جلد نمبر ۱۳

نقوش لاہور
پاکستان

شمارہ 107

نقوش، شمارہ ۱۰۷، لاہور

لکھنؤ کی ادبی فضا — ناسخ و آتش کے بعد

ڈاکٹر محمد حسن

ناسخ نے ۱۸۳۸ء میں اور آتش نے ۱۸۴۷ء میں وفات پائی۔ اس سے قبل ہی لکھنؤ کی ادبی اور لسانی خود مختاری مستحکم ہو
لی تھی اور لکھنؤ کے طرزِ خاص کو عام طور پر تسلیم کیا جانے لگا تھا۔ ان اساتذہ کے پروردہ شعرا کی نئی نسل پروان چڑھنے لگی تھی جس نے
ذبات نگاری کے بجائے خیال بندی اور نازک خیالی کی فضا میں آنکھ کھولی تھی۔ رعایتِ لفظی صناعی مذہب الکلامی کو شعر کا زیور سمجھا
ا اور مضمون سے زیادہ زبان دانی اور بندش کی چستی پر زور دینا سیکھا تھا۔ عام طور پر ادب کے مورخین نے لکھنؤ اور دہلی کے
بستانوں کی الگ تقسیم کر کے ان تمام خصوصیات کو لکھنؤ کے دبستان کی خصوصیات قرار دیا ہے گو اس طرزِ خاص کی باقاعدہ ترویج کی ذمہ
اری ناسخ اور ان کے معاصرین پر عاید ہوتی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ طرز ایک ادبی میلان کی حیثیت رکھتا ہے اور صرف لکھنؤ
ک محدود نہیں ہے۔ دہلی کے شعرا نے بھی خارجیت، زبان دانی پر زور، لفظی صناعی سنگلاخ زمین میں طبع آزمائی ابتذال اور خیال
بندی کو اختیار کیا۔

ناسخ اور آتش کے بعد والے دور میں ادبی دبستان کی یہ تقسیم اور بھی مبہم ہونے لگتی ہے۔ ایک طرف تو دہلوی شعرا نے
لکھنؤ کے اثر کو قبول کیا جن میں شاہ نصیر کی سنگلاخ زمینیں، مومن کی ذومعنیں داسوخت کا انداز اور اشاریت، غالب کی مشکل پسندی
اور فارسیت، ذوق کی محاورہ بندی قابلِ ذکر نشانیاں ہیں۔ دوسری طرف لکھنوی شعرا کو اس کا احساس ہونے لگا تھا کہ ان کی
شاعری تغزل سے محروم اور تاثیر سے عاری ہوتی جا رہی ہے اور صحت زبان کی فکر میں وہ غزل کی اصلی روح سے غافل ہو گئے ہیں
چنانچہ شاگردانِ ناسخ و آتش کو اور ان کے معاصرین کے یہاں یہ احساس مختلف شکلوں میں نمایاں ہوا۔

اس دور کے لکھنؤ میں تین ادبی گروہ ملتے ہیں۔ ایک شاگردانِ ناسخ کا گروہ، دوسرے شاگردانِ آتش کا گروہ اور تیسرا
اردانِ مصحفی کا گروہ۔ ناسخ اور آتش کے دور تک ان تینوں اساتذہ کے رنگ کافی حد تک الگ تھلگ اور منفرد تھے لیکن
ن کے شاگردوں میں یہ علیحدگی اور وضاحت برقرار نہ رہی۔ ان گروہوں نے ایک دوسرے کے اساتذہ کا نہایت آزادی
سے اثر قبول کرنا شروع کیا۔ یہی نہیں ان تینوں گروہوں نے دہلوی اساتذہ کی داخلیت وارداتِ قلبیہ سوز و گداز اور لب
لہجے کی نرمی کو بھی اپنے طور پر اختیار کرنے کی کوشش کی۔

شاگردانِ ناسخ کی فہرست خاصی طویل ہے۔ صاحب تذکرۂ جلوۂ خضر نے شاگردانِ ناسخ میں ۷۴ شعرا کو شامل کیا ہے
ن میں آباد، آشنا، اثر، اعجاز، افضل، انس، بحر، برق، بسمل، ثاقب، جوش، حشم، رشک، رونق، سالم، سحر، سیفی،
جماعت، شہید، صبر، محبت، صولت، ضبط، فراق، فرخ، فصیح، قبول، قدس، قوس، کوثر، کیوان، لائق، مسیحا،

مفتون، ملال، قہر، نادر، نامی، نصیر، نمود، نواب، وزیر، وصف شامل ہیں۔ ان میں رشک، برق، وزیر، آباد، سحر، شہید، کوثر، اثر اور مسیحا کو استاد قرار دیا گیا ہے۔ لیکن درحقیقت ان میں میر علی اوسط رشک، مرزا محمد رضا برق، شیخ امداد علی بحر، خواجہ وزیر اور شیخ امان علی سحر اور حاتم علی مہر ایک دُوسری حیثیت سے نادر ہی ہمارے لیے اہم ہیں۔

شاگردان ناسخ نے زبان و قواعد اور عروض کے ان تمام قواعد کا لحاظ رکھا جن کو ناسخ نے وضع کیا تھا لیکن ایک طرف تو اس دور میں زبان کے اصول وضوابط کو زیادہ واضح اور مرتّب کرنے کا کام باقاعدگی سے شروع ہوا۔ لغات مرتّب ہوئے رسائل تصنیف ہوئے اور واضح اصول مرتّب کیے گئے، جن میں میر علی اوسط، رشک کا نفس اللغۃ امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ دوسری طرف صحت زبان، بندش کی چستی اور محاورہ کی درستی کے ساتھ ساتھ سادگی اور روزمرہ کی طرف بھی توجہ مبذول ہوئی خواجہ آتش نے بانکپن رندی اور خمریات کے مضامین سے جو نئے رنگ پیدا کیے تھے ان سے بھی اثر قبول کیا گیا اور ان مضامین کی رنگینی اور کیفیت کو ناسخی زبان اور نازک خیالی کے ساتھ اپنانے کی کوشش کی گئی۔

اس طرح شاگردان آتش کی فہرست میں بھی جلوۂ خضر کے مصنّف نے مندرجِ ذیل ۳۸ نام گنوائے ہیں۔ اصغر، اعظم، افضل، اوج، بسمل، حامد، حزیں، جلیل، خلیل، رند، زاہد، سخن، سرور، سلیم، شاہی، شرر، شرف، شمس، شناور، شوق، شیدا، صبا، عارف، علی، عزیز، عشق، فیضی، قاسم، قدس، ماہ، مضطر، مجیب، منش، نادر، نمود، یوسف۔ جن میں خلیل، رند، شرف، صبا اور تسنیم خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ شاگردانِ نسیم نے بھی ناسخ کے شاگردوں کا اثر قبول کیا۔ زبان کی تراش خراش میں ان کی پیروی کی۔ لیکن ان کے کلام میں گھلاوٹ اور کیفیت کا جُز ناسخ کے شاگردوں کے مقابلے میں پھر بھی زیادہ نمایاں رہا۔

تیسرا گروہ شاگردانِ مصحفیؔ کا ہے جن میں کرامت علی شہیدی، میر مظفر علی اسیر، طالب علی خاں عیش، تقی خاں ہوس، محمد عیسیٰ تنہا، قابلِ ذکر ہیں۔ یہ مختصر سا گروہ اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے، کہ دراصل لکھنؤ کے شاعرانہ مزاج کو جو اثر برابر شعریت، تغزل، واردات قلبیہ اور سادگی کی طرف کھینچتا رہا۔ وہ مصحفی اور ان کے شاگردوں کا اثر تھا۔ اس وقت بھی جب ناسخ کی لفظی صناعی اور سنگلاخ زمینیں مقبول عام ہو چکی تھیں اور طرز کی قدردانی ہوتی تھی۔ مصحفی کے شاگردوں کی یہ چھوٹی سی جماعت اثر، گداز اور نرمی کی طرف ضرور توجہ کرتی تھی۔ دراصل لکھنؤ کے رنگ سخن میں مصحفی اور ان کے شاگردوں کی وجہ سے ایک سنگم قائم ہوا اور جس طرح رام پور میں دہلی اور لکھنؤ کے شاعروں کے یکجا ہو جانے سے یہ دونوں دبستان قریب آئے۔ اسی طرح مصحفی اور ان کے شاگردوں کی کوشش سے لکھنؤ اور دہلی کا ادبی فاصلہ کم ہوا اور یہ عنصر ایک اہم عنصر بن کر لکھنؤ کے دبستان میں حقیقی شاعری اور تغزل کی آواز بلند کرتا رہا۔ اور آخر کار اس سے دُور رس نتائج برآمد ہوئے۔

ناسخ کی غزلوں میں تغزّل کی کمی اور بے مزہ اور صفائی کے فقدان کی طرف سب سے پہلے میر کلو عرش اور ان کے شاگردِ رشید شاد لکھنوی نے احتجاج کیا تھا۔ اپنے دیوان 'سخن بے مثل' کی تقریظ میں انھوں نے ناسخ کی اصلاحِ زبان کے کام کی اہمیت بھی یہ کہہ کر کم کر دی ہے کہ شاہ حاتم اپنے وقت میں قواعد زبان اُردو درست کر گئے تھے . . . . . . بعد

میر تقی صاحب نے اس کو درست کیا۔ اس کے بعد ان کے صاحب زادے میر کلو عرش نے جو میرے استاد ہیں زبان کی اصلاح کی ان کے بعد میں نے اور " اکثر حضرات " کی اس بات کو غلط بتایا ہے کہ ریختہ کا بیکر ایک مترجم بے مُرشد نے غازی الدین حیدر شاہ اودھ میں یہ اختراع کیا ہے (بحوالہ جلوۂ خضر جلد دوم ص ۱۴۴) میر کرامت علی شہیدی نے ناسخ کے جواب میں دیوان مرتب کیا۔ عرش اور آتش کے شاگردوں میں سے بعض نے ناسخ کی شاعری پر سرقہ ' ترجمہ ' خلافِ محاورہ ' گرانی الفاظ ' بے مزگی کلام ' صفائی کے کوچے میں پھسڈی رہ جانے ' تصرفات ' قادر الکلامی میں غلطی کرنے اور کوہ کندن وکاہ برآوردن کے مصداق نازک خیالی کرنے اور ضعف تالیف کے الزامات لگائے ہیں ان سے یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ گو ان اعتراضات کے باوجود ناسخ کے رنگ کو قبول عام حاصل ہوا اور اکثر شعرا نے انہی کی تقلید کی مگر شعرا کا ایک چھوٹا سا حلقہ ایسا بھی تھا جو اس رنگ میں کچھ کمی محسوس کرتا تھا اور تاثیر اور شعریت کو تلاش کرتا تھا۔

یہ تلاش اور شاگردانِ مصحفی کے ہاں اور زیادہ نمایاں تھی۔ آتش کے ہاں رعایت لفظی سنگلاخ زمینوں میں قافیہ پیمائی اور طویل غزلوں کے باوجود متصوفانہ قلندری کا بانکپن شخصیت کے سوز کی ہلکی سی آنچ اور خمریات کے مضامین میں رندی کا جوش ملتا ہے۔ داخلیت اور سوز و گداز کی کمی کو آتش نے رندی اور قلندری سے پورا کرنا چاہا۔ ناسخ اور آتش کے بعد والے دور میں یہ مسئلہ اور بھی واضح طور پر سامنے آیا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ کے دور میں لکھنؤ عیش و عشرت کا گہوارہ تھا اور اس کی تہذیبی فضا سعادت علی خاں اور غازی الدین حیدر کے دور سے کسی طرح مختلف نہ تھی۔ لہذا اس دور کا مذاق سخن میں بھی ناسخ کے رنگ کو سرایت کر گیا۔ اور لکھنؤ میں رعایت لفظی ، قافیہ پیمائی ، خارجیت اور تقالات کا سکہ چلتا رہا۔ اور اس ذوق کی جڑیں اس قدر مضبوط تھیں کہ انتزاع سلطنت اور ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے باوجود لکھنؤ کے ذوق شعری میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اور رعایت لفظی عدد قافیہ پیمائی اور نازک خیالی ہی کو حاصل شاعری سمجھا جاتا رہا۔

شاگردانِ آتش و ناسخ نے عام لکھنوی رنگ کو اختیار کیا لیکن اس میں تغزل کا رنگ پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ حضرات صفِ دوم کے شاگرد تھے۔ لہذا اجتہاد اور ایجاد کی اس منزل تک نہ پہنچ سکے کہ تقلید سے دامن بچا کر تغزل کا کوئی نیا راستہ پیدا کر سکتے۔ ان پر مذاق عام کی گرفت اتنی سخت تھی کہ اس سے الگ چلنا ناممکن تھا۔ اس دائرے میں رہ کر جو نقش و نگار بنا سکتے تھے بن گئے۔ شاگردانِ ناسخ میں وزیر نے رعایت لفظی کو کسی قدر دلکشی کے ساتھ استعمال کیا اور اس میں عاشقانہ اور اخلاقی مضامین کا رنگ پیدا کر دیا۔ شاگردانِ آتش میں آغا حجو شرف ، صبا اور رند نے تغزل کی شان اور زیادہ نمایاں کی۔ چنانچہ صبا کہتے ہیں۔

مضمون ؟

اشعار ہر زمین میں ہیں عاشقانہ شرح

ایک اور جگہ کہتے ہیں

اے صبا آپ رعایت نہ کریں لفظوں کی
وہ گل پا لیا گلچیں نے تو کیا حال ہوا

بار رند نے ایک جگہ کہا ہے:

بہت جو شیخ ناسخ خواجہ آتش کے سوا بالفصل رند
شاعران ہند میں رکھتے ہیں طرز میر ہم

ایک اور جگہ سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ رند علمی دستگاہ اور شاعرانہ کمال کے بجائے کلام کی تاثیر کو اہمیت دیتے ہیں۔
ایک جگہ دعا مانگتے ہیں۔

رندی ہے یہ تمنا کہ اثر بھی دے تو
دنیا تو نے اگر ذوق سخن مجھ کو دیا

ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

بہتر جو استعارہ و اغراق سے نہیں
پھر کیوں پسند خلق مری سادہ گوئی ہے

رعایت لفظی اس دور کا غالب رنگ تھا لیکن اس کے باوجود امانت کے علاوہ اس دور کے اکثر شعرا نے یا تو رعایت لفظی میں مضمون آفرینی کی مدد سے لطف پیدا کرنے کی کوشش کی یا اس میں تجربات رندی عاشقانہ رنگ یا واردات قلبیہ کا عنصر داخل کر کے اسے پُرلطف بنانا چاہا۔ ناسخ کے تلامذہ میں بھی" رشک، برق اور وزیر نے بھی نسبتاً اس صنعت کو کم برتا۔ اور آخر میں سحر نے اس دیوان کو ضائع کر دیا۔ جو اس قسم کے اشعار پر مشتمل تھا" (بحوالہ شعر الہند) چنانچہ خود کہتے ہیں:

سودا ہے نئی بات کا اے جان پرانا
سب پھینک دیا پھاڑ کے دیوان پرانا

تلامذۂ آتش میں "صبا" اور "نسیم" نے اسے برتا۔ صبا نے کم اور نسیم نے بہت" اور صاحب جلوہ خضر کی یہ رائے بہت حد تک صحیح ہے۔

رعایت لفظی کو حسن کے ساتھ برتنے کے ساتھ اس دور کے شعرا نے" وقوعی خیالات" یعنی معاملہ حسن و عشق معاملہ بندی اور کاروبار دل و دلدار پر زور دیا۔ محبوب کا وہ تصور بھی ختم ہوا جس میں اسے سفاک قاتل اور بے رحم جلاد کی شکل میں پیش کیا جاتا تھا۔ سوفیانہ پن اور ابتذال کی ہوا اس کے ساتھ ساتھ منو تنی پر سے تصنع کے نقاب ہٹے۔ گو اب بھی عشق کی پوری منب وتاب نمایاں نہ ہوئی مگر پہلے کے مقابلے میں اس کی جھلکیاں زیادہ نظر آنے لگیں۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ محبوب کی نسوانیت کا اعلان اور اس کی کنگھی چوٹی اور محرم کے ذکر کو سرمایۂ شاعری قرار دینے کا سلسلہ بھی بہت کم ہو گیا۔ خال و

خط کے تذکرے کے ساتھ گل و بلبل سرو قمری کا ذکر بھی کم ہوا اور استعارات اور مبالغے کی اقسام سے کام لینے میں توازن کا ثبوت دیا گیا۔

معاملاتِ حسن و عشق کو نظم کرنے کی کوشش، کا ایک خوش گوار نتیجہ ادا بندی اور سلاست زبان کی شکل میں نمایاں ہوا۔ عربی اور فارسی الفاظ کا استعمال جو ناسخ کے کلام میں بہت زیادہ تھا اس دور میں کم ہوا۔ فارسی ترکیبیں اور عربی کی مشکل فقروں اور تلمیحوں کو بھی بہت کچھ ترک کر دیا گیا اور ان کے بجائے ہندی اصطلاحات اور فصحا کے مستعمل الفاظ و لغات استعمال کیے جانے لگے۔ محاوروں کی چاشنی کی طرف توجہ کی گئی۔ جس سے شعر میں عام گفتگو کے لب و لہجہ سے تو بہ پیدا کرنے کا موقع ملا۔ سلاست اور صفائی کو کلام کا جوہر سمجھا جانے لگا اور اس بات کی کوشش ہونے لگی کہ جو لفظ جس طرح بولا جاتا ہے اسی طرح شعر میں باندھا جائے۔ جس کی نمایاں مثال رشک کے دیوان میں ملتی ہے۔

ادا بندی اور سلاست کا رجحان اس لحاظ سے قابل توجہ ہے کہ اس نے نئے دور کی شاعری کے لیے زمین ہموار کی۔ شاعری کی زبان اور روزمرہ کی زبان کے درمیان جو خلیج پیدا ہو گئی تھی اسے ختم کیا اور جس طرح گفتگو میں لہجہ تیور رنشائے اور تیور سے کام لیا جاتا ہے۔ اس کو غزل میں حسن و عشق بڑھ گیا اور سادہ روزمرہ کے لب و لہجے میں شعریت اور لطافت پیدا کی گئی۔ گو تلامذۂ آتش کے کلام میں یہ ادا بندی اور گھلاوٹ بہت زیادہ نمایاں ہے (خصوصاً رند اور صبا کے کلام میں) لیکن تلامذۂ ناسخ نے بھی کثرت سے اسے استعمال کیا ہے۔ مثلاً :

ان کی رفتار سے دل کا عجب احوال ہوا   رندہ گیا پس گیا مٹی ہوا پامال ہوا   صبا

کون کہتا ہے نہ کر شستہ انہ چھیڑ
دل لگی میں چھیڑ جھنجھلا کر نہ چھیڑ   رشک

شب ہجراں سحر ہوتی تو کیا
کس کو امید زندگانی ہے   رشک

مار ڈالا بے ثباتی نے تری   ہستی فانی بڑا دھوکا دیا   رند

رند حاضر ہیں شیشہ و ساغر
مے نہ سمجھو اگر حرام تو لو   رشک

کہنے سننے کی اب نہیں طاقت   عفو کیجے کہا سنا میرا   اسیر

شباب تھا کہ الٰہی نسیم کا جھونکا   کہ دفعتاً ادھر آیا ادھر روانہ ہوا   اسیر

ہمارا دل انھیں کے پاس نکلا ہم نے پہچانا
گواہی دی خدائی بھر نے ایک نے پہچانا   صبا

کیا ہنستے ہو تم کو مری فریاد سے کیا کام   آباد رہو تم تمھیں ناشاد سے کیا کام   شرف

بھرا گیا ہے لائے جو منزل میں عشق کی
کیا جانیے رہنما تھا کہ رہزن تھا کون تھا — شرف

کہیے یاران عدم کیا گزری — کچھ لب گور سے فرمایئے گا — وزیر

اس دور کا سب سے اہم اور حیرت انگیز تجربہ آغا حجو شرف نے کیا۔ جنھیں عبدالغفور نساخ نے ناسخ کا شاگرد بتایا ہے اور بعض دوسرے تذکرہ نویسوں نے آتش کے سلسلہ تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ آغا حجو شرف نے فارسی شاعری کی ان تمام مروج اصطلاحوں اور علامتوں کو یکسر ترک کر دیا جن کی وجہ سے لکھنؤ کی شاعری بالخصوص اور اردو کی شاعری بالعموم ہوسناکی فحاشی کا مجموعہ بنی ہوئی تھی۔ یہی نہیں بلکہ ان کا استعمال عموماً روایتی انداز میں پیش کیا جاتا تھا اور اس تقلیدی رنگ نے بت، صنم، کلیسا، بت خانہ، برہمن، ناقوس، زنار، زاہد، واعظ، ناصح، شیخ، پیر مغاں، مغبچہ، ساقی، رند، جام، ساغر، شیشہ، قلقل، شراب، صہبا وغیرہ کو بے روح الفاظ اور بے رنگ علامتیں بنا رکھا تھا اور شاعری علامتوں کی مدد سے پٹے پٹائے مضامین اور محدود خیالات و تصورات کو دہرانے کا نام رہ گئی تھی۔ یہ وہ احساس ہے جس کا اظہار بعد کو حالی کے مقدمہ شعر و شاعری اور آزاد کے مشاعرہ انجمن پنجاب اور دیباچہ آب حیات کا محرک بنا۔ لیکن اس دور میں روایتی دبستانِ شاعری سے پرداختہ ایک شاعر اس قدر انقلابی تجویز نہ صرف سوچ سکتا تھا بلکہ اس پر غزل کی حدود میں رہ کر عمل درآمد بھی کر سکتا تھا۔ یہ بات یقیناً حیرت خیز ہے۔ تعجب ہے کہ شرف کو ادب کی تاریخ میں مناسب درجہ کا ابھی تک مستحق نہیں سمجھا گیا۔

اس دور کی ایک اور خصوصیت یہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ ناسخی رنگ کی مقبولیت اور رواج کے باوجود مصحفی کے تلامذہ کے مختصر سے گروہ نے شعریت کو زیادہ ملحوظ رکھا اور مصحفی کے اثر نے کبھی براہ راست ہوس اور اسیر کے رنگِ سخن میں اور کبھی آتش اور ان کے تلامذہ کے طرز کی شکل میں بالواسطہ ذوقِ عصر کو متاثر کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لکھنؤ کے دورِ آخر میں داخلیت اور تاثر کے کھوئے ہوئے عناصر کے نقوش پھر سے تھوڑے بہت ابھرنے لگے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ توجہ ہے کہ شاعری اور زبان دونوں کا دائرہ اس دور میں محدود سے محدود تر ہونے کے باوجود وسیع ہوا اس میں بلندی اور رسائی فکر کی جلوہ گری غزل پر صرف کر دی تھی۔ لیکن بعد کے دور میں ایک طرف مثنوی کا عروج ہوا اور واسوخت اور شہر آشوب لکھے گئے تو دوسری طرف منظوم ڈرامے کی ابتدا ہوئی۔ مرثیہ کا ارتقا ہوا۔ اس دور کے بہت کم اساتذہ ایسے ہیں جنہیں 'یک فنے' ہونے کا وہ الزام دیا جا سکے۔ جو غالب نے حاتم علی مہر کی مثنوی کی تعریف کرتے وقت ان کے استاد ناسخ پر عائد کیا تھا۔

جہاں تک زبان کی پیکر تراشی کا تعلق ہے ناسخ اور آتش نے جو کام شروع کیا وہ اس دور میں گویا ارتقا کی منزل تک پہنچا اور اس سے آج بھی بہت آگے نہیں بڑھا ہے۔ ان بزرگوں نے ایک کو تو ناسخ کے دور کی اصلاحات کو واضح اور مرتب شکلوں میں لغات اور رسائل کی صورت میں پیش کیا اور ان اصول کی روشنی میں اپنے اشعار اور اپنے تلامذہ کے کلام کی تراش خراش کی جو لفظ اور محاورہ تلمیح، استعارہ استعمال کیا اس کی نظیر اور سند کی روشنی میں پرکھا۔ قواعد کی کسوٹی پر کسا۔ روزمرہ اور

فصحا کی زبان سے استناد کیا۔ دُوسری طرف انھوں نے ناسخ اور آتش کے اصول کو سامنے رکھ کر اصلاحِ زبان کے کام کو ایک قدم آگے بڑھایا اور صفائی اور سلاست بندش کی چستی اور زبان کی ہمواری کے تقاضوں کے پیش نظر بہت سی ایسی گراں بار ثقیل اور بھونڈے الفاظ اور تراکیب بھی ترک کر دیں، جنھیں خُود ناسخ اور آتش نے بلا تکلف استعمال کیا تھا۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ عربی اور فارسی کے نامانوس لغات اور تراکیب شامل ہیں۔

صاحب جلوۂ خضر نے ان تبدیلیوں کے دو اقسام قرار دیے ہیں ایک وہ الفاظ، محاورات اور تراکیب جو بلا سبب ترک کر دی گئیں مثلاً جان کا پیوند ہونا، شجرہ، سو (بمعنی چنانچہ یا الغرض) پیالا ہونا۔ تو سہی، اس پر خفا ہونا (بجائے اس بات پر خفا ہونا) بہ تنگ آنا، اشعار بجانا (بمعنی ساز پر اشعار گانا) چاہیئے ہیں، پری اندام شبیہہ لکھنا۔ کاکو، نور کا عکس، جب تب، منار (بجائے مینار) ان کے علاوہ دُوسری قسم ان الفاظ و تراکیب کی ہے جن کے ترک کرنے کا کوئی اہم سبب تھا۔ اس دُوسری فہرست میں یہ سلیمان (بمعنی سلیمان کی قسم) شام سے لے تا سحر، سدا، کیجے (بمعنی کیجیے) ہنوز (بجائے اب تک) دے بن سیپ (بمعنی بجائے بے سیپ) لیک، تسپر، تک جیسے الفاظ شامل ہیں۔

ان تبدیلیوں سے اندازہ ہوگا کہ گو ناسخ کی روایت کے تتبع میں اس دور کے شعرا نے بھی بعض فصیح عام فہم روزمرہ کے بعض الفاظ کو متروک قرار دے دیا۔ لیکن ناسخ اور ان کے ہم عصروں کے مقابلے میں زیادہ سادہ عام فہم اور رواں الفاظ کو ثقیل اور ناہموار الفاظ پر ترجیح دی گئی اور زبان کا دائرہ ناسخ کے عہد سے زیادہ وسیع رہا۔ اس کے علاوہ شعر میں الفاظ کے دبنے اور گرنے کا بھی خیال رکھا گیا۔

ناسخ کی اصلاحات کی فہرست یُوں تو خاصی طویل ہے انھوں نے بتایا کہ کون لفظ ترک کرنا چاہیے۔ کون لفظ رکھنا چاہیے۔ غلط العام کیا ہے۔ خواص میں کس قدر غلطیاں ہیں۔ بازاری کیا ہے درباری کیا ہے۔ لغت صحیح کون ہے صرف و نحو سے درست ہے یا نہیں۔ اس پر خاص شاعری کے لوازمات کا خیال۔ مضمون بلند ہو، بندش چست ہو، نشست الفاظ درست ہو، شعر میں شوکت پیدا ہو، درستی ایسی کہ پھر بگڑ نہ سکے اور بگڑے تو پھر اس وضع پر بن سکے وغیرہ وغیرہ (بحوالہ جلوۂ خضر جلد دوم ص ۴۲) لیکن دراصل غرابت الفاظ کی اصلاح بندش کی چستی اور کلام کی ہمواری اور خیال بندی پر زور دینا ہی ان کا اصل کارنامہ تھا۔

اس دور میں زبان دانی اور شعر گوئی کے بھی اصول خاصی سختی سے برتے گئے۔ یہاں الفاظ بہت کم شعر میں دبتے ہوئے ملیں گے۔ اس کے علاوہ شعر میں لفظ کا صحیح تلفظ برقرار رکھنے کی کوشش بھی کی گئی۔ مثلاً رشک کے کلام میں نشہ (نشاہ) ترش، ہیں۔ ساتھی (ساتھ ہی) جیسے لاتعداد الفاظ اپنی صحیح اور روزمرہ کی شکل میں استعمال کیے گئے ہیں۔

مختصراً لکھنوی شاعری کا یہ دور دراصل ایک عبوری دور معلوم ہوتا ہے جب شاعری فکر و خیال کے اعتبار سے ایک خلا میں محصور نظر آتی ہے تخیل کی اڑان اور خیال بندی کے تجربے یہ ثابت کر چکے تھے کہ یہ کرتب تاثیر اور شعریت کا بدل نہیں ہو سکتے۔ اس لیے نئے دور کے ان شعرا نے مصحفی اور میر کے رنگ کی کچھ جھلکیاں لے کر غزل کو پھر سے محدود مضمون

میں مزاج بنانے کی کوشش ایک ایسے دور میں ہو رہی تھی جب سیاسی اور تہذیبی انحطاط زمانے کا ورق الٹ رہا تھا۔ پرانی تہذیب بانجھ ہو چکی تھی اور اس زوال آمادہ عہد کے پاس نئے خیالات کی توانائی اور نئی تخلیقی صلاحیت نہ تھی جو شاعری کے تنِ مُردہ میں دوبارہ جان ڈال سکتی۔ اس لیے ان شعرا نے صرف زبان کی سلاست، اندازِ بیان کی خوبصورتی بحث کی صفائی اور ادا بندی پر اکتفا کیا اور ناسخ کے دور کی خشک اور بے آب و گیاہ شاعری میں وارداتِ قلبیہ کے نخلستان سجائے ان کا کارنامہ چھوٹا سا ہے مگر اس لحاظ سے تاریخی حیثیت رکھتا ہے کہ زبان اور شاعری کے پیکر تراشنے میں اور داغؔ امیرؔ، جلالؔ اور پھر حالیؔ، شبلیؔ، آزادؔ کے دور کے شاعروں کو ورثہ انہیں بزرگوں سے ملا۔ ان کی دُنیا محدود ہے مگر اس کے سائے گل بوٹے نقلی اور بناوٹی نہیں ہیں۔ ان کے ہاں کہیں کہیں شادابی ملے گی وہ محض مینا کاری نہیں کرتے بلکہ کبھی کبھی من کی موج بھی ان کے ہاں لہراتی نظر آتی ہے اور ان کے یہی نقش و نگار ان کی متاع ہیں۔

اس پس منظر میں شاگردانِ ناسخ، آتش، مصحفی کی خدمات زبان وادب پر علیحدہ علیحدہ غور کرنا مناسب ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہاں صرف چند اہم شعرا کے کارناموں کے ذکر پر اکتفا کیا جائے گا۔

شاگردانِ ناسخ میں کئی حیثیتوں سے میر علی اوسط رشک اور خواجہ وزیر ممتاز نظر آتے ہیں۔ میر علی اوسط رشک اس حیثیت سے بھی ممتاز ہیں کہ ان کے شاگردوں کی تعداد بہت زیادہ ہے اور لکھنؤ کے آخری دور کے اساتذہ میں سے کئی اہم نام ان کے شاگردوں کی فہرست میں نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے اپنے شاگردوں اور معاصرین کے لیے لُغات اور شعر گوئی اور زبان دانی کی ضابطہ بندی میں سب سے زیادہ نمایاں حصّہ لیا ہے۔

رشک (وفات ۱۸۶۷ء) کی زندگی کے بارے میں زیادہ معلومات محفوظ نہیں ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا لقب والاجاہ تھا اور ان کے والد کا نام میر سلیمان تھا۔ بعض نے انہیں لکھنوی قرار دیا ہے اور ان کے بزرگوں کا وطن فیض آباد بتایا ہے۔ مگر وہ خود کہتے ہیں۔

فیض، ناسخ در رشک میں کیوں کر نہ ہو
کا بعد ہے خاک فیض آباد کا

تعلیم و تربیت لکھنؤ میں اس دور کے مذاقِ عام کے طور پر ہوئی۔ ان کے والد مختلف علوم و فنون میں دستگاہ رکھتے تھے۔ انھوں نے اس دور کے علما و فضلا سے تحصیل علم کی اور شاعری میں ناسخ کی شاگردی اختیار کی۔ یہ امتیاز صرف رشک اور خواجہ وزیر کو حاصل ہے کہ ناسخ نے انھیں اپنی زندگی میں اپنی نیابت کے قابل سمجھا اور ناسخ کے بعض شاگرد ان کے ان ممتاز شاگردوں سے اصلاح لینے لگے۔

ان کے دو دیوان نظمِ مبارک (۱۲۵۳ھ) میں اور نظمِ گرامی (۱۲۶۱ھ) میں مرتب ہو کر شائع ہوئے۔ صاحب سراپا سخن اور بعض دُوسرے تذکرہ نگاروں نے ایک تیسرے دیوان کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ سبحان اللہ سیکشن علی گڑھ یونیورسٹی لائبریری میں موجود ہے۔ جسے ابواللیث صدیقی نے ان کا تیسرا دیوان بتایا ہے اور غیر مطبوعہ

قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں ۱۲۵۷ھ تک کے بعض قطعات تاریخ کا ذکر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سبحان اللہ سیکشن کا یہ قلمی دیوان غالباً دونوں مروجہ دواوین کا انتخاب ہے اس کے سرورق پر ایک قطع تاریخ درج ہے جس کے آخری مصرع "مظہر دین و اولیا" سے ۱۲۷۳ھ تخرج ہوتے ہیں۔ لیکن اس کی قطع کے مصنف کے بارے میں یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس میں جو غزلیں مندرج ہیں وہ بعض اختلافات کے ساتھ نظم مبارک اور نظم گرامی میں ملتی ہیں۔ لیکن رشک کے تیسرے دیوان کے مرتب ہونے کی شہادت صحیح معلوم ہوتی ہے۔

ان دواوین سے طرز کلام کے بارے میں عام طور پر جو رائیں قائم کی گئی ہیں۔ ان میں نظر ثانی کی گنجائش ہے۔ یہ بات دُہرائی جاتی رہی ہے کہ رشک کا طرز کلام بالکل ناسخ کے طرز پر ہے اور ان میں اور ان کے استاد کے کلام میں کوئی فرق نہیں یعنی ان کی غزلوں کا جوہر بھی رعایت لفظی اور قافیہ پیمائی ہے اور اس میں شعریت اور تغزل کا فقدان ہے۔ اس کے پیش نظر ان کے کلام کی صرف یہ اہمیت سمجھی گئی ہے کہ جب کبھی کسی لغت نویس کو کسی لفظ کی سند ڈھونڈنی ہو تو اسے کلیات رشک کی ورق گردانی کرنی چاہیے۔

اس میں شک نہیں کہ رشک کے یہاں ایسی غزلیں بھی کثرت سے پائی جاتی ہیں جن میں رعایت لفظی اور قافیہ پیمائی کے علاوہ اور کوئی کمال نہیں ہے لیکن اسے رشک کے کلام کا بنیادی آہنگ کہنا صحیح نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رعایت لفظی کا استعمال فی نفسہ معیوب نہیں نہ خیال بندی اور نازک خیالی کو فی نفسہ عیب قرار دیا جا سکتا ہے ورنہ میر اپنے دیوان کے آخر میں اپنے انداز شعر کو ان تمام صنعتوں پر محیط قرار نہ دیتے۔ یہ باتیں صرف اسی وقت عیب بن جاتی ہیں۔ جب یہ ہی مقصد بن جائیں اور شعر سے شعریت تغزل اور تاثیر معدوم ہو جائے۔

رشک نے ناسخ کی شاگردی ہی نہیں شیفتگی کا دم بھرا ہے اور انھیں اپنا "مولد اور استاد" بنایا ہے۔ "مخزن دولت اُردوئے معلیٰ" "خضر وادی ارشاد معنی آرا سخن ایجاد" قرار دیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ شاگردان ناسخ سے بھی اثر پذیری کا اعتراف کیا ہے۔

غزل کا ہر شعر گرم تر ہے کلام رشک آتش و ششرر ہے
یہ صحبت مہر کا اثر ہے کہ سرد تیسرا سخن نہ دیکھا

اس کے علاوہ جن خیالی بند شعرا کا ذکر خصوصیت کے ساتھ ملتا ہے۔ ان میں بیدل بھی ہیں۔

فرط غم سے ہیں اے رشک دل ملتا نہیں
ہر غزل میں عالم اشعار بیدل چاہیے

رشک نے بلاشبہ نازک خیال اور ندرت ادا کی کوشش کی ہے لیکن ان کے یہاں ناسخ کا سا غلو پیدا نہیں ہوا ہے۔ وہ طویل غزلیں کہتے ہیں لیکن سنگلاخ زمینوں کے رسیا نہیں ہیں۔ رعایت لفظی وہ برتتے ہیں لیکن اس میں اکثر لطف ذاتیر برقرار رکھتے ہیں۔ صاحب جلوۂ خضر نے ایک جگہ لکھا ہے کہ رعایت لفظی کو لطف کے ساتھ صرف خواجہ وزیر اور اسیر نے برتا

رشک اس فہرست میں شامل ہونے کے لائق ہیں۔ انھوں نے غزل کو ناسخ کی ثقالت اور بے لطفی سے بہت کچھ پاک کیا۔ یہ گروہ ناسخ کی استادی کے قائل اور ان کے معتقد ہونے کے مدعی ہیں لیکن ناسخ کے ہاں محبوب جس قدر جلاد، سفاک اور وحشی نظر آتا ہے وہ رشک کے ہاں ناپید ہے۔ پھر اکثر اشعار میں الفاظ مضمون پر غالب آتے نہیں دکھائی دیتے۔

رشک کی ایک اور خصوصیت ادا بندی ہے۔ خصوصاً چھوٹی بحر کی غزلوں میں سادگی اور روزمرہ کی زبان کا نکھار نمایاں طریقے پر سامنے آتا ہے اس سادگی نے رشک کے بڑے کام کیے ہیں اور عام بول چال کی زبان میں جو لوچ اور لطیف موڑ اور زاویے ہوتے ہیں انھیں بھی اپنے اشعار میں حسن کے ساتھ برتا ہے۔ رشک کے زمانے ہی سے لکھنوی شاعری نے لب و لہجے سے آشنا ہونے لگی تھی۔

رشک کی شاعری کو عاشقانہ کہنا دشوار ہے۔ کیوں کہ اس میں حسنِ محبوب کا ذکر اور والہانہ شوق کے جذبے کا اظہار بہت کم ہوا ہے لیکن جہاں کبھی ہوا ہے وہ ناسخ کے مقابلے میں زیادہ تابناک اور لطیف ہے۔ ہاں رشک نے خیال بندی کو دوسرے مضامین اور موضوعات کے سلسلے میں استعمال کیا۔ اخلاقی مضامین کو نئے ڈھب سے باندھا۔ دنیا کی ناپائداری اور ثباتی غم نصیبی کا کار آمد ثابت ہونا تقدیر سے انسان کا عاجز ہونا، قناعت اور استغنا کا ایجمن، خودی اور خود نمائی کی مخالفت گردشِ چشمِ یار اور گردشِ روزگار کا ایک ہونا، وفا کی جفا، دیر او کعبے سے آزاد ہو کر ہر جگہ جلوہ خداوندی دیکھنا آئینہ ہستی میں اسرار و رموز روشن ہونا، غرض اس قسم کے مسائل سے ان کی غزلیات معمور ہیں۔ اور یہ مضامین محض آرائش کی خاطر نہیں باندھے گئے ہیں۔ ان کے پیچھے شاعر کا یقین اور جذبہ بھی کا۔ فرما نظر آتا ہے اور جس صفائی سے انھیں باندھا گیا ہے وہ کیفیت سے خالی نہیں۔

اس کے علاوہ رشک نے اپنی غزلیات میں خیال بندی سے بڑا کام لیا ہے وہ خیال بندی کو بے نمک اور گرانبار نہیں ہونے دیتے بلکہ مومن کی طرح اس میں ایک دلچسپ پہلو نکال لیتے ہیں۔

گردشِ چشم ادھر بھی ساقی ... نہ کروں گا سوال ساغر کا

ہو جو منظور ترکِ آرائش ... پہلے توڑ آئینہ سے دل کا

سرو سے عرض کیجیے طول نگار کا ... پھولوں سے کہیے رنگ و پیرہنِ چشمِ یار کا

جس کی آبادی اجاڑی آپ نے ... نام دل تھا اس خراب آباد کا

اب نہیں فرصت گھڑی بھر کا چاک جیب سے ... ہاتھ میرا قبل ایام جنوں بے کار تھا

بیچ دریا میں پہنچ کر کوتہی قسمت نے کی ... بحرِ غم سے پار اتر جاتے تو بیڑا پار تھا

رشک ناسخ کے برخلاف اکثر شگفتہ زمینیں چھوٹی بحریں اور مترنم ردیفیں منتخب کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان کی غزلیں اکثر طویل ہوتی ہیں اور وہ ہر ممکن قافیے کو باندھنا چاہتے ہیں اور اس کوشش میں بھرتی کے شعر لکھنا اور خالصتاً "قافیہ پیمائی اور رعایت لفظی کا مظاہرہ بھی کرنا پڑتا ہے۔ مگر ان کے دیوان کو محض رعایتِ لفظی قرار دینا ناانصافی ہے۔ جہاں

تک روزمرہ کی گفتگو کی زبان اور اس کے رسیلے پن اور لب و لہجے کو شعر میں منتقل کرنے کا سوال ہے اس میں رشک اپنے معاصرین میں دو ایک کے سوا سب سے ممتاز ہیں۔ ہر ایک قافیے کو نبھانے میں بھی وہ الفاظ اور محاوروں کے ہر زاویے کو نمایاں کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً اُن کی ایک غزل کی زمین ہے "تقاضا، اٹوٹا" غیر سارا ٹوٹا اس میں ٹوٹنے کے سلسلے میں تار اٹوٹا سے سے کر

ظلم اس عہد شکن کے جو ہوئے حد سے سوا
ہر کوئی دیکھنے انجام ہمارا ٹوٹا

تک مختلف زاویے سے قافیے باندھے گئے ہیں اسی طرح دلِ شیدا کھینچا کی زمین میں کھینچنے کا لفظ، نقشہ کھینچنے، پھرسا کھینچنے، دامنِ صحرا کھینچنے، قدِ و بالا کھینچنے، سولی پر کھینچنے، تیر کھینچنے، تیغا کھینچنے، تپا کھینچنے، پنکھا کھینچنے، نالا کھینچنے، رنج کھینچنے تک بیے استعمال کیا گیا ہے۔ رشک نے طویل اور مترنم ردیفوں میں غزلیں کہی ہیں۔ جن میں سے بعض مسلسل ہیں۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ رشک کے یہاں استعارے اور تشبیہہ کی لطافت بھی جگہ جگہ پائی جاتی ہے اور یوں بھی وہ کلام میں رنگینی کو ملحوظ رکھتے ہیں ایک جگہ خود لکھا ہے۔

ہے نقص عبارت اے قاصد
نامہ رنگین غزل دے گا

رواں بحروں میں ان کی غزلیں خصوصیت کے ساتھ کامیاب ہیں۔

جو مکافات ہمر عمل دے گا
زُلف کے پیچ سے نکالا نہ گیا
چلا ہے دیکھنے وہ رشک گلشنِ دامنِ صحرا
یہی تحفۂ عدم تو اے دل لا کام لیتا جا

وغیرہ وغیرہ۔

رشک نے جگہ جگہ تاثر پاروں اور حسّی تصویروں سے بڑا کام لیا ہے جن سے اُن کے کلام کی رنگینی میں بڑا اضافہ ہُوا ہے۔ یہ تصویریں محض استعارے یا تشبیہوں سے حاصل نہیں کی گئی ہیں بلکہ کبھی کبھی پورے شعر میں یہ فضا موجود ہے۔ مثلاً:

جن دنوں تک ہم کو تھی بے ہوش فصلِ بہار
روز پھولوں کے قرابوں میں گلاب آیا کیا
یکسر ہیں نگاہ حسرت آگیں
دیکھا کرو دیکھنا ہمارا

یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ تصوف کے مضامین جس قدر بے تکلفی اور آورد کے ساتھ ناسخ اور ان کے اکثر معاصرین کے ہاں نظم ہوتے تھے ان کے برخلاف رشک کے ہاں نہیں ہوتے بلکہ تصوف کے مضامین میں ندرت اور لطافت دونوں موجود ہیں۔ رشک یقیناً صوفی صافی نہیں تھے لیکن ان کا مزاج اس قلندرانہ پن سے زیادہ ہم آہنگ معلوم ہوتا ہے جس کی پرچھائیاں آتش کے ہاں پائی جاتی ہیں۔ اس لیے قناعت، خودداری، بانکپن اور غم کو متاعِ دو جہاں کا سمجھنے کا انداز ان کے ہاں ملتا ہے۔ اس کے علاوہ ندرت ادا اور طرزِ بیان کی رنگینی کی تلاش میں بھی وہ اپنے اکثر معاصرین سے ممتاز ہیں اور انھوں نے بعض نئے خیالات شگفتگی اور جدت ادا کے ساتھ نظم کیے ہیں۔

اے خدا دانستہ کب میں نے کیا کارِ خطا
کام جو میرے نظر میں اسباب آ گیا

———

دیکھا جو چشمِ غور سے دونوں کا حال ایک ہے
گردشِ چشمِ یار کا گردشِ روزگار کا

———

یہی تحفہ عدم کو اے دلِ ناکام لیتا جا
زرِ داغ ساوک گردشِ ایام لیتا جا

— —

ہم اس رات کو سمجھیں گے شبِ ماہِ تمام
اپنے آغوش میں جب تاباں ہو گا
ایک دن کام ہی آجاتا ہے کھوٹا پیسا
داغ سینے کا چراغِ شبِ ہجراں ہوگا

رشک کی زبان دانی عام طور پر تسلیم کی گئی ہے اور ان کی شاعری کا کمال صرف اس قدر سمجھا گیا ہے کہ جناب ناسخ سے بسبب اصلاح تازہ کے جو باتیں رہ گئی تھیں ان کو ناسخ کے شاگردوں نے خصوصاً رشک نے جاری کیا اور جو کچھ کیا ساتھ دلیل کے کیا چنانچہ خود فرماتے ہیں۔

دعوائے بے دلیل نہیں فنِ شعر میں
جو ہے محاورہ وہ نظائر کے ساتھ ہے

(جلوۂ خضر جلد دوم ص ۱۵۰)

اس کے ساتھ اسی تذکرہ نویس نے یہ رائے بھی ظاہر کی ہے کہ لوگ ان کے مذاق کو ناپسند کرتے ہیں۔ مگر تحقیق میں ان کو سرآمد

شاگردانِ ناسخ جانتے ہیں اس سلسلے میں ان کی دو خصوصیات ہیں ایک یہ کہ اُنھوں نے الفاظ کو اس طرح شاعری میں نظم کرنے کا التزام کیا جس طرح وہ فصحائی زبان پر جاری ہیں مثلاً آپ ہی، ساتھ ہی، بانشا یا ترش اور اس بات کا بھی لحاظ رکھا کہ اس کا صحیح تلفظ شعر میں واضح ہو جائے گا۔ مثلاً:

ہم آپ میں آئیں گے تو وہ آئیں گے آپ ہی
دل ہی میں سراغ رُخ دل دار ملے گا

یا

اپنی شیریں دہنی بھی وہ ترش کر دیا ہوتا
چاشنی دار اچار اسے کھلا دیا ہوتا

اُنھوں نے جو محاورے اور الفاظ استعمال کیے ہیں ان کو بے سند اور بے نظیر کے نہیں لیا ہے اور ان کی بول چال کی شکل ملحوظ رکھی ہے اس لیے مولانا محمد حسین آزاد نے بجا طور پر لکھا ہے کہ لکھنؤ کی زبان کے سلسلے میں" اصل واضع ان قوانین کے یہی علی اوسط رشک ... تھے " ان قوانین کی تفصیلات آب حیات (ص ۳۰۴) اور جلوۂ خضر جلد دوم میں دی گئی ہیں۔ یہ قوانین مستند سمجھے گئے اور ان اصلاحات کا سکہ اس قدر رائج ہوا کہ لکھنؤ اسکول کے متاخرین شعراء نے خود ناسخ پر رشک کو ترجیح دی اور ان کے اصول زیادہ مستند سمجھے مثلاً امیر ضامن علی جلال اور امیر مینائی دونوں نے لغت کی تدوین کے سلسلے میں جہاں کہیں ناسخ اور رشک کی نظروں میں اختلاف پایا ہے وہاں اکثر جگہ رشک کی رائے کو تسلیم کیا ہے مثلاً ناسخ نے "بل" مذکر اور مونث دونوں طرح لکھا ہے رشک نے صرف مونث قرار دیا ہے اور جلال نے اس کی پیروی کی ہے۔ جلال نے تو اپنی لغت رشک کی لغت کو سامنے رکھ کر لکھی۔ امیر مینائی ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"مسالا ... میری رائے ہے کہ اُردو میں جو بولیں وہی لکھیں۔ جس طرح مسالہ بولتے ہیں اسی طرح لکھا بھی جائے اور یہی مشرب متوسطین و متاخرین شعرائے لکھنؤ کا ہے۔ جیسا کہ جناب رشک نے اپنی لغت میں لکھا ہے ...."

(مکاتیب امیر مینائی مکتوب بنام مولوی نور الحسن)

رشک کا دیوان گویا اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ مستند الفاظ اور محاوروں کو صحیح محل استعمال پر صرف کیا گیا ہے۔ جس کی تفصیل مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں صغیر بلگرامی نے تذکرہ جلوۂ خضر جلد دوم میں اور جناب نشتر نے " رشک مرحوم اور زبان کی اصلاح " کے عنوان سے اپنے مقالے مطبوعہ رسالہ ادیب اودھ یکم ستمبر ۱۹۲۱ء میں نہایت شرح و بسط کے ساتھ دی ہیں۔

رشک کی تصانیف میں غزلیات کے تین دواوین کے علاوہ اور کوئی شعری تصنیف مشہور نہیں ہوئی۔ تیسرے دیوان سے انتخاب کر کے چند اشعار رسالہ "سخنور" لکھنؤ مرتبہ عبدالباری آسی۔ اس کے پہلے شمارے بابت جنوری ۱۹۳۴ء میں شائع

پا گیا ہے ۔ اور مصنف کا بیان ہے کہ یہ دیوان جناب محمد قاسم صاحب وکیل کے کتب خانے میں ہے ۔ ۲۰/۲۶ تقطیع اور کاغذ پر لکھا ہوا ، ۲۷ ۱صفحات کا دیوان ہے ۔ ان دواوین میں چند رباعیات ، قطعات تاریخ اور مخمسوں کے علاوہ سب غزلیں ہیں ۔

البتہ ان کے قطعات تاریخ سے اس دور کے بعض حالات ، بعض مشاہیر کی تاریخ ہائے وفات اور خود ان کی زندگی کے سوانح پر روشنی پڑتی ہے مثلاً انھوں نے اپنے والد میر سلیمان کے انتقال کی تاریخ کہی جو ۱۲۱۹ھ میں ہوا تھا ۔ اسی طرح ۱۲۲۰ھ میں اپنی بہن کے انتقال کی تاریخ کہی جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت وہ شاعری کرتے تھے اور کم سے کم عنفوانِ شباب میں تھے جس سے ان کی عمر تاریخ پیدائش ۱۲۰۰ھ کے لگ بھگ قرار پائی ہے ۔ ان کے انتقال کی تاریخ مسلّمہ طور پر ۱۲۸۴ھ مانی جاتی ہے ۔ اس طرح ان کی عمر ۸۴ کے قریب ہوئی حالانکہ خم خانہ جاوید اور گلِ رعنا میں ۷۰ قرار دی گئی ہے یہ بھی قطعات تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو چچی یا پھوپھی نے نہایت لاڈ سے پالا تھا ۱۲۳۸ھ ۔ یہ کانپور تھے جب ناسخ وہاں پہنچے تھے ۔ یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ۱۲۴۵ھ میں ناسخ کانپور گئے تھے وہاں ایک کلوار کے لڑکے کے قتل کا واقعہ انھیں لکھ بھیجا تھا اور انھوں نے اس کی تاریخ کہی تھی ۔

دواوین کے علاوہ رشک کی نفس اللغتہ اُردو لغت نویسی کی ابتدائی کوششوں میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے یہ ۱۲۵۶ھ میں مرتب ہوئی جس کا ثبوت اس کے تاریخی نام سے ملتا ہے ۔ نفس اللغتہ اُردو کی پہلی باقاعدہ لغت ہے جس کی پیروی میں متعدد لغات تصنیف ہوئے اور جس نے اُردو میں لغت نویسی کا دروازہ کھول دیا ۔ نفس اللغتہ میں رشک نے فارسی مفردات کو جگہ نہیں دی ہے کہ :

" طالب اُردو کو فارسی میں مل جائے گا ۔ " (دیباچہ امیر اللغات ص ۷)

اور اس طرح اپنی لغت کو محض مرکبات اُردو کے محاورات اور امثال کے لیے وقف کر دیا ہے ۔ رشک کا لغت فارسی میں ہے چونکہ ان کے سامنے اُردو میں لغت نویسی کا کوئی نمونہ نہ تھا ۔ انھیں اپنی یادداشت پر بھروسہ کرنا پڑا ۔ اُن کا مقصد دراصل زبان اور قواعد کی وہ تراش خراش پیش کرنا تھا جو ناسخ کے دور میں منضبط ہوئی ۔ جگہ جگہ ضروری قواعد اور اصول بھی بیان کرتے جاتے ہیں ۔ ہر چند یہ لغت غلطیوں سے پاک نہیں ہے مگر پہلی کوشش ہونے کی بنا پر اسے " اُردو لغت کا بنیادی پتھر " کہا جا سکتا ہے ۔ اس میں الفاظ ، محاورات اور روز مرہ کی بہت سے جمع کہاوتیں ، ضرب الامثال ، اور عام طور پر بولے جانے والے فقرے نظائر اور صحیح محلِ استعمال کے ساتھ پیش کیے گئے ہیں ۔ لفظ کے صحیح تلفظ پر اس تلفظ کو ترجیح دی گئی ہے جو فصحا میں رائج ہے ۔ تذکیر و تانیث کے اصول بھی واضح طور پر متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور استنا د کو دور کر دیا گیا ہے ۔ متروکات کی بھی ضابطہ بندی کی گئی ہے ۔ اور حقیقت یہ ہے کہ رشک زبان دانی کے اس نظام کے مصنف اور مرتب ہیں جس نے لکھنو کی زبان کی شیرازہ بندی کی اور اسے دہلی کی زبان سے مختلف اور منفرد قرار دیا ۔

رشک کی تصانیف کے ضمن میں تانیث و تذکیر حروفِ تہجی کے باب میں ان کے مضمون کا بھی ذکر ضروری ہے جو ان

طرف امیر مینائی نے اپنے شاگرد نعیم الحق آزاد شیخ پوری کے نام اپنے ایک مکتوب میں اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"رشک مرحوم نے کسی کتاب میں تانیث و تذکیر حروفِ تہجی کا تذکرہ کیا ہے اس کتاب کا نام و نشان ضرور لکھ دیں اور اگر آپ کے پاس ہو تو چند روز کے لیے مستعار مجھے بھیجیے۔" (مکاتیب صفحہ ۲۹۹)

نہ نہیں کہ یہ اشارہ رشک کے کس رسالے کی طرف ہے یا ان کی لغت کے کس حوالے کی طرف۔

بہرحال رشک کی شاعری اور ان کی لغت نویسی دونوں کی حیثیتیں تاریخی ہیں۔ وہ گویا عہدِ نو اور عہدِ قدیم کی درمیانی کڑی ہیں۔ شاعری کو ادا بندی، سادگی اور شعریت سے قریب لانے زبان دانی کی داغ بیل ڈالنے اور تراش خراش کرنے میں انھوں نے بڑی خدمت انجام دی۔

ناسخ کے شاگردوں میں دوسرا اہم نام خواجہ وزیر کا ہے ان کا سلسلہ نسب خواجہ بہاؤ الدین نقشبند تک پہنچتا ہے ان کے والد کا نام خواجہ محمد فقیر تھا۔ صاحب تذکرہ نادر نے خواجہ وجیہ اللہ لکھا ہے۔ لکھنؤ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۷۰ھ ۱۸۵۲ء میں انتقال کیا۔ علم معانی و بیان قافیہ علم وغیرہ میں مہارت رکھتے تھے۔ ناسخ کے شاگردوں میں یہ سعادت رشک اور وزیر ہی کو حاصل ہے کہ اُستاد نے جیتے جی اپنے بعض شاگردوں کو ان سے رجوع کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

وزیر کا دیوان ان کی وفات کے بعد ۱۲۰۲ھ میں مرتب ہُوا اور ہادی علی اور سید محسن علی شاگردانِ خواجہ وزیر کی کوششوں سے اس کی طباعت ہوئی۔ اس کے بارے میں مرتبین نے دیباچے میں یہ اعتراف کیا ہے کہ خواجہ وزیر کی نظر سے ان کا کلام گزر چکا تھا:

"بے تکلف ارشاد فرماتے تھے کہ کلام سابق بالکل ناپسند طبیعت ہے۔ ابتدائے عشق کے شعروں سے مجھے نفرت ہے اگر مکاہ زمانے فرصت دی۔ عوارض لاحقہ سے مہلت ہوئی تو دوبینے کی توجہ میں جیسا جی چاہتا ہے بہت کچھ موزوں ہو جائے گا۔"

مگر اس کی نوبت نہیں آئی۔

خواجہ وزیر کے کلام کے بارے میں صاحب جلوۂ خضر نے لکھا ہے کہ انھوں نے شوکت بخاری کے طرز کو انتخاباً کیا تھا۔ اور لفظ سے مضمون پیدا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی طبیعت دار، بلند خیال اور نازک طبع ہونے کا اعتراف کیا ہے کہ ان کے طرزِ خوش نما کی تقلید ایک زمانے کی مگر اس کے ساتھ ساتھ یہ خراجِ عقیدت بھی پیش کیا گیا ہے کہ ایہام کو حسن کے ساتھ صرف دو ہی شاعروں نے برتا۔ ناسخ کے شاگردوں میں وزیر نے اور آتش کے شاگردوں میں صبا نے نسیم نے۔ حقیقت یہ ہے کہ وزیر نے واقعتاً ناسخ کی ڈگر سے ہٹنے کی کوشش نہیں کی۔ اور آج ان کی کلیات کے پڑھنے والے کو ایہام کے حسن کا دور دور پتہ نہیں چلتا جس کے لیے انھیں خراج پیش کیا گیا ہے۔

خواجہ وزیر کا کلام رعایت لفظی اور صناعی کا نمونہ ہے۔ وہ ناسخ کے سچے شاگرد ہیں اور اپنے استاد کی طرح مضمون

نے اس کیفیت کو حتی الامکان برقرار رکھا ہے اس لیے ان کے کلام کی نمایاں خصوصیت ان کی غزلوں کی طوالت اور ہر قافیہ کو برتنے کا التزام ہے۔ یہاں رشک کی طرح نہ چھوٹی بحروں کا پتہ ہے نہ مترنم ردیفوں کا نہ صفائے گفتگو اور ادا بندی کا نہ گھلاوٹ اور سادگی۔ اس کے بجائے وزیر کے یہاں نازک خیالی اور خیال بندی کی بے کیف شکلیں اکثر ملیں گی۔ اس نازک خیالی کے شوق نے انھیں بیدل کی طرف متوجہ کیا ہوگا۔

وزیر اب بیٹھے ہیں دل کے عوض سب درد رہتا ہے
کہ رویا کرتے ہو پڑھ پڑھ کے تم دیوان بیدل کا

اس نازک خیالی نے وزیر کے ہاں تقریباً وہ تمام شکلیں اختیار کیں۔ جو ناسخ کے کلام میں ملتی ہیں۔ کہیں کہیں ابتذال بھی موجود ہے۔ وارداتِ حسن و عشق کے بجائے صناعی اور غیر حقیقی حسن کا تصور عام طور پر موجود ہے۔ محبوب کا تصور عامیانہ اور مبتذل ہے۔ لیکن اس کے باوجود متانت اور سنجیدگی کے اعتبار سے ناسخ اور ان کے عام مقلدوں کے مقابلے میں وزیر کا کلام زیادہ متعین اور متوازن ہے۔ اس لیے مصنف گل رعنا کی یہ رائے کس قدر قابلِ قبول ہے۔ کہ

"اہلِ لکھنؤ کا دار و مدار مضمون کی بندی، خیال کی نزاکت اور زبان کی صحت پر ہوا کرتا ہے . . . . ."

پہلی دو باتوں میں خواجہ وزیر اور زبان کی صحت میں میر صاحب کو (رند) نہیں پہنچتے۔ مگر رند کے ہاں سادگی اور صفائی اور تاثیر کا ہلکا سا رنگ پایا جاتا ہے۔ جس سے خواجہ وزیر محروم ہیں۔ چوں کہ وزیر نے ناسخ کے طرز کی پیروی کرتے ہوئے ان کی شاعری کے ابتذال کو کم کر دیا اور اس میں ایک متانت پیدا کر دی اور صناعی اور رعایتِ لفظی کو برقرار رکھا اس لیے اس دور میں جو آج وزیر کی شاعری کو زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی۔ خود خواجہ وزیر اپنے کلام کو ناپسند کرنے لگے تھے اور کہتے تھے کہ اس سے بہتر کلام میں دیکھنے کی مدت میں جمع کر سکتا ہوں۔ صاحب خوش معرکہ زیبا کا بیان ہے کہ

"ایک دن اتفاق یہ بندہ ہمراہ لالہ فتح چند کے ان کے دولت خانہ پر گیا۔ برسبیلِ ذکر فرمانے لگے کہ اکثر مجھے شیخ صاحب (ناسخ) سے بہتر اور بعضے برابر جانتے ہیں۔ میرا دیوان جو دلی میں گیا وہاں کے صاحب تمیزوں نے شیخ کے دیوان کو دھوکا ڈالا سبحان اللہ کیا نفسانیت ہے کہ اپنی نمود کے واسطے استاد کو ٹالتے ہیں اور ایسے سخن زبان پر لاتے ہیں۔"

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ خود وزیر کو اپنے کارنامے کا احساس تھا۔ بعد کے تذکرہ نویسوں اور ادبی مؤرخوں نے بھی جہاں ان کی بندشوں کی چستی، صحتِ زبان، متانت اور رعایتِ لفظی کے حسن کو سراہا ہے وہاں ان کے مرتبہ کے تعین میں غلو سے کام لیا ہے اور بعض نے انھیں رشک سے بھی بڑھا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وزیر کا کلام سادگی اور تاثیر سے بہت کچھ عاری ہے اور اس میں شعریت کے بجائے صناعی کے جوہر دکھائے گئے ہیں البتہ بعض شعر کامیاب ہیں اور ضرب المثل

کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں مثلاً:

چلا ہے او دل راحت طلب کیا شاد ماں ہو کر
زمیں کوئے جاناں دے گی آسماں ہو کر
اسی باعث تو قتل عاشقاں سے منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہو کر
ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو
کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کر لو تیر کو

خواجہ وزیر کے شاگردوں میں قلق اور گویا تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ خواجہ وزیر کا تمام کلام غزلیات پر مشتمل ہے البتہ انھوں نے بعض رباعیاں، قطعات، تاریخ اور بعض ترجیع بند کہے ہیں ان میں سے ایک ترجیع بند غالباً واجد علی شاہ کے غسل صحت کے موقع پر کہا گیا ہے۔

ہوا ہے اب کے یہ فیض مسیح باد بہار
چمن میں دیدۂ نرگس تلک نہیں بیمار

اس میں مدح کا جوش نہیں مگر مضمون آفرینی کی چند کامیاب کوششیں البتہ موجود ہیں۔

سلسلۂ ناسخ کے ایک اور اہم رکن فتح الدولہ بخشی الملک مرزا محمد رضا خاں برق (وفات ۱۲۷۳ھ / ۱۸۵۷ء) ہیں جو مرزا محمد کاظم بسالت جنگ کے صاحبزادے تھے اور واجد علی شاہ کے در دولت سے نہ صرف منسلک تھے اور ان کے خاص رفیق تھے بلکہ ان سے والہانہ عقیدت اور شیفتگی رکھتے تھے۔ انتزاع سلطنت کے بعد واجد علی شاہ کے ساتھ مٹیابرج چلے گئے اور وہیں انتقال ہوا۔ ان کی ایک اور تاریخی خصوصیت یہ ہے کہ لکھنؤ کے اور آخر کے شعرا میں سے اکثر برق کے شاگرد ہیں۔ جن میں خصوصیت کے ساتھ سحر، جلال اور ان کے شاگرد رشک کے سلسلے میں محسن کاکوروی قابل ذکر ہیں۔

ان کے نتائج فکر میں دیوان غزلیات کے علاوہ واسوخت اور مسدس شہر آشوب ہے۔ غزلیات کا عام رنگ وہی ہے جو اس دور کے لکھنؤ میں مروج تھا۔ البتہ ان کے یہاں شعر بہت صاف ہیں اور ان میں لطافت اور تاثیر موجود ہے۔ ادا بندی کے اشعار بھی کافی ملتے ہیں صاحب گل رعنا نے ان کے تذکرے میں لکھا ہے۔

"اس زمانے میں رنگ ہی کچھ اور تھا۔ لفظی رعایتیں ضلع جگت کی حد تک پہنچ گئی تھیں۔ نئی نئی تشبیہوں اور پیچیدہ استعاروں کا ہر شخص دلدادہ ہو رہا تھا۔ شاعری اپنے بلند مرتبے سے گر کر اِنگیا چوٹی میں پھنس گئی تھی۔ یہ باتیں اس زمانے میں عیب نہیں تھیں بلکہ طرۂ افتخار سمجھی جاتی تھیں"

خود برق کی زبان سے اس کی حقیقت سنیے:

راجہ اندر کا اکھاڑا صحبت قدس ہے برق
نام رکھا ہے پرستاں بزم عشرت گاہ کا

اس دور کے مذاق پر یہ تنقید بڑی حد تک درست ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ برق کے کلام میں بہت سے صاف اور شستہ اشعار ملتے ہیں جن میں برجستگی اور بے ساختگی موجود ہے مثلاً

اذان دی کہ ناقوس دہر میں پھونکا
کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

قیس کا نام نہ لو ذکر جنوں جانے دو
دیکھ لینا مجھے تم موسم گل آنے دو

لیکن غزلوں میں یہ رنگ نمایاں نہیں ہوا ہے اور وہ رعایت لفظی تصنع اور ابتذال کا شکار ہو گئی ہیں مگر ان کے واسوخت، مسدس اور شہر آشوب میں سادگی اور برجستگی بہت نمایاں ہے۔ اس شہر آشوب میں جسے صاحب تذکرہ جلوۂ خضر نے تفصیل کے ساتھ نقل کیا ہے۔ لکھنؤ کی تباہی کا نقشہ بڑی خوبصورتی اور دلسوزی کے ساتھ کھینچا گیا ہے۔ اس میں واقعیت اور خارجی منظر کشی کا پورا حسن موجود ہے۔ باغ میں لکھنؤ والوں کی رنگ رلیاں، مہ جبینوں کا ریشم کا جھولے ڈالنا، پتنگیں بڑھانا، تمامی کا لہنگا پہنے کہاریوں کا اکڑ اکڑ کر چلنا اور انعام کے لیے سواریوں سے جھگڑنا، ہولی کے رنگ سوانگ ابلیس کا منظر موتیوں کی مالا، جوگنوں کا بھیس بنانے، مہ جبینوں کا سوانگ بنانا، نور کی گھڑیاں تیار ہونا، ارگن کی صدائیں، نوچندی اور جہلم کے ہنگامے، کربلا کی فضا، درگاہ میں زیارت کے بہانے نظر بازیاں، اور نمائش بینی، غرض اس دور کے لکھنؤ کا ایک جیتا جاگتا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے۔ جس کا مرقع بعد کو سرشار نے فسانۂ آزاد میں پیش کیا۔ شاعری میں واسوخت اور شہر آشوب کی وجہ سے برق کا نام باقی رہے گا۔

مرزا حاتم علی مہر (تاریخی نام خورشید علی) (وفات ۱۸۷۹ء) بھی ناسخ کے ممتاز شاگردوں میں تھے لیکن ان کی شہرت غالب کے مکتوب الیہ ہونے کی بنا پر زیادہ ہے ورنہ اس اعتبار سے وہ یقیناً توجہ کے مستحق ہیں کہ اپنے ہم عصروں میں انھوں نے مختلف اصناف میں سب سے زیادہ طبع آزمائی کی ہے اور وکالت اور آنریری مجسٹریٹی کی وجہ سے وہ اس نئے نظام سے زیادہ قریب تھے جو انگریزوں کے زیر اہتمام قائم ہو رہا تھا۔ تعجب ہے کہ ان کے انداز کلام پر اس نئے ذوق کا زیادہ اثر نہیں پڑا۔ اور ناسخیت کا رنگ ان کی تمام تصانیف پر نمایاں ہے۔ غالب نے اپنے ایک خط میں ان کے جامع کمالات ہونے پر داد و تحسین کا اظہار کیا ہے۔ ان کی تصانیف میں دیوان اردو موسومہ بہ "الماس درخشاں" کے علاوہ مثنوی داغ نگار، مثنوی شعاع مہر، واسوخت، دلِ مہر اور بعض متفرق نظمیں شامل ہیں۔ اس کے علاوہ صاحب تذکرہ آب بقا نے پیرایۂ عروض، باغ فرنگستان، ذات انتقام و ملیات، حریم آخرت، بیان بخشائش، قیصریہ، پنجۂ مہر اور تو قیر شرف وغیرہ کا ذکر کیا ہے اور ان کے مراثی کو بھی سراہا ہے۔ مثنوی شعاع مہر جو ۱۲۷۵ھ میں چھپی تھی۔ غالب نے تقریظ لکھی۔ اس میں نگار بیگم زوجہ مسعود سوداگر پر سلطان محمود کا عاشق

ہوا نظم کیا ہے۔ مثنوی داغِ نگار کے بارے میں مشہور ہے کہ پورا قصہ ایک دن میں نظم کیا تھا۔ مہر کے کلام کا عام رنگ ناسخی ہے حتیٰ کہ وہ مثنوی اور واسوخت میں بھی نازک خیالی اور بلند پروازی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور رعایتِ لفظی اور شوکتِ تخیل کو برقرار رکھتے ہیں۔ فارسی کے الفاظ اور تراکیب بھی کثرت سے استعمال ہوئی ہیں۔ سنگلاخ زمینوں کی بھی کثرت ہے۔ کہیں کہیں روزمرہ اور محاورے کے بے ساختہ استعمال نے شعر میں حسن پیدا کر دیا ہے۔ دراصل حاتم علی مہر کا درجہ ناسخی رنگ کے فروغ دینے والوں میں اہم ہے اور ان کی قادر الکلامی اور سخنوری میں شبہ نہیں۔ مگر ان کے ہاں شعریت اور تاثیر تصنع کی بنا پر نمایاں نہ ہو سکیں اور وہ لکھنوی رنگ کی بے جا تقلید کے شکار ہو کر رہ گئے۔ مثنوی اور واسوخت بھی اسی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

———

مصر کا ایک نامور مصنّف — احمد امین

(تأثرات)

ڈاکٹر مختار الدّین احمد آرزو

مصر کے مشہور فاضل اور عربی زبان کے ممتاز مصنف احمد امین سے میری ملاقات قاہرہ میں ۱۹۵۳ء کے اواخر میں ہوئی۔ جدید عربی ادب کے مطالعہ کے لیے روکیفیلر فونڈیشن نے مجھے ایک سال کے لیے فیلوشپ تفویض کی تھی جس کے مقاصد میں شرق اوسط کے سارے اہم مقامات میں میرا قیام اور وہاں کے ممتاز علماء اور ادیبوں سے ملاقات شامل تھی۔ میں بغداد، دمشق، بیروت ہوتا ہوا اور وہاں کے ادیبوں اور شاعروں سے ملتا ہوا قاہرہ پہنچا تھا۔ فونڈیشن کے شرق اوسط کے مسائل کے ماہر نے جن لوگوں سے مجھے وہاں ملنے کا مشورہ دیا تھا ان میں ڈاکٹر طٰہٰ حسین اور احمد امین کے نام سر فہرست تھے۔

احمد امین کا نام میں نے ۱۹۴۳ء میں علی گڑھ آکر سنا۔ ان کی تحریرات و تصنیفات کے دیکھنے کا موقع تو بعد کو ملا۔ اس وقت تو صرف اس حیثیت سے ان سے متعارف ہوا کہ وہ لجنۃ التالیف والترجمہ کے صدر ہیں اور میرے دو اساتذہ الاستاذ عبدالعزیز المیمنی اور مولانا بدرالدین العلوی کے دوستوں میں ہیں۔ الاستاذ المیمنی کی تصانیف سمط اللآلی اور الطرائف الادبیہ اور مولانا بدرالدین کی کتاب المختار من شعر بشار اور بعد میں دیوان شعر ابنے ودوید انھی نے شائع کی تھیں۔ احمد امین سے خط کتابت کا سلسلہ چھ سات سال کے بعد شروع ہوا۔ جب میں ایم اے (عربی) کی تیاری کر رہا تھا اور سلطان صلاح الدین ایوبی کے معاصر اور چھٹی صدی ہجری کے ایک بہادر مجاہد اور ادیب و مصنف اسامہ بن منقذ الشیزری کی زندگی اور تصانیف پر ایک مقالہ لکھ رہا تھا۔ صدر الدین علی بن ابی الفرج البصری کی الحماسۃ البصریہ ہو (جس پر میں علی گڑھ میں ڈاکٹریٹ کے لیے کام کر رہا تھا) یا اوکسفرڈ کے دوران قیام کا کوئی علمی منصوبہ احمد امین نے ہمیشہ دلچسپی لی اور مفید مشورے دیے۔ ان سے خط و کتابت کا سلسلہ ان کی وفات کے چند ہفتے پہلے تک قائم رہا۔

جہاز جب قاہرہ پہنچا تو آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ شاہ فاروق، مصری تاج و تخت کی صعوبتوں سے دستبردار ہو کر اطالوی حسیناؤں کے کنارے آرام کر رہے تھے۔ نجیب (جنھیں عام مصری نگیب کہتے ہیں) زمام حکومت و قیادت سنبھالے ہوئے تھے اور ملک کی سیاسی اور اقتصادی بدحالی دور کرنے میں مصروف تھے۔ انگریز اب بھی اپنا لڑکھڑاتا ہوا اقتدار قائم رکھنے کی سعی لاحاصل کر رہے تھے۔

انھی دنوں کچھ مصریوں اور غیر ملکیوں کی انقلاب کی سازش پکڑی گئی تھی اور ملزموں کے لیے سزائے موت تجویز ہوئی تھی۔ مصر کے عربی اخبارات اس واقعہ کی تفصیلات سے بھرے ہوئے تھے۔ باہر سے آنے جانے والوں پر کڑی نظر تھی، اس کا احساس مجھے مطار (ہوائی اڈے) پہ اترتے ہی ہوگیا۔ بہت دیر کے بعد میری پاسپورٹ اور سامان دکھانے کی باری آئی۔ پاسپورٹ آفیسر شکستہ انگریزی، فرانسیسی لہجے میں بول رہا تھا جب انھوں نے پوچھا تم کہاں سے آرہے ہو تو میں نے انگریزی کے بجائے اس کی زبان میں جواب دیا اور بتایا کہ میں جامعہ اسلامیہ علی گڈھ سے آرہا ہوں تو ایک معمر اور باوقار آفیسر مسکراتے ہوئے آگے بڑھے اور بولے کیا تم الاستاذ المیمنی کی یونیورسٹی سے آئے ہو۔ میں نے جواب اثبات میں

دیا اور بتایا کہ میں ان کا شاگرد ہوں اور عربی ادب پر تحقیقی کام کے لیے اوکسفورڈ جا رہا ہوں اور یہاں مصر کے علماء سے ملنے اور اپنے موضوع کے متعلق معلومات فراہم کرنے آیا ہوں تو پاسپورٹ اور کسٹم کے سارے مرحلے لمحوں میں طے ہو گئے گویا انھیں اس بات کا یقین تھا کہ پروفیسر عبدالعزیز میمن کا شاگرد اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا طالب علم مصر کے علماء اور دانشوروں سے ملے گا، مخطوطات پڑھے گا، دارالکتب المصریہ جائے گا، اہم کتابوں کے فوٹو اسٹیٹس اور مائکروفلم بنوائے گا، ادیبوں اور شاعروں سے ملاقات کرے گا، قہوہ خانے جائے گا، ام کلثوم اور عبدالوہاب کے نغمے سنے گا، شادیہ اور فرید الاطرش کے فلم دیکھے گا، دریائے نیل اور اہرام مصر کی سیر کرے گا ——— لیکن نہ تو مصر میں جاسوسی کرے گا اور نہ یہاں کی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لے گا۔ معمر آفیسر بار بار اھلاً وسھلاً و مرحبا کہہ رہے تھے اور استاذ المیمنی کا ذکر کرتے جاتے تھے۔ وہ اس وقت تک باتیں کرتے رہے اور قہوہ پلاتے رہے جب تک برٹش ایرویز کی بس ہوائی اڈے سے مسافروں کو شہر لے جانے کے لیے روانہ نہ ہو گئی۔

——— O ———

قاہرہ آنے کی اطلاع میں نے احمد امین کو علی گڑھ ہی سے دے دی تھی وہاں پہنچ کر بہت جلد ان سے ملاقات کا وقت بھی طے ہو گیا۔ میری پہلی ملاقات ان کے دفتر کے ایک کمرے میں ہوئی۔ ایک لمبی میز پر کتابوں اور کاغذات کا انبار تھا، کسی زیر طبع کتاب کے کچھ فرمے پروف ابھی دیکھے تھے اور میز کے پیچھے دراز قد مضبوط جسم کے ایک شخص عینک لگائے اور ترکی ٹوپی پہنے بیٹھے تھے ان کی آنکھوں میں حزن تھا لیکن لبوں پر مسکراہٹ طاری تھی۔ یہ احمد امین تھے جو مجھے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور مسکرائے۔ خوش آمدید کہا۔ انھوں نے قہوہ منگوانے کے لیے آدمی کو آواز دی اور فوراً ہی اس بے تکلفی سے باتیں کرنے لگے، جیسا میں ان کا قدیمی رفیق یا پرانا شاگرد ہوں۔ گفتگو کی ابتدا استاذ گرامی میمن صاحب کی خیریت جوئی سے ہوئی، جب میں نے انہیں بتایا کہ وہ ساٹھ سال سے زیادہ کے ہو چکے ہیں اور اب متقاعد ہو کر علی گڑھ چھوڑ کر کراچی چلے گئے ہیں تو ان کے چہرے پر افسوس اور تشویش کے آثار ظاہر ہوئے لیکن جب میں نے انہیں بتایا کہ استاد محترم وہاں کی جامعۂ کراچی کے قسم عربی کے صدر اور ایک ادارۂ تحقیقات کے نگراں مقرر ہوئے ہیں تو ان کی سابقہ بشاشت چہرے پر عود کر آئی۔ وہ قاہرہ میں استاذ کے ساتھ گزری ہوئی صحبتوں کو یاد کرنے لگے اور ان کے وسیع مطالعہ اور اعلیٰ قوت حافظہ کی متعدد مثالیں انھوں نے سنائیں۔ جب میں نے بتایا کہ مشرق اوسط کا دورہ ختم کر کے اوکسفرڈ پروفیسر ب کی نگرانی میں کام کرنے جا رہا ہوں تو بولے گب بہت ذہین آدمی ہیں اور مسائل کا استقرا خوب کرتے ہیں وہ جب عربی بولتے ہیں تو تکلف کا احساس ہوتا ہے، وہ عربی عبارت اگرچہ رک رک کر اور یورپی لہجہ میں عربی پڑھتے ہیں لیکن ان عبارتوں سے جس طرح وہ نتیجہ نکالتے ہیں اور جس خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں وہ ہم مصریوں کو بھی بہت کم نصیب ہے۔ کچھ رک کر اور قہوہ کا ایک گھونٹ لے کر وہ بولے ا میں نے محسوس کیا کہ عمر کی زیادتی یا کسی علالت کے باعث ان کے ہاتھ میں ارتعاش ہے، میں یورپ کے علماء میں نلینو اور گولڈزیہر سے بے پناہ طور پر متاثر ہوں۔ نلینو کی کتاب علم الفلک والی اسے زندہ رکھنے کو کافی ہے لیکن میں اس کے ان خطبات کو بہت اہمیت دیتا ہوں جو اس نے قاہرہ میں تاریخ ادب عربی پر دیے ہیں۔ ان خطبات نے تحقیق کی پیچیدہ راہوں کے کئی ایک تاریک گوشے منور کیے ہیں اور جریدی! جریدی خدا کی قسم بہت بڑا عالم ہے اس کی نحو پر بھی بڑی گہری نظر ہے اور عربی تو وہ قدیم عربوں کی طرح لکھنے پر قادر ہے۔

اپنے اساتذہ کے ذکر پر انہوں نے محمد عبدہ کا خاص طور پر نام لیا۔ انہوں نے شیخ الخضری، شیخ محمد مہدی اور شیخ علی فوزی کا بھی ذکر کیا۔ علی فوزی کے ذکر پر ان کی آنکھیں نمناک ہو گئیں اور انہیں بہت سی بھولی بسری باتیں یاد آنے لگیں اور وہ اس زمانہ کا حال سنانے لگے جب

وہ استفادہ کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ کہنے لگے شیخ عبدالحکیم بن محمد اور عاطف بک میرے دوست اور رفیق تھے عبدالحکیم مجھ سے عمر میں بڑے تھے اور مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح سمجھتے تھے اور عاطف بک کے ساتھ پتا نہیں کتنی صبحیں اور شامیں میں نے ایک ساتھ گزاری ہیں میری شخصیت کی تعمیر میں ان لوگوں کا بڑا حصہ ہے۔

یہ صحبت ابھی جاری رہتی کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہ ادھر متوجہ ہوئے اسی کے ساتھ میں نے دیکھا کمرے میں دو صاحب داخل ہوئے جو بعد میں معلوم ہوا قاہرہ یونیورسٹی کے اساتذہ میں تھے اور ان کے قدیم رفیقوں میں۔ میں اجازت لے کر رخصت ہوگیا۔ اور یہ پُرلطف صحبت ختم ہوگئی۔

———○———

احمد امین سے دوسری ملاقات کئی دن کے بعد ان کے گھر پر ہوئی ان کی آنکھوں کا عارضہ اور بڑھ گیا تھا اور وہ افسردہ نظر آتے میں ان سے کہہ رہا تھا کہ ان کی کن کن تصانیف کی شہرت دور دور تک پہنچی ہوئی ہے اور انقطاع عالم کے لوگ ان سے مستفید ہو رہے ہیں، لیکن وہ ان کتابوں کے ماتم گزار تھے جنھیں وہ لکھنا چاہتے تھے لیکن اب تک لکھ نہ سکے تھے۔ کہتے تھے بہت سے موضوعات زمانہ سے سوچ رکھے ہیں کچھ تصنیف کے بطائق و کارڈ بھی تیار ہیں اور مواد موجود ہے لیکن فرصت نہیں ملتی۔ وہ مصری رسالوں اور اخباروں کے ایڈیٹروں اور مالکوں کے شکر گزار نظر آتے تھے جن کی بدولت انھیں سینکڑوں مضامین لکھنے کے مواقع فراہم ہوئے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ انتظامی ذمہ داریوں کی مصروفیات کے شکوہ سنج تھے جن کی وجہ سے وہ علمی دنیا سے وقتاً فوقتاً کنارہ کش ہو جاتے تھے۔ جامعۂ قاہرہ کے کلیۃ الآداب کی عمادت (پرنسپلی) کے دو تین سال کے زمانہ کو وہ اپنا عقیم (بانجھ) زمانہ بتاتے ہیں جب وہ تالیف و تصنیف کی طرف بہت کم توجہ دے سکے۔ ان کا تقریباً سارا وقت بقول ان کے لایعنی مسائل، کالج کے انتظامات کرنے، طلبا کی شکایات سننے، اساتذہ کی مشکلات دور کرنے اور دوسرے امور میں صرف ہوتا رہا۔

میں نے ان سے پوچھا آپ کو اپنی تصنیفات میں کونسی کتاب سب سے زیادہ پسند ہے۔ میں نے سمجھا وہ اس کا وہی روایتی جواب دیں گے کہ میری سب تصانیف میرے جگر کے ٹکڑے ہیں، میں کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح کس طرح دوں لیکن وہ خاموش رہے پھر مسکرائے اور بولے تم بتاؤ تمھیں میری کونسی کتاب پسند آئی ویسے میں نے سب سے زیادہ محنت فجر الاسلام والے سلسلۂ تصانیف پر کی ہے۔ میں نے کہا ان کی اہمیت اپنی جگہ پر مسلّم ہے لیکن میں نے تو آپ کو بہ حیثیت انشاء پرداز کے زیادہ پڑھا ہے اور پہچانا ہے۔ مجھے آپ کے بعض مضامین، آپ کی خود نوشت سوانح زندگی اور وہ مکاتیب زیادہ پسند ہیں جو آپ نے اپنے صاحبزادے کے نام سپردِ قلم کیے ہیں۔

کچھ اور باتوں کے بعد میں نے ان سے دریافت کیا کہ آپ کے لکھنے پڑھنے کے اوقات کیا ہیں بولے میں وقت کی سختی سے پابندی کرتا ہوں اور چاہتا ہوں سارے کام اپنے وقت پر ہوں۔ میں یہی پابندی اپنے عزیزوں، شاگردوں اور اپنے دفتر کے لوگوں سے چاہتا ہوں اور پھر مسکرا کر بولے، یہیں سے ان کا مجھ سے اختلاف شروع ہوتا ہے لیکن خیر یہ تو معاملہ ہی کچھ اور ہے اور نیک و بد کی توفیق خدا کے ہاتھ میں ہے۔ میں صبح کی چائے کے بعد لنچ کے وقت تک تحریری کام کرتا ہوں اور تالیف و تصنیف میں لگا رہتا ہوں کھانے کے بعد دن میں سوتا ضرور ہوں سونے کے بعد ہی شام کے کام کے لیے میرا جسم اور دماغ تازہ دم ہوتا ہے۔ دن کو سونا اگرچہ تھوڑی ہی دیر کے لیے ہو لیکن میرے لیے بہت ضروری ہے۔

میں نے ان سے کہا میری علی گڑھ یونیورسٹی کے ایک سابق وائس چانسلر دن میں سونے کے بڑے قائل تھے وہ کہتے تھے کم از کم ۱۵ منٹ کے لیے ہی سہی لیکن سونا چاہیئے۔ راوی کہتا ہے اکیڈمک کونسل یا اگزیکٹو کونسل کے جلسوں میں بھی اگر ان کے سونے کا وقت آگیا اور ایجنڈا کے کچھ دفعات ان کے خیال میں اہم نہیں ہیں تو وہ وہیں میٹنگ ہی میں میز پر دس منٹ کے لیے سر رکھ کر سو جاتے تھے۔ اس عرصے میں ان پر نیند کی ساری کیفیت طاری ہو جاتی تھی، دس منٹ کے بعد وہ بالکل تازہ دم ہو جاتے اور جس دفعہ پر اس وقت بحث جاری ہوتی اس پر زور و شور سے وہ حصہ لینے لگتے۔ احمد امین یہ لطیفہ سُن کر بہت ہنسے اور بولے نیند تو مجھے بھی بہت گہری آتی ہے اور بہت جلد، لیکن میں کسی میٹنگ میں نہیں سو سکتا، میرے لیے ضروری ہے کہ جگہ پرسکون ہو ورنہ معمولی سی آہٹ بھی میری نیند کو درہم برہم کر دے گی۔ سونے کے بعد اٹھ کر قہوہ پیتا ہوں اور پھر مطالعہ میں مصروف ہو جاتا ہوں لیکن یہ وقت صرف پڑھنے کا ہوتا ہے، لکھنے کا نہیں، لکھتا ہوں تو تکان غالب ہو جاتی ہے اور کبھی کبھی رات کی نیند اڑ جاتی ہے۔ میں رات کو ۱۱ بجے ضرور سو جاتا ہوں اور صبح کو سویرے اٹھ کھڑا ہوتا ہوں اور پھر یہ بنجارہ اپنے سفر پر پچھلے دن کی طرح روانہ ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر عبدالعلیم صدر شعبہ عربی و اسلامیات علی گڑھ کی کتاب اعجاز القرآن للخطابی اسی زمانے میں علی گڑھ سے شائع ہوئی تھی۔ میں کچھ نسخے اپنے ساتھ لیتا گیا تھا، ایک نسخہ احمد امین کی نذر کیا۔ دیکھ کر بہت خوش ہوئے بولے خطابی بڑا امام گزرا ہے۔ افسوس ہے کہ اس طرف توجہ نہیں ہوئی تم جانتے ہو الصغانی لغت نویس اس کا بڑا قائل تھا۔ یہ اچھا ہوا کہ اس کی تصانیف کی اشاعت کا سلسلہ جامعہ علی گڑھ سے شروع ہوا، میری طرف سے ڈاکٹر عبدالعلیم سے کہنا اس کی اور کتابیں بھی مرتب کریں۔ اشاعت کے لیے لجنۃ التالیف تیار ہے علیم صاحب کا مقالہ عقیدۂ اعجاز قرآن جو جرمن زبان میں لکھا گیا تھا اور جس کا انگریزی ترجمہ پکتھال نے اسلامک کلچر میں شائع کیا تھا آج کل مصر میں موضوعِ بحث بنا ہوا تھا اس لیے کہ اسی زمانہ میں ایک شامی فاضل نے دمشق کے علمی و تحقیقی رسالے المجمع العلمی العربی میں بہت طویل مضمون سپردِ قلم کیا تھا جو کئی ماہ تک چھپتا رہا تھا اس مضمون میں علیم صاحب کے مقالے کا انہوں نے بار بار ذکر کیا تھا اور اس سے متعدد موقعوں استناد کیا تھا۔

اب دیر ہو رہی تھی، میں احمد امین کا جو بہت مصروف آدمی تھے، بہت وقت لے چکا تھا میں نے ان سے رخصت ہونے کی اجازت چاہی۔ بولے مصر کب چھوڑ رہے ہو۔ میں نے کہا چند دنوں کے بعد۔ پوچھا بحری راستے سے لندن جاؤ گے یا ہوائی سفر اختیار کرو گے میں نے کہا ہوائی جہاز ہی سے سفر شروع ہوا ہے اور ہوائی جہاز ہی سے سفر پورا کرنا ہے۔ کچھ مسکرائے اور بولے۔ افسوس کہ تم سمندر کے سفر کے لطف سے محروم رہے۔ سمندر کے سفر میں جو بات ہے وہ ٹرین یا ہوائی جہاز کے سفر میں ممکن نہیں۔ خیر واپسی سمندر کے راستے سے کرنا اور اسکندریہ سے اتر کر سیدھے قاہرہ آجانا اور اس درمیان میں جب موقع ملے تو سمندر کے عجائبات پر جو لٹریچر یورپی زبانوں میں ہے اس کا ضرور مطالعہ کرنا۔

انہوں نے کہا سمندر سے مجھے بچپن سے عشق رہا ہے ازہر چھوڑنے کے بعد جب میں اسکندریہ کے ایک مدرسہ میں مدرس ہو کر پہنچا تو میری عمر سترہ اٹھارہ سال کی ہوگی سمندر کے حسن سے پہلی بار مجھے اسکندریہ میں شادکام ہونے کا موقع حاصل ہوا۔ فرصت کے وقت میرا بہترین مشغلہ یہ ہوتا تھا کہ سمندر پر چلا جاتا اور گھنٹوں موجوں کی طغیانی دیکھتا رہتا۔ وہ کہتے تھے کہ موجوں کے زیر و بم کے نظارے سے مجھے ایک خاص قسم کا سرور حاصل ہوتا ہے۔ اس وقت تک سمندر کا نظارہ صرف ساحل سے کیا کرتا تھا جب ۱۹۲۸ء میں ترکی جانے کا اتفاق ہوا اور سمندر کے

وسط میں ہمارا جہاز پہنچا۔ تب پہلی بار سمندر کی عظمت اور اس کی ہیبت و جبروت کا اندازہ ہوا لیکن سمندر کا جوش و خروش سفر کے ابتدائی پہلے دو دن رہا اس کے بعد سمندر پر سکون ہو گیا اور اس کی صحبت میں وہی سکون مجھے حاصل ہونے لگا جو اسکندریہ کے ساحل پر مجھے کسی زمانہ میں حاصل ہوتا تھا۔

میں نے انہیں بتایا کہ بیروت میں روکفیلر فونڈیشن نے میرے قیام کا انتظام اس ہوٹل میں کیا تھا جس کا ایک تہائی حصہ عین سمندر کے اندر واقع تھا۔ سمندر کے رُخ پر جو کمرے واقع تھے ان میں یا ان کی بالکونی پر بیٹھ کر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی ہوٹل میں نہیں بلکہ جہاز میں بیٹھا ہوا ہوں اور جہاز سمندر میں رواں دواں ہے۔ احمد امین جواب کچھ تھک سے گئے تھے اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے اچانک صوفے پر سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور ان کی آنکھوں میں عجیب چمک سی پیدا ہوئی۔ وہ پُرشوق لہجے میں بولے خدا کی قسم ٹھہرنے کی جگہ تو بس وہی ہوٹل ہے۔ جب بیروت جانا ہوا تو اسی ہوٹل میں ٹھہروں گا اور کچھ دن اور سمندر کا لطف اٹھاؤں گا۔

لیکن بیروت جانا اور اس سمندر سے لطف اٹھانا اب ان کے مقدر میں نہ تھا۔ میں ان سے رخصت ہو کر اوکسفرڈ پہنچا اور چند ہی مہینے کے بعد ایک دن بوڈلین لائبریری میں بیٹھا ہوا تھا کہ میرے استاد پروفیسر گب آگئے۔ انہوں نے باتوں باتوں میں ذکر کیا کہ ۳۰ جون ۱۹۵۴ء کو احمد امین قاہرہ میں وفات پا گئے۔

پروفیسر گب نے اپنے دوست کی یاد میں اسی زمانے میں ایک چھوٹا سا مقالہ لکھا جس کا انتصار انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے طبع جدید میں شائع ہوا ہے۔ قاہرہ سے روانگی کے وقت احمد امین نے اپنی سوانح زندگی۔ حیاتی کے دوسرے ایڈیشن کا ایک نسخہ مرحمت فرمایا تھا۔ میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ ہندوستان پہنچ کر میں ان کی دونوں کتابوں ۔ حیاتی (سوانح حیات) اور الی ولدی (بیٹے کے نام خطوط) کا ترجمہ کروں اور ان پر ایک تعارفی مضمون شائع کروں گا تاکہ اُردو پڑھنے والے ان سے واقف ہو سکیں۔ یہ مختصر سا مضمون لکھ کر اس وعدے کی ایفا کر رہا ہوں جو احمد امین سے آج سے تیرہ سال پہلے قاہرہ میں میں نے کیا تھا۔

مرزا محمد حسن قتیل اور ہفت تماشا

نثار احمد فاروقی

(الف) حیات و سیرت

مرزا محمد حسن قتیل[1] اصلاً بٹالہ[2] ضلع گورداسپور (پنجاب) کے کھتری بھنڈاری خاندان سے تعلق رکھتے تھے[3] ان کا خاندانی نام دیوانی سنگھ[4] تھا، شجرہ خاندان جو جناب مالک رام کو اسی دودمان کے ایک رکن سے پہنچا تھا یہ ہے[5]

---
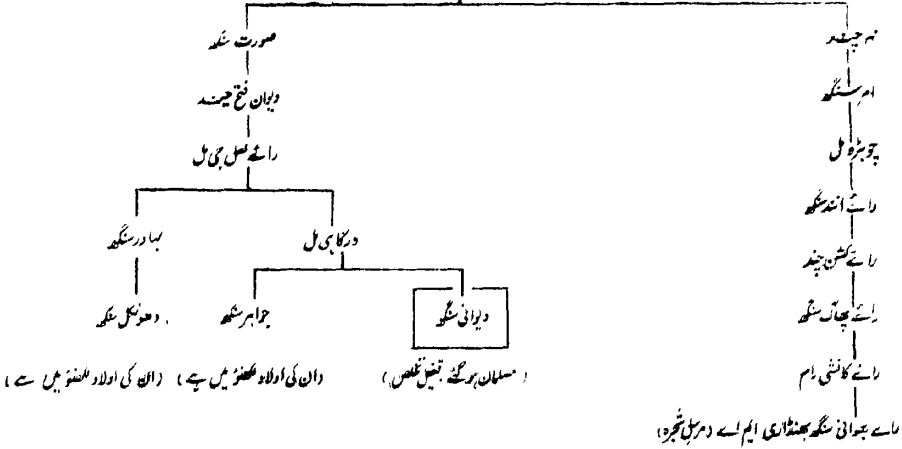
[1] ظاہر ہے مرزا لقب تعظیمی کے طور پر اضافہ ہوا ہے۔ یہ قتیل کے نام کے ساتھ کب سے رائج ہوا، کہنا مشکل ہے۔ قتیل کا نام بعض کتابوں میں باختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ مثلاً: محمد احسن (صحائف شرائف۔ نیز دیباچہ لطائف بترجمہ پنڈت کیفی ص ۲۵۹) احمد حسن (قاموس المشاہیر جلد ۲ ص ۱۴۰) محمد قتیل (خلاصۃ الافکار، ابوطالب اصفہانی۔ قلمی نسخہ پٹنہ۔ دانش گاہ دہلی) مرزا محمد حسن خان (دستور الفصاحت ص ۱۲۱)

[2] وطن میں بھی اختلاف ہے، اس کی بحث آگے آئے گی۔ بٹالہ کی دوسری شکلیں۔ پٹیالی (مصحفی: عقد ثریا/۴۶) پٹیالہ (عربی = ریاض الافکار) نیز پٹیالہ، سوائے پٹیالہ مشہور کہ مابین راوی و بیاہ از مضافات صوبہ لاہور متصل امرت سر.. واقع است (نشتر عشق - جلد ۲)

[3] یہ معلوم رہے کہ خلاصۃ التواریخ کے مؤلف سجان رائے کھنڈ اری اور مصطلحات شعرا کے مصنف سیالکوٹی مل وارستہ کا شجرہ بھی قتیل ہی کے خاندان سے ملتا ہے (تذکرہ سفینۂ ہندی/۱۷۲) بعض تذکرہ نگاروں نے وارستہ کو قتیل کا نانا بتایا ہے۔ (انیس العاشقین بحوالہ معاصر ۴)

[4] شجرۂ خاندانی سے یہی نام پہنچا ہے۔ تجنیس خطی کے سبب دوسری روایات: دلوالی سنگھ اور دیوالی سنگھ بھی ملتی ہیں۔

[5] مالک رام: قتیل پنجابی تھا۔ نگار لکھنؤ جلد ۲۴ شمارہ ۱/۵

آغا حسین قلی خاں عاشق[1] نے قتیل کے خاندان اور ابتدائی زندگی کے بارے میں جو معلومات فراہم کیے ہیں۔ وہ قابل قدر ہیں۔ ان کا ملخص ترجمہ ذیل میں دیا جاتا ہے۔

"ان کے آباؤ اجداد قصبہ پٹیالہ (بٹالہ؟) کے رہنے والے تھے جو مشہور مقام پٹیالہ سے مختلف جگہ ہے: ایک زمانہ گزرنے پر ان کے جد سومی (صورت سنگھ؟) نے قوم کھتری کے ایک فرد کے ہمراہ، جو ان سے دوستی رکھتا تھا، اپنے موروثی مکان کو چھوڑ کر باگپت (باغپت؟) میں نزول کیا، جو دریائے جمنا کے پار دہلی سے سترہ کوس کے فاصلے پر ایک شہر ہے؛ قتیل کے والد اور دادا وہیں پیدا ہوئے۔ جب قتیل کے دادا نے فردوس آرام گاہ (محمد شاہ) کے جلوس کے سترھویں سال (مطابق ۱۱۴۷ھ / ۱۷۳۴ء) وفات پائی تو ان کے باپ (درگاہی مل) نے باغپت سے نقل مکان کر کے دہلی سے بارہ کوس کے فاصلے پر قصبہ ڈرسنہ میں سکونت اختیار کر لی۔[2] یہاں دو تین سال ہی گزرے تھے کہ نواب ہدایت علی خان بہادر نے شاہجہان آباد پہنچ کر یہ صوبہ مستاجری پر لیا۔ تو اپنی ہم کیشی نیز ان روابط قدیم پر نظر کر کے جو سید فیض اللہ خاں اور ان کے دادا کے وقت سے آپس میں چلے آ رہے تھے، ان کے والد (درگاہی مل) کو ڈاسنے سے بلا بھیجا، اور "دلجوئی و چارہ سازی" کے ساتھ پیش آئے، ہزار روپیہ (سالانہ) ان کی ذات کا مقرر کر کے اجازت دی کہ اپنے گھر میں بال بچوں کے ساتھ رہیں (یعنی تکلیف نوکری سے معاف رکھا)۔ چنانچہ درگاہی مل کبھی ان کی سرکار میں رہتے تھے، کبھی ڈاسنے چلے جاتے تھے اور فارغ البال زندگی گزار رہے تھے۔ اسی زمانے میں قتیل ۱۱۶۹ھ / ۱۷۵۶ء[3] میں دہلی پیدا ہوئے۔ سترہ سال کی عمر تک صرف و نحو و منطق و حکمت و معانی و بیان و بدیع و ریاضی و عروض و عربی و فارسی کی تحصیل کرتے رہے، آخر شعر گوئی کی طرف میلان ہوا، اور میرزا محمد باقر کرمان شاہ شہید کے شاگرد ہو کر ان سے فیض اٹھایا۔ ان کی صحبت کی برکت سے چودہ سال کی عمر میں مسلمان ہوئے۔ دو سال تک اسے اپنے عزیز و اقارب سے مخفی رکھا۔ آخر جب سترہ سال کی عمر کو پہنچے تو اپنے اسلام کا اظہار کیا، اور مذہب اثنا عشری اختیار کیا اپنے گھر بار سے کنارہ کر کے آزادگی و تجرد کے میدان میں قدم رکھا۔"

قتیل کا وطن اور مولد بھی ایک نزاعی مسئلہ بن گیا ہے، کوئی اسے پٹیالہ سے منسوب کرتا ہے، کوئی پٹیالی سے، کوئی لاہور[4] سے، کوئی فرید آباد سے[5] اور کوئی دہلی سے۔ سید اسد علی انوری فرید آبادی نے اپنے ایک مضمون میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ: مرزا قتیل مرحوم کا خاندان ابھی تک فرید آباد میں آباد و خوش حال ہے۔ یہ کھتری صاحبان قصبے کے معززین میں سے ہیں۔ ان کی وہی گوت ہے جو قتیل کی بتائی گئی ہے۔ فیض آباد کے کھتریوں سے ان کی اب تک رسم و راہ اور رشتہ داری ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ ان کے پاس قدیم شجرہ موجود ہے۔ جس میں آج تک کے

---

[1] نشترِ عشق۔ حصہ ۲ (قلمی نسخہ بانکی پور پٹنہ۔ بحوالہ معاصر حصہ ۲ تذکرے کے مختصر تعارف کے لیے ملاحظہ ہو۔ دیباچہ دستور الفصاحت۔

[2] اس کا امکان ہے کہ باغپت اور پھر ڈاسنے میں مستقل سکونت اختیار کرنے کے باوجود درگاہی مل کی شادی پنجاب میں ہوئی کیونکہ قتیل نے ہفت تماشا (باب دوم) میں لکھا ہے کہ "بعضے کھتری جو مدت سے پنجاب کی سکونت چھوڑ کر پورب میں رہنے لگے ہیں۔ پنجاب کے کھتری ان کے ساتھ ایک برتن میں کوئی چیز نہیں کھاتے اور ان میں آپس میں رشتہ بھی نہیں کیا جاتا ... لہٰذا وہ کھتری جو پنجاب سے پورب کے شہروں میں آئے ہیں۔ اور یہاں خوشحالی زندگی بسر کرنے کے باعث۔ یہیں بس جاتے ہیں۔ جب ان کا لڑکا جوان ہو جاتا ہے تو شادی کے لیے اسے اپنے وطن کو بھیج دیتے ہیں۔"

[3] قدرت اللہ شوق گوپاموی: نتائج الافکار / ۵۰۳ (طبع بمبئی)، نیز صدیق حسن خان: شمع انجمن / ۳۹۰ (طبع بھوپال)۔

[4] رام بابو سکسینہ (مرتب) مرقع شعرا (طبع دہلی)

اندراج موجود ہیں، لیکن درگاہی مل والد مرزا قتیل کے آگے کوئی نام نہیں دیا گیا ہے۔ غالباً اس لیے کہ درگاہی مل کے صاحبزادے مسلمان ہو گئے تھے۔[1]

اس دعوے کی تردید میں ڈاکٹر مختار الدین احمد نے ایک مدلل مضمون لکھا[2] اور بیشتر مطبوعہ ماخذ کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالا کہ مرزا غالب سے پہلے کسی نے قتیل کو فریدآباد سے نسبت نہیں دی[3] اور غالب کے بیان کا یہ حال ہے کہ وہ ایک جگہ قتیل کو دہلوی اور[4] دوسرے موقع پر لکھنوی[5] بھی لکھتا ہے۔ دوسری دلیل یہ کہ کسی قدیم ذریعے سے قتیل کی نسبت وطنی تو کجا فریدآباد میں چند روزہ قیام بھی ثابت نہیں ہوتا[6]

لیکن یہ نزاع اس طرح بھی طے ہو سکتا ہے کہ ہم ان سب بیانات کو متخالف نہ سمجھیں، اور ان کا باہمی ربط تلاش کریں۔ میرا خیال ہے کہ قتیل کے آباؤ اجداد کا وطن بٹالہ ہی ہے، اور اس کے دادا رائے سل چی مل وہاں سے نقل مکان کر کے نکلے تھے۔ مگر خود قتیل دہلی میں پیدا ہوا[7] جیسا کہ وہ خود کہتا ہے:

گرچہ باشد مولدِ مومن خاکِ دہلی اے قتیل!
کم کسے چوں من زیزدوایزہ داں برخاست است

اس کے خاندان کے کچھ افراد تو بٹالہ میں رہ گئے، کچھ فیض آباد (شاید وہاں سے لکھنؤ) پہنچ گئے۔ اور کچھ نے فریدآباد میں اقامت اختیار کر لی۔ فریدآباد دہلی کے مضافات میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور اسے دہلی ہی کا ایک حصہ شمار کیا گیا ہے۔ یہی ادعا سید ہاشمی فریدآبادی نے کیا ہے[8]۔ ان کا خیال ہے کہ قتیل کا دہلوی ہونا اور فریدآبادی نہ ہونا ایک دوسرے کے نقیض نہیں ہیں۔

قتیل کے سالِ ولادت میں جھگڑا[9] ہے۔ صحیح یہی ہے کہ وہ ۱۱۷۲ھ/۱۷۵۸ء میں پیدا ہوا[10] اور علوم رسمیہ کی ابتدائی تعلیم کے بعد شروع

---

[1] اسد علی انوری۔ قتیل کا وطن، رسالہ نگار (لکھنؤ) جلد ۴۱ شمارہ ۵

[2] پہلے یہ غالباً نگار ہی میں چھپا تھا۔ نظرثانی کے بعد دوبارہ نقوش (لاہور) مارچ ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا۔ ہمارے پیشِ نظر نقوش کا ادبِ عالیہ نمبر ہے

[3] ڈاکٹر مختار الدین کا یہ مفروضہ صحیح نہیں۔ کم سے کم ایک نظیر تو موجود ہے، یعنی مرقع شعرا کا گردرآور، جو خود کالستھ خاندان سے تعلق رکھتا ہے، قتیل کو فریدآباد کا باشندہ بتاتا ہے (رجوع کنندیاں)

[4] ملاحظہ ہو۔ مختار الدین احمد (مرتب، احوالِ غالب/ ۲۰۵، ۲۱۲ (طبع علی گڑھ)

[5] اس کا ذکر ڈاکٹر مختار الدین نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے۔ حوالہ نہیں دیا۔

[6] مضمون نگار نے مکمل مراجع سے باعتبار سنین یہ ثابت کیا ہے کہ کس سن میں قتیل کہاں رہا۔ فریدآباد میں اس کا جانا کسی تحریر سے مستفاد نہیں ہوتا۔

[7] اس کی تائید: بھگوان داس ہندی (سفینۂ ہندی/ ۱۷۲)، عاشق، خوب چند ذکا، عبرتی عظیم آبادی، ابو طالب اصفہانی اور گریم بیل بھی کرتے ہیں۔

[8] سید ہاشمی فریدآبادی: قتیل کا وطن: رسالہ اردوئے معلی (دہلی) جنوری ۱۹۴۵ء

[9] اسد علی انوری نے فرقتی عظیم آبادی کے تذکرہ شمع انجمن (نایاب) کے حوالے سے "۱۱۶۶ھ" سالِ ولادت لکھا ہے (نگار، جلد ۴۱ ش ۵)

[10] نشترِ عشق (قلمی) نسخہ بانکی پور۔ بحوالہ معاصر ۴

جوانی[1] میں اپنا آبائی وطن ترک کرکے حلقہ بگوشِ اسلام ہوا۔ کہتے ہیں کہ اس کی تعلیم و تربیت مرزا محمد باقر کرمانشاہ متخلص بہ شہید[2] کے ہاتھوں ہوئی اور انھیں کی ترغیب سے وہ مسلمان ہوا۔ کچھ مدت تک اس نے تبدیلیٔ مذہب کا راز اپنے عزیزوں سے چھپایا، آخر ۱۸۰۱ سال کی عمر میں (تقریباً ۱۱۹۰ھ مطابق ۱۷۷۶ء) اپنے نئے عقیدے کا اعلان کر دیا۔ ظاہر ہے اس صورت میں خاندان اور اہلِ خاندان سے بھی معاشرتی تعلق منقطع ہو گیا۔[4]

بقول عاشقی، قتیل نے اثنا عشری فرقے کے عقائد اختیار کر لیے تھے[5]۔ یہ کچھ مستبعد نہیں جب کہ وہ محمد باقر شہید کا تربیت یافتہ اور نجف خان ذوالفقار الدولہ کا نوکر تھا[6] پھر دربار اودھ سے توسل پیدا ہوا تو وہاں بھی حکمرانوں کے شیعی عقائد تھے۔ لیکن اس کی تحریروں سے ان عقائد میں غلو کا ثبوت نہیں ملتا[7] اور اس سے شبہ ہوتا ہے کہ عجب نہیں کہ وقتی مصالح کے پیشِ نظر قتیل نے اثنا عشری فرقے کے عقائد اختیار کر لیے ہوں؛ جیسا کہ غلام ہمدانی مصحفی نے بھی نواب سعادت علی خان کے زمانے میں کیا تھا[8] قتیل کے بارے بھی مصحفی نے اشارہ لکھا ہے: "بسکہ در عہد نواب وزیر مرحوم رواج ایرانیاں بیشتر بود، مشار الیہم دیدہ دیدہ ہمیں مذہب اختیار کردہ"۔ خود قتیل نے بھی ہفت تماشا (باب دوم) میں لکھا ہے کہ "بہت سے لوگ شیعوں کی حکومت ہونے کے باعث تشیع کی طرف جھکتے ہیں"۔

مصحفی کا قول ہے کہ قتیل کی ابتدائی تعلیم فیض آباد میں ہوئی[9] لیکن بعض تذکرہ نگاروں نے[10] یہ کہا ہے کہ وہ اسلام قبول کرنے

---

[1] نشترِ عشق (قلمی) بحوالہ معاصر[4]

[2] حیرت ہے کہ اٹھارھویں صدی کے بیشتر فارسی تذکروں میں شہید کا حال نہیں ملتا۔

[3] عبرتی: ریاض الافکار (قلمی)، ورق ۵۳۔ الف "درسن ہفدہ سالگی" قدرت اللہ شوق: نتائج الافکار/ ۵۷۴

[4] نشترِ عشق (قلمی)، ج ۲

[5] عبرتی۔ ریاض الافکار (قلمی)، ورق ۵۳۔ الف

[6] نجف خان شیعہ تھا (ملفوظات شاہ عبدالعزیز دہلوی) اور یہ ممکن نہیں تھا کہ اس کے عقیدے سے اختلاف رکھنے والا کوئی شخص اس کے مصاحبوں میں داخل ہوتے۔ مصحفی اس کے عہدِ وزارت میں گوشہ نشین ہو گئے تھے (تذکرہ ہندی، ۲۴۸) میرزا مظہر جانِ جاناں کی شہادت میں نجف خاں کا ایما بھی شامل ہو یہ کچھ بعید نہیں ہے۔

[7] اس کی تفصیل کے لیے خود زیرِ نظر کتاب کے وہ بیانات ملاحظہ ہوں جو مذہب امامیہ اور شیعی رسوم سے متعلق ہیں مثلاً باب اول کا آخری حصہ

[8] مصحفی نے لکھنؤ میں متعہ بھی کیا تھا جسے وہ "محکم تر از نکاح" (مجمع الفوائد) کہتا ہے۔ لیکن اس نے ایک قصیدے میں بظاہر ان عقائد سے اپنی برأت کا اظہار بھی کیا ہے۔ تفصیل یہاں غیر ضروری ہوگی (ملاحظہ ہو۔ ابواللیث صدیقی: مصحفی اور ان کا کلام/ ص ۸۔ ۹

[9] مصحفی۔ عقد ثریا/ ۶۴ "وہ پیلے کہ متعلقانش بحسب آب خور د بفیض آباد رفتہ استقامت گرفتند بردست مرزا محمد باقر شہید اصفہانی ہیژدہ سالہ بود کہ بشرف اسلام پیوستہ، در آں ایام ہم درس کتاب از مرزا می گرفت۔

[10] شوق: نتائج الافکار/ ۵۷۴ نیز بھگوان داس ہندی: سفینۂ ہندی/ ۱۷۲

سے پہلے دلّی آیا اور عربی و فارسی کی متداول درسی کتابیں پڑھیں۔ قیاس چاہتا ہے کہ مصحفیؔ نے خود قتیلؔ سے معلوم کر کے لکھا ہوگا۔ عاشقؔ کے قول سے ظاہر ہوتا ہے کہ تعلیم اور تبدیل مذہب دلّی میں ہوا[1] قتیلؔ نے اپنی ولادت ۱۱۷۲ھ مطابق ۱۷۵۸-۹ء) سے اسلام لانے تک کا زمانہ بظاہر دو شہروں میں گزارا ہے۔ یعنی دلّی اور فیض آباد میں۔ اس کے بعد ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء کے لگ بھگ وہ ذوالفقار الدولہ نجفؔ خان کے لشکر میں شریک ہو کر[2] دلی و اطراف میں بسر کرتا رہا[3]

ظاہراً نجفؔ خاں سے یہ تعلق اس کی موت (۷ جمادی الثانی ۱۱۹۶ھ/۱۷۸۲ء) تک باقی رہا۔ قتیلؔ اکثر دلی آتا رہتا تھا۔ چنانچہ ہم اسے ان مشاعروں میں بھی موجود پاتے ہیں[4] جو عہد نجف خانی میں مصحفیؔ کے مکان پر ہوتے تھے۔ اسی زمانے میں قتیلؔ نے مصحفیؔ کو فارسی شعراء کا تذکرہ عقدِ ثریا لکھنے کی ترغیب دی[5] بلکہ کچھ مواد بھی، جو قتیلؔ نے فراہم کر رکھا تھا، یا زبانی یاد تھا۔ تذکرے میں شمول کے لیے لکھوا دیا۔

نجفؔ خاں کے لشکر سے علیحدہ ہو کر قتیلؔ نے لکھنؤ کا رُخ کیا، اور پھر اسے اپنا وطن ہی بنا لیا کیونکہ ۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء سے آخر دم تک وہ لکھنؤ میں رہا۔ چند سفر ضرور درپیش آئے۔ مگر وہ مختصر وقفوں کے لیے تھے[6]

۱۱۹۸ھ/۱۷۸۴ء سے ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء تک کا زمانہ اس نے لکھنؤ میں گزارا ہے[7] کیونکہ تذکرۂ ہندی کی ترتیب کے وقت وہ لکھنؤ میں موجود ہے[8] یہ زمانہ لازماً ۱۲۰۹ھ/۱۷۹۴ء تک کا ہے۔ ابوطالب اصفہانی سے بھی اسے ۱۲۰۷ھ/۱۷۹۲ء میں مقیم لکھنؤ بتاتا ہے[9] ۱۲۱۲ھ/۱۷۹۷ء میں خود قتیلؔ نے عبدالقادر خاں کے مکان پر خواجہ محمد علی تمنا سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے[10] ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء میں وہ نواب عماد الملک کی ملازمت میں کالپی چلا گیا

---

[1] عاشقؔ۔ نشتر عشق حصہ ۲ (قلمی نسخہ بانکی پور) بحوالہ معاصر ۴

[2] مصحفیؔ۔ عقد ثریا / ۴۶

[3] کیا یہ ممکن نہیں کہ اسی زمانے میں قتیلؔ نے فرید آباد میں کچھ وقت گزارا ہو، نجفؔ خان کا حصہ دونبہ ان دنوں آگرہ اور دہلی کے درمیان منڈلاتا رہتا تھا۔

[4] مصحفیؔ۔ عقد ثریا / ۲

[5] مصحفیؔ۔ عقد ثریا / ۲

[6] ان سفروں کا حال مرزا قتیلؔ کے رقعات معدن الفوائد (طبع نول کشور ۱۸۸۱ء)، بہفت تماشا، دیباچہ عمان المعانی (قلمی نسخہ مملوکہ قاضی عبدالودود صاحب پٹنہ۔ بحوالہ نقوش ادب عالیہ نمبر)، وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً: معدن الفوائد ص ۴۱، ص ۴۹، ۷۰، وغیرہ نیز ہفت تماشا۔ مولف حیات الشعراء (قلمی) کا یہ بیان کہ قتیلؔ "مدتوں ملک اصفہان میں رہا" بظاہر غلط ہے۔ اس کی تصدیق کہ قتیلؔ کبھی ہندوستان سے باہر گیا ہو۔ کسی ذریعے سے نہیں ہوتی۔

[7] مصحفیؔ۔ عقد ثریا / ۴، مصحفیؔ۔ تذکرہ ہندی / ۱۰۶ (ترجمۂ رند) نیز عقد ثریا / ۱۴ (ترجمہ بے تاب)

[8] مصحفیؔ۔ تذکرہ ہندی / یہ تذکرہ مابین ۱۲۰۰ھ/۱۷۸۶ء و ۱۲۰۹ھ لکھا گیا تھا۔ (رک دیباچہ دستور الفصاحت / ۸۴-۸۶)

[9] ابوطالب: خلاصۃ الافکار (قلمی)، بحوالہ معاصر ۴ نیز قلمی نسخہ دہلی یونیورسٹی لائبریری۔

[10] "در سال ہزار و دو صد و دوازدہ بملاقات شریف خواجہ محمد علی تمنا۔۔۔ در لکھنؤ بخانۂ خان صاحب عبدالقادر خان بہادر اتفاق افتاد" عمان المعانی (قلمی)، بحوالہ نقوش ادب عالیہ نمبر)

تھا [۱] جہاں اس کا قیام ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰-۰۱ء تک رہا [۲] ۱۲۲۱-۲۲ھ/۱۸۰۶ء میں انشاء اللہ خان انشاء (متوفی ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۷-۱۸ء) نے دریائے لطافت لکھی تو اس کا آخری حصہ جو معانی و بدیع سے متعلق تھا، قتیل نے تصنیف کیا [۳]

قتیل نے ایک مشاعرے کی روداد خواجہ امانی کو لکھی ہے۔

"احوال مشاعرہ بریں منوال است کہ چوں روزہائے موسم سرمائم عمر رست و تا فارغ شدن مردم از طعام و طے کردن مسافت تا ایں جا وانعقاد پذیرفتن صحبت سہ پہر می زنند، ازیں جہت صحبت دیر وزہ بہ نصف شب کشیدہ۔ جابجا دروازہ یا بند شدہ بود۔ خجرۂ میر صاحب باوصف غوشش گوئی بدستور بودہ است۔ تمام جسم مبارک ایشاں رعشہ داشت و آواز راہم کسے نمی شنید، لیکن من و خدا کہ غزلہا خوب گفتہ بودند" [۴]

ظاہر ہے یہ میر کی وفات (۱۸۱۰ء - ۱۲۲۵ھ) سے دو تین سال قبل کی روداد ہے۔ ۱۲۲۹ھ (مطابق ۱۸۱۳-۱۴ء) میں جب عبدالقادر خان غمگین [۵] نے لکھنؤ کا سفر کیا، اس وقت بھی مرزا قتیل محفل سخن میں نظر آرہے ہیں۔ غمگین نے لکھا ہے:

"بعد سے در محفل مشاعرہ کہ درآں ایام بخانہ مرزا جعفر [۶] می بود رفتم۔ مرزا محمد حسن متخلص بہ قتیل و مصحفی و میر نصیر دہلوی درآں زمرہ سرکردہ بشمار آمدند و شیخ امام بخش ناسخ را دراں ایام بدزا فزونی و نامری دریں کار بود" [۷] ۱۲۳۱ھ (مطابق ۱۸۱۵-۱۶ء) نے دوبارہ کالپی کا سفر کیا [۸]

---

[۱] ملاحظہ ہو۔ چار شربت (طبع نولکشور) نیز ہفت تماشا (متن فارسی، طبع نولکشور ۱۸۰۵ء)، صدیق حسن خان، شمع انجمن / ۳۹۰ (طبع بھوپال)

[۲] ہفت تماشا (باب دوم)۔ قتیل نے لکھا ہے کہ وہ عمادالملک کی وفات کے بعد بھی کچھ زمانے تک کالپی میں رہا۔

[۳] دریائے لطافت کا فارسی متن سب سے پہلے مطبع آفتاب عالم تاب مرشد آباد سے ۱۲۶۶ھ میں شائع ہوا تھا۔ انجمن ترقی اردو سے دوبار چھپی ہے۔ پہلی طباعت ۱۹۱۶ء (الناظر پریس لکھنؤ) پر مولوی عبدالحق کا مقدمہ ہے، طبع ثانی (مترجمہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی) ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی۔

[۴] معدن الفوائد۔ / ۵۴

[۵] تفصیل کے لیے رجوع شود: احمد علی شوق: تذکرہ کاملان رامپور / ۳۲۴ - ۳۲۵، امیر مینائی: انتخاب یادگار / ۲۷۱ - امتیاز علی عرشی (دیباچہ)، دستور الفصاحت ۱۹۳

[۶] مرزا جعفر، مرزا فخر الدین احمد خان بہادر کا عرف ہے۔ یہ نواب آصف الدولہ کے نائب سرفراز الدولہ حسن رضا خان کے بہنوئی تھے۔ شعر و سخن کا ذوق رکھتے تھے۔ ان کے گھر بڑی ستھری محفلیں شاعری کی ہوتی تھیں۔ ان کے بیٹے افتخار الدولہ معین الملک مرزا قمر الدین احمد خان بہادر صولت جنگ قتیل کے شاگرد تھے (دستور الفصاحت ص ۱۲۰-۱۲۱، نیز ملاحظہ ہوں۔ نجم الغنی۔ تاریخ اودھ (ج ۲) ص ۱۱۴ - ۱۱۵ و عہد مصحفی۔ ریاض الفصحا / ۶۹ / ۵۹ - ۲ - وقائع عبدالقادر خانی / (طبع کراچی) سوانحات اودھ جلد دوم نیز حواشی تذکرہ ابن امین اللہ طوفان ۔ از قاضی عبدالودود۔

[۷] روزنامچہ عبدالقادر غمگین رامپوری (قلمی نسخہ کتب خانہ حبیب گنج) اس کی نقل رضا لائبریری رامپور میں ہے۔ اب کراچی سے اردو ترجمہ، حواشی کے ساتھ شائع ہو گیا ہے جسے جناب محمد ایوب قادری نے مرتب کیا ہے۔

[۸] مظہر العجائب / دیباچہ (طبع نولکشور)۔ ویسے قتیل نے اپنی عمر کے آخری عمر کے آخری پندرہ سال میرزا اسکندر شکوہ کے مختار کار میرزا شجاعت علی خان کی معیت میں بسر کیے تھے۔ اور ایک مختصر سے وقفے کے لیے وہ کالپی گئے تھے (نشتر عشق قلمی)

۲۳۔ ربیع الثانی ۱۲۳۳ھ[1] مطابق ۲ مارچ ۱۸۱۸ء روز شنبہ[2] کو قتیل نے استسقا[3] میں مبتلا ہو کر لکھنؤ میں وفات پائی۔ مؤلف صحائف شرائف کا ستخرجہ مادۂ تاریخ یہ ہے[4]

طبع من از دوات و کلک گرفت — بہ تاریخ امتحان سخن

خامہ بنوشت بر سر کاغذ — مردہ آہ عیسیٰ زمان سخن (۱۲۳۳ھ)

عسکری مدح او چساں گویم — ہست الکن مرا زبان سخن

دوسرے شعر کے دوسرے مصرع میں سر کاغذ (کاف) کے اعداد کا تعمیہ ہے۔ قتیل کے شاگرد خواجہ آمانی نے "دادنورسے ابزار و بجہان تاریکی" سے تاریخ نکالی تھی[5] لیکن اس سے ۱۲۳۱ھ برآمد ہوتے ہیں۔ غالباً اس مصرع اول میں تعمیہ رہا ہوگا۔

قتیل کی معنوی اولادیں تو آج بھی زندہ ہیں۔ جسمانی اولاد کوئی نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس نے تمام عمر تجرد اور آزادگی میں گزاردی[6] مختلف شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ عاشق مزاج اور اوباش قسم کا انسان تھا۔ اس دور کے ادھر میں طوائف بھی زندگی کے آداب میں جزو تکمیلی کی حیثیت رکھتی تھی قتیل بھی ان "لولیان شوخ" کی عشوہ فروشیوں سے بہرہ اندوز ہوتا تھا۔ عاشق کہتا ہے "ہمیشہ بایک کس تعلق خاطر می دارد وگاہے می شود کہ بریک محبوب اکتفا نہ کردہ بادو سہ کس تعلق خاطر می دارد"[7]

اس کے مدفن کا کچھ سراغ نہیں ملتا۔ غالباً حوادث کی آندھیوں نے ایک قلندر کا تبرک سمجھ کر آزادوں میں بانٹ دیا۔

مختلف تذکروں کے مطالعے سے قتیل کی سیرت کی جو تصویر بنتی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ آزاد منش قلندر وضع[8] سادہ طبیعت[9]، موٹا

---

[1] عاشق: نشتر عشق جلد دوم (بعض تذکروں نے قتیل کا سال وفات ۱۲۴۰ھ بتایا ہے۔ جیسے مثلاً نتائج الافکار/ ۵۷۵، شمع انجمن/ ۲۹۰ یہ بالکل غلط ہے

[2] عبرتی: ریاض الافکار (قلمی) ورق ۵۳ - الف نیز زخمی - انیس العاشقین (قلمی) بحوالہ معاصر ۴ -

[3] عاشق: نشتر عشق جلد دوم - تقویم ہجری و عیسوی کی رو سے ۲۳ ربیع الثانی مطابق ۲ مارچ ہوتی ہے۔ لیکن دن دوشنبہ آ کر پڑتا ہے۔ تذکرہ میں صریحاً شنبہ آیا ہے۔

[4] صحائف شرائف (قلمی) بحوالہ معاصر ۴ (اس کا ایک مخطوطہ سنٹرل اسٹیٹ لائبریری حیدرآباد میں بھی ہے) معدن الفوائد کے آخر میں (ص ۹۴) قتیل کی ایک غزل درج ہے جس کا مقطع ہے: مسلمانان مسلمانش نگویند۔ قتیل کافر ایمانے دارد۔ اس کے دوسرے مصرعے سے کرامت علی اظہر نے تاریخ وفات برآمد کی تھی جسے میر ناصر علی نے تضمین کیا تھا۔

[5] صحائف شرائف حوالہ ماسبق

[6] ابو طالب: خلاصۃ الافکار (قلمی) عاشق: نشتر عشق ج ۲ "مجردان جہان و آزادان زماں را طرز مجردی و آزادی آموخت" زخمی انیس العاشقین (قلمی) بحوالہ معاصر ۴

[7] عاشق۔ نشتر عشق ج ۲

[8] احمد علی: مخزن الغرائب و عاشق: نشتر عشق بحوالہ معاصر ۴

[9] عاشق۔ نشتر عشق ج ۲

جھوٹا کھانے والا، معمولی پہننے والا[1]، عاشق مزاج[2]، خوش طبع، حریف و ظریف، یار باش، بشاش بشاش، اور سیر و سیاحت کا دلدادہ انسان تھا۔ اس نے اسباب دنیا کبھی فراہم نہیں کیا[2] حتیٰ کہ گھر بار اور بیوی بچوں کی قید سے بھی آزاد رہا۔ اس کی ایک قلمی تصویر بھی دستیاب ہوئی ہے[3]

(ب) تصانیف

قتیل کی تصانیف تعداد میں خاصی ہیں۔ اس کی آزادی اور قلندری کو دیکھتے ہوئے حیرت ہوتی ہے کہ بایں ہمہ بے پروائی یہ سب آخر لکھی کیسے گئیں۔

مخزن الغرائب کے مؤلف کا بیان ہے کہ "فقیر کسے را در لطافت طبع و جودت ذہن و استقامت عقل و لزوم قناعت و تجرد و تفرد و خوش گزرانیدن تا مانند ایشاں ندیدہ ام۔ دکاہے تلاش دنیا نکردہ۔ خانہ بدوش۔ قلندرانہ بہ لباس کم بہا زیست می نماید۔ ہرگز در بند شیخی نبودہ۔ از علاقۂ دنیا تا دوات و قلم کہ از لازمۂ اہل علم است ہمراہ خود ندارد۔ ایں ہمہ بے تعلقی از لاچاری (نیست)، بلکہ با ستغنائے طبع است۔ اکثر بزرگان مثل ۔۔ نواب آصف الدولہ مرحوم و دیگر عزیزان در صدد تربیت او درآمدہ انداو سر باز زدہ و تن بکرہ و فرندادہ ردئیہ کو اختیار نمودہ از اں زگشتہ[5]

قلندری کا یہ حال تھا کہ "نہ التفات بر قلم تراشیدن دارد نہ بر قط زدن۔ ہنگام تحریر اگر نوک قلم می شکند بہ ہماں قلم دہ خط می نویسد و خدمت لفافہ تعلق بہ حاضرین دارد۔ الی یومنا ہذا ہمیں نمط زندگی می کند۔۔۔"[6]

اسی لاابالی پن کی وجہ سے قتیل نے کبھی اپنا کلام بھی یکجا کر کے نہیں رکھا۔ عاشق کا بیان ہے کہ اس کا "دیوان غزل و جنگ نثر قریب پانزدہ ہزار بیت" تھا[7] مگر اس کے پاس کبھی کچھ نہیں رہا۔ دوست اور شاگرد جوڑتے رہتے تھے۔

شاعری اور انشاپردازی کے جو رائج الوقت معیار تھے ان پر قتیل کو حاکمانہ قدرت حاصل تھی۔ احمد علی الہاشمی کا بیان ہے کہ "از علم (کذا) متداولہ بہرۂ وافی و از فنون شاعری نصیبۂ کافی دارد، و در عروض و قافیہ و تاریخ و لغت و انشاء و در فہم و فراست و دقت طبع دریں زمان عدیل و نظیر خود ندارد"[8] اور بقول عاشق "امروز در ہندوستان کسے ہم زبان آں جناب نیست"[9]

---

[1] احمد علی - مخزن الغرائب (قلمی)

[2] بھگوان داس: سفینۂ ہندی ص ۱۷۲

[3] عبرتی: ریاض الافکار نیز احمد علی مخزن الغرائب

[4] رجوع: مرقع شعراء (شائع کردہ رام بابو سکسینہ)

[5] احمد علی الہاشمی: مخزن الغرائب (قلمی) بحوالہ معاصر ۴ (اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ حبیب گنج علی گڑھ میں ہے)

[6] آغا حسین قلی خان عاشق: نشتر عشق جلد ۲ (قلمی) بحوالہ معاصر ۴

[7] نشتر عشق حصہ ۲ بحوالہ معاصر ۴

[8] مخزن الغرائب (قلمی) بحوالہ معاصر ۴

[9] نشتر عشق حصہ ۲، بحوالہ معاصر ۴

نظم و نثر میں اس کی ماہرانہ چابک دستی کی دو مثالیں عاشق نے لکھی ہیں جن کا ملخص یہ ہے :

۱۔ ایک بار مرزا جعفر کے لڑکے کی شادی کے موقع پر شہر کے لوگوں کو شرکت مجلس کا دعوتی رقعہ بھیجنے کی خدمت قتیل کے سپرد کی گئی دعوت کے رقعے کا مضمون ہوتا ہی کیا ہے مگر انہوں نے دو دن میں سو رقعے مختلف الفاظ و عبارت میں لکھ کر پیش کیے اور کہا کہ اگر ایک ہفتے کی مہلت مل جائے تو ایسے ہی آٹھ سو رقعے اور لکھ سکتا ہوں۔

۲ - ایک بار سعادت یار خان رنگینؔ لکھنؤ سے دالپسی میں مجھ سے ملنے آئے اور قسم کھا کر بیان کیا کہ ایک بار انشاء اللہ خان مرحوم نے جو مرزا کے دوستوں میں تھے اور آپس میں ہنسی مذاق بھی ہوتا تھا۔ دو تین دن میں بڑے غور و تامل کے بعد دو تین فقرے بے نقط نثر کے لکھ کر قتیل کو خط بھیجا۔ اگلی صبح کو جب قتیل سے ملاقات ہوئی تو انشا نے کہا [1] "دیکھا میں نے کیسا بے نقط رقعہ لکھا تھا؟ تم اس کا جواب نہیں دے سکتے۔ قتیل نے "فی الفور قلم اٹھایا اور قرآن کی جو سورتیں اسے یاد تھیں ان کی بے نقط تفسیر لکھنی شروع کر دی اور" در عرصہ یک نیم پاس نہایت روانی و سلاست کے ساتھ فیضی کی سواطع الالہام سے بہتر عبارت لکھ ڈالی [2]

---

[1] کچھ شاعرانہ چشمک اور معاصرانہ رقابت بھی ہو۔ انشا ء کی نکتہ چیں طبیعت قتیل کو بھی باوجود دوستی و یک جہتی کے رگیدنے سے نہ چھوڑا اور معمولی اعتراضوں پر ان کی ہجویں لکھ ڈالیں ۔ "یک روز بعد نماز ظہر بتلاوت قرآن مجید مشغول بودم آں روز مرزا قتیل ہم در خانۂ من مہمان بود، چونکہ تلاوت کردہ بودم لفظ معنا را خواندم مرزا قتیل لفظ معنا را شنید و لعنت معنا یعنی بساں مَین خوب است کہ قاعدۂ عربی معنا است، فوراً کبت گفتم:

کہے جو کہ قتیل صحیح ہے وہ ، کہ وہ کھتری ہے اور گدھے کی ہے دُم
کہے وہ جو خدا معنا سو غلط ۔ نہ طریق رشاد کو کیجیے گم
مع ہو ہو مضاف تو میں کر جزم ابھی کیوں ہو بھلا وہ کہو مجھے تم
تو منا میں غلط ہوں یہ سب معلے معنا مع من معنا معکم

(ملاحظہ ہو مرزا عسکری کلام انشا شائع کردہ ہندوستانی اکادمی الہ آباد ۱۹۵۲ء)

ایک اور موقع پر قتیل سے لفظ ہجر کے مفتوح یا مکسور ہونے پر بحث ہوگئی تو انشاء نے طویل رقعہ لکھ ڈالا۔

انیسا مشفقانہ بندہ نوازا لم حرر تنی قولاً ثقیلا ....
تجھے کہتی تھی دنیا قاف معنی تو کیوں کر بن گیا مجنوں کا ٹیلا
وہ حجر اسے جو مجبورا کے ہمراہ سو ہے حلقی بہی ہاں مرزا قتیلا
وسے جو ان قومی کے ہے آخر وہ مجبورا سے ہو ترے خلیلا

لیکن ہجو کا پھیکا جب منہ لگ جاتا ہے ، مشکل سے چھوٹتا ہے ، انشا کو اس میں معذور ہی سمجھنا چاہیئے ۔ (سبحان علی بیگ سے ان کے مرنے کا حال معدن الفوائد ص ۱۸ پر ملاحظہ ہو)

[2] عاشق : نشتر عشق حصہ ۲ بحوالہ معاصر حصہ ۴ (یہ بیان مبالغے سے خالی نہیں ہے)

یہ واقعہ لکھ کر عاشق کہتا ہے کہ اسے مبالغہ یا جانب داری نہ سمجھا، حقیقت یہ ہے کہ فیضی تو موجود ہے کوئی اکبر نہیں رہا۔ ظہوری آج بھی زندہ ہے مگر برہان الملک جیسا قدردان کمال نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ قتیل زبان عربی وفارسی و ترکی سے واقفیت رکھتا تھا۔ عاشق کا بیان ہے کہ وہ عربی اور ترکی میں بات چیت کر سکتا تھا[۱]۔ احمد علی کہتا ہے کہ "مہارت کلی" حاصل تھی[۲]۔ مصحفی[۳] اور احمد علی[۴] نے فن تاریخ میں اس کی دسترس اور قوت حافظہ کی بھی تعریف کی ہے۔ زود گوئی کا یہ عالم تھا کہ "دوساعت نجومی"[۵] میں سو شعر کہہ ڈالتا تھا۔

قتیل کی تصانیف کا مختصر خاکہ یہ ہے:

(۱) **دیوان فارسی**: یہ ہنوز غیر مطبوعہ ہے، اس کے قلمی نسخے ہندوستان کے مختلف کتاب خانوں میں پائے جاتے ہیں اشعار کی مجموعی تعداد پانچ ہزار کے لگ بھگ ہے۔

(۲) **چار شربت**: یہ قواعد فارسی، مصطلحات، زبان دانی اور محاورۂ اہل فارس میں ہے اس کی تالیف کا زمانہ غالباً ۱۲۲۳ھ ہے۔ محمدی پریس لکھنؤ سے شائع ہو چکی ہے۔

---

[۱] عاشق: نشتر عشق حصہ ۲ معاصر ۴

[۲] مخزن الغرائب ج ۲ (قلمی) بحوالہ معاصر ۴۔ لیکن یہ کہنا یقیناً مبالغہ ہے۔

[۳] عقد ثریا/۴۶ [۵] مخزن الغرائب ج ۲ (قلمی) بحوالہ معاصر ۴

[۴] مخزن الغرائب جلد ۲ بحوالہ معاصر ۴۔

[۵] قتیل نے اردو نثر میں بھی کچھ لکھا تھا، اس کے کچھ اردو خطوط معدن الفوائد (نسخہ قلمی) میں بھی شامل ہیں۔ جن کا ہم آگے ذکر کریں گے۔ ان کے علاوہ دریائے لطافت میں اردو نثر کے نمونے، خصوصاً ضلع ہنگت کا بے مثال نمونہ (ملاحظہ ہو دریائے لطافت اردو ترجمہ ص ۲۷۹) وغیرہ ہیں۔ البتہ اردو شاعری میں کوئی مستقل کارنامہ نہیں ہے۔ ایک شعر رعایت خان ناصر نے اپنے تذکرے میں درج کیا ہے (تذکرہ ناصر، قلمی، بحوالہ معاصر ۴) اور تین شعر نسخہ دلکشا جلد ا (مخطوطہ بانکی پور) میں دیے گئے ہیں۔ (معاصر ۴) اس میں سے ایک دریائے لطافت کی مثالوں سے ماخوذ ہے۔ (ملاحظہ ہو ص/۱۳۷۵) چار شعر مرقع شعراء سے ملتے ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے

اس زلف کی کیا بات ہے آدھی اِدھر آدھی اُدھر
پھیلی یہ کالی رات ہے آدھی اِدھر آدھی اُدھر

اسی مضمون کا ایک شعر:

ہوا ہے مانگ میں دل گم مرا، میں ڈھونڈھوں کدھر
کہ آدھی رات ادھر ہے اور آدھی رات ادھر

تقریباً نصف درجن شاعروں سے منسوب ہے۔ (ملاحظہ ہو، نقوش۔ جون، ۱۹۵۶ء)

(۳)، نہر الفصاحت: یہ مختصر رسالہ قواعد زبان فارسی اور اصول بلاغت و انشا وغیرہ میں ہے اور غالباً پہلی بار رجب ۱۲۵۰ھ میں مطبع مصطفائی کانپور سے شائع ہوا تھا (تعداد صفحات ۴۸)

اس کے دیباچے سے معلوم ہوتا ہے کہ میر امان علی کا بڑا لڑکا میر محمد حسین جب شجرۃ الامانی کے مطالب پڑھ چکا اور اسے انشا کا ذوق پیدا ہوا تو میر امان علی نے فرمائش کی کہ اب تک ایسا رسالہ لکھ دو جو ان مطالب پر مشتمل ہو جو شجرۃ الامانی میں نہیں ہیں۔ چنانچہ قتیل نے یہ نہر الفصاحت لکھی۔ اسے دس موجوں (فصول) میں تقسیم کیا۔ وہ اس کتاب کا نام محمد حسین کی رعایت سے منافع الحسینیہ بھی تجویز کرتا ہے۔

موج اوّل: در تعلیم بعضے چیزہا کہ ترک آں واجب و مستحسن است۔ (خصوصاً ہندوستانی فارسی کے نقائص اور وہ الفاظ و محاورات جو ہندی قواعد اور ہندوستانی مزاج کے نمونے پر بنا لیے گئے ہیں)

موج دوم: در بیان استعمال افعال

موج سوم: در بیان واجبات و مستحسنات

موج چہارم: در زوائد واجبی

موج پنجم: در بیان مرکبات

موج ششم: در بیان مقدرات و محذوفات

موج ہفتم: در علم بیان

موج ہشتم: در ذکر زبان فارسی

موج نہم: در بیان فرق در اشعار متقدمین، و متاخرین و نثر ہندیان و اہل زبان

موج دہم: در تعلیم طریق تحریر نثر

(۴)، معدن الفوائد یا رقعات مرزا قتیل۔ خواجہ امام الدین امامی شاگرد قتیل نے ۱۲۳۲ھ/۱۸۱۶-۱۷ء [1] میں اپنے موسوم رقعات جمع کیے تھے۔ اس میں بہت سی کارآمد باتیں قتیل کی زندگی اور اس کے معاصرین کی بابت معلوم ہوتی ہیں۔ یہ کتاب مطبع نولکشور سے ۱۸۸۱ء میں چھپی تھی

(۵)، شجرۃ الامانی۔ یہ میر امان علی کی فرمائش پر ان کے بیٹے میر محمد حسین کے لیے لکھا گیا تھا۔

---

[1] اس میں حمد کا حصہ عربی میں، نعت کا ترکی میں، منقبت کا فارسی میں اور تعریف اصحاب اردو میں لکھا گیا ہے۔ چار زبانوں میں اسے تقسیم کرنے کا سبب بظاہر یہ تھا کہ خواجہ امامی نے ان ہی چاروں زبانوں میں قتیل کے رقعات بھی فراہم کیے تھے، لیکن مطبوعہ نسخے میں صرف فارسی رقعات چھپے ہیں۔ معدن الفوائد کے دو قلمی نسخے پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب لکھنوی کے پاس ہیں۔ ان میں پانچ خط اردو زبان میں بھی ہیں۔ انہیں ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی نے مختصر تمہید کے ساتھ شائع کر دیا تھا (ملاحظہ ہو۔ نور الحسن ہاشمی مرزا قتیل کے غیر مطبوعہ اردو خطوط، رسالہ نیا دور جلد ۱۹، شمارہ ۲، جون ۱۹۶۴ء)۔ مطبوعہ نسخے میں فارسی رقعات کی تعداد ۱۸۲ ہے۔ ان میں کہیں کہیں ترکی عبارت بھی فارسی کے ساتھ آگئی ہے۔

(۶) ثمر البدائع : یہ بھی فارسی بلاغت اور فنِ انشا سے متعلق ہے۔ ۱۲۶۳ھ میں مطبع محمدی لکھنؤ سے شائع ہو چکی ہے۔

(۷) مظہر العجائب : یہ ۱۲۳۱ھ / ۱۸۱۵ء میں کاپی میں لکھی تھی اور نولکشور سے شائع ہو چکی ہے۔

(۸) حدیقۃ الانشا : یہ ہماری نظر سے نہیں گزری۔ یہ بھی علم نہیں کہ چھپی تھی یا نہیں۔

(۹) دریائے لطافت : یہ انشاء اللہ انشا (متوفی ۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۷ء) کی تالیف ہے جو ۱۲۲۲ھ / ۱۸۰۷ء میں لکھی گئی۔ اس کا آخری حصہ جو معانی و بیان و بدیع و عروض و منطق سے متعلق تھا، قتیلؔ نے لکھا ہے۔ یہ حصہ مطبوعہ کتاب (مترجمہ برجموہن دتاتریہ کیفیؔ طبع انجمن ۱۹۳۵ء) کے صفحہ ۳۵۹ سے شروع ہوتا ہے۔

(۱۰) ہفت تماشا : یہ قتیلؔ کی زندگی کے آخری ایام کی تصنیف ہے، اور اپنے موضوع کے لحاظ سے نہایت اہم کتاب ہے۔ یہ مارچ ۱۸۷۵ء میں مطبع نولکشور سے چھپی تھی۔ اس کے مطالب کا تعارف یہاں قدرے تفصیل سے کرایا جائے گا۔

—— ۳ ——

(ج) ہفت تماشا

ہفت تماشا قتیلؔ کی تصانیف میں سب سے اہم اور قابلِ قدر کتاب ہے۔ اس کی شانِ نزول قتیلؔ نے دیباچے میں یوں بیان کی ہے۔

"محمد حسن قتیلؔ کہتا ہے کہ نواب سعادت علی خان کے عہد میں[۱] مرزا محمد حسین کربلائے معلیٰ سے لکھنؤ تشریف لائے تو محمد آفرین علیخان کے توسط سے حضور پُرنور نے صندوق نقرہ کے ساتھ انھیں ۱۲۲۶ھ / ۱۸۱۱ء میں پھر واپس بھیجا۔ میں ان کے محامد آقا محمد صادق خان صفاہانی اور آقا ابوالحسن خان قزوینی کی زبانی سن چکا تھا، اور ان دونوں کے ذریعے سے وہ بھی مجھ سے غائبانہ متعارف تھے۔ اسی وسیلے سے دو تین مرتبہ ان کی خدمت میں عریضہ بھیجا اور اس کا جواب پایا۔ انھوں نے حکم دیا کہ میں ہندوؤں کا احوال اور اس فرقے کے رسوم۔ نیز قدیم مسلمانوں کے اوضاع و اطوار اور نومسلموں کے حالات لکھوں، چنانچہ میں نے تعمیلِ ارشاد کی اور اس کا نام ہفت تماشا رکھا۔۔"[۲]

بظاہر مرزا محمد حسین نے اس کتاب کی فرمائش یوں کی ہوگی کہ قتیلؔ خود ایک معزز ہندو گھرانے سے علاقہ رکھتا ہے۔ ہندوستانی دیومالا اور رسوم مذہبی سے اچھی طرح واقف اور مع ہذا فارسی انشاپردازی پر قادر ہے۔ وہ ایک ایسی کتاب لکھ سکے گا جس سے تازہ وارد ولایتی حضرات کو ہندوستان کے مذاہب اور مختلف فرقوں کے رسوم و عقائد سمجھنے میں مدد مل سکے۔ لیکن نہ مرزا محمد حسین نے سوچا ہوگا، نہ مرزا محمد حسن (قتیلؔ) نے، کہ آنے والے زمانے میں یہ ایک اہم تاریخی و معاشرتی دستاویز بن جائے گی۔

اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے ہندوستان کی معاشرت پر اس کتاب میں اتنا قابلِ قدر مواد محفوظ ہے، جو اس عہد کی اور کسی کتاب میں نہیں ہے۔ اس کی مدد سے اس عہد کے شمالی ہند کی سوسائٹی کا پورا مرقع تیار ہو سکتا ہے۔

---

[۱] نواب سعادت علی خان ۱۲۱۲ھ / ۱۷۹۸ء کو مسندِ آرائے ریاستِ اودھ ہوئے اور ۱۲۲۹ھ / ۱۸۱۴ء تک مسند نشین رہے۔ ملاحظہ ہو۔ نجم الغنی: تاریخ اودھ جلد چہارم ص ۱ تا ۱۰۸۔

[۲] دیباچہ ہفت تماشا صفحات ۲ تا ۵ (یہ لفظی ترجمہ نہیں ہے۔ مطالب کی تلخیص ہے)

اس میں، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، سات تماشے (یعنی ابواب) ہیں:

پہلا باب : سمارتگوں (یعنی اہلِ تقلید) کا مذہب اور اس کے بارے میں تحقیقات

دوسرا باب : انسان کی آفرینش کا بیان

تیسرا باب : ہندو فرقوں کے عقائد

چوتھا باب : ہندوؤں کے متبرک دنوں اور تہواروں کا بیان

پانچواں باب : ہندوؤں کے رسوم و رواج

چھٹا باب : ہندوستانی مسلمانوں کی معاشرت اور رسوم و رواج

ساتواں باب : بعض عجائب و غرائب

ان ابواب میں ہندوستانی دیومالا کی روایات، جہلاء اور عوام کے عقائد، عوامی رسمیں، نذر و نیاز، باہمی روابط، یا خود قتیل کی زندگی اور ذہنی افتاد سے متعلق کارآمد معلومات ملتے ہیں۔ قتیل کے بارے میں مشہور ہے کہ اثنا عشری تھا، لیکن اس کا بیان ملاحظہ فرمائیے: "ایرانی ان کو امام زین العابدین علیہ السلام بھی کہتے ہیں۔ مگر یہ بالکل غلط ہے کیونکہ امام حسین علیہ السلام کے ساتھیوں میں امام قاسم کے سوا کسی شخص میں اتنی لیاقت نہیں تھی کہ اسے امام کہا جائے اور محرم میں سیاہ لباس پہننے کی جو ایرانیوں کی رسم ہے۔ اس کا بانی یزید تھا اور زین العابدین ہر سال محرم میں امام حسین علیہ السلام کی یاد میں رویا کرتے تھے اور رونا خدا کی مرضی کے خلاف ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مرضی سے ان کو شہادت کے اس مرتبے پر فائز کیا جو کسی شخص کو نصیب نہیں ہوا، لہٰذا کس بات پر رونا؟[1]" (تماشائے اول)

قتیل کی اس کتاب سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ محض اندھے تقلیدی عقائد ہی نہیں رکھتا تھا، بلکہ بہت سے امور میں اس کی آزادانہ رائے تھی، جو اس نے عقلی دلائل کی روشنی میں قائم کی تھی۔ ایسی آرا کے اظہار میں وہ پوری بے تکلفی سے کام لیتا ہے۔ حتیٰ کہ خود کھتری گھرانے سے تعلق رکھتے ہوئے بھی وہ یہ لکھتا ہے کہ "اس زمانے میں اصل النسل کھتری روئے زمین پر باقی نہیں رہے ہیں اور جس قدر بھی ہیں وہ لوگ برہمن کے نطفے سے ہیں۔ کیوں کہ اس جماعت کے مردوں کے قتل کے بعد ان کی بچی ہوئی عورتوں کو پرس رام نے اپنے بھائیوں کے حوالے کر دیا تھا اور ان کے بطن سے جو اولاد وجود میں آئی وہ برہمن کے بجائے کھتری کے لقب سے ملقب ہوئی (تماشائے اول)

اس عہد کی معاشرت میں شرافت اور حسب نسب کے معیار بہت سخت اور تقلیدی قسم کے تھے۔ ایک تو مسلمانوں میں پہلے ہی سے عرب کے تفاخر نسبی کا اثر تھا، پھر ایرانی حلقۂ اسلام میں داخل ہوئے تو وہ بھی کسی سے کم نہ تھے، انہوں نے عربوں کے نسب میں بھی کیڑے نکال دیے، چناں چہ خلفائے عباسیہ کے زمانے میں جب عربوں کے خلاف شعوبیہ تحریک نے زور پکڑا تو متعدد کتابیں مثالب العرب (عربوں کی برائیاں) کے موضوع پر وجود

---

[1] یہاں شیعہ حضرات کا یہ عقیدہ ذہن میں رہے کہ: "مَنْ بَکیٰ اَو اَبْکیٰ اَوْ تَبَاکیٰ وَجَبَتْ لَہُ الْجَنَّۃُ"، یعنی جو رویا یا جس نے رلایا، یا رونے کی صورت ہی بنائی اس پر جنت واجب ہو گئی۔

قتیل نے جو کچھ لکھا ہے یہ عقیدۂ اہلِ تشیع کے سراسر خلاف ہے۔

میں آ گئیں [1] اگر عرب اپنی نسل اور نسب پر اتراتے تھے تو عجم والے بھی اپنی شوکتِ باستان پر نازاں تھے، یہ دونوں اثرات لے کر مسلمان ہندوستان پہنچے۔ تو یہاں کے باشندے ان سے بھی ایک قدم آگے نظر آئے یعنی انھوں نے پوری انسانیت کو اونچ نیچ کے خود ساختہ معیاروں سے تقسیم کر رکھا تھا۔ اور خود خلاصۂ کائنات بنے بیٹھے تھے۔ یہاں پیشہ وروں کی بڑی جماعت "شودر" کا درجہ رکھتی تھی۔ اہلِ ہند نے مسلمانوں کو بھی شودروں کی صف میں جگہ دی [2] چونکہ اسے مذہبی عقیدے کے طور پر اختیار کیا گیا تھا۔ اس لیے مسلمانوں نے کبھی اپنی اس عزت افزائی پر ہندوستان والوں سے تعارض نہیں کیا، اور اسی حیثیت میں رہنا منظور کر لیا۔ نسلِ انسانی کی یہ تحدید اور ذاتوں کی تنگ نظری کے ساتھ تقسیم۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے قدم جمانے میں یقیناً بہت معاون ہوئی ہو گی [3] چنانچہ انھیں شودروں کے ایک بڑے طبقے کی ہمدردی حاصل ہو گئی جنھیں ابھی تک سوسائٹی نے بنیادی معاشرتی حقوق سے بھی محروم کر رکھا تھا۔ مساوات کا سبق انھوں نے پہلی بار مسلمانوں سے پڑھا اور اس کا آنند محسوس کیا۔ اگرچہ یہاں کے "ذات پات" کے تصورات سے خود مسلمان بھی کسی نہ کسی درجے میں متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس عہد کے مسلمانوں میں بھی نسب کے ساتھ ساتھ حسب (پیشے) پر بہت مبالغے کے ساتھ زور دیا جاتا تھا۔ اگر کسی ایسے خاندان کا شخص ترقی کر کے سماجی امتیاز حاصل کرے جس کے رشتے دار مثلاً کلال رہے ہوں، (جن کا حسب یہ تھا کہ یا تو بادشاہ کی ذاتی خدمت سے متعلق ہوتے تھے، یا فراش اور حاجب وغیرہ ہوتے تھے، یا شراب کشید کرتے اور بیچنے کا کام کرتے تھے، یا بہت ہی غریب ہوئے تو پانی بھرتے تھے) تو وہ اپنے خاندان کو چھپانے لگتا تھا۔ مثلاً مصحفی کلال فرقے سے تعلق رکھتا تھا۔ [4] اس نے اپنے ہم چشموں سے اپنے خاندان کا حال نامعلوم و مخفی رکھا اور ایک موقع پر عبدالقادر رامپوری کو یہ اطلاع دی کہ میں علی گڑھ میں پیدا ہوا تھا [5] مگر میرا خیال ہے کہ اس نے مصلحتاً غلط بیانی سے کام لیا۔ اس لیے کہ عبدالقادر رامپوری امروہے کے خاندانوں سے ذاتی طور پر واقف تھا اور وہ ایک زمانے میں امروہے کا تھانے دار بھی تھا [6]

---

[1] تفصیل کے لیے: محمد نبیلہ حجاب ۔ مظاہرُ الشعوبیۃ فی الأدبِ العربی (مصر ۱۹۶۱ء) نیز احمد امین ۔ ضحی الاسلام

[2] ملاحظہ ہو ۔ ہنست ناتھا (باب دوم)

[3] ELLIOT & DOWSON VOL, II (INTRODUCTION BY PROF HABIB).

متی کلال کا واقعہ ذہن میں رہے جو شاعر تھا اور جہانگیر کا حاجب بھی تھا۔ اس نے نور جہاں سے منت کر کے سفارش کرائی کہ شہنشاہ میرے کلام کو شرفِ سماعت عطا فرمائیں ۔ جہانگیر نے اسے موقع دیا جب اس نے یہ شعر پڑھا:

مئی بہ گریہ سرے دارد لئے نصیحت گر ۔۔۔ کنارہ گیر کہ امروز روزِ طوفان است

تو جہانگیر نے اسے پڑھنے سے روک دیا اور طنزاً کہا کہ پیشے کی رعایت یہاں بھی نہ چھوڑی؟

(سرخوش : کلمات الشعرا ص ۱۰۹)

[4] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ۔ راقم الحروف کا مضمون "ذاتِ مصحفی" مطبوعہ رسالہ برہان دہلی ۱۹۵۷ء

[5] وقائع عبدالقادر خانی

[6] وقائع عبدالقادر خانی

اسی طرح میر سیادت کے مدعی ہیں۔ ممکن ہے ماں کی طرف سے وہ فاطمی ہوں مگر ان کے ہم عصروں [1] نے ان کے حسب پر ایسا طعن کیا ہے جس سے شبہ ہوتا ہے کہ ان کے خاندان میں کسی وقت نان بائی کا پیشہ ہوتا تھا۔ قتیل نے اس زمانے کے ان تصورات کو قدرے تفصیل سے پیش کیا ہے، اور بظاہر وہ ان مروج اقدار کا مخالف نہیں۔ ہمدرد ہے۔

وہ کہتا ہے کہ "بعضے امیر مرثیہ خوانوں کو بھی محرم کے سوائے اپنی مجلس میں بٹھانے کے لائق نہیں سمجھتے" [2] حالانکہ محرم کے دنوں میں ان روضہ خوانوں کی بڑی آؤ بھگت کرتے تھے۔

سمارتکوں کے بیان میں قتیل نے یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ ان کی بت پرستی ایسی نہیں ہے کہ وہ بتوں کو خدایا خدا کا مظہر سمجھتے ہوں۔ عقیدۂ خواص ہی قابل اعتبار ہے۔۔۔ لیکن اس فرقے کے عوام یقیناً بتوں کو خدا سمجھتے ہیں" [3]

اس کے بعد "سرآوگ" کا ذکر ہے، جو عبادت بدنی و مالی کا معتقد نہیں ہے، یہ مسئلہ مسلمانوں میں بھی نزاعی رہا ہے۔ چنانچہ سرسید احمد خاں نے اس سلسلے میں متعدد مضامین لکھے ہیں۔ وہ بھی عبادت بدنی کے قائل نہیں تھے۔ پھر سرآوگی کا بیان ہوا ہے جس کے ہاں آہنسا کا عقیدہ نہایت مضحک صورت اختیار کر گیا ہے۔ آج بھی یہ بات غور و فکر کا نتیجہ موضوع ہے کہ ہمارا ملک، جہاں ایسے لوگ بھی آباد ہیں جو "جیوہتیا" سے بچنے کے لیے ناک پر کپڑا باندھتے ہیں اور جو نظریاتی حیثیت سے دنیا کے تمام ممالک سے زیادہ عدم تشدد کا حامی ہے، اعداد و شمار کی روشنی میں یہاں کے

---

[1] مثلاً میر کی آپ بیتی/ ۹۸ نیز دلی کالج میگزین (میر نمبر، مرتبہ راقم الحروف، صفحات ۴۸، ۵۵، ۵۶) کلیات میر میں بھی ایسے اشعار مل جاتے ہیں جن میں سیادت کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ میر نے اپنے سوتیلے بھائی محمد حسن کے نام کے ساتھ کہیں "میر" نہیں لکھا۔ اس سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید ان کی ماں فاطمی ہوں، مگر اپنے باپ کو بھی وہ "میر محمد علی" لکھتے ہیں۔ میر کی آپ بیتی (طبع اول/ ۹۱)

مثلاً سودا کا یہ قطعہ:

بیٹھے تنور طبع کو جب گرم کر کے میر	کچھ شیرمال سامنے کچھ نان کچھ پنیر
میری سکے اب تو سارے مصالح ہیں مستعد	بنتا تو گندنا ہے اور آپ کو تھا میر

(آب حیات طبع دہم/ ۲۰۴)

یا قائم چاند پوری کے دیوان (قلمی نسخہ انڈیا آفس لندن) میں یہ رباعی ملتی ہے:

روٹی کے لیے کہائے تم بھر جی میر	کہیے تو بجا ہے آپ کو خبز خمیر!
پر میر ہوئے یہ اس طرح کے جیسے	ساگوں میں ہے کوتھ میر ساگوں میں میر

خود میر نے بھی ذکر میر میں کبود جامہ کے سیرابہ پز (نہاری فروش) کا قصہ عجیب سے رمزیہ انداز میں بیان کیا ہے۔ اگرچہ کوئی دستاویزی ثبوت ملنا مشکل ہے۔ لیکن میرا خیال یہی ہے کہ میر کے خاندان میں کچھ لوگ اس پیشے سے متعلق رہے ہوں گے۔

[2] ہفت تماشا: باب دوم۔

[3] مرزا مظہر بھی اُن صوفیہ میں ہیں جو ہندوؤں کی بڑی جماعت کو "مشرک" نہیں سمجھتے (کلمات طیبات مکتوب چہار دہم)

باشندے دنیا کے سب سے زیادہ متشددانہ عوام ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان نظریات پر اتنے سیلقے سے زور دینے کا مقصد بھی یہی ہے کہ ہندوستانی باشندوں کو اپنے اس امتیاز کا احساس رہا ہے حال ہی میں ایک روسی پروفیسر نے ایسے اعداد و شمار پیش کیے تھے جن میں بتایا گیا تھا کہ ہندوستان میں عوامی بلووں کا سالانہ اوسط دنیا کے دوسرے سب ممالک سے زیادہ ہے۔ ایسی ہی بات ایک مستشرق نے ایرانیوں کی نسبت لکھی ہے کہ فارسی میں اخلاقی شاعری کی جتنی مقدار ہے اور جس بڑی تعداد میں اخلاقیات پر کتابیں لکھی گئی ہیں، اور ان میں جا بجا سچائی، راستی اور ایمانداری کی تبلیغ میں جو مبالغہ کیا گیا ہے اس کا سبب یہی ہے کہ ایرانی باشندوں میں ان صفات کا دوسری سب قوموں کی نسبت بہت زیادہ فقدان ہے۔

ممکن ہے یہ تاریخی عمل ہو یا سیاسی اور اقتصادی صورتِ حال کا ردِ عمل، یا جغرافیائی اثرات کا کرشمہ، کہ ہندوستانی فلسفے کے تمام مذاہب عدم تشدد کی کیلی پر گھومتے ہیں۔ اب ہمارے زمانے میں گاندھی جی بھی ان نظریات میں اتنے متشدد تھے کہ انہوں نے ایک بار دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں یہ بیان دے دیا تھا کہ ہمارے ملک پر اگر جاپان نے حملہ کیا تو ہم سرحد پہ ہار سے کر کھڑے ہو جائیں گے۔ اور ان کا استقبال کریں گے! ان کا مطلب یہ تھا کہ ہم اپنی اہنسائی پالیسی پر بدستور قائم رہیں گے۔ مولانا آزاد کا بیان ہے کہ انہوں نے گاندھی جی کے اس بیان پر احتجاج کیا اور اس کی تردید شائع کرائی تھی [1]

مسلمانوں کے زمانۂ اقتدار میں 'عالمی قانون کا تقاضا تھا، کہ محکوم قومیں ان کے قریب آنے کی کوشش کریں۔' کلچر سے بڑھ کر یہ بات مذہبی عقائد تک پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ اسی کتاب میں آپ حسینی برہمنوں کا حال دیکھیں گے [2] کہ انھوں نے اپنا ناتا کس طرح واقعات کربلا سے جوڑ دیا ہے۔ یا جے پور کے اولو العزم مہاراجہ کا رشتہ یوں قائم کیا ہے کہ ان کے اجداد نوشیرواں عادل کی نسل سے تھے اور "راجپوتوں سے ہمشیر زادگی کا" رشتہ ثابت کرتے ہیں اور اسے حضرت شہر بانو کے واسطے سے کہتے ہیں جنہیں حضرت علی اصغر کی عجمی والدہ سے نسبت ہمشیر زادگی تھی۔۔ یہ راجپوت نوشیرواں عادل کی نیک نامی اور اسلام کے طنطنے پر نظر رکھتے ہوئے اس فرضی قرابت کا اقرار کرتے ہیں اور اسے آخرت کا سرمایہ سمجھتے ہیں۔" [3]

ایسی روایات بھی زبان زد ہو جاتی تھیں کہ کربلا میں حضرت حسین کی حمایت کرنے کے لیے ہندوستان سے ساہس راؤ نامی ایک شخص بھیجا گیا تھا۔ پریم چند نے اسے اپنے ڈرامے کربلا کا کردار بنا دیا ہے [4] تاریخی اعتبار سے تو یہ سب خرافات ہیں، لیکن ایسی روایتوں کے بین السطور میں ہم بہت کچھ پڑھ سکتے ہیں۔

اسی ذیل میں شنوتی فرقہ بھی آتا ہے۔ جس کا ذکر قتیل نے باب دوم میں کیا ہے " ان کی عادت ہے کہ رمضان کا چاند دیکھ کر عید تک خوب نمازیں پڑھیں گے۔ پورے روزے رکھیں گے اور کلام پاک کی تلاوت بھی کریں گے۔ غرض کہ رات رات بھر عبادت میں گزار دیں گے۔ نماز حنفی مسلک کے مطابق پڑھیں گے۔ ہندو مذہب کے برت بھی رکھیں گے۔ محرم میں تعزیہ داری کریں گے اور کالکاجی کے میلے میں جا کر کالکا مندر کے سامنے ناچیں گے بھی منترا

---

[1] AZAD: INDIA WINS FREEDOM: PP 31,39.

[2] اس فرقے کے لوگ خال خال ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ تھی کہ ہندوؤں کے آگے کبھی دستِ سوال دراز نہیں کرتے۔ مسلمان جو کچھ دیتے ہیں اس پر بسر اوقات کرتے ہیں

[3] ہفت تماشا (باب دوم)

[4] ملاحظہ ہو: پریم چند کے ڈرامے " از راقم الحروف (شمولہ دید و دریافت) نیز نقادر کانپور پریم چند نمبر

اور بندرابن میں آرتی اور اشلوک پڑھیں گے۔ گائے اور سور کے گوشت سے پورا پورا پرہیز کریں گے، وغیرہ۔ ان کے نام مسلمانوں جیسے ہی ہیں۔ قتیل نے ان کی ابتداء کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ انہوں نے جبر واکراہ سے اسلام قبول کیا ہوگا۔[1] اور بعد میں ان کے لیے ہندو دُوں میں بھی گنجائش نہیں رہی۔ مجبوراً آدھا تیتر آدھا بٹیر ہو کر رہ گئے۔ یا پھر شک اور جہالت میں گرفتار ہیں۔" یہ اسباب بھی ہو سکتے ہیں؛ لیکن میں اس کی تعبیر یوں کروں گا کہ ہندو معاشرے میں انصاف اور سماجی مساوات نہ ملنے کی وجہ سے انھوں نے اسلام قبول کیا، چونکہ ان کو اتنی تعلیم نہ مل سکی کہ وہ اپنے ہزاروں برس کے خرافی تصوّرات اور تہذیبی و سماجی معمولات کو بھی بدل سکیں۔ اس لیے انھوں نے مذہبی عقیدوں میں لچک پیدا کر لی۔ یعنی اُن کا مذہب اسلام رہا اور تہذیب ہندو۔ آج بھی ہندوستان کے بیشتر دیہاتوں میں ایسے لوگ مل جائیں گے جو باعتبار خاندان مسلمان ہیں، لیکن تمام تر ہندو مذہب میں رنگے ہوئے ہیں۔[2] خصوصاً ان علاقوں میں جو مسلمانوں کے تہذیبی اور علمی مراکز سے دور رہ جا پڑے ہیں۔ جیسے راجستھان، گجرات، مدھیہ پردیش وغیرہ۔ یہ لوگ صحیح معنوں میں دو مختلف تہذیبوں کے سنگم کا نمونہ پیش کرتے ہیں۔ اس سے غرض نہیں کہ یہ نمونہ اچھا ہے یا اسے مذموم سمجھا جائے۔

قتیل نے لکھا ہے کہ ہندوؤں کے اور فرقے بھی ایسے ہیں جو مسلمانوں کے رہن سہن اور خوراک اور پوشاک کو پسند کرتے ہیں اور ان کی گفتگو سے متاثر ہو کر یا اہل اسلام کی شان و شوکت دیکھ کر متحیر ہو جاتے ہیں اور جوق در جوق صوفیوں کی اطاعت میں آ جاتے ہیں۔ ان میں بہت سے لوگ شیعوں کی حکومت ہونے کے باعث تشیع کی طرف جھکتے ہیں۔ یہ الزام تو بہت پرانا ہو چکا کہ اسلام تلوار کے ذریعے پھیلا، ہندوستان کی حد تک تو یہ بہت آسانی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مغلوں کی شائستگی اور کلچر کی برتری نے یہاں کی قوموں کو تبدیل مذہب پر آمادہ کیا۔ اس کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہوگی۔

قتیل نے انگریزوں کے ملکی نظم و نسق کی تعریف کی ہے۔ اس سے بالواسطہ دیسی انتظام کی خرابیوں کا علم ہوتا ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے کہ شاہی وقتوں میں اکثر سنیاسیوں اور بیراگیوں میں کشت و خون ہوتا تھا مگر اب " صاحبان عالی شان انگریز بہادر کے نظم و نسق کی وجہ سے یہ لوگ سر نہیں اٹھا سکتے ... یہ رعب خداداد ہے ورنہ اتنی بڑی جماعتوں سے کسی قدیم عادت کا چھڑا دینا محالات میں سے تھا۔[3]

---

[1] قتیل نے پچھلے باب میں یہ بھی لکھا ہے کہ ڈولے کی رسم جو اکبر کے زمانے سے شروع ہوئی۔ جبر واکراہ کی وجہ سے بھی ممکن ہے۔ ابتدا میں ایسا ہی ہو، لیکن یہ رسم تو بہادر شاہ ظفر کے عہد تک نبھائی گئی ہے۔ جس غریب کا اختیار اپنے اوپر بھی نہ رہا تھا۔ میں اسے مخلوط کلچر کی دین سمجھتا ہوں۔ اس میں سیاسی قوت یا بالادستی کے خوف کو کچھ دخل نہ تھا۔

[2] اسلام کے ہر دور میں اور ہر علاقے میں یہ ہوا ہے کہ تبدیل مذہب کرنے والے اپنا تہذیبی اور تاریخی سرمایہ لے کر اسلام میں داخل ہوئے اور پھر انہوں نے اسلامی عقائد و تصورات کو ان سے مسخ یا متاثر کیا ہے۔ اس کا نہایت دل چسپ تجزیہ پروفیسر احمد امین المصری نے اپنی کتاب فجر الاسلام اور ضحی الاسلام میں کیا ہے۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر محمد اشرف کی آپ بیتی بھی ملاحظہ فرمایئے۔ جو نقوش (لاہور) کے آپ بیتی نمبر میں شامل ہے۔

[3] ہفت تماشا (باب دوم)

دوسرے موقع پر اس نے انگریزی ڈاک کے نظام کی تعریف کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ اس میں خط ہرگز گم نہیں ہوتا، دیسی ڈاک میں ضائع ہو جاتا ہے۔ "خطِ احدے را ڈاکِ انگریزی تلف نمی شود اگر مکتوب الیہ کہ خط برائے ودست ہم بجائے حرکت کند باز خط را ضائع نمی کنند یا بمکتوب الیہ می رسد، اگر در بیان قرب وجوار تردّد دارد، دالاّ بہر کہ نوشتہ است پس می دہند۔ بخلاف ڈاکِ جناب عالی کہ ہمیشہ در چہار خط دو خط بباد می رود[1]"

اس طرح ناگے سنیاسیوں کا بیان پڑھ کر یہ سمجھ میں آجائے گا کہ امرائے ریاست ان لوگوں کو اپنے مقاصد کے لیے کیوں ملازم رکھتے تھے، مثلاً شجاع الدولہ کی سرکار ہی میں کئی سو ناگے ملازم تھے[2]۔

بیدانتیوں کے ذیل میں قتیل نے صوفیہ کا بھی ذکر کیا ہے اور کہا ہے کہ "تحفۂ اثنا عشریہ کے مصنف مولوی عبدالعزیز کے والد شاہ ولی اللہ محدث اپنی تصنیف موسومہ بہ قرۃ العین فی تفضیل الشیخین میں لکھتے ہیں کہ علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ نے اس جماعت کو قتل کر دیا تھا۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ وہ لوگ باطل کے پیرو تھے۔ کیونکہ علی کا انھیں قتل کرنا اس جماعت کے عقائد کے باطل ہونے کی قوی دلیل ہے۔ اصل خواہ کچھ ہی ہو اس کا مفہوم یہی ہے جو میں نے لکھا ہے"[3]

صوفیہ کے بارے میں قتیل کی رائے سنی سنائی معلوم ہوتی ہے وہ محی الدین ابن عربی کی فصوص الحکم کے حوالے سے لکھتا ہے کہ "اس جماعت کا ہر فرد اپنے تئیں خدا سمجھتا ہے" یہ غلط محض ہے اسی طرح یہ قول کہ "صوفیوں کے اعمال وہی ہیں جو بیدانتیوں کے اعمال ہیں" بہت عامیانہ انداز کا ہے۔ فلسفہ بیدانت کا اثر ہندوستانی صوفیہ کے افکار پر ضرور پڑا ہے۔ لیکن اس میں بہت زیادہ مماثلت مغلوں کے دور میں پیدا ہوئی۔ اسی فکری ارتباط کا ایک نتیجہ دارا شکوہ کی مجمع البحرین[4] ہے۔ اس سے پہلے صوفیہ کے عقائد (خصوصاً مغلوں سے ماسبق عہد میں) ایرانی اثرات کے حامل تھے، انھیں بیدانتی نہیں کہا جا سکتا۔ قتیل نے چشتی سلسلے کے بارے میں یہ کہا ہے کہ "رقص و وجد جو چشتیہ سلسلے میں رائج ہے۔ انھوں نے بیراگیوں سے سیکھا ہے کیونکہ وہ لوگ بھی اکثر بتوں کے سامنے رقص کرتے تھے" یہاں بھی قتیل نے سطحی معلومات پر بھروسا کیا ہے۔ ایران میں تو بیراگی نہ تھے، وہاں رقص و سماع کا ذکر حافظ شیرازی ہی کے بیشتر اشعار میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً

ببیں کہ رقص کناں می رود بنالۂ چنگ
کسے کہ اذان نمی داد استماع سماع

اسی طرح وہ بعض خرافی روایات کی تطبیق پر قیاس کرتا ہے۔ مثلاً ایک قصہ سکھدیو اور جنک کا بیان کر کے لکھتا ہے کہ میں نے کسی کتاب میں یہی قصہ چشتیوں کے پیشوا ابراہیم ادھم سے منسوب دیکھا ہے۔ اس قسم کی روایات، کرامات، یا خرافی حکایات کسی فیصلے کا مدار نہیں ہو سکتیں

---

[1] معدن الفوائد/ ۱۱

[2] نجم الغنی: تاریخ اودھ جلد دوم

[3] ہفت تماشا (باب دوم)

[4] دارا شکوہ: مجمع البحرین، مرتبہ محمد محفوظ الحق۔ طبع کلکتہ ۱۹۲۹ء

یہ تو اسلام اور یہودیت و عیسائیت میں بھی مشترک ہیں [1]

غرض کہ صوفیہ کے بارے میں قتیل نے جو کچھ لکھا ہے اس میں تین باتوں کو خاص طور سے ملحوظ رکھا جائے، اوّلاً یہ کہ وہ صوفیائے سوء پر قیاس کرتا ہے، ثانیاً اسے تصوف کا نہ عملی تجربہ ہے نہ کتابی علم ہے، سوم یہ کہ وہ بہرحال شیعہ ہے اور شیعوں کے زمانۂ اقتدار میں تصوف کے خلاف جو ذہن پیدا ہو گیا تھا۔ اس کی ترجمانی کر رہا ہے۔ اس نے جو کچھ لکھا ہے اس کا معتد بہ حصہ قابل قبول ہو سکتا ہے۔ اگر اعتراض کا رُخ تصوف سے ہٹ کر محض بناوٹی صوفیوں اور تصوف کی قبیح رسوم و عقائد کی طرف ہو۔ لیکن اسے بے دلیل اور علی الاطلاق رد کرنا، سوائے مذہبی تنگ نظری کے کچھ نہیں ہو سکتا۔

اس سے قطع نظر ان مماثل حکایتوں میں جو ہندوؤں کے اوتاروں اور مسلمانوں کے صوفیوں سے منسوب کر دی گئی ہیں، ہندوستانی فکر اور اسلامی تصوف ایک دوسرے سے قریب آتے ہوئے تلاش کیے جا سکتے ہیں اور ان کا گہرا مطالعہ ہمیں بعض اچھے علمی نتائج تک پہنچا سکتا ہے۔

باب چہارم میں ہندوستانی تہواروں کا ذکر ہے۔ اس کے مطالعے سے واضح ہوگا کہ اپنی حکومت کے زمانے میں مسلمان یہاں کے تہواروں میں عام طور سے حصہ لیتا تھا۔ نہ صرف بادشاہ اور امراء ہندوستانی تہوار مناتے تھے۔ جن کی تفصیلات تاریخ کی کتابوں میں مل سکتی ہیں بلکہ عوام بھی پورے جوش و خروش سے شرکت کرتے تھے۔ اگرچہ ان کے بعض رسوم و اعمال اسلامی عقائد کے صریحاً خلاف نظر آتے ہیں۔ مثلاً دسہرے کے بعد ہندو عوام میں نیل کنٹھ کے دیدار کا رواج ہے، اکثر مسلمان بھی اس میں ان کے مقلد تھے [2] اسی طرح ہولی مسلمانوں میں بھی کھیلی جاتی تھی۔ نیز دیوالی کے سلسلے میں مسلمانوں کے رسوم کا جو بیان قتیل نے کیا ہے وہ خاص طور سے توجہ کے لائق ہے۔ انگریز بہادر نے اپنے سیاسی مقاصد کے لیے اس اتحاد و ارتباط میں رخنے پیدا کر دیے اور ہولی کا رنگ مسلمانوں پر ڈالنا خلاف قانون بنا دیا [3] تا آنکہ مسلمان رفتہ رفتہ ہندوستانی تہواروں سے دستکش ہو گئے۔

لیکن اس بیان کو حجت بنا کر یہ نہ کہا جائے کہ اب ان روایات کو زندہ کرنے میں کیا مانع ہے۔ کیونکہ آج ہندوستانی مسلمانوں کا موقف اس زمانے سے قطعاً مختلف ہے۔ اب سیاسی مصالح سامنے آتے ہیں اور صدیوں کی بنی ہوئی خلیج ایک دن میں پاٹی نہیں جا سکتی۔ اپنی غلطی کا اعتراف اور دوسروں کی کوتاہی سے درگزر کرنے کے لیے بڑی عالی ظرفی اور بلند حوصلگی کی ضرورت ہے، ان سب کے ماسوا آج ہندوستان کا طبقۂ اکثریت احساس برتری میں مبتلا ہے، اور اس کا ردِ عمل مسلمانوں پر لازماً احساس کمتری کی شکل میں ہو رہا ہے۔ اس لیے موجودہ حالات میں یہ بہت دشوار

---

[1] ڈاکٹر رادھا کرشنن نے ہندو فلسفہ و تہذیب کے اثرات سے بحث کرتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ ہندوستانی رسوم و عقائد سے مسلمانوں کے دوسرے فرقوں کی نسبت شیعہ سب سے زیادہ متاثر ہوئے ہیں۔ انہوں نے غالباً رسوم تعزیہ داری پر قیاس کیا ہے ملاحظہ ہو۔

RADHAKRISHAN: EASTERN PHILOSOPHY AND WESTERN THOUGHT

(OXFORD, UNIVERSITY, 1964)

[2] ہفت تماشا (باب چہارم)

[3] ہفت تماشا (باب چہارم)

ہو گیا ہے کہ ایک بڑا طبقہ مخلوط تہذیب کو نظری اور عملی سطح پر برابر پھیلاتا رہے۔ پھر بھی اقلیت سے یک طرفہ تعاون حاصل رہے۔ ماضی کی ان شیریں روایات کو زندہ کرنے کے لیے دونوں فریقوں کو اپنی ذہنی سطح میں بہت کچھ فراز پیدا کرنا ہوگا۔

ہندوستانی تہواروں کے بیان میں یا ہندوستانی شادی بیاہ کی رسموں میں عرسوں، میلوں ٹھیلوں، نذر نیاز اور ایسی ہی دوسری معاشرتی چیزوں میں یہاں کے مسلمانوں نے ہندو طرز معاشرت کا کتنا گہرا اثر قبول کیا، اس کا بیان تاریخ کی کتابوں میں جا بجا ملے گا اور اس کتاب میں یک جا بہت کچھ مل جائے گا۔ لیکن ان باتوں کا تعلق زیادہ تر عوام سے یا متوسط طبقوں سے ہے۔ اعلیٰ فکری سطح پر بھی ہمیں اس تہذیبی اختلاط کی شہادتیں مل سکتی ہیں۔ خصوصاً صوفیانہ افکار کے وسیلے سے علمی اور ہندی اثرات اسلامی فکر تک بہت آسانی سے پہنچ گئے تھے۔ پھر بھی جس چیز نے ہندوستان کے مسلمانوں کی مذہبی اور فکری انفرادیت کو برقرار رکھا، وہ دو نمایاں باتیں تھیں۔ ایک تو اسلامی فقہ کی جامعیت اور زندگی کے تمام مسائل و معاملات کا احاطہ، یعنی مسلمان ملوک اور امراء اپنے غلط اعمال کی بھی فقہی تاویل و توجیہہ تلاش کرتے تھے اور اپنے تئیں اسلامی فقہ کی گرفت سے آزاد نہیں سمجھتے تھے[1] پس یہ تو ممکن تھا کہ وہ جس مسلک میں اپنے لیے عملی سہولت دیکھیں اسے اختیار کر لیں، لیکن اسلام نے جس طرح نکاح، طلاق، بیع و شریٰ اور مذہبی فرائض کی شرعی حد بندی کر دی تھی۔ اس کا لازمی تقاضا تھا کہ وہ بحث بڑھتے بڑھتے جزئی مسائل تک پہنچ جائے۔ تعبیر کی غلطی نے ہمیشہ ہر فلسفے کو مسخ کیا ہے۔ یہاں بھی یہ آزادی "مدحتِ غراب" کی بحثوں تک پہنچی۔ لیکن مجھے سر دست صرف اس مسئلے سے سروکار ہے کہ فقہی حد بندیوں نے مسلمانوں کی معاشرتی انفرادیت باقی رکھنے میں غیر معمولی رول ادا کیا ہے۔

دوسری خصوصیت مسلمانوں کی تہذیبی برتری تھی۔ وہ اپنی میراث میں عرب و عجم کی ہزاروں سال کی تاریخ اپنی پشت پر لے کر آئے تھے اور انھیں اس کی ضرورت نہیں تھی کہ نشست و برخاست کے معمولی آداب سے لے کر مہمات مسائل تک کہیں بھی وہ دست نگر رہے ہوں۔ خود ایرانیوں اور ترکوں کی تہذیبی میراث اتنی قیمتی تھی کہ نہ صرف مسلمانوں کے معاشرتی تقاضوں کی تکمیل کر سکے بلکہ دوسری اقوام کے لیے بھی نمونہ بننے کی صلاحیت رکھتی تھی۔

ہندوستان کی معاشرت کا بیان پہلی بار قدرے تفصیل سے بابر نے اپنی تزک میں کیا ہے۔ اس سے یہ دیکھنا چاہیے کہ مغل شائستگی نے یہاں قدم جمائے اور شیوع حاصل کیا تو ہندوستانی سوسائٹی کا کیا رنگ تھا۔ ایک تو حاکمانِ وقت کی تہذیب اور فیشن قدرتی طور پر سند اور نمونہ بن جایا کرتا ہے۔ دوسرے یہاں کی تہذیب کمتر ہونے کے ساتھ بہت ہی محدود طبقے میں سمٹی ہوئی تھی۔ اس لیے پہلی بار تہذیبی قدروں کی تعمیم مسلمانوں ہی کے دور میں ہوئی۔ یہ تہذیب کیا تھی؟ اسے چند لفظوں میں بتانا مشکل ہے۔ اس کتاب کے سوا شرر کی کتاب "مشرقی تمدن کا آخری نمونہ"

---

[1] تاریخ کی کتابوں میں اس کی بہت دلچسپ مثالیں ملیں گی، ازاں جملہ وہ واقعہ یاد کرنا چاہیے جو ملا عبدالقادر بدایونی نے اکبر کے درباری فقہا کے سلسلے میں لکھا ہے کہ اس نے سوال کیا بیک وقت کتنی عورتوں کو نکاح میں رکھنا جائز ہے۔ فقہا نے تین سے اٹھارہ تک مختلف عدد بتلائے۔ آخر بدایونی نے کہا کہ "متعہ امام مالک اور شیعہ علما کے نزدیک مباح، امام شافعی اور امام اعظم کے نزدیک حرام ہے۔ جب مالکی مذہب کا قاضی اس کا حکم باضابطہ صادر کر دے تو اس وقت امام اعظم کے مذہب میں بھی باتفاق مباح ہو جاتا ہے۔" بادشاہ نے فرمایا ہم قاضی حسین عرب مالکی کو قاضی بناتے ہیں۔ اور قاضی یعقوب کو آج سے معزول کرتے ہیں۔ اسی وقت قاضی حسین کو وکیل بنایا گیا اور اس نے متعہ کے جواز کا فتویٰ دے دیا۔" (بدایونی: منتخب التواریخ (اردو ترجمہ) ۴۳۸ - ۴۳۹)

بھی نظر میں رکھیے تو زیادہ واضح تصویر ذہن میں آسکتی ہے۔

مسلمانوں کے اثر سے یہاں کے ہندو شرفا کی خواتین نے بھی پردہ شروع کر دیا تھا اور وہ اس میں مسلمانوں سے زیادہ اہتمام کرنے لگے تھے۔ رابندر ناتھ ٹیگور نے اپنی خود نوشت میں لکھا ہے کہ ان کے بچپن تک بنگال کی شریف ہندو عورتیں اتنا سخت پردہ کرتی تھیں کہ انہیں گنگا اشنان کرنا ہوتا تھا تو پالکی میں سوار ہو کر جاتی تھیں جس پر چاروں طرف سے پردہ پڑا رہتا تھا، اور انہیں پالکی سمیت دریا میں غوطہ دیا جاتا تھا[۱] قتیل نے بھی لکھا ہے کہ اٹھارھویں صدی میں معیارِ تہذیب و شرافت یہ تھا کہ مسلم تہذیب سے کتنی مماثلت ہے "جن ہندوؤں کو مہذب مسلمانوں کی صحبت میں رہنے کا اتفاق ہوا ہو، یہ دستور ہے کہ لڑکا صبح کو بیدار ہو کر اپنے والد کو سلام کرتا ہے۔ چاہے وہ ایک ہی کمرے میں سوئے ہوں اور ان میں تربیت یافتہ لڑکے اپنے باپ کو "آپ" سے مخاطب کرتے ہیں۔ ... اس گروہ کے اکثر لوگ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے نام کی ہنسلی اپنے بچوں کے گلے میں ڈالتے ہیں اور ان کی نیاز کا کھانا پکواتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر لوگ شیعی عقیدے کی طرف مائل ہو کر اپنے بچوں کے نام کا تعزیہ مسلمانوں کے گھروں سے اٹھواتے ہیں۔ کچھ لوگ صوفیوں کے عقائد کی پیروی کر کے اپنے بھائیوں سے چھپ کر، مسلمانوں کو عرس کے لیے روپیہ دیتے ہیں، اور کسی چشتیہ، قادریہ یا سہروردیہ سلسلے کے بزرگ کا عرس کراتے ہیں۔ ان میں سے کچھ لوگ اپنی عورتوں کو پردے میں بٹھاتے ہیں اور مسلمانوں کی تقلید میں انہیں چوپالے کی سواری میں اپنے رشتہ داروں کے ہاں بھیجتے ہیں"[۲]

اس کتاب میں قتیل نے ہندوستانی فرقوں کی ان رسموں کا بیان بھی کیا ہے جو پیدائش سے موت تک انجام پاتی ہیں۔ انھیں اس نظر سے دیکھنا چاہیئے کہ تہذیبی اختلاط کے اس دور میں یہ رسوم مسلمانوں کی زندگی میں کہاں تک اثر انداز ہوئیں۔ یہ مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

دنیا میں جہاں بھی اقتصادی تقسیم ناہموار رہی ہے اور عام لوگوں کو اپنی ضروریاتِ زندگی میں دوسروں کا دست نگر رہنا پڑا ہے۔ وہاں علم بھی سمٹ کر محدود ہوا ہے؛ اور اس کے نتیجے میں توہم پرستی و ضعیف الاعتقادی نے عوام کو زندگی کی ہفت خواں طے کرنے میں بڑی مدد دی ہے یہ ممکن نہیں کہ عقل کی روشنی میں انسان اتنا کرب آفریں سفر طے کر سکے۔ یہ توہمات ہی ہیں جو دکھی انسانوں کو کارزارِ حیات سے نکال لے جاتے ہیں؛ ایک بڑی طاقت پران کا غیر متزلزل اعتقاد ہی انہیں اپنے سماج کی زور آور قوتوں کے مقابلے کا حوصلہ عطا کرتا ہے۔ ہفت تماشا میں آپ کو ہندوستانی عوام کی سچی تصویر نظر آئیگی۔ جہاں شیخ سرور، شیخ سدو، شاہ مدار، سیتلا دیوی سب اپنی اپنی نبرد آزمائی میں معروف ہیں۔ شاہ مدار کی چھڑیاں بڑی دھوم سے منائی جاتی تھیں، دور و نزدیک سے لاکھوں انسان قافلہ در قافلہ چلتے تھے اور ہفتوں تک جشن رہتا تھا "چھڑیوں" کی وجہ تسمیہ غالباً یہی تھی کہ یہ قافلے جھنڈیاں اور علم لے کر چلتے تھے جو "شاہ مدار کے جھنڈے" کہلاتے تھے۔ اور میرا خیال ہے کہ ہندوستانی شعبدے بازوں کو، یا ان لوگوں کو جو بندر، بھالو وغیرہ نچاتے ہیں، مداری بھی اسی لیے کہا جاتا ہے۔ شاہ مدار کے مریدوں میں اکثریت ایسے ہی جہلا کی تھی کہ وہ سال بھر تک محنت کر کے جو کچھ کماتے تھے اسے ایک ہی ہفتے میں شاہ مدار کے نام پر لٹا دیتے تھے۔ اسی لیے اردو میں کہاوت "مرتے کو ماریں شاہ مدار" آج تک

---

[۱] KRISHNA KIRPALANI : RABINDRANATH TAGORE : A. BIOGRAPHY (LONDON, 1962) P 18

[۲] ہفت تماشا (باب پنجم)

چلی آتی ہے۔

یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ میر حسن نے دہلی سے لکھنؤ کا سفر انھیں مداریوں کے قافلے کے ساتھ کیا تھا اور اس جلوس کا انہوں نے اپنی مثنوی میں[1] ذکر کیا ہے۔ ان کی مثنوی کا تہذیبی پس منظر تفصیل سے سمجھنے کے لیے بھی اس معاشرت کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

سخی سرور یا سرور سلطان وغیرہ کے بارے میں ٹمپل نے اپنی کتاب میں تمام خرافی حکایات کو جمع کر دیا ہے، وہاں تفصیل دیکھی جا سکتی ہے[2]۔

دوسری بات جس پر میں زور دینا چاہتا ہوں یہ ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دورِ حکومت میں ہندوستانی فرقوں کے مذہبی معاملات میں کبھی مداخلت نہیں کی، حتیٰ کہ ہندوؤں نے مذہبی عقیدے کے طور پر انھیں "راکشس" "اللہ" "شودر" سمجھا تو اس پر بھی قناعت کر لی، ایسا ہی معاملہ دوسرے رسوم و عقائد کا تھا، جن میں ایک ستی کی رسم بھی ہے۔ انگریزوں نے بعد میں راجا رام موہن رائے کی پر تحریک پر اسے خلاف قانون قرار دیا اور بڑی کوششوں سے اس قبیح رسم کو بند کیا۔ لیکن مسلمانوں نے اپنے دورِ حکومت میں اس کی قباحت کو اپنی مذہبی رواداری کے جذبے کی بنا پر برداشت کر رکھا تھا۔ آج جبکہ تاریخ کی اُلٹی تعبیر کرنے کی ہوا چل رہی ہے۔ اسے بھی مسلمانوں کے نسق کی کمزوری سمجھا جائے گا۔ قتیلؔ نے ستی کی رسم کا جو بیان کیا ہے وہ غور سے پڑھنے کے قابل ہے:

"ستی کا جلوس حاکم وقت کے دروازے کے سامنے سے نکلتا ہے۔ کبھی کبھی حاکم بھی اس میں شریک ہو جاتا ہے۔ یہ بات داخل آئین ہے کہ چاہے حاکم ہندو ہو یا مسلمان وہ ستی کے جلنے سے پہلے، اس کی خواہش کے مطابق روپیہ دینے کا وعدہ کرتا ہے، اگر وہ دیکھتا ہے کہ ستی روپیہ لینے کے لیے راضی نہیں ہوتی تو مجبوراً گھر واپس ہو جاتا ہے۔ ستی کے جلوس کے ساتھ نوبت بجانے کا حکم بادشاہوں اور امراء کی طرف سے ہے۔ جب ستی لکڑیوں کے انبار پر بیٹھ کر اپنے شوہر کے سر کو اپنے زانو پر رکھ لیتی ہے تو اس وقت بھی حاکم یا بادشاہ کی طرف سے کوئی شخص جا کر اس سے آئندہ زمانے کا حال پوچھتا ہے تاکہ بادشاہ وقت اور اس کی بیوی کے حق میں اس کی زبان سے دعائے خیر نکلے۔

ظاہر ہے کہ ستی اگر جان بچا کر بھاگ نکلے تو اس کی بقیہ زندگی موت سے بدتر گزرتی ہے، جس شے پر اس کی چھایا پڑ جاتی تھی اسے بھی ناپاک سمجھا جاتا تھا۔ ایسی صورت میں اگر مسلمان بادشاہ اپنے اختیارات حکومت سے کام لے کر ستی کو غیر قانونی قرار دے بھی دیتے تو برادری اور سماج میں اس غیر منصفانہ سلوک پر کس طرح پابندی لگا سکتے تھے؟ اور اس زمانے کے جاہل عوام اس کی تعبیر یہی کرتے کہ مسلمان حاکم ہمارے مذہبی امور میں بے جا مداخلت کر کے ہمارے دھرم کو نشٹ کرنا چاہتے ہیں اس سے دلوں میں گرہیں پڑ جاتیں اور حکومت کرنا مشکل ہو جاتا۔

شادی کی رسمیں دوسری تمام رسموں سے زیادہ مسلمانوں میں مقبول ہوئیں۔ آج بھی شمالی ہندوستان کے مسلمان گھرانوں میں شادی کے موقع پر یہی تماشا ہوتا ہے۔ جو قتیلؔ نے ہفت تماشا میں لکھا ہے۔

— ۴ —

---

[1] میر حسن۔ گلزار ارم (مجموعہ مثنویات میر حسن۔ نول کشور ۱۹۴۵ء) ص ۱۳۶-۱۴۰۔

[2] اس کا اردو ترجمہ "حکایات پنجاب" کے نام سے تین جلدوں میں چھپ چکا ہے۔ اسے مجلس ترقی ادب لاہور نے چھاپا ہے

ڈاکٹر محمد عمر جو جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کے شعبۂ تاریخ میں استاد ہیں، اور پروفیسر شیخ عبد الرشید اور پروفیسر خلیق احمد نظامی کی نگرانی میں اٹھارھویں صدی کی ہندوستانی معاشرت پر تحقیق کرکے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے پی ایچ ۔ ڈی کی سند لے چکے ہیں۔ ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس کتاب کی کہنگی اور گمنامی کی گرد جھاڑ کر، اسے دوبارہ نئے لباس میں جلوہ گر کیا اور معاشرتی تاریخ پر کام کرنے والوں کو اس کی اہمیت سے روشناس کرایا ہے۔ جس زمانے میں یہ کتاب لکھی گئی تھی اس وقت فارسی ہندوستان کی سرکاری زبان تھی اور تصنیف و تالیف یا علمی مباحث کا ذریعۂ اظہار بھی۔ اسی لیے انشاؔ نے اردو زبان کے قواعد کی کتاب بھی فارسی میں لکھی اور یہی سبب ہے کہ شعرائے اردو کے بیشتر تذکرے فارسی میں لکھے گئے ہیں۔ اب زمانے کی روش بدل گئی ہے۔ علوم مروجہ بھی وہ نہیں رہے جو پہلے معیار علم و فضل سمجھے جاتے تھے۔ فارسی زبان کی کتابوں کے مخاطب بھی تعداد میں کم رہ گئے ہیں۔ چنانچہ عوام سے سروکار نہیں، خواص بھی جو کچھ لکھتے ہیں، اس میں فارسی مآخذ سے ان کی بے خبری بہت الم ناک ہے۔ قرون وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ فارسی اور عربی سے عالمانہ واقفیت کے بغیر لکھی ہی نہیں جا سکتی۔ لیکن یہ بھی اس عہد کی ستم ظریفی ہے کہ فارسی سے کامل بے اعتنائی کے باوجود لوگ ازمنہ وسطیٰ پر وثوق کے ساتھ گفتگو کر لیتے ہیں۔

ہفت تماشا اٹھارھویں اور انیسویں صدی کے شمالی ہندوستان کی معاشرت کے سلسلے میں بنیادی ماخذ ہے، اس سے بے نیاز ہو کر کوئی مؤرخ نہیں گزر سکتا، لیکن میں نے زمانۂ حال میں عزیز احمد کی کتاب

STUDIES IN ISLAMIC CULTURE IN INDIAN ENVIRONMENT:

کے سوا اور کسی کتاب کے مصادر میں ہفت تماشا کا نام نہیں دیکھا[1] حالانکہ جتنا مواد اس میں ہے وہ اس کی کسی ہم عصر کتاب میں شاید ہی یک جا مل سکے۔

زمانہ کی ضرورت اور کتاب کی اہمیت کا لحاظ کرکے، اس کا اردو ترجمہ شائع کیا جا رہا ہے۔ انگریزی اور ہندی زبانوں میں بھی اسے منتقل کر دیا گیا ہے اور دونوں تراجم اس کے بعد شائع ہوں گے۔ امید ہے کہ اس کتاب کے نئے روپ سے اس کے افادے کا نطاق وسیع تر ہو جائے گا، اور اب ہند ایرانی معاشرت یا مغل شائستگی کے بہت سے پہلوؤں پر نئے انداز اور نئی تعبیروں کے ساتھ گفتگو کی جا سکے گی۔

کسی زبان کی کتاب کو دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کے لیے بعض بنیادی شرائط کی تکمیل ضروری ہے۔ سب سے پہلے تو مصنف اور اس کے عہد کی تہذیب و روایات کے پس منظر سے واقفیت ہو، ورنہ انجام یہ ہوتا ہے کہ سر جادوناتھ سرکار جیسا عالم اور مؤرخ، اورنگ زیب کے آخری زمانے کے اس خط کو جس میں اس نے خدا سے توبہ و انابت کی ہے اور خسران دنیا و آخرت کا ذکر کیا ہے یہ کہہ کر پیش[2] کرتا ہے کہ خود شہنشاہ

---

[1] مثال ۔۔۔ ڈاکٹر محمد حسن کی کتاب "دہلوی ادب کا تہذیبی و فکری پس منظر" لکھنؤ سے شائع ہوئی ہے (دانش محل لکھنؤ، ۱۹۶۴ء) اس کے مصادر کی فہرست ہفت تماشا سے خالی ہے۔ لیکن مصنف نے بعض امور کا تجزیہ نئے تقاضوں کو ذہن میں رکھ کر کیا ہے، ان کی رائے سے اکثر اختلاف ہونے کے باوجود یہ ۔۔۔ قابل قدر ہے۔

[2] SARKAR: SHORT HISTORY OF AURANGZIB (1930) PP 384-385.

نیز ملاحظہ: شبلی: اورنگ زیب پر ایک نظر/ ۹۸ - ۱۱۶ (علی گڑھ ۱۹۲۴ء)

کا مجرم ضمیر اُسے آخر عمر میں ملامت کرتا تھا اور وہ گناہوں کے بوجھ سے دبا ہوا اپنے ماضی کے افعال پر شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ اب سرکار کو یہ کون سمجھائے کہ اورنگ زیب کا وہ خط "مجرم ضمیر" کی کراہ نہیں ہے، بلکہ ایک نہایت متقی اور صالح مسلمان بھی، جس کی ساری زندگی کامل زہد و ورع میں گزری ہو، آخری وقت میں ایسی ہی باتیں لکھے گا۔ مسلمان کا ایمان ہمیشہ خوف و رجا کے درمیان رہتا ہے۔ وہ کبھی اپنے اعمالِ صالحہ پر اس پندار میں مبتلا نہیں ہو سکتا کہ میرے لیے نجات یقینی ہے اور میں خدا کے برگزیدہ بندوں میں شامل ہو گیا ہوں۔

چونکہ ڈاکٹر محمدؐ عمر نے اس عہد کی معاشرت پر تحقیقی کام کیا ہے جس زمانے میں مہنت تماشا لکھی گئی ہے، اس لیے وہ تاویل و تعبیر کی کسی ایسی غلطی کے مرتکب نہیں ہوئے ہیں۔ انھوں نے کتاب کا ترجمہ اس دور کے سیاق و سباق کو ذہن میں رکھ کر کیا ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ دونوں زبانوں پر قدرت حاصل ہو۔ مترجم کو اس کا دعویٰ تو نہیں ہے، لیکن اصلاً قدرت و مہارت کی ضرورت اس زبان پر ہوتی ہے جس میں ترجمہ کیا جائے۔ پھر تو اگر مصنف کا مفہوم بھی گرفت میں آگیا ہے تو بعض اوقات اصل سے زیادہ بلیغ انداز میں مترجم کے قلم سے ادا ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھیے تو جناب محمدؐ عمر نے اس ترجمے پر واقعی بہت محنت کی ہے۔ انھوں نے خواہ مخواہ لفظی ترجمہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اور یہ محض مرادی بھی نہیں ہے بلکہ جہاں اسلوب و ادا میں جیسی سہولت دیکھی اسے اختیار کر لیا ہے۔

تراجم کے بارے میں ایسی رائیں علی العموم اصل سے مقابلہ کیے بغیر ظاہر کر دی جاتی ہیں۔ لیکن میں اپنی رائے ذمہ داری کے ساتھ ظاہر کر رہا ہوں اس لیے کہ میں نے پورے ترجمے کا مقابلہ اصل فارسی متن سے کیا ہے اور جہاں کہیں مناسب سمجھا ہے ترمیم بھی کی ہے۔

ادبی تاریخ اور ادبی تنقید

اسلوب احمد انصاری

ادبی تاریخ نگاری کا جو انداز انگریزی اور اردو زبانوں میں عموماً رائج رہا ہے، وہ ایک دوسرے سے کسی قدر مختلف ہے۔ انگریزی میں بالعموم اس کا اہتمام کیا گیا کہ ادب کے میدان میں تدریج وارتقا کے مدارج کو ایک وسیع افق کے بالمقابل اور ایک ہمہ گیر چوکھٹے (FAMEWORK) کے اندر رکھ کر دیکھا جائے: یعنی ادب کی رفتار کو غیر ادبی عوامل کی روشنی میں پرکھا جائے۔ اس سے میری مراد وہ سیاسی اور تاریخی حادثات اور تبدیلیاں ہیں جو سماجی اداروں کی تعمیر و تشکیل اور شکست و ریخت میں برابر منعکس ہوتی رہتی ہیں۔ انہی سے منسلک تہذیب و تمدن کے وہ آثار و شیون اور خیالات و تصورات کے وہ دھارے بھی ہیں، جو ہماری ذہنی زندگی کی بوقلمونی کو متعین کرنے اور قوموں کی زندگی میں نشانات راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اردو میں اس کے برعکس تاریخ نگاری میں تمام تر زور سوانحی اطلاع، قلمی مرقعوں اور آپس کی نوک جھونک اور معاصرانہ چشمکوں پر رہا۔ اور اس میں تسلسل کے عنصر کو، جو تاریخی عمل کی بنیاد ہے، خاطر خواہ نہیں برتا گیا بلکہ اسے نظر انداز کیا گیا۔ "آب حیات" اس کی ایک بیّن مثال ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ سیاسی اور تاریخی پس منظر کو ناواجب طور پر اہمیت دینے کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ ادب کو ان عوامل کی براہ راست پیداوار اور ادبی تاریخ نگاری کو سماجیات کے مطالعے کا بدل سمجھ لیا جاتا ہے، اور یہ ایک خطرناک رجحان ہے جس کے خلاف مدافعت کے لیے ہمیں چوکنا رہنا چاہیے۔ اس طریقۂ کار میں جو خامی ہے، اس پر بحث کرنے سے پہلے ہمیں یہ غور کرنا ہے کہ ادبی تاریخ نگاری کے کیا لوازمات ہیں، اور کن حد بندیوں کے اندر یہ اپنا وظیفہ ادا کرتی ہے؟

شروع میں یہ کہنے کی ضرورت ہے کہ ادبی کارناموں پر، خواہ وہ کسی بھی زبان میں تخلیق کیے گئے ہوں، ہم دو حیثیتوں سے نظر ڈال سکتے ہیں ایک ابدیت کے نقطۂ نظر سے اور دوسرے ایک ہم عصر منظر کے اعتبار سے۔ یعنی ہر ادبی کارنامہ ایک وجود بالذات (SELF-SUBSISTENT) اکائی بھی ہے، اپنے اندر ایک عالم گیریت اور ہمیشگی بھی رکھتا ہے۔ اور ادبی کارناموں پر مشتمل نظام (ORDER) کا ایک حصہ بھی ہے۔ جو تاریخ کے ایک خاص نقطہ پر وجود میں آیا ہے۔ یہ پورا نظام جس کا وہ ایک حصہ ہے تاریخ کی گردش کا پابند ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادبی تاریخ نگاری کا نقطۂ آغاز اس نسبت اور تعلق کو متعین کرنا اور نمایاں کرنا ہے۔ جو ایک ادبی کارنامہ ماقبل اور مابعد کے دوسرے ادبی کارناموں سے رکھتا ہے اس عمل کی کارفرمائی ہمیں اس رشتے میں بھی نظر آتی ہے، جو ایک مصنف دوسرے مصنف سے، ایک ادبی دور دوسرے ادبی دور سے رکھتا ہے۔ یہاں اس امر کی صراحت بیحد ضروری ہے کہ ادبی کارناموں یا ادوار کے سلسلے میں تسلسل کا یہ عمل حیاتیاتی عمل تسلسل سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ یہاں ایک کارنامہ دوسرے کارنامے کو، یا ایک ادبی دور دوسرے ادبی دور کو براہ راست جنم نہیں دیتا، نہ یہاں خوب سے خوب تر کی طرف بڑھنے اور ترقی کرنے کی طرف میلان کا پایا جانا ضروری ہے۔ یہاں تسلسل ضرور ہے، لیکن تسلسل کی جبریت کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ یہاں لین دین کا اصول ہے، لیکن اس میں کوئی میکانکیت نہیں؛ یہاں عمل اور ردِ عمل کی کارگزاری ہے، لیکن اس کے نتیجے کے طور پر ہم لازماً کیفیت کے متعلق کوئی حکم نہیں لگا سکتے۔ مختصر طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ ادبی تاریخ نگاری میں ہم وقت کے دوران (TIME-SEQUENCE) کا استعمال تو کرتے ہیں، لیکن اسے آخری اور قطعی معیار تصور نہیں کرتے۔ اس سلسلے میں یہ بھی کہا گیا

ہے کہ تاریخی ادوار کی نشان دہی فلسفہ کی اصطلاح میں ایک طرح کی (NOMINALISM) یا نام نہاد سی چیز ہے۔ اور یہ پورا عمل جس کی ہم حد بندی کرتے ہیں ایک بے نام، بے جہت لازمان بہاؤ ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ نقطۂ نظر انتہائی مبالغے پر مبنی ہے۔ یہاں یہ اضافہ کرنا شاید غلط نہ ہو کہ تاریخ کے اس بہاؤ کو جو چیز مقید کرتی اور اسے انضباط بخشتی ہے، وہ قدر یا (VALUE) کا عمل دخل ہے۔ اسی سے یہ طومار ایک شکل پاتا، یہ خلفشار گرفت میں آتا اور یہ بکھرے ہوئے انفرادی قطعے وحدت کی لڑی میں پروئے جا سکتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ ادبی کارناموں کی تخلیق میں سماجی اور معاشی میلانات اور تاریخی اور سیاسی حالات بالواسطہ طور پر اور ایک حد تک دخیل ہوتے ہیں، کیونکہ ادبی شعور اور خارجی زندگی کے ڈانڈے کہیں نہ کہیں ملتے ضرور ہیں۔ لیکن ہمیں ان عوامل میں جو ادبی کارنامے پر اثر انداز ہوتے ہیں اور جنہیں ہم (CONDITIONING FACTORS) کہہ سکتے ہیں، اور ان میں جو بالآخر اس کی صورت گری کرتے ہیں، اور جنہیں ہم (DETERMINING FACTORS) کہہ سکتے ہیں، ایک حد فاصل قائم کرنی چاہیئے۔ خارجی موثرات پر زور دینے سے جو صرف ایک چوکھٹا فراہم کرتے ہیں، ہم دراصل دو غلطیوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اوّل ادبی ادوار کی سیاسی یا مذہبی تحریکات کے مطابق حد بندی کرنا جیسے انگریزی ادب کے ایک دور کو ملکہ الزبتھ اور ایک دوسرے دور کو ملکہ وکٹوریہ کے نام اور زمانے سے منسوب کرنا اور اس طرح اور دوسرے ادوار کو تجدید مذہب (REFORMATION) یا شہنشاہیت کے احیاء (RESTRATION) سے منسلک کرنا، اور دوسرے ادبی تعبیر و تفسیر یا (EXEGESIS) کو ادبی کارنامے کی کلیت (TOTALISTY) کے مرادف ٹھہرانا۔ یہ طریقۂ کار ممکن ہے افہام و تفہیم کے عمل میں مفید اور مددگار ثابت ہو، لیکن اس سے بہت سی غلط فہمیوں کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔

جس طرح تاریخ بذات خود محض واقعات کی کھتونی سے عبارت نہیں بلکہ ذہنِ انسانی کے نامیاتی ارتقاء کی ایک داستان ہے، اسی طرح ادبی تنقید نگاری بھی محض ادب پاروں کے یکے بعد دیگرے یا عہد بہ عہد تخلیق کیے جانے کے جائزہ کا نام نہیں، بلکہ انسانی ذہن یا فطانت کے مختلف ارتعاشات کا ایک مرقع ہے۔ اس میں شک نہیں کہ بعض ادبی اصناف مثلاً ہجو نگاری یا واقعاتی ناول کے سلسلے میں یہ ضروری ہے، کہ ہم اس زندگی کو نظر جما کر دیکھیں، جو لکھنے والے کے اردگرد پھیلی ہوئی ہے، اور جو براہ راست اس کے مشاہدے اور تجربے میں آ چکی ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی یہ ماننے میں تامل نہ ہونا چاہیئے کہ ادب کا وہ خمیر جس سے اس کی تعمیر ہوئی ہے، اس منزہ، منضبط اور تکمیل یافتہ شکل سے مختلف ہوتا ہے۔ جو ہمیں ادبی کارناموں میں نظر آتی ہے۔ بیرونی زندگی کے واقعات اتار چڑھاؤ، کش مکش، افراتفری، اس کے چہرہ کا حسن اور بدصورتی، اس کی فراوانی اور رنگارنگی، پوری چھان پھٹک کے بعد اس افسانوی ڈھانچے FICTIONAL-STRUCTURE کو وجود میں لاتی ہیں، جو بالآخر ہماری توجہ کا واحد مرکز بنتا ہے۔ یہاں یہ ظاہر کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی اور سماجی واقعات اور ادوار سے زیادہ ادبی مورخ کو جس چیز سے سروکار ہونا چاہیے، وہ تاریخ تصورات ہے۔ ایلیٹ نے یہ بات بہت پتے کی کہی ہے، کہ دانتے اور شیکسپیئر کے یہاں بیّن طور پر فکری عمل نہیں پایا جاتا۔ یعنی وہ خود تصورات وضع نہیں کرتے، بلکہ مروجہ تصورات اور عام سچائیوں کو، جو بڑی حد تک قبول عوام کا درجہ حاصل کر چکی ہیں، اور شاید ایک حد تک پامال بھی ہو گئی ہوں، ایک نئی جودت، جدت اور معنویت کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ دانتے کے سلسلے میں یہ بات اب مستحکم طور سے تسلیم کی جا چکی ہے کہ اس کی شہرۂ آفاق تصنیف (DIVINA COMMEDIA) کا تصور نبی کریم کی معراج کے تخلیقی تصور سے اخذ کیا گیا ہے اور عہد وسطیٰ اور الزبتھ دور کا وہ کون سا تصور اور وہ کون سا عقیدہ ہے، جس کی شاعرانہ تجسیم، جذبہ و تخیل کی رعنائیوں کے ساتھ شکسپیئر کے ڈراموں میں اپنی دلفریب لازوال جھلکیاں نہیں دکھاتی۔ جو بات دانتے اور شیکسپیئر پر صادق آتی ہے، اسی کا اطلاق کالی داس، غالب، اقبال، رومی، بلیک، ٹینی سن، براؤننگ اور خود ایلیٹ پر بھی ہوتا ہے۔ ایلیٹ اپنی اہم ترین نظموں میں ان عوامی معتقدات کا جنہیں فریزر (FRASER) نے اپنی کتاب میں جمع کر دیا ہے، یا عیسائیت

کے ان مرکزی تصورات کا کس حد تک رہینِ منت ہے، جو عوامی شعور و ادراک میں پیوست ہیں۔ اسی طرح جدید نفسیات، معاشیات، حیاتیات اور طبعی سائنس کے کتنے حیرت انگیز انکشافات ہیں، جنہوں نے موجودہ دور کے یورپی ادب کے لیے خام مواد مہیا کیا ہے۔ جدید انگریزی ادب میں متضاد عناصر کی یکجائی اور کارفرمائی ہمیں قدم قدم پر چونکا دیتی ہے۔ جدید سائنس نے انفس و آفاق کے بارے میں انسانی تصورات کی جو کایا پلٹ کی ہے اور جن اقدامات کا سہرا اس کے سر بندھ چکا ہے۔ ان سب کا عکس موجودہ ادب کے دور میں براہِ راست نظر آتا ہے۔ چند مرکزی تصورات جو آج کے اور یورپین شعر و ادب میں جگہ پا گئے ہیں یا پاتے جا رہے ہیں۔ یہ ہیں : آئن سٹائن کا نظریۂ اضافیت، سارترے کا فلسفۂ وجودیت، برگساں کا تصورِ زمانِ محض، یونگ اور اڈلر کے لاشعور کے متعلق انکشافات، مارکس کا اجتماعی کش مکش اور آویزش کا نظریہ، تحلیل نفسی کی سائنس اور وقت کی سیمابیت کے پہلو بہ پہلو شعور کی گریز پا کیفیات کا قیاسی علم۔ اور گمان غالب یہ ہے کہ موجودہ سائنس دانوں نے خلاء میں پرواز کا جو نادر اور محیر العقول تجربہ کیا ہے، وہ بھی ادب کی کائنات میں ضرور اپنے لیے اظہاریت پائے گا۔ یہ سب تصورات ایک تجرباتی انداز میں آج اس طرح پڑھے لکھے لوگوں کے لیے عام ہو گئے ہیں، یا ہوتے جا رہے ہیں، جس طرح عہدِ وسطےٰ کے انگلستان میں ملائکہ یا روح کے بارے میں یا کائناتی نظم (COSMIC ORDER) کے بارے میں، یا ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں ارتقاء کے بارے میں، یا ایران اور ہندوستان میں فنا اور بقا کے بارے میں تصورات عام طور پر رائج تھے۔ میں نے ان سب کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا، کیونکہ گو اوّلاً یہ مختلف علوم اور فکر کے مختلف دبستانوں میں جنم لیتے ہیں، لیکن وہ رفتہ رفتہ ذہنی آب و ہوا میں اس حد تک رچ بس جاتے ہیں، کہ کچھ عرصہ بعد وہ عام شعور کا ایک ناقابلِ انکار اور ناقابلِ تقسیم جزو معلوم ہونے لگتے ہیں، اور عام شعور سے چھن کر وہ ادبی کارناموں میں جگہ پاتے ہیں۔ ادبی مواد کے علاوہ ان کا اثر ادبی اسالیب، کے ارتقاء پر بھی پڑتا ہے۔ مڈلٹن مرے نے بہت صحیح بات کہی ہے، کہ شاعر اور ناول نگار بحیثیت محض شاعر اور ناول نگار، کوئی فکری نظام نہیں رکھتے۔ بلکہ مشاہدات، تخیلی یا جذباتی عقیدے اور وجدانی کیفیات کے مالک ہوتے ہیں۔ ادبی کارناموں میں عمل استخراج (ABSTRACTION) یا اس کے نتائج کی تلاش عبث ہے۔ جو خصوصیت ادب کے لیے مابہ الامتیاز ہے، وہ یہ کہ ادب میں ہمیں تصورات کا براہِ راست یا تفصیلی اظہار نہیں ملتا۔ بلکہ ان کی صرف وہ شکلیں جو کرداروں، واقعات اور مجموعی فضا اور لب و لہجہ کے اندر محسوس اور مادی طریقہ سے پیش کی جا سکیں۔ ادیب یا شاعر ہر چشمہ سے فیضان حاصل کرتا، اپنی ہر حس کو کام میں لاتا اور تجربے اور مشاہدے کی ہر پرت کو استعمال کرتا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر ادب کا خام مواد، جو ہر طرف منتشر ہے، شاعر یا ادیب کے شعور و ادراک کو متاثر کرتا ہے، یہ وہ مقناطیسی آلہ ہے، جو ہر طرف سے، ہر طرح کے تجربے اور ہر نوع کے خیالات کو اپنی جانب کھینچتا ہے، اور اسے ایک نئی، اچھوتی اور وقیع شکل عطا کرتا ہے۔

اس سے متصل مسئلہ ذہنی اور تمدنی تحریکات کا ہے۔ ان میں سیاست، مذہب، سماجیات اور فنونِ لطیفہ سب ہی شامل ہیں، ان میں اور تصوّرات میں جو فرق ہے، وہ یہ کہ تصورات اوّلاً ایک فرد کی ذہنی ریاضت اور کد و کاوش کا نتیجہ ہوتے ہیں، اور پھر وہ رفتہ رفتہ ایسی عام سچائیوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں، جو اجتماعی شعور (COLLACTIVE CONCLOUS) میں سرایت کر جاتی ہیں۔ تحریکات عام طور پر چند افراد یا ایک گروہ کی مسلسل کوششوں سے شروع ہوتی ہیں۔ ان کا حلقۂ اثر وسیع ہوتا ہے ان میں ایک اضطراری جوش اور سرگرمی ہوتی ہے، جس کے اثر سے مدتوں کے انجماد کو صدمہ پہنچتا ہے فکر و عمل کے نئے سانچے وجود میں آتے ہیں۔ یہ تحریکات جیسے یورپ میں انسانیت پسندی (HUMANIUSM) کی تحریک یا اصلاح مذہب (REFORMATON) کی تحریک یا احیائے علوم (RENAISANCE) کی تحریک یا انقلاب فرانس کی تحریک یا ادب برائے ادب کی تحریک، پورے ادوار کو متاثر کرتی ہیں اور جغرافیائی حد بندیوں کو توڑ کر ان

میں پوری نسلیں اور قومیں شریک ہو جاتی ہیں جن عقائد پر ان تحریکات کی تعمیر ہوتی ہے جن آدرشوں سے انھیں خونِ حیات ملتا ہے۔ جن خوابوں کے سائے ان میں جھلملاتے ہیں، وہ موجودہ اقدار کے سانچے میں ہل چل سی ڈال دیتے ہیں اور یکایک انسانی شعور صدیوں کی منزل برسوں میں طے کر کے، ایک جستِ بلاخیز کے ساتھ زندگی کے ایک نئے موڑ پر آجاتا ہے۔ بلاشبہ ان تحریکات کا جائزہ اور مطالعہ ہمیں ان زیرِ زمین (SUBTARRANEAN) وابستگیوں کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے، جو کسی زمانے کا ادب اس زمانے کی ذہنی آب و ہوا سے رکھتا ہے۔ چونکہ ان تحریکات کے پیچھے بعض اقدار میں پختہ یقین بلکہ ان پر ایمان کارفرما ہوتا ہے، اور وہ پوری زندگی کو کلیتہ متاثر کرتی ہیں۔ اس لیے ان کا اثر بھی گہرا اور دیرپا ہوتا ہے، اور اس کی جڑیں دور تک پھیلتی ہیں۔ ان تحریکات کے واسطے سے ادبی اثرات کا مسئلہ بھی اہمیت اختیار کرتا ہے۔ ادبی اثرات انفرادی طور پر بھی ظاہر ہو سکتے ہیں اور اجتماعی طور پر بھی۔ یعنی ایک شاعر یا شاعروں کا ایک گروہ، ایک پوری نسل کے شاعروں سے متاثر ہو سکتا ہے۔ اس کی بیّن مثال انگریزی شاعر ملٹن کے شاعرانہ محاورے (POETIC IDIOM) کا وہ اثر ہے، جو اٹھارویں صدی کے شاعروں میں تواتر کے ساتھ نظر آتا ہے۔ یا رومانی شاعروں کا اثر، جو ملکہ وکٹوریہ کے عہد میں لکھنے والے شاعروں میں بہت دیر تک اور دور تک محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ کے شاعرانہ لب و لہجہ کا اثر بعد کے کتنے شاعروں کے یہاں رہ رہ کر جھلک اٹھتا ہے۔ اجتماعی طور پر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ مغرب میں یہ رومانیت کی تحریک کم و بیش ایک ہی تاریخی دور میں مختلف زبانوں کے ادب پر اثر انداز ہوئی، اور زبانوں کے مزاج کے فرق کے باوجود اس میں بعض عناصر نمایاں طور پر مشترک ہیں۔ پھر بھی یہ قابلِ لحاظ ہے کہ رومانیت کی یہ تحریک عہدِ وسطیٰ کے رومانوں کی یاد کو تازہ کرتی ہے، اور اس نے فکر و عمل کے ان پہلوؤں سے بھی تقویت حاصل ہوئی۔ جو سیاسی سطح پر انقلابِ فرانس کے وسیلے سے سامنے آئے۔ یہاں یہ جتانا ضروری نہیں کہ انگریزی یا یورپین ادب میں رومانیت کی تحریک، احیائے علوم کی اس تحریک کے ساتھ تاریخی تسلسل اور یگانگت کو ظاہر کرتی ہے، جو عہدِ کلیسا کے اقتدار کے شکنجے سے آزاد ہونے کے بعد سولھویں صدی میں شروع ہو چکی تھی، اور جس نے بعد میں انقلابِ فرانس کی شکل میں انسانی ضمیر کی آزادی کے لیے فضا ہموار کی اور اس کا صور پھونکا۔ اس طرح ہمارے اپنے ادب میں تصوف اور بھگتی کی تحریکوں کا فروغ خیال اور عمل کی اس غیر یقینی اور عدمِ استقامت کا آئینہ دار ہے، جو سیاسی نظام کا شیرازہ بکھر جانے کی وجہ سے عام طور پر زندگی میں در آیا تھا۔ ذہنی اور روحانی ہیجان کی اس بھٹی میں تپ کر جو خیالات اور تصورات ابھرے، وہ ادب اور شاعری میں برابر اپنی جلوہ گری کرتے رہے، اور نہ صرف خیالات، بلکہ ان سے منسلک جذبات کے مرتعش سائے اور زندگی کے بارے میں بنیادی قدریں بھی اس میں اظہار پاتی رہیں۔

ادبی تاریخ کے مطالعے کی ایک دلچسپ کڑی، جو اردو ادب میں بالکل ناپید ہے، تواتر کے ساتھ پائے جانے والے بعض کرداروں، موضوعات اور غالب فنی محرکات (MOTIFS) کا جائزہ ہے۔ آخر الذکر علامات (SYMBOLS) سے بالکل مختلف چیز ہے۔ گو ان میں علامتی رنگ پایا ضرور جاتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ کرداروں کی حد تک مغربی ادب میں خانہ بدوش یہودی، ڈان جوئن اور فاؤسٹ سے بڑا کام لیا گیا ہے۔ اسی طرح زیارت (PILGRIMAGE) کا موضوع، یا خرابے (WASTE LAND) کا تصور، یا تجدیدِ حیات (REBIRTH) کا خیال، یا جنت اور دوزخ کا تصور، یا حضرت عیسٰے یا شیطان کی شبیہہ (FIGURE) یا (Oedipus complex)، ایسی مرکزی تمثیلیں یا غالب فنی محرکات ہیں۔ جو گوناگوں انداز سے مختلف شاعروں کے یہاں برتے گئے ہیں۔ ان کے اردگرد امتدادِ زمانہ کی وجہ سے فنی اور جذباتی تلازمات کا ایک دبیز اور گنجان تانا بانا بن گیا ہے۔ مشہور مصنفہ (MAND BODKIN) نے اپنی دو بیحد معروف کتابوں میں تفصیل کے ساتھ ان کا ذکر کیا ہے۔ ضروری ہے کہ اردو اور فارسی شعر و ادب کے سلسلے میں بھی اسی طرح کا کوئی کام کیا جائے۔ غالب فنی محرک کی اصطلاح موسیقی اور نقاشی سے لی گئی ہے۔ لیکن اس کی نشان دہی ادب کی تاریخ

میں واضح طور پر کی جاسکتی ہے۔ اور اس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ اس طرح کے محرکات ایک وضع کے حسی پیکر (ALCHETYPES) ہیں، جو اجتماعی لاشعور (COLLECTIVE UNCOVICIOUS) میں گہرے طور پر مرتسم ہیں، اور جنھیں مختلف اوقات میں مختلف شاعر اور ادیب اپنی صلاحیت اور مزاج کے موجب انسانی ذہن کی پیچ در پیچ ساخت اور اس کے جذباتی اور فکری نشوو ارتقا کو ظاہر کرنے کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ ان میں ایک ماقبل منطق (PRE-LOGICAL) اپیل بھی ہے اور گہری حیاتی کشش بھی۔ ان کے استعمال سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایک ہی تجربہ، جس کی ایک سماجیاتی بنیاد ہے۔ بدلتے ہوئے تاریخی ادوار اور ادبی پس منظر میں اپنی شادابی اور طرفگی کو کھوئے بغیر کتنے معنی خیز انداز میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس سے ذہنی اور جذباتی تسلسل کا بھی پتہ چلتا ہے، اور خالص علمی تصورات کی نسبت یہ محرکات ادیب یا شاعر کی قوتِ تخلیق کو زیادہ موثر طور پر اکساتے ہیں۔

تاریخی مطالعہ ایک اور طرح بھی کارآمد ہو سکتا ہے۔ یعنی ان اسباب کو دریافت کرنے کے سلسلے میں جو مختلف اصنافِ سخن کے وجود میں آنے اور رواج پانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ بے شک تمام اصنافِ سخن اور اسالیب بیان ایک ہی نقطۂ آغاز کو فرض کرتے ہیں، یعنی انسانی تجربات کا فنی اظہار۔ لیکن ہر صنفِ سخن کی اپنی پابندیاں بھی ہیں اور وہ رسمیات (CONVENTIONS) بھی، جن کا لحاظ رکھنا ضروری ہوتا ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی بڑی حد تک صحیح ہے کہ یہ رسمیات، زندگی اور تجربے کے سلسلے میں ہمارے عام رویّہ سے متاثر ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر عہدِ وسطےٰ کی اس شاعری کو لیجئے، جسے درباری عشقیہ شاعری (COURTHY LOVE POETRY) کہا جاتا ہے۔ یہ جن روایات کو فرض کرتی ہے، وہ اس زمانے کے اعلیٰ طبقوں کی زندگی سے براہِ راست منسلک اور مربوط ہیں۔ عشق و محبت کا ایک مخصوص نظریہ، عاشق کا ایک انوکھا کردار، جان بازی اور سپردگی کا ایک نرالا تصور، اس خاص تجربے کے سلسلے میں حزم و احتیاط، سلیقہ اور رکھ رکھاؤ، رازداری اور سیر چشمی، ان سب پر عمل جیسا واقعی زندگی میں تھا، وہی شاعری میں بھی جلوہ فگن نظر آتا ہے۔ غزل اور قصیدہ، جو ہمارے ادب میں فارسی اور عربی سے آئے، ان کی بھی اپنی روایات ہیں، جو ایرانیوں اور عربوں کی مخصوص تہذیب اور زندگی کی عام روش کو فرض کرتی ہیں۔ خاص طور پر قصیدے کی تشبیب میں جو منظر نگاری نظر آتی ہے وہ عربوں کی صحرائی زندگی کے بے داغ صبح و شام کی عکاسی کرتی ہے۔ تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ اس میں پیچیدگی، تنوع اور حسن کاری بڑھتی گئی۔ فارسی کے مشہور قصائد کی لسانی گراں باری اس کی ایک واضح مثال ہے۔ اسی طرح گیتوں (BALLADS) اور رزمیہ (EPICS) کی روایات میں جو فرق ہے وہ اجتماعی زندگی کے نظم کے مابین اس امتیاز کو ظاہر کرتا ہے جو ان دو مختلف النوع اسالیب و اصنافِ بیان میں جھلکتا ہے۔ گیتوں کے پس پشت جو معاشرہ ہے، وہ سادہ ہے۔ اس میں اجتماعی احساس گہرا نہیں ہوا ہے۔ اس میں جذباتی زندگی میں زیادہ سے زیادہ لوگ ایک دوسرے کے شریک ہو سکتے ہیں۔ اس میں ردِ عمل میں سچائی، بے لوثی اور تندی و تیزی ہے۔ رزمیہ میں درباروں کی شان و شوکت، اداروں کا فروغ، آلاتِ حرب و ضرب کا بیان، زندگی کی سج دھج اور رنگا رنگی، دولت اور قوت کا نشہ، اجتماعی امتیازات اور حد بندیاں، یہ سب منعکس نظر آتی ہیں ان سب روایات یا رسمیات کے سماجی پس منظر کی چھان بین اور اس بات کا کھوج لگانا کہ بعض اسالیب بیان بعض ادوار سے کیوں مختص ہو جاتے ہیں۔ یا بعض دوسرے کیوں ایک معینہ مدت کے بعد غیر مقبول ہوتے بلکہ فنا ہو جاتے ہیں، ادبی تاریخ نگاری کے لیے دلچسپ موضوعات ہو سکتے ہیں۔

اب ہم لسانی تاریخ کے متعلق بھی غور کریں۔ کیونکہ ادب اور زبان کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ہر ادبی کارنامہ، خصوصاً شاعری کے میدان میں آخری تجزیہ میں دراصل زبان ہی سے عہدہ برآ ہونے کا ایک وسیلہ ہے۔ تخلیقی عمل میں الفاظ کو اضافی یا آرائشی چیز سمجھنا۔ یا انہیں ایک منفعل (PASSIVE) وظیفہ کا حامل سمجھنا، صریح غلطی ہے۔ کیونکہ الفاظ ہی کی وساطت سے خیالات و جذبات کے مرکب (COMPLEX) کی واگذشت عمل میں آتی ہے۔ اور اسی

کی مدد سے عام تجربہ، گہرائی اور معنی خیزی حاصل کرتا ہے۔ ہر نظم ایک لسانیاتی تنظیم ہے جس میں الفاظ ایک آنی (INSTRNTANEOUS) اور ہمہ وقتی کیفیت کے اسیر ہوتے ہیں۔ نثر کی زبان میں وضاحت، تفصیل اور ایک سببی رشتہ (CAUSAL CONNECTION) ہوتا ہے۔ اس میں منطق کی کارگزاری اور ارتقاء اور رفتار کا احساس ہوتا ہے۔ ہم الفاظ کے آرپار دیکھ سکتے ہیں۔ شاعری میں الفاظ معنی و مفہوم کی بہت وسعتیں اپنے اندر رکھتے ہیں۔ بقولِ ایلیٹ ہر لفظ اپنی پرچھائیاں (TENTERCLES) رکھتا ہے۔ جو دوسرے الفاظ کی پرچھائیوں کی طرف لپکتی ہیں۔ نثر میں الفاظ صرف اپنا لغوی مفہوم رکھتے ہیں۔ شاعری میں اس پر مستزاد، ان میں ایک اندرونی نغمگی اور پہلوداری بھی ہوتی ہے۔ الفاظ کے معانی میں تبدیلی کے بہت سے اسباب ہیں، اوّل ان اشیاء اور ضروریات میں ترمیم و اضافہ، جنہیں الفاظ پیدا کرتے ہیں۔ دوسرے زندگی میں مادی ضروریات کے پیشِ نظر آہستہ آہستہ پیچیدگی کا پیدا ہونا۔ تیسرے الفاظ کے امکانات اور ان کی قوتِ اظہار کو شعوری طور پر بڑھانے کی کوشش، چوتھے بعض معانی کا مقبول ہو جانا، اور بعض دوسرے معانی کا اسی سبب سے متروک ٹھہرنا، (درخت کی پتیوں کی طرح الفاظ بھی اپنے پرانے برگ و بار کو اتار پھینکتے ہیں، اور نئی توانائیوں اور قوتوں کو حاصل کرتے ہیں) اور پانچویں، دوسری زبانوں سے الفاظ کی مانگ اور درآمد کا سلسلہ جاری رہنا: جس سے مروجہ الفاظ میں ترمیم ہوتی رہتی اور نئے الفاظ وجود میں آتے رہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ بعض الفاظ یا ٹکڑوں کی تکرار، بعض تراکیب کی ساخت، بعض الفاظ کی ظاہری ہیئت، کسی ادیب یا شاعر کے مزاج کو سمجھنے میں کس حد تک معاون ہوتی ہے۔ اس سے بڑھ کر یہ دیکھنا بھی دلچسپ ہوگا کہ ایک خاص دور میں زبان کے سانچے میں اس سے پہلے دور کی نسبت کیا تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ یا کسی ایک خاص دور میں علوم و فنون میں سے کسی ایک سے الفاظ اور اصطلاحات کس حد تک مستعار لی گئی ہیں یا ایک ہی لفظ مختلف ادبی تاریخی ادوار میں کس مفہوم میں کم و بیش کتنے فرق کے ساتھ استعمال کیا گیا ہے۔ الفاظ کی تاریخ، درآمد کا عمل، معانی میں تبدیلی، مختلف علوم و فنون کے نشوونما ارتقاء کا زبان پر اثر، مخصوص محاوروں اور تراکیب کی وضع، ان کی ترویج اور ان کے پوشیدہ امکانات، ان کے مختلف آمیزے اور باہمی ترتیب و ترکیب (CONBINATIOUS PERMNTULIOUS) یہ سب مسائل محض فروعی نہیں بلکہ مرکزی حیثیت رکھتے ہیں۔ بعض الفاظ اور تراکیب کا وجود میں آنا، لیکن جلد ہی متروک ہو جانا، اس امر کی غمازی کرتا ہے کہ وہ چلن کے بازار میں اپنی ساکھ قائم نہیں کر سکیں۔ ہیئتی تبدیلی ہی میں بحروں کی تبدیلی کا مسئلہ بھی شامل ہے۔ جو اپنی ایک الگ حیثیت رکھتا ہے۔ زبان کے استعمال میں تبدیلیوں کے پس منظر میں ہم ماضی کے ایک پورے دور کی تشکیل نو کر سکتے ہیں۔ ادب اور زبان کے اس گہرے اور باہمی تعلق کو سامنے رکھ کر اس سوال پر بھی بحث کی جا سکتی ہے کہ ان میں اوّلیت کسے حاصل ہے۔ یعنی ادب، زبان کی تبدیلیوں کا آئینہ ہے، یا زبان کا ڈھانچہ، ادبی مزاج اور ذہن کے پیچ و خم اور نشوونما ارتقاء کی مناسبت سے تبدیلیوں کا خواہاں ہوتا ہے۔

ادبی تاریخ سے ہٹ کر جب ہم ادبی تنقید کا رُخ کرتے ہیں، تو ہمیں فوراً یہ احساس ہوتا ہے، کہ ہم باہر کی دنیا سے سفر کر کے اندر کی دنیا میں آ گئے ہیں۔ ادبی تنقید، تاریخ نگاری کا ضمیمہ نہیں ہے۔ بلکہ دونوں جداگانہ حیثیت کی مالک ہیں۔ اور ایک دوسرے کا تکملہ کرتی ہیں وہ سب امور جو تاریخ نگاری میں مسلمات کا درجہ رکھتے ہیں یا مرکزی کہے جا سکتے ہیں، ادبی تنقید نگاری میں فروعی حیثیت رکھتے ہیں۔ تاریخ نگاری میں قدم قدم پر شہادت فراہم کرنا ضروری ہوتا ہے، جس کی دوسرے لوگ تنقیح کر سکیں۔ اس کے لیے ہنرمندی، احتیاط اور بیدار مغزی لازمی ہیں۔ تنقید نگاری میں زیادہ عمل دخل ذوق، ادراک اور وجدانی شعور کا ہوتا ہے۔ اس میں تجزیہ سے زیادہ شیرازہ بندی (SYNTESIS) ضروری ہے۔

تنقید نگار کے سامنے سب سے اہم سوال پڑھنے کے اندر مناسب ردِ عمل کو جگانا اور اسے صحیح راستے پر لگانا۔ آخر الذکر کام قدروں کے نظام کو برتے بغیر ممکن نہیں۔ تین سے سروکار محاکمے کے عمل کے لیے ضروری ہے۔ کسی ادبی کارنامے کی تشریح و توضیح اور اس کی قدر و قیمت کے تعین کا مسئلہ، یہ دونوں مختلف چیزیں ہیں۔ پہلی کے لیے تاریخی طریقۂ کار کو برتنا ضروری ہے، دوسری کے لیے ادیب یا شاعر کے ادراک اور اس کے وظیفۂ عمل کو سمجھنا۔ تشریح و توضیح ہر قسم کی اطلاع کی فراہمی کا مطالبہ کرتی ہے، یعنی مصنف کی نجی زندگی کے حالات و کوائف، سیاسی اور سماجی پس منظر، ادبی روایات اور رسمیات اور خالص ادبی اثرات، جو ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ اور ان سب کے لیے علم و آگہی سے حتے الوسع کام لینا ضروری ہے۔ تنقید نگاری کے لیے ان سب سے بڑھ کر جو چیز اہمیت رکھتی ہے وہ یہ کہ سارا خام مواد کس طرح ایک سانچے میں ڈھل کر ہمارے سامنے آیا ہے۔ یعنی ادبی کارنامے کا اندرونی ڈھانچہ اور اس کا دروبست کیسا ہے؟ اس کے مختلف اجزائے ترکیبی میں کیا ربط و تعلق ہے؟ یہ عضوی ہے یا میکانکی؟ اس کے پیچھے الفاظ و محاکات کا کیا وظیفہ ہے؟ یہ ایک دوسرے پر کیا عمل کرتے اور ایک دوسرے کو کس طرح سہارا دیتے ہیں؟ اس میں مصنف کا لب و لہجہ کیا ہے؟ اس سے اس کے نقطۂ نظر کو سمجھنے میں کس حد تک مدد ملتی ہے؟ مزید یہ کہ وہ تجربات جو کسی ادبی کارنامے کے ذریعے پیش کیے گئے ہیں۔ پختہ ہیں یا خام، سطحی ہیں یا گہرے اور پیچیدہ، پہلودار ہیں یا یک رخے؟ وہ ہمارے اندر کس طرح کے ردِ عمل کو بیدار کرتے ہیں اور بحیثیتِ مجموعی مثبت زاویۂ نظر کی طرف لے جاتے ہیں یا منفی کی طرف؟ اور کسی ادبی کارنامے میں متضاد جذبات اور احساسات ایک دوسرے سے مائل بہ پیکار رہتے ہیں یا بالآخر ایک تطابق اور ہم آہنگی حاصل کر لیتے ہیں؟ یہ کہنا تو یقیناً غلط ہوگا کہ فن کی کائنات اس حد تک خود مکتفی (Self-sufficient) ہے، کہ وہ عملی زندگی سے کوئی علاقہ نہیں رکھتی۔ تنقید کا مسئلہ براہِ راست اقدارِ حیات کے لیے منسلک و پیوستہ ہے۔ اور تجربات آغازِ کار میں فن کی کائنات سے باہر بھی وجود رکھتے ہیں۔ لیکن فن کی کائنات میں داخل ہونے کے بعد ان کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ ادبی کارنامے کی بڑائی کا معیار اس تجربے کی پنہائی اور شمولیت (INCLUSIVENESS) ہے، جو اس کے پیچھے موجود ہے۔ ادبی کارنامہ ایک مجسّم (EMBODIED) تجربہ بھی ہے اور ایک معنی خیز (significant) تجربہ بھی۔ اور اس کا امتیاز یہ ہے کہ وہ ہمیں زیادہ سے زیادہ ذہنی، جذباتی اور روحانی آسودگی مہیا کر سکے۔ اس سلسلے میں تین امور غور طلب ہیں۔ اوّل، یہ کہ اولین تجربے کی تمام بے قاعدگی، جزویت اور خلفشار کو دور کرنے کے بعد ہی ہم اسے فن کی کائنات میں داخل کرتے ہیں۔ یعنی اس کا ایک عملِ تطہیر سے گزرنا ضروری ہے۔ جو ادیب یا شاعر کے ادراک کے اندر وقوع پذیر ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ فن کی کائنات میں داخل ہو کر یہ تجربہ ایک ڈرامائی رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ اور تیسرے یہ کہ ادبی کارنامہ، جیسا کہ پہلے بھی کہا گیا، ایک لسانیاتی تنظیم ہے، جس میں قدروں کے نظام کو پیوست کر دیا گیا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ واقعاتی تجربے میں (MATTER OF FACTNESS) کا عنصر ہوتا ہے، وہ فن کی سطح پر قائم نہیں رہتا۔ اس سے اس کا دائرۂ عمل وسیع ہوتا اور اس کی اپیل عام ہوتی ہے۔ لیکن یہ پورا عمل فن کار کے ادراک کے وسیلے سے انجام پاتا ہے، جو زندگی کے بے رس واقعات کو ایک نکھار اور شادابی اور ایک نئی ترتیب اور تنظیم بخشتا ہے۔ لیکن تاریخ نگاری میں ان امور کا تفصیلی جائزہ لینے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ تاریخ نگاری اور تنقید میں جو فرق ہے، وہ یہ کہ اوّل الذکر میں زور عمومی جائزہ پر ہوتا ہے، اور تفصیلات پر۔ ادبی تنقید میں ارتکاز اور شیرازہ بندی پر۔ اوّل الذکر میں ہم ایک مصنف اور دوسرے مصنفین کے درمیان اختلاف پر زور دیتے ہیں،

موخر الذکر میں ان کے مابین مماثلت پر۔ اوّل الذکر میں وقت کے دوران اور تسلسل پر، موخر الذکر میں وقت کے ٹھہراؤ اور ہمیشگی پر

ہاں، ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ایک نقطۂ اتصال ضرور ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ادبی کارنامہ ایک

خاص تاریخی نقطہ پر وجود میں آنے کے باوصف اس بات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ ہم انہیں مذاق و مزاج کے موجودہ معیار پر پرکھیں۔ اور اس طرح ماضی کے سرمائے کو حال کے رجحانات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کریں۔ ایلیٹ نے اپنے تنقیدی نظریات کی بحث میں ادبی کارناموں کی تحسین کے سلسلے میں ماضی کی ماضیت (PASTNESS) پر زور دیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ ماضی کا ڈھانچہ خود حال کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی وجہ سے بدلتا رہتا ہے۔ گویا ماضی اور حال کے درمیان ایک باہمی تفاعل پایا جاتا ہے۔ جس طرح بیرونی زندگی کی رفتار وقت کی گردش کے سبب تبدیلیوں کی آماجگاہ بنی رہتی ہے۔ اسی طرح احساس اور ذوق کی بنیاد میں بھی نامعلوم تغیرات ہوتے رہتے ہیں۔ جب یہ تغیرات ایک عرصہ تک جمع ہو چکتے ہیں، تو اچانک وہ ایک گہری خلیج کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا شاید غلط نہ ہو کہ تنقید کے لیے صحیح اور متوازن نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہم عصری مخاطبین کے ردِ عمل، ادبی کارنامے کی روایات اور فکر و وجدان کے بعض مسلمات کو پہلو بہ پہلو رکھ کر ادبی کارنامے کی قدر و قیمت کا تعین کیا جائے۔ ادبی اقدار میں بعض عالمگیر بھی ہیں لیکن پھر بھی ان کا نقطۂ ارتکاز بدلتا رہتا ہے۔ ہر ادبی کارنامے کا ایک مقامی ضمیر ہوتا ہے۔ اور ایک آفاقی۔ اور دونوں کو اپنی اپنی جگہ اہمیت ہے۔ یہی حال زبان کا ہے۔ زبان بھی ایک نمونہ پر منطبق ہے۔ اور زبان کے استعمال میں تبدیلیاں خود زندگی کے ہیولے میں تبدیلیوں کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ اس سلسلے میں یہ غور کرنا نامناسب نہ ہوگا کہ زبان کے جس چلن کو ایک خاص ادبی کارنامے میں برتا گیا ہے، وہ ابلاغ کے مقصد کو کتنی کامیابی کے ساتھ پورا کرتا ہے؛ اور اس خاص تجربے کے لیے، جو اس میں مجسم کیا گیا ہے، کس حد تک تشفی بخش معول (MEDIUM) ہے۔ ادبی کارنامے کی قدر و قیمت متعین کرنے کے لیے یہ دیکھنا ہو گا، کہ یہ تجربے آج کے بدلے ہوئے حالات میں بھی بعض انسانی قدروں کا کس حد تک حامل ہے۔ اور اس سے انسان کے عزائم اور آرزوؤں کی کس حد تک سیرابی ہوتی ہے۔ یہاں اس امر کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ فنی کارنامے کی آخری چھان بین میں ہمیں ان عقائد کو جو محض ایک چوکھٹے کی حیثیت رکھتے ہیں، اس بنیادی سچائی سے الگ کر کے دیکھنا ہوگا، جو اس کی تہہ میں موجود ہے۔ اس بنیادی سچائی کا فیصلہ بالآخر ان روحانی یا اخلاقی اور جمالیاتی محسوسات کی نسبت سے کیا جائے گا، جو عام طور پر انسانی شخصیت کے مرکزی محرکات تصور کیے جاتے ہیں۔ لہٰذا ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ادبی تنقید اس وسیع چھان بین کی داخلی بنیاد ہے۔ جس پر ادبی تاریخ نگاری تکیہ کرتی ہے۔ اور اس ادبی تنقید نگاری میں ایک غیر جانبدارانہ اضافی نقطۂ نظر ہمیں۔ افراط و تفریط، کٹر پن اور عصبیت سے محفوظ رہنے کا راستہ دکھا سکتا ہے۔

تحقیق اور مواد کی فراہمی کا مسئلہ

ڈاکٹر سیّد محمد عقیل

تحقیق کا مسئلہ، ادب کے دُوسرے شعبوں کی طرح ایک اہم مسئلہ ہے۔ ادب کی ابتدا، اس کی ترقی اور اس کے مختلف منزلوں سے گزرنے کی جس طرح تاریخ مرتب کی جاتی ہے، اسی طرح یہ امر بھی یقینی ہو جاتا ہے کہ تاریخ کی تدوین، بغیر چھان بین کے معتبر، مستند اور صحیح نہیں ہو سکتی۔ گویا جس طرح کسی ادیب کی ذہنی صلاحیتوں کا جائزہ، اس نے کلام کی وسعت اور گہرائی، اس میں مختلف رنگوں کی تلاش کے بغیر مکمل نہیں ہوتا، اُسی طرح اس کے حالات، اس کے کلام، اس کے سوانح زندگی سے دُوسرے تاریخی اور سماجی رشتوں کا علاقہ اور دورِ ماقبل و ما بعد کے صحیح ادراک کے بغیر اس کی شخصیت اور کلام کی تصویر مکمل نہیں ہوتی۔ اور اس کے لیے جب تک محقق، ایک خاص مزاج اور مذاق کا حامل نہ ہو، جب تک اس میں، دریا میں غوّاصی کر کے دُرِ مقصود حاصل کر لینے کا جذبہ کارفرما نہ ہو، جب تک کان کنی اور اس کی محنت شاقہ برداشت کر لینے کی ہمت اور صلاحیت نہ ہو اس وقت تک تحقیق کا کام ممکن نہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ اُسے اس ایمانداری، دیانت داری اور توازن کو بھی اپنے مزاج میں پیدا کرنا پڑتا ہے جس کا فقدان ادب کے طالب علم کو بھٹکا کر کہیں سے کہیں پہنچا سکتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ خود محقق کی شخصیت، کاوشِ فکر اور فن بے طرح مجروح ہو سکتے ہیں۔ جس کے بغیر اس کی شخصیت محض ایک داستان گو، افسانہ طراز اور قیاسی طوطے مینا اُڑانے والے سے زیادہ نہیں رہ جاتی۔ گو کہ یہاں ادبی تحقیق ہی سے بحث کی جا رہی ہے لیکن یہ باتیں کسی بھی شعبے کی تحقیق کے لیے کہی جا سکتی ہیں۔

ادب کا کام یُوں بھی بڑی جانفشانی کا کام ہے۔ یہ انسانوں کی ایسی بولتی ہُوئی تاریخ ہے جس کی پیٹ میں، وقت، کلچر، ذہن اور مذاق، جذبہ تعصب کی رنگ آمیزیاں آ جاتی ہیں جسے مغربی مبصرین نے قوموں کی رُوحوں کی خُود نوشت سوانح عمری سے تعبیر کیا ہے۔ جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ تاریخ کچھ بھی ہو لیکن اگر اُس نے انسانوں کی جذباتی اور عقلی دلچسپیوں پر روشنی نہیں ڈالی، اگر اُس نے حظِ نفس اور قومی تعمیر کے ان آلات کا اظہار نہیں کیا جو قوموں کے ارتقا اور تنزل میں لائحہ عمل بنتے رہے ہیں تو اس نے اپنا کام پُورا نہیں کیا۔ اور ان سب کی تصریح اور محاسبے کے لیے بغیر فن کی روشنی کیلیے کوئی اور راستہ نہیں۔ تنقید کی منزل اس کے بعد ہی آئے گی جب ہم واقعات کی اصلیت اور حقیقت کو پرکھ کر اس کا جائزہ لیں گے۔ پھر محقق ایسا رہبر کامل نہیں جس کی قیادت پر آنکھ بند کر کے بھروسہ کیا جا سکے اور نہ اپنے شبہات کو اتنی وسعت دی جا سکتی ہے کہ ہر قدم اور ہر منزل مشکوک نظر آنے لگے۔ ورنہ ہر بات کی چھان بین کے لیے عمرِ خضر بھی کافی نہیں ہو سکتی۔ تحقیق کے مفہوم کو اتنا تنگ بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ہر لفظ، ہر شعر، ہر مصرعے کے لیے محقق وقت برباد کرتا رہے۔ اور جب اس کا کام مکمل

ہوا تو معلوم ہوا کہ فلاں مصرعے میں 'یہ' کے بجائے 'بہے' یا 'اب' کے بجائے 'جب' اور اس طرح تحقیق کسر واجب یا غیر واجب کی شکل میں کتاب کے صفحات پر بکھری پڑی ہے۔ اگر کسی انفرادی رجحان کے باعث کسی محقق کو اس طرح کی تحقیق میں دلچسپی ہے تو وہ اسے اپنے لیے مخصوص کرسکتا ہے۔ لیکن صرف یہی بات تحقیق کا مفہوم ہرگز نہیں بن سکتی۔

اُردو میں تحقیق کا رجحان زیادہ پرانا نہیں اور جسے صحیح معنوں میں تحقیق کہا جاتا ہے وہ اس دور سے پہلے اپنی تمام نئی صورتوں کے ساتھ ممکن بھی نہ تھی۔ ہمارے محققین تذکروں اور چند قلمی کتابوں، چند سُنی سنائی باتوں اور کچھ مروّجہ اصولوں کی روشنی میں تحقیق کا تھوڑا بہت کام کرتے رہے ہیں۔ جن تھوڑے بہت وسائل کے ساتھ اُنھوں نے کام کیا وہ اس لیے یقیناً قابلِ قدر ہے کہ اُنھوں نے اپنی دلچسپی سے جہاں تک ہوسکا کچھ مواد اُردو دنیا کے لیے فراہم کردیا۔ جس پر آج جدید تحقیق کی بُنیاد کھڑی کی جاسکتی ہے۔ اور چونکہ اُنھوں نے اپنی دلچسپی اور تجسس کی کسک سے یہ کام کیا لہٰذا اس میں حقیقت کی روشنی اور صداقت کی جستجو اور ایک علم دوست کی لگن موجود ہے۔ لیکن ادب کا وہ محقق جسے خوب سے خوب تر کی تلاش رہتی ہے وہ نئے راستے اور طریقوں کو کام میں لاکر اور بہتر صورتیں پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس تمہید کی روشنی میں اب تحقیق کے بعض پہلوؤں پر نگاہ ڈالنی چاہیے۔

سب سے پہلے قدم جو محقق اٹھاتا ہے وہ اپنے موضوع کا تعین ہے۔ یہاں موضوع کے تعین سے وہ موضوعات بھی لیے جاسکتے ہیں جو یونیورسٹیوں میں تحقیقات کے طلباً اپنے لیے منتخب کرتے ہیں اور ایسے موضوعات بھی جو بعض افراد اپنی دلچسپی سے اپنے تحقیقی کاموں کا مرکز بنا لیتے ہیں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ موضوع کا تعین، محقق کی تھوڑی بہت دلچسپی کے بغیر نہیں ہونا چاہیے۔ ایک ایسے طالب علم کو جسے علم عروض سے نہ تو واقفیت ہو اور نہ دلچسپی، علم عروض، صنائع و بدائع یا قواعد کا مطالعہ جیسا موضوع دے دینا، موضوع اور محقق دونوں کی مٹی خراب کرنا ہے۔ اسی طرح سوانحات یا شعرا سے دلچسپی رکھنے والے کو لسانیات کے موضوع میں پھنسا دینا، اس کے لیے مصائب کا دروازہ کھول دینا ہے۔ نہ تو خود کام کرنے والا لگن کے ساتھ کام کرسکتا ہے اور نہ اس کا کیا ہوا کام اس کا اہل ہوگا کہ اسے ادب کے طاق و ایوان میں سجایا جاسکے۔ یہی حال افراد کا بھی ہوسکتا ہے کہ جو خود اپنی دلچسپی کے مستقر تلاش کرسکتے ہیں۔ ورنہ یہی ہوگا کہ 'من چہ سرائم و طنبورۂ من چہ می سرائد'۔ اسی کے ساتھ ساتھ محقق کو اپنی صلاحیتوں اور کوششوں کا بھی صحیح اندازہ کرلینا چاہیے کیونکہ جس طرح جبراً کوئی کام اچھا نہیں ہوتا اسی طرح محقق نے اگر اپنی مرضی سے بھی ایسا موضوع لے لیا جس کا وہ اہل نہیں تو موضوع کے ساتھ وہ انصاف نہیں کرسکتا۔ موضوع کا انتخاب مختلف انداز کا ہوسکتا ہے۔ کچھ لوگ کسی مخصوص شاعر کو اپنا لیتے ہیں اور اپنی تحقیق کو اسی ایک شاعر اور ادیب کے گرد و پیش تک محدود رکھتے ہیں، کچھ ایک مخصوص دور کے ادب کا جائزہ لیتے ہیں۔ ان رجحانات کو دائرۂ بحث میں لاتے ہیں جو اس مخصوص دور کا مزاج اور مذاق ہوتے ہیں اور اس سے دور کی ادبی اور سماجی کوششوں کو اکٹھا کرکے اس پر محاکمہ کرتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو مختلف اصنافِ سخن سے دلچسپی ہے اور جو اسی چوکھٹے میں اپنی کوششوں کو محدود رکھنا چاہتے ہیں۔ کچھ مذہبی یا سماجی گروہوں کی بنیاد پر ادب کا جائزہ لینا چاہتے ہیں جیسے اُردو ادب کی ترویج میں ہندوؤں کا حصّہ، کچھ ادب کے علاقائی ارتقا

پر کام کرنا چاہتے ہیں جیسے 'بھوپال میں اُردو' 'بہار میں اُردو' وغیرہ۔ غرض کہ موضوعات کی انتہا نہیں۔ لیکن ان تمام تحقیقی کاموں میں کتنے ہی ایسے ہیں جو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچتے۔ کبھی تو محقق کی لاپروائی، کبھی لگن کی کمی اور کبھی صلاحیتوں کا فقدان آڑے آتا ہے اور ان سب وجوہ کا صحیح طور پر جائزہ لیا جائے تو طریق کار ہی کا زیادہ تر اس میں ہاتھ نظر آتا ہے۔ ہماری تحقیقات میں نہ تو محقق کا منصب متعین ہے، نہ طریق کار اور مواد کی فراہمی وغیرہ کے لیے اتنی آسانیاں ہیں جو جدید دُنیا میں روز بروز مروّج ہوتی جاتی ہیں۔ اس لیے یہ بہت ضروری ہے کہ موضوع کے تعین ہی کے وقت محقق اس سے اپنی دلچسپی، اپنی قوتِ مطالعہ وغیرہ کا اندازہ لگائے اس کے بعد مواد کی فراہمی کا سوال آتا ہے۔

مواد کی فراہمی محقق کے لیے ایک بڑی اہم منزل ہے جس پر ہمارے تحقیقی کاموں کی تکمیل کا آدھا انحصار ضرور ہے۔ محقق ایسے کام زیادہ تر، لائبریریوں ہی کی مدد سے کر سکتے ہیں۔ باہر کے ملکوں میں علاوہ مخصوص لائبریریوں کے لوگوں کی اپنی نجی لائبریریاں اور کتابوں کے ذخیرے بھی ہیں جہاں سے تحقیق کے طلبا خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ لیکن باوجود بہت سی آسانیوں کے ابھی ہمیں وہ آسانیاں فراہم نہیں جو دُوسرے ملکوں میں ہیں۔ ہمیں تو بہی تھوڑی سی مے اور چھوٹے سے پیمانے پر اکتفا کرنی پڑتی ہے۔ یا پھر چند راویوں کے بیانات کی بنیاد پر اپنی دیواریں کھڑی کرنی ہوتی ہیں۔ کیونکہ بہرحال کتابیں یا کتابوں کے متعلق واقف کاروں کی معلومات ہی ہماری تحقیق کا مسالہ بنتی ہیں۔ جب تک ہمیں اس بات کا علم نہ ہو کہ ہمارے موضوع سے متعلق مسالہ کہاں ہے اور کیسے فراہم کیا جا سکتا ہے، اس خاص موضوع پر کون کون سی کتابیں ہیں، تحقیق کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔

یورپ اور امریکہ میں ایسے کاموں کے لیے تحقیق و تدقیق سے دلچسپی رکھنے والوں نے ایسی اہم کتابوں کی ببلیوگرافیاں تیار کر دی ہیں۔ جن میں تمام و کمال معلومات فراہم کر دی گئی ہیں۔ کسی بھی موضوع پر کام کرنے والوں کو دو چار ایسی ببلیوگرافیاں ضرور مل جاتی ہیں جن میں متعلقہ موضوع پر جدید سے جدید تر کتابوں کی فہرست اور ان میں اس موضوع پر کیا کچھ لکھا گیا ہے، سب کچھ شامل رہتا ہے۔ چنانچہ عہد وسطیٰ کی انگریزی غنائی شاعری پر کام کرنے والوں کے لیے رابنسن کی INDEX OF MIDDLE ENGLISH VERSE اور ایڈن ویلس کی کتاب MANUAL OF THE WRITING IN MIDDLE ENGLISH اور کارلٹن براؤن کی مشہور کتاب REGISTER OF MIDDLE ENGLISH RELIGIOUS AND DIDATIC VERSE خاص ہیں۔ یہی نہیں بلکہ الگ الگ مصنفین کے لیے بھی وہاں ببلیوگرافیاں تیار کر لی گئی ہے۔ چنانچہ چاسر پر کام کرنے والوں کے لیے ڈی۔ ڈی گریفتھ کی ببلیوگرافی اور ڈاکٹر جانسن اور اس کے عہد پر کام کرنے والوں کے لیے کلیفرڈ (CLIFFORD) کی ببلیوگرافی خاص ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ تقریباً ہر شاعر اور ادیب کے لیے الگ الگ ماہرین موجود ہیں جو اس بات پر عامل ہیں کہ چاہے ہماری معلومات زیادہ ادیبوں اور شاعروں کے متعلق کافی نہ ہوں لیکن جن کے متعلق ہوں، پوری اور تفصیلی ہوں۔ اس طرح محققین کو نہ صرف ہدایات اور آسانیاں فراہم ہو جاتی ہیں بلکہ ان کا بہت سا وقت برباد ہونے سے بچ جاتا ہے۔ لیکن ہم اُردو والوں کا معاملہ بالکل دُوسرا ہے۔ اوّل تو تحقیق کا کام ہمارے یہاں ابھی تک سائنٹفک ڈھنگ سے بہت کم کیا گیا ہے۔ پھر ہمیں وہ آسانیاں بھی حاصل نہیں۔ اُردو میں

ببلیوگرافی تیار کرنا شاید کوئی اہم اور قابلِ قدر کام نہیں سمجھا جاتا اور سچ پوچھیے تو ہمیں چند کتب خانوں کے علاوہ اور کسی کتب خانے میں کیا ہے، اس کا بھی علم نہیں۔ ان دو ایک کتب خانوں کے جو دو ایک کیٹلاگ، ڈاکٹر زور، پروفیسر مبارز الدین رفعت، مرحوم نصیر الدین ہاشمی صاحبان اور دُوسرے لوگوں نے تیار کر دیے ہیں انھیں بھی ہمارے محققین اپنے کام کے لیے بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ ہمارے لیے کچھ انڈیا آفس کے کیٹلاگ اور کچھ مستشرقین کی تیار کی ہوئی پُرانی فہرست کتب ہیں جو ہی کافی سمجھی جاتی ہیں۔ ان میں سے اکثر کسی موضوع پر آج تک کی (up to date) مکمل اطلاع دینے سے قاصر ہیں۔ ہمارے پاس نہ کیمبرج ببلیوگرافی آف انگلش لٹریچر جیسی کوئی چیز ہے اور نہ منتھلی ریویو یا کوارٹرلی ریویو جیسی میگزین، جو موضوعات اور کتابوں کی مکمل فہرست فراہم کر سکیں۔ اگر 'نوائے ادب' یا 'قومی زبان' جیسے دو ایک رسالے اُردو میں اور نکلنے لگیں تو محققین کی بہت کچھ مدد ہو سکتی ہے لیکن اُردو میں ایسے رسالوں کا مذاق ابھی زیادہ پیدا نہیں ہُوا۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہمیں اپنے سرمائے کا خود صحیح علم نہیں ہو پاتا۔ اور نہ ہم ان اغلاط سے باخبر ہو پاتے ہیں جو گارساں دی تاسی، بلوم ہارٹ، یا اشپرنگر کی فہرستوں میں ہو سکتی ہیں۔ اور کبھی کبھی تو اصل کتاب تک رسائی بھی مشکل ہو جاتی ہے۔ کسی جگہ سے حوالے نقل کیے جاتے ہیں جن میں ایسے ایڈیشن اور ایسی کتابوں کے نام بھی وجود میں آ جاتے ہیں جن کا کوئی وجود ہی نہیں ہوتا۔

فنِ تحقیق کو پروان چڑھانے کے لیے اُردو میں ببلیوگرافی نگاری کی سخت ضرورت ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انگریزی ادب کی طرح شعرا اور ادیبوں کا ایک رجسٹر بھی تیار ہو جائے تو محققین کی بڑی مدد ہو سکتی ہے۔ بعض اوقات ہمارے محققین شعرا کی پیدائش اور اموات کی صحیح تاریخوں کی تلاش میں مہینوں سرگرداں رہتے ہیں پھر بھی کسی صحیح نتیجے پر نہیں پہنچ پاتے۔ کیا یہ ممکن نہیں کہ قاضی عبدالودود صاحب جیسے لوگ کم از کم یہی کام کر دیں تو اُردو ادب کے محققین کا بہت سا وقت ضائع ہونے سے بچ جائے۔ بظاہر یہ بات دریافت ہو جانے کے بعد بہت معمولی سی ہو جاتی ہے کہ کوئی شاعر کب پیدا ہُوا اور کب مرگیا۔ لیکن اس سے جو دور کا احاطہ ہوتا ہے اس سے اُس زمانے کے انسانوں کے سماجی اور تہذیبی ذوق کی تصویر مکمل کرنے میں بڑی آسانیاں ہو جاتی ہیں۔ اور شعرا کے رجسٹروں، پیدائش اور اموات کی تاریخوں کا تعین کرنا ہر شخص کا کام نہیں۔ چنانچہ ولی دکنی کے نام، ان کی جائے رہائش، ان کا شمالی ہندوستان آنے کا سن اور اُن کی تاریخ وفات، سب ابھی تک معرضِ بحث میں ہیں۔ جن سے شمالی ہندوستان میں اُردو شاعری کے آغاز کا مسئلہ بھی اچھی خاصی بحث کا موضوع بنا ہُوا ہے۔ کام صرف وہی لوگ انجام دے سکتے ہیں جو صاحب نظر ہیں۔ جنھوں نے اپنی عمریں کسی موضوع پر سوچنے اور سمجھنے پر صرف کی ہیں، جن کی نظر میں ایسے اہم مسودے ہو سکتے ہیں جنھیں شاید بعد کو آنے والی نسلیں نہ دیکھ سکیں گی اور نہ شاید انھیں کا علم ہو گا۔ اُردو ادب کے لیے یہ دور اس وجہ سے بھی بے حد پُر آشوب ہے کہ پُرانے بادہ خوار اٹھتے جاتے ہیں اور بہت سے پابہ رکاب ہیں۔ نئی نسل کے وسائل و ذرائع اتنے محدود ہوتے جا رہے ہیں کہ جب انھیں اپنے ادب سے سائنٹفک مطالعے کا شعور آیا تو سارے آلاتِ متعلقہ ہی ان کے سامنے نہ رہ گئے۔ میں یہ باتیں اپنے ہندوستان کے وسا

ہی کو نظر میں رکھ کر کہہ رہا ہوں۔ مصحفی پر ایک مدّت سے کام کرنے والے قاضی عبدالودود صاحب اگر مصحفی پر ایک ببلیوگرافی ہی بنا دیں یا پروفیسر مسعود حسن رضوی، انیس اور مرثیوں سے متعلق تمام معلومات ایک جگہ جمع کر دیں تو یہ کام بھی اس سے کم نہ ہوگا کہ یہ حضرات مصحفی یا فنِ مرثیہ گوئی پر کوئی کتاب چھوڑیں۔ ہو سکتا ہے کہ بعد کو کام کرنے والے، ان موضوعات پر، انھیں ببلیوگرافیوں کی مدد سے کسی نئے زاویے سے سوچ سکیں اور اس طرح فنِ تحقیق کی روشنیاں ادب کے ایوانوں کو اور زیادہ منوّر کر سکیں۔

ببلیوگرافی ہی سے متعلق مسئلہ مخطوطوں کی تلاش کا مسئلہ ہے جو محقق کے لیے بڑا جانگسل ہے۔ ہندوستان میں پریس کی مدّت حیات اتنی کم ہے کہ اہم اور قدیم کتابوں کے بہت سارے مخطوطے مختلف کتب خانوں، اُمرا اور رئیسوں کے دیوان خانوں میں دبے پڑے ہیں جو گاہے ماہے کسی کے ہاتھ لگ گئے تو لگ گئے ورنہ سڑ گل کر برباد ہو جاتے ہیں اور بہت سے اہم مسائل جن پر کچھ روشنی پڑ سکتی تھی ہمیشہ کے لیے پردۂ خفا میں سو جاتے ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ان کا پتہ بھی کیونکر لگے۔ ہمارے پاس نہ تو فلپ ہیمر کی ..... GUIDE TO ARCHIVES & MANUSCRIPT ہے

اور نہ ڈاؤن کی AMERICAN LIBRARY RESOURCES۔ نہ آکسفورڈ کا SUMMARY CATALO-
GUE OF MANUSCRIPT .... اور نہ ادب اور فن کی طرف ایسی توجّہ کا شعور۔ بلکہ کبھی کبھی تو جنھیں ادبی ذوق ہے وہ بھی اس کام کو بے مصرف اور وقت کی بربادی سے تعبیر کرتے ہیں۔ چنانچہ مخطوطوں کی تلاش ہمارے یہاں جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ اکثر کتابیں ناخواندوں اور بے قدروں کے پاس دبی پڑی ہیں جو کتابوں کو اوّل تو کاہلی اور تساہل کے باعث دکھاتے ہی نہیں اور اگر دکھایا تو محقق کو اس سے فائدہ اُٹھانے کی اجازت نہیں دیتے اور سمجھتے ہیں کہ معلوم نہیں کون سا جواہر ان کے پاس ہے جسے یہ محقق ہزاروں میں بیچ دے گا۔ یہاں تک کہ وہ مخطوطہ کچھ دنوں میں راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ جاتا ہے۔ کچھ ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جو ایسے بیش بہا نسخوں کو کوڑا کرکٹ سمجھ کر گھر کے سب سے خراب حصّوں میں پھنکوا دیتے ہیں جہاں نہ وہ خود کبھی جاتے ہیں اور نہ کسی کو جانے دیتے ہیں۔ کچھ لوگ چند عام طور پر دستیاب ہو جانے والی کتابوں کو اتنی اہمیت دے دیتے ہیں جیسے سوا ان کے پاس کے اور ان کتابوں کا کہیں وجود ہی نہیں اور ان کے حاصل کرنے کی ایک لمبی چوڑی داستان سُناتے ہیں، کچھ لوگ صرف یہیں تک بتاتے ہیں کہ کبھی یہ کتاب اُن کے پاس تھی، کچھ نایاب کتابوں کے حوالے دیتے ہیں مگر کسی کو دکھاتے نہیں تاکہ سب لوگ انھیں کا حوالہ دیتے رہیں اور جو کچھ غلط سلط رائے انھوں نے اُن مخطوطوں کو پڑھ کر قائم کی ہے اس میں کوئی بہتری کی صورت نہ پیدا ہو یا اُس مخصوص کتاب کے لیے لوگ ہمیشہ ان ہی کے محتاج رہیں اور اس طرح ان کی اہمیت ہمیشہ باقی رہے۔ کچھ صرف اپنے مخطوطوں کے نام زبانی بتا دیتے ہیں مگر کسی قیمت پر دکھانے کو تیار نہیں ہوتے۔ اس سلسلے میں ایک قصّہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ کہا جاتا ہے کہ سیاسیات کا معروف مفکّر ہر ولڈ لاسکی، جان اسٹورٹ مل کی خود نوشت سوانح عمری کا ایک قلمی نسخہ خود مصنّف کے ہاتھ کا لکھا ہوا دیکھنا چاہتا تھا جو ایک لارڈ کے قبضے میں تھا۔ لاسکی کی خواہش پر لارڈ نے اپنے ایک غیر دستخط شدہ خط میں اُسے لکھا کہ کسی مخطوطے پر قابض ہونے میں سب سے بڑی خوشی اس وقت

ہوتی ہے جب سوا فالعض کے دُوسرا نہ دیکھ سکے۔[1]

ایسی صورت میں اُردو میں مخطوطوں کی تلاش آسان کام نہیں۔ یہ صُورت اس وقت تک ختم نہیں ہوسکتی جب تک کہ ہم میں مخطوطوں کی اہمیت اور ان کی قدر وقیمت کا صحیح شعور بیدار نہ ہو۔ بڑے بڑے ادارے قائم کیے جائیں جو مناسب اور موزوں قیمت دے کر کسی طرح ایسے مخطوطات کو ایسے نا اہلوں کے پنجوں سے نکال کر محققین کے لیے فراہم کریں۔ انجمن ترقی اُردو بھی اس سلسلے میں مدد اور رہبری کر سکتی ہے۔

مخطوطوں اور اہم کتابوں کی تلاش کبھی کبھی میل دل کی موبی ڈک اور حاتم طائی کے کوہ ندا سے کم دلچسپ نہیں ہوتی۔ جن حالات میں مخطوطوں کے مالکین اور محققین کو پیش کیا گیا ہے ان کے علاوہ بھی ایسی صورتیں پیدا ہو جاتی ہیں جو محقق کے لیے کچھ کم محنت طلب اور پریشان کن نہیں ہوتیں۔ اکثر ادیب اور ناقد ایسی کتابوں کے حوالے دے دیتے ہیں جن کے یا تو انھیں نام غلط یاد رہ گئے یا مصنف کا نام بدل گیا یا کسی سہو کی وجہ سے لائبریری یا کسی کتب خانے کا غلط نام ان کی تحریروں میں شامل ہو گیا۔ اب محقق بے چارہ اس راز سے ناواقف سرگرداں حیران و پریشان ڈھونڈتا پھرتا ہے لیکن کتاب کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ ادیب یا ناقد مذکور سے استفسار کرتا ہے تو اکثر و بیشتر جواب سے محروم رہتا ہے یا پھر اُسے غیر تشفی بخش جواب ملتا ہے کہیں بیانات میں تضاد ملتا ہے تو کہیں ایجابی کیفیت۔ کہیں تحقیق کے نقطۂ نظر سے ایک بڑا ہی اہم واقعہ ایک ضعیف یا نامانوس راوی کی روایت سے ملتا ہے تو کہیں ایک معمولی واقعہ بڑی اہمیت کے ساتھ۔ ایسی صورت میں محقق کا کام مشکل سے مشکل تر ہوتا جاتا ہے۔ ایسے راویوں سے بھی اس کا سابقہ پڑتا ہے جو جان بوجھ کر حقائق کو بدل دیتے ہیں کسی محبت یا دشمنی کے جذبے سے سرشار ہو کر اور کبھی کوئی ادیب خود اپنے ہی متعلق سہواً غلط باتیں لکھ جاتا ہے۔ ایسی کتابوں کے نام ملتے ہیں جو کتاب کے اصل نام تھے ہی نہیں لیکن وہ کتاب ہمیشہ اسی نام سے یاد کی گئی جیسے فضلی کی کتاب کربل کتھا کا نام ہمیشہ دہ مجلس ہی پکارا گیا۔ کریم الدین نے جس کے پاس کربل کتھا کا نسخہ تھا، کسی بے خیالی میں اس کا نام دہ مجلس لکھ دیا کیونکہ یہ کتاب روضۃ الشہدا کی بنیاد پر لکھی گئی تھی۔ اب ثابت ہوا کہ مصنف نے اس کا نام کربل کتھا رکھا تھا۔ تقریباً یہی صُورت واجد علی شاہ کی بنّی، ناجو اور عشق نامہ کے لیے پیدا ہوئی۔ کوئی انھیں مثنوی بتاتا ہے، کوئی غزلوں کا مجموعہ اور کوئی اُردو نثر میں لکھی ہوئی سوانح عمری۔ اور کتابوں کے دیکھنے سے پتہ چلا کہ بنّی اور ناجو علم موسیقی پر نثر میں لکھی ہوئی کتابیں ہیں جن میں گیتوں اور راگنیوں کو مصوّر بھی کیا گیا ہے۔ رہس اور نقلیں بیان کی گئی ہیں۔

کم و بیش یہی صُورت راویوں اور روایتوں کی بھی ہے۔ جنھوں نے میجر سلیمن کی کتاب سفرنامۂ اودھ اور نجم الغنی کی تاریخ اودھ کا اثر لیا ہے وہ مسیح الدین کی سفیر اودھ اور ولیم نائٹن کی کتاب ایک مشرقی بادشاہ کی خانگی زندگی اور اس کتاب کو جیسے جانتے ہی نہیں جو اودھ بلیو بک کے جواب میں خود واجد علی شاہ نے ۱۸۵۵ء میں لکھی تھی۔ اکثر محقق کو واقعات کی تہوں میں وہ اُلٹ پھیر، بیانات میں وہ تضاد ملتا ہے کہ صحیح راستہ تلاش کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ایک مؤرخ ٹیپو سلطان کی بُرائی کرتا ہے تو

---

1. Art of Literary Research _ Richard Altic p. 242

دُوسرا انگریز مورخ اسی دور کا جیمس مل اپنی کتاب 'تاریخ ہند' میں انگریزوں کی بدمعاشیوں کو بے نقاب کرتا ہے۔ ادب کی تاریخ میں بھی اسی طرح کے بے شمار بیانات ملتے ہیں۔ مصنّف اکثر جذبات کی رو میں بہنے لگتا ہے اور حقیقت پس پشت پڑ جاتی ہے۔ جذبات کی رَو میں بہنا، تحقیق کی دُنیا میں بے انتہا خطرناک اور مضرت رساں ہے اور جس سے کبھی اضافے کا امکان بھی نہیں۔ جذبات میں ایک طرف تو جانب داری کا امکان پیدا ہو جاتا ہے، دُوسری طرف حقیقتوں کی سمت دھیان نہیں جاتا۔ عبارت کا بہاؤ اور خیالات کی رَو اصلیت کا دامن چھوڑ دیتی ہے اور تحقیق کے مسائل پس پشت چھوٹ جاتے ہیں۔ اور خاص طور پر جب کسی دعوے کے لیے ثبوت فراہم نہ ہو سکے یا ثبوت اس کے برعکس ہوں اور مدعی نے انھیں دیکھا ہی نہ ہو تو محقق کہاں سے کہاں پہنچ جاتا ہے۔ نصیرالدین ہاشمی صاحب جو دکنی ادب کے ماہرین میں شمار کیے جاتے ہیں اور جن کی اہمیت کا وافعی سب کو اقرار ہے، اپنی کتاب 'دکنی کلچر' میں 'اُردو حیدر علی اور ٹیپو کے عہد میں' کے سلسلے میں ایک جگہ یوں رقم طراز ہیں۔

"سلطنتِ خداداد کے بعض اُردو کارنامے تاریخ اُردو میں آبِ زر سے لکھے جائیں گے
نواب حیدر علی اور ٹیپو سلطان نے اُردو زبان میں بعض ایسی یادگاریں چھوڑی ہیں جن کو
نہ زمانہ مٹا سکتا ہے اور نہ حوادث محو کر سکتے ہیں۔"[1]

اس عبارت کے بعد جب کارناموں کا تذکرہ ہوتا ہے تو کہیں کتاب کا نام معلوم ہے تو مصنّف کا پتہ نہیں چلتا، سنِ تصنیف بھی نامعلوم۔ کتاب انڈیا آفس لائبریری میں ہے لیکن کبھی شائع نہیں ہوئی۔ پھر کتاب کو مصنّف اصلی نے پُورا لکھا بھی نہیں بلکہ ادھورا چھوڑ دیا تھا۔ کس نے بعد کو پُورا کیا یہ بھی نہیں معلوم۔ کب پُورا کیا؟ اس کا بھی علم نہیں۔ ان تمام کمیوں کے باوجود کتابوں کا اُردو ادب کی تاریخ میں 'آبِ زر' سے تذکرہ، کس قدر جذباتی بات ہے۔ ایک تحقیق کے طالب علم کے ہاتھ کیا آیا، صرف نام اور جن کے وجود کے بارے میں خود محقق اوّل مشکوک ہے۔

اسی طرح جذباتی تنقید کی ایک دُوسری مثال صغیر بلگرامی کی مشہور و معروف کتاب تذکرۂ جلوۂ خضر سے ملاحظہ ہو۔ ہندوستان میں اُردو کے آغاز کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

"وہ دیکھو عرب سے عربی گھوڑے پر سوار عربی لوگ چلے آتے ہیں۔ علی ابن ابی طالب
علیہ السلام کی خلافت کا زمانہ ہے۔ بدن میں سفید سفید عبائیں، سر پر اُودے اُودے
عمامے تحت الحنکیں بندھے۔ . . . . . دیکھیے دریا، جنگل، پہاڑ جو کچھ سامنے آتا ہے
سب سے گزرتے چلے آتے ہیں۔ لیجیے ہندوستان میں آدھمکے، سندھ کو فتح کیا۔ دَور
دَورِ خُدا پرستاں ہو گیا۔"[2]

---

[1] دکنی کلچر مطبوعہ ۱۹۶۳ء لاہور۔ "اُردو حیدر علی اور ٹیپو کے عہد میں" والا باب ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

[2] تذکرہ جلوۂ خضر ص ۲۱-۲۲ مطبوعہ ۱۸۸۵ء ملوکہ الہ آباد یونیورسٹی۔

اور پھر اس کے بعد مولانا بلگرامی نے وہ سماں باندھا ہے کہ اُردو کی ابتدا کی صورت پیدا ہوتی نظر آتی ہے۔ پھر ایک جگہ خلیفہ ہارون رشید کا ہندوستان میں ورود لکھ دیا ہے۔ یہ درست ہے کہ محمد بن قاسم سے قبل بھی عربوں نے ہندوستان میں دو ایک کوششیں کیں لیکن ابھی تک کسی تاریخی دستاویز سے حضرت علی کے زمانہ میں ہندوستان پر کسی ایسے حملے کا پتہ نہیں چلتا۔ پھر یہ بھی محلِ نظر ہے کہ آیا حضرت علی کے دورِ خلافت میں بیرونی فتوحات عمل میں آئیں بھی یا نہیں۔ صغیر نے کوئی ماخذ بھی اپنا نہیں بتایا۔ غالباً اُنھوں نے جو کچھ ادھر اُدھر سے سُنا اسے قلم بند کر دیا۔ نہ اُن کا مقصد بد دیانتی تھا اور نہ فرضی قصّے قصداً گھڑنا لیکن بعد کے طالب علم انھیں بیانات پر ایک طرف تو اپنی تحقیق کی دیواریں کھڑی کر سکتے ہیں دُوسری طرف تذکرہ جلوۂ خضر کے حوالوں کی اہمیت گھٹ جاتی ہے کیونکہ یہی بیانات مصنّف کے غیر محتاط ہونے کا ثبوت بن جاتے ہیں۔ محمد حسین آزاد نے الٰہی بخش معروف کو ذوقؔ کا شاگرد بتایا ہے جبکہ خود معروفؔ نے اپنی مثنویوں میں خود کو شاہ نصیر کا شاگرد لکھا ہے۔ یُوں بھی معروف اور ذوقؔ کی عمر وں میں اتنا تفاوت ہے کہ یہ بیان قابلِ قبول نہیں۔ اُردو ادب کی ایک تاریخ میں میر تقی میر کے لیے یہ عبارت ملتی ہے۔

> "اُن کے والد نے انھیں جو باتیں تعلیم کی تھیں، وہ 'نکات الشعراً' میں درج ہیں۔ ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو دُنیا داری سے سروکار نہ تھا۔"

غالباً ذکرِ میر کے دھوکے میں مصنّف نے نکات الشعرا کا نام لکھ دیا جو ایک غیر محتاط طالب علم کے بھٹکنے کے لیے بہت کافی ہے۔

نولکشور پریس سے شائع شدہ دیوانِ مخفی کو 'ابتدائی ایڈیشنوں میں' مخفی رشتی کا دیوان بتایا گیا ہے اور کچھ اشتہارات میں اس بات کی مذمت بھی کی گئی ہے کہ اس دیوان کو بہت سے لوگ مغل شاہزادی زیب النسا کا دیوان بتاتے ہیں جس کا تخلص بھی مخفی کہا جاتا ہے۔ لیکن اسی نول کشور پریس سے ۱۹۱۵ء میں جو دیوانِ مخفی شائع ہوا اس میں اُسے زیب النسا مخفی کی تصنیف بتایا گیا اور ۱۹۲۹ء میں جب عبدالباری آسی نے اسی دیوان کو پھر سے مرتب کیا تو جی بھر کے اسے زیب النساء مخفی کا دیوان ثابت کیا گیا کچھ محققین کے نزدیک اورنگ زیب کی کسی شاہزادی کا نہ مخفی تخلص تھا اور نہ کوئی شاعرہ تھی۔ اسی طرح ابوسعید ابوالخیر کے نام سے جتنی رُباعیاں مشہور ہیں، ڈاکٹر عندلیب شادانی کی تحقیق کے مطابق، علاوہ دو، ایک کے کوئی ان کی نہیں۔ جبکہ پروفیسر براؤن، نکلسن، ڈاکٹر قاسم غنی، ڈاکٹر رضا زادہ شفق اور بہت سے ایرانی اور ہندی نژاد ادیبوں نے ابوالخیر کو بہت بڑا رُباعی نگار مانا ہے۔ ڈاکٹر شادانی نے جو بحث کی ہے وہ وزن رکھتی ہے اور محققین کی آسودگی کے لیے اچھے ثبوت اُنھوں نے فراہم کیے ہیں[1]۔

محققین کے لیے ایسی فروگذاشتیں صرف اُردو ادب ہی میں اکٹھا نہیں ہوئیں، ان کا سلسلہ عالمگیر ہے۔ انگریزی

---

[1] ڈاکٹر عندلیب شادانی نے مجلّہ 'نذرِ عرشی' میں ایک مضمون 'رُباعیات ابوسعید الخیر' میں یہ بحث اٹھائی ہے اور شیر خاں لودھی کی کتاب 'مراۃ الخیال' کا حوالہ دیا ہے جو عالمگیری عہد کی تصنیف ہے۔

ادب میں بھی، جہاں مصنّفین اور محققین بڑی احتیاط سے قدم اٹھاتے ہیں، اس طرح کی مثالیں موجود ہیں۔ مشہور انگریزی شاعر شیلی کی موت اور اُس کی لاش کے جلانے کے سلسلے میں بہت سے قصّے مشہور ہیں جن کا مستند راوی ایڈورڈ جان ٹریلانی (E. J. TRELAWNY) سمجھا جاتا ہے جس نے بڑی تفصیل سے پیسا (PISA) کے نزدیک سمندر کے کنارے شیلی کی لاش جلنے کے دلچسپ اور پُرسوز قصّے لکھے ہیں لیکن رچرڈ آلٹک کے بیان کے مطابق ٹریلانی نے اپنی پوری زندگی میں اسی ایک قصّے کو دس مختلف طریقوں اور واقعات کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ہم ٹریلانی کے بیانات کو ایک چشم دید گواہ سمجھ کر حرف بہ حرف تسلیم کر لیتے ہیں۔ جبکہ اس کے ہم عصر اسے سب سے بڑا جھوٹا اور بے اعتبار سمجھتے تھے۔ آج بھی اس کی خود نوشت سوانح عمری کو جس میں اُس نے بہت سے رُومانی ایڈونچر لکھے تھے،[1] بہت سے محققین نے دسواں حصّہ بھی مشکل سے صحیح بتایا ہے اور اپنی اس تحقیق کے ثبوت میں محکمۂ جہازرانی اور پبلک ریکارڈ آفس سے حوالے دیے ہیں۔ جہاں سے ٹریلانی کے بیانات کی پُرزور تردید ہوتی ہے۔[2] بائرن کے مشہور امریکی سوانح نگار مرچنڈ (MARCHAND) نے اس کی زندگی کے چند عشقیہ واقعات کی تلاش میں، خاص طور پر آگسٹالے (AUGUSTA LEIGH) نے جو اس کی سوتیلی بہن تھی، تمام یورپ اور یونان کا سفر کیا کہ اس عشق کی تفصیلات فراہم ہوں۔ لیکن اس کی کوئی اصلیت، سوا چند زبانی روایتوں کے اور کچھ نہ نکلی۔

بعض اوقات خود نوشت سوانح عمریاں یا خطوط اور خود مصنّف کے بیانات اپنے بارے میں قصداً اور کبھی کبھی سہواً غلط ہو جاتے ہیں۔ تحقیق کے طالب علم نے اگر مزید چھان بین کے بغیر انھیں جُوں کا تُوں، اس بنیاد پر مان لیا کہ مصنّف سے بہتر اُس کے بارے میں کون صحیح جان سکتا ہے تو غلطیوں کے بے انتہا امکانات ہو سکتے ہیں۔ تحقیق کو 'شنیدہ کے بود مانند دیدہ' کی حد تک حالات اور واقعات کے قریب ہونے کی کوشش کرنا چاہیے۔ جنھوں نے 'شاد کی کہانی شاد کی زبانی' کا تفصیلی مطالعہ کیا ہے اور قاضی عبدالودود صاحب کا اِس کتاب پر 'نشتر و سوزن' میں تبصرہ پڑھا ہوگا وہ ان اغلاط اور غلط بیانیوں سے بخوبی واقف ہوں گے جو مصنّفین خود اپنے بارے میں پھیلا دیتے ہیں۔ 'شاد کی کہانی شاد کی زبانی' سے جو تصویر شاد عظیم آبادی کی بنتی ہے اس کے مطابق ہندوستان کیا، تمام مشرق میں اُن سے بڑا نہ کوئی شاعر ہے اور نہ کوئی مفکر۔ یہاں تک کہ مغرب میں بھی ان کی شاعری کا شہرہ ہے۔ اکبرالٰہ آبادی اور اقبال کی شہرت کا اصلی سبب شاد عظیم آبادی ہی تھے۔ حالی نے مقدمۂ شعر و شاعری میں مرثیہ پر جن خیالات کا اظہار کیا وہ سب شاد ہی کے لکھے ہوئے ہیں۔ حسرت موہانی نے اقبال پر جب زبان کے معاملے میں اعتراضات کیے تو اُن کا جواب درپردہ شاد ہی دیتے رہے۔ اقبال نے آکسفورڈ اور کیمبرج میں جو فارسی پر مقالے پڑھے وہ سب شاد ہی کے لکھے ہوئے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔ فراق صاحب نے فراق نمبر میں 'میری زندگی کی دُھوپ چھاؤں'

---

1. Adventure of a Young Son.
2. Scholars Adventure by Richard Altic P. 287 Macmillan Edition.

کے عنوان سے جو اپنی سوانح عمری لکھی ہے اس میں ایک جگہ لکھا ہے "میں آئی۔ سی۔ ایس کے لیے ایک انٹرویو کے بعد منتخب کر لیا گیا" اور یہ بیانات متعدد بار 'بلٹز بمبئی' اور سرچ لائٹ پٹنہ میں بھی انھوں نے دیے۔ فراق صاحب کی جو عظمت بہ حیثیت شاعر کے ہے اس کے سامنے آئی۔ سی۔ ایس یا گورنر ہونا بالکل غیر اہم بات ہے اور پھر یہ بات ایک ادیب سے بہتر کون سمجھ سکتا ہے لیکن ان بیانات کے بعد کسی کو کیسے شبہ ہو سکتا ہے کہ وہ آئی۔ سی۔ ایس منتخب نہیں ہوئے۔ حالانکہ واقعی یہی ہے کہ فراق صاحب کو سہو ہوا ہے۔ وہ آئی۔ سی۔ ایس کے لیے نہیں بلکہ پی۔ سی۔ ایس کے لیے منتخب ہوئے تھے۔ یہ ویسی ہی بات ہے جیسے مصحفی نے تذکرہ ریاض الفصحا میں اپنی عمر اسّی سال کے قریب لکھی ہے جس سے ان کا سنِ پیدائش ۱۱۴۱ھ سے ۱۱۵۵ھ تک[1] کہیں ہو سکتا ہے۔ پھر دیوانِ ششم کے دیباچے میں یہ عبارت ملی: "تولّد من در احمد شاہی است"۔ احمد شاہ کا عہد ۲۸ اپریل ۱۷۴۸ء/۱۱۶۱ھ سے شروع ہوتا ہے اور یہیں سے صفدر جنگ کی وزارت کا آغاز بھی۔ اور واقعہ یہی ہے کہ مصحفی کا دوسرا بیان ہی صحیح ہے۔ ان باتوں کو ہم بد دیانتی نہیں بلکہ صرف سہو کہیں گے۔

واقعات اور بیانات کا جائزہ بڑی احتیاط سے لینا چاہیے کیونکہ ذرا سی بے احتیاطی پوری نسل کو بھٹکا سکتی ہے۔ خاص طور پر تاریخ اور ادب کی دنیا میں تو بڑی ہستیوں کو تو بہت ہی محتاط رہنے کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ آنے والی نسلیں ان کی شخصیت سے مرعوب ہو کر انھیں اپنا قائد اور پیشوا سمجھنے کے ساتھ ساتھ ان کے تمام بیانات پر بھروسہ کر سکتی ہیں۔ اسی طرح بڑے ادیبوں کی ذمہ داریاں اور بڑی ہو جاتی ہیں۔ انھیں کسی ذاتی پسند، ناپسند اور بغض و عناد کو کام میں نہیں لانا چاہیے کیونکہ اس کی وجہ سے ادب میں اکثر غلط اور بے بنیاد باتیں پھیل گئی ہیں۔ اس سے تحقیق و تدقیق کی دنیا مجروح ہو سکتی ہے۔ میر اور خانِ آرزو کے ذاتی اختلافات نے خانِ آرزو کی شخصیت کو بہت مسخ کیا۔ اودھ اور روہیلوں کی خاندانی لڑائیوں نے اودھ کی تاریخ کی شکل و صورت ہی بدل دی۔ غالب اور نواب شمس الدین احمد خاں کی خاندانی لڑائی نے غالب کو ان اقدام کے لیے اکسایا کہ نواب شمس الدین احمد خاں کی پھانسی میں غالب جیسا بلند انسان بھی سازشی کی حیثیت سے مشتبہ نظر آتا ہے لیکن غالب کے سوانح نگاروں نے اس واقعہ کی چھان بین کو مناسب نہیں سمجھا۔ کہا جاتا ہے کہ ورڈس ورتھ کے خلاف جو الزامات تراشے گئے کہ وہ سخت مغرور، متعصب اور اپنے ملک و وطن سے غدّاری کرنے والا انسان تھا، اس میں سے ہنٹ، کیٹس، اور ہیزلٹ کا چھوٹا مگر با اثر حلقہ شامل تھا۔[2] جبکہ دوسرے مؤرخ اور تنقید نگار اُسے بے انتہا انسانیت پرست، محبِّ وطن اور آزاد منش انسان کہتے آئے ہیں۔ معلوم نہیں کہ مس ایڈتھ باتھو (EDITH BATHO) جنھوں نے The Latter Wordsworth میں اس خیال کا اظہار کیا، کیٹس اور ہیزلٹ وغیرہ سے کس جذبے کے ساتھ متاثر تھیں یا واقعی جو لوگ ورڈس ورتھ کے بہت قریب تھے انھوں نے اُسے ایسا ہی پایا تھا۔ ایسے بڑے ادیبوں کی اس طرح کی متضاد رائیں محققین کو بڑی پریشانی میں مبتلا کر دیتی ہیں۔

---

1. اودھ کے پہلے دو نواب' مصنفہ آشیر بادی لال ص ۱۲۶ مرقع دہلی ص ۱۱۳ از درگاہ قلی خاں۔
2. Art of Literary Research - Altick p. 39

اُردو میں تحقیقی کام کے لیے دُوسرے ذرائع بہت محدُود ہیں۔ مائیکروفلم اور روٹو گراف کا حاصل کرنا ہر تحقیق کے طالب علم کے لیے ممکن نہیں۔ ہماری معاشی حالت سب کو یکساں ان ذرائع سے فائدہ نہیں پہنچا سکتی۔ اس کام میں کچھ لائبریریاں اور کچھ حکومت مدد کر سکتی ہے۔ لائبریریوں میں بھی صرف یونیورسٹیوں کی لائبریریاں ہی ہیں جنھیں جدید ترین آلات کے حاصل کرنے کی مقدرت حاصل ہے۔ یہ لائبریریاں ایسی نایاب کتابوں کی مائیکروفلم منگانے اور ان کے پڑھنے کے لیے مشینوں کا انتظام کریں تو تحقیق کا کام موجودہ صورت سے اور بہتر ہو سکتا ہے کیونکہ جو لائبریریاں مشورہ کے لیے کتابیں مستعار دیتی ہیں وہ بھی اپنی ان کتابوں کو باہر نہیں جانے دینا چاہتیں جو نایاب ہیں۔ پھر مائکروفلم اور روٹو گراف کی سہولتیں نایاب کتابوں کو تلف ہونے سے بھی بچا سکتی ہیں۔ جدید تحقیق میں یوں بھی مائیکروفلم کی ہوئی کتابیں مستعار آئی ہُوئی کتابوں سے اس لیے بہتر سمجھی جاتی ہیں کہ ان کا مسوّدہ ہر وقت محقق کی مدد کے لیے موجود ہوتا ہے جبکہ مستعار آئی ہوئی کتاب ہر وقت مشورہ کے لیے نہیں مل سکتی۔

ہمارے محققین کے آخری مددگار وہ بزرگ اور ماہرین ادب ہو سکتے ہیں جنھوں نے اپنی عمر کا معتدبہ حصّہ تحقیق اور تجسس میں صرف کیا ہے۔ یہ منزل گویا زبانی یادداشت کی منزل ہوگی۔ کسی مستند ببلیگرافی اور قلمی کتابوں کے ذخیروں کی فہرست کی عدم موجودگی میں ان کی رہبری بہت بڑا سہارا ہے بشرطیکہ تحقیق کی اس دقت کو وہ بھی سمجھ کر کچھ دستگیری کے لیے صمیم قلب سے تیار ہوں۔ اور ایک امداد باہمی کی اسپرٹ کے ساتھ تحقیق کے میدان میں دشت نوردی کرنے والوں کی بے لوث رہبری کریں۔ نئی نسلوں کے لیے اپنا سرمایۂ علمی وقف کر دیں کیونکہ ان کے بعد اُردو ادب کے مشعل بردار اب یہی آنے والے ہوں گے اس میں کسی ذہنی احتساب سے کام لینا نہ تو اُن کے شایانِ شان ہے اور نہ یہ اُردو ادب کی خدمت۔ کسی موضوع کو صرف یہ سمجھ لینا کہ بس اُس کے تمام راستے انھیں پر بند ہو جائیں تاکہ آنے والے ہمیشہ ان کے محتاج رہیں اور دُوسرے اس میں نئے راستے نہ نکال سکیں، بڑی خود غرضی اور تنگ نظری ہے اور میرا خیال ہے کہ کوئی بالغ النظر محقق یا ادیب اسے کبھی پسند نہیں کرے گا۔ لارڈ روزبری اور پروفیسر لاسکی جیسی مثالیں مہیا کرنے والے کبھی اچھے نام سے ادب کی تاریخ میں یاد نہیں کیے جاتے۔ اُردو میں یہ رُجحان، کبھی چاہے رہا ہو مگر اب شاید ہی کوئی ادیب ایسا مزاج رکھتا ہو۔ میں ایسے چند قد آور ادیبوں کو جانتا ہُوں جو اپنے تنگ اور مشکل سے مشکل وقت میں بھی محققین کی ہر امکانی مدد کی کوشش کرتے ہیں۔ محض اس لیے کہ وہ ادب کے اس دھارے اور رُخ کو پہچانتے ہیں جس کے سوتے نئی نسل سے عدم توجہی برتنے کے باعث خشک ہو جاتے ہیں۔ ایک ادب دوست کا یہی وطیرہ ہونا چاہیے اور ہمارے محققین کو بھی ہر امکانی صُورت میں ان سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔ ہو سکتا ہے کہ نئے لوگوں کو اس طریق کار سے اختلاف ہو جو پُرانا طریق کار رہا ہے لیکن جو علم ان پُرانے لوگوں کے ذہن میں بند ہے اس کی افادیت سے کسے انکار ہو سکتا ہے ادب کسی کی جاگیر نہیں اور نہ اس کا دائرہ اتنا تنگ ہو سکتا ہے کہ صرف چند اصولوں کے ساتھ اس کا انکشاف ہو سکے۔ نہ ادب میں نئے راستے نکالنا یا نئی معلومات بہم پہنچانا، مخصوص موضوعات پر چھان بین کرنا محض چند لوگوں کا اجارہ ہے۔ ادب کی دنیا میں ایسے لوگوں کو جو یہ سمجھتے ہیں کہ فلاں موضوع کو صرف وہی سمجھتے ہیں، اس سلسلے میں جتنی تحقیقات ہیں صرف وہی کر سکتے ہیں۔ انھیں کی بات اس ضمن میں حرفِ آخر ہے، انھیں گمراہ، کج فہم اور بر خود غلط شخصیتوں سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔ غلطیاں ایسے محققین سے بھی ہو سکتی

ہیں جنھوں نے کسی موضوع پر اپنی عمریں صرف کر دی ہیں اور اکثر وہی باریک نکتے ایک کم عمر محقق پر منکشف ہو سکتے ہیں۔ محقق اپنی تحقیق کی ترنگ میں بہک بھی سکتا ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک کم عمر اور معمولی تحقیق کے طالب علم کو وہ مسالہ مل جائے جو کسی بڑے ادیب یا محقق کو نہیں ملا اور اتفاق سے اُس میں اُن باتوں کا بکسر بطلان ہو جسے آج تک کے ادیب اور محقق صحیح مانتے آئے ہیں۔ ایسی صورت میں اُس محقق کو اس بات پر فخر و مباہات نہیں کرنا چاہیے کہ اس کے علم کے آگے دُوسروں کی کوئی حقیقت نہیں کیونکہ اس نے آج تک کی مشہور روایتوں کو غلط ثابت کر دینے کا نسخہ حاصل کر لیا ہے۔ بلکہ اسے ایک اتفاقی امر سمجھ کر سیدھے سادے طریقے سے اپنی تحقیق کو علما اور محققین کے لیے پیش کر دینا چاہیے۔ فخر و ادعا اور جذباتیت محقق کے لیے سم قاتل سے کم نہیں۔ اسے ہر وقت اپنے منصب اور اپنی ذمہ داریوں کا خیال رکھنا چاہیے اور ساتھ ہی ساتھ ان آبگینوں کا بھی جو ذرا سی ٹھیس لگ جانے سے چُور چُور ہو کر بکھر سکتے ہیں اور پھر فنِ تحقیق کے صفحات زخموں اور دل آزاریوں کی ناقابلِ بیان داستانوں سے بھر سکتے ہیں۔

محقق کا کام بڑا صبر آزما، محنت طلب اور کبھی کبھی تھکا دینے والا ہوتا ہے۔ اکثر یہ کی نظر پڑ ڈال کر ان حقائق کو ایسے واقعات کی تہہ سے نکال لانا جن پر ہر وقت، مروّت، رواداری اور تاریخ گہرے پردے ڈال چکی ہوتی ہے، کوئی معمولی کام نہیں۔ پھر ان حالات سے لڑتے رہنا جو خاندانی وقار، افشائے راز کا خوف، بنا بنایا بھرم باقی رکھنے کی تمنا سے پیدا ہوتے ہیں، صحیح واقعات کو محقق تک نہیں پہنچنے دیتے۔ ادیبوں کا آپس کا جذبۂ رقابت، آمدنی اور وسائل کے محدود ذرائع اور بہت سی دُشواریاں جن کا تذکرہ اس مضمون میں کیا گیا، بڑے بڑے اہلِ ہمت کے قدم ڈگمگا دیتی ہیں اور جن سے وہی لوگ سربر ہو سکتے ہیں۔ جنھوں نے دُنیا کے بہت سے آرام و آسائشوں کو تج کر ’اجل آئے کہ جان جائے‘ کا وِرد کرتے ہوئے تحقیق کی منزل میں قدم رکھا ہے اور اپنی ذاتی شہرت اور نام و نمود کے جذبے کو دبا کر ادب کے دائرے کو وسیع کرنے کے آرزو مند ہیں۔

میری ڈائری کے چند اوراق (مسلسل)

مشتاق احمد خان

بروز منگل ۲۵ مئی سنہ ۴۸ء

گذشتہ دو دنوں میں اعصابی کھچاؤ کی وجہ سے رات کو آرام کی نیند نہیں آئی۔ لیکن صبح چھ بجے ہوائی جہاز کا وقت تھا جس سے میرا کراچی واپس ہونا ضروری تھا۔ اس لیے تھکا ماندہ ۴ بجے تڑکے اٹھ بیٹھا۔ سوا پانچ بجے ہوائی جہاز کے اڈہ پر پہنچ گیا۔ وہاں آدھ گھنٹہ کا انتظار بڑی ہی آزمائش کی گھڑیاں تھیں۔ دہلی سے ہوائی جہاز کو روانہ ہوکر کوئی آدھ گھنٹہ بھی نہیں ہوا تھا کہ صحرائے راجستھان میں ہمارا ڈیکوٹا باد و باراں کے طوفان میں گھر گیا اور بری طرح ڈگمگانے لگا۔ وہ کبھی بادلوں کے اوپر جاتا تھا اور کبھی نیچے اور کبھی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے بادلوں کا لحاف اوڑھ لیا ہو۔ مسافروں کی اکثریت طوفان کے اثرات کی تاب نہ لاکر بیمار ہوگئی۔ میں آنکھیں بند کرکے اپنے والدِ محترم کی بتائی ہوئی دعا کا ورد کر رہا تھا۔ دوسرے مسافر بھی بے چارگی اور بے بسی کے عالم میں میری طرح اپنے اپنے طریقہ سے اپنے خالق کو یاد کر رہے تھے دعا کا ورد کرتا ہوا میں دل میں سوچ رہا تھا کہ قدرت کی ان گنت اور مہیب طاقتوں کے سامنے ان انسانی کھلونوں کی کیا حقیقت ہے۔ سائنس کے اس دور میں جب کہ برخود غلط انسان کو اپنی عقل و عجب پر اتنا زعم ہے کہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ ایسے موقعہ پر اسے بھی لامحالہ ماننا پڑتا ہے کہ کوئی طاقت ضرور ایسی ہے جس کے دستِ قدرت میں موت و حیات کا نظام ہے۔ اگر اس کی رضا ہو تو وہی اپنے بندوں کی حفاظت کر سکتا ہے۔ خدا خدا کر کے اس آزمائش سے چھٹکارا ملا تو سب کی جان میں جان آئی لیکن مجھے اطمینانِ قلب اس وقت نصیب ہوا جب ہمارا جہاز بھارت کی فضائی حدود پار کر کے پاکستان میں داخل ہوگیا۔

کراچی پہنچتے ہی غلام محمدؔ صاحب کو ٹیلیفون کیا اور سہ پہر ان سے ملاقات کے لیے گیا۔ جب میں نے انہیں یہ بتایا کہ حمل و نقل کے انتظامات کے سب مرحلے طے ہو چکے ہیں اور اب اس میں کسی قسم کی ترمیم کی گنجائش نہیں تو وہ بہت آزردہ خاطر ہوئے اور غصہ میں کہا "معلوم ہوتا ہے کہ تم لوگوں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ جو من میں آئے وہ کرو گے اور اپنے دوستوں اور بہی خواہوں سے مشورہ کرنا بھی ضروری خیال نہیں کرتے" میں نے بہت کچھ سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ غصہ میں بھرے خشمگیں نظروں سے میری طرف دیکھتے رہے اور تھوڑے تھوڑے وقفہ سے ہمارے اکابر اور ہمارے نظم و نسق کے بارہ میں کڑوی باتیں سناتے رہے۔ عام حالات میں میری حساس طبیعت شاید اسے برداشت نہ کرتی۔ مگر میں نے سفارتی طوق اپنے گلے میں ڈال رکھا تھا۔ اس لیے خاموش رہنے ہی میں اپنی خلاصی سمجھی۔ اگر میں یہ کہوں کہ اس ناخوشگوار ملاقات کا میرے اعصابی نظام پر اُسی قسم کا اثر پڑا۔ جیسا کہ باد و باراں کے طوفان میں گھرے ہوئے ہوائی جہاز پر ہوا تھا۔ تو اس میں ذرا بھر بھی مبالغہ نہ ہوگا۔

بروز بدھ ۲۶ مئی سنہ ۴۸ء

آج صبح میں قائدِ اعظمؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ میں جیسے ہی ان کے کمرے میں داخل ہوا۔ انھوں نے اپنے مخصوص طریقہ سے بلا کسی تمہید کے چھوٹتے ہی پوچھا "تمہیں اپنے مشن میں کہاں تک کامیابی ہوئی؟" میں اپنی ناکام کوشش کی ناخوشگوار حقیقت کا فوری انکشاف نہیں کرنا چاہتا تھا اور جواب دینے کے لیے موزوں اور وضاحتی الفاظ کی تلاش کر رہا تھا کہ

قائدِاعظمؒ نے یہ کہہ کر خود ہی میری مشکل حل کر دی "مجھے بتانے کی ضرورت نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ تمہیں کامیابی نہیں ہوئی"۔ مجھے لامحالہ اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑا۔ مگر اس ناخوشگوار اعتراف کے اثر کو زائل کرنے کے لیے میں نے عرض کیا" حضور نظام نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ میری عرضداشت پر غور کریں گے" قائدِاعظمؒ نے فرمایا "تم بالکل اس کا یقین نہ کرو۔ وہ تمہیں ویسے ہی ٹال رہے ہیں جیسا کہ وہ دوسروں کو ٹالتے رہے ہیں" پھر ذرا سے توقف کے بعد کہا "تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ تاریخ میں ایسے لوگوں کا جو زندگی کی حقیقتوں سے فرار ہونے کی کوشش کریں۔ کیا حشر ہوتا ہے"

ایک سفارتی نمائیندہ کے لیے اپنے سربراہِ مملکت کے بارہ میں ایسی باتیں سننا ایک تلخ تجربہ ہے اس لیے میں قصرِ گورنر جنرل سے بہت ہی افسردہ ہو کر واپس آیا۔ راستہ بھر میں دعا مانگتا رہا کہ بار الٰہا۔ میری دو پشتوں نے حضور نظام کا نمک کھایا ہے اُنہیں صحیح اور بر وقت فیصلہ کرنے کی توفیق ارزانی فرما۔ ایسا نہ ہو کہ روپیہ پیسہ کے بارے میں ان کی ضرورت سے زیادہ احتیاط اُمتِ مُسلمہ پر ان کے ان گنت احسانات اور ان کی اپنی ذاتی خوبیوں پر پانی پھیر دے۔

گھر واپس ہوا تو میں نے بمبئی کے سینٹا کروز کے ایئر پورٹ پر ملنے والے حیدر آبادی دوست کو اپنے انتظار میں پایا۔ اس نے مجھے صدرِ اعظم کا ایک خط دیا جو میری ان سے دہلی کی ملاقات سے پہلے لکھا گیا تھا۔ اس خط کو میں نے مُسرّت و تعجب کے ملے جُلے جذبات کے ساتھ پڑھا۔ اس خط کی ابتدا" برادرِ عزیز "کے محبت آمیز القاب سے ہوئی اور "بھائی "کے پیارے اور دلپذیر لفظ پہ خط ختم ہوا۔ میرے اور صدرِ اعظم کے مابین خط و کتابت میں یہ اس انتہائی مشفقانہ طرزِ تخاطب کا آغاز تھا جو اس وقت سے لے کر حیدر آباد کے سقوط تک برابر قائم رہا اور اس کا نشان امتیازی ہو گیا تھا۔ اس خط میں جو ہدایات تھیں وہ وہی تھیں جن کے متعلق دہلی میں بالمشافہ گفتگو ہو چکی تھی۔ البتہ اس بات کی سخت تاکید تھی کہ اگر چار پانچ دن میں بھارت سے ہمارے تعلقات میں بہتری کی کوئی صورت نہ پیدا ہوئی تو حمل و نقل اور رسل و رسائل کے انتظامات کو آخری شکل دے دی جائیگی اور چونکہ معاشی ناکہ بندی کا آغاز ہو چکا ہے۔ اس لیے بعض ضروری اشیاء کے بھیجنے کا فوری انتظام کیا جائے گا۔

اس خط میں ۱۹ لاکھ کی ایک رقم کا بھی ذکر تھا جو ایک دوست کی تحویل میں تھا۔ مجھ سے یہ خواہش کی گئی تھی کہ موقعہ محل دیکھ کر اس کو ایجنسی کے حساب میں منتقل کرانے کی کوشش کروں۔ مگر اس طرح سے کہ انہیں ناگوارِ خاطر نہ ہو۔

جمعرات ۲۷ مئی ۱۹۴۸ء

سہ پہر میں غلام محمدؒ صاحب سے ملنے گیا۔ اس ملاقات کا مقصد دراصل پرسوں کی تلخی کو بھلانا تھا جس میں مجھے بڑی حد تک کامیابی ہوئی۔ وہ بہت اچھے موڈ میں تھے اور دیر تک مختلف افراد اور واقعات پر رواں دواں تبصرہ کر کے اپنی شگفتہ باتوں سے مجھے ہنساتے رہے۔

رقمی معاملہ کے بارہ میں تحقیق سے پتہ چلا کہ اب اس میں صرف ۱۷ لاکھ کی رقم باقی ہے۔ جس کی منتقلی کا انتظام میں نے کر لیا ہے

آج شام کو ہزایکسی لینسی سردار شاہ ولی خان سفیرِ افغانستان کے استقبالیہ میں شرکت کی۔ جب میں رخصت ہونے لگا تو میزبان سفیر صاحب نے حیدر آباد کے مسئلہ پر تبادلہ خیال کے لیے کسی وقت ملنے کے لیے کہا۔ میں اس دعوت سے بہت خوش ہوا۔ میری یہ انتہائی خواہش ہے کہ دوسرے سفارتی نمائندوں سے بھی تبادلہ خیال کرنے کیلئے مجھے مناسب مواقع ملیں۔ اسی تقریب میں مصر کے نمائندہ الحسین الخطیب سے بھی تبادلہ خیال ہوا۔ میرا تاثر یہ ہے کہ ہمارے مُوقف سے انہیں دلچسپی ہے۔

جمعہ ۲۸ مئی ۱۹۴۸ء آج صبح مولانا مناظر احسن گیلانی اور ڈاکٹر حمید اللہ تشریف لائے۔ ان دونوں حضرات کا جامعہ عثمانیہ سے تعلق ہے اور ان کا شمار دینی حلقوں میں اور مشرقی علوم میں چوٹی کے ماہرین میں ہوتا ہے۔ وہ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی صاحب کی دعوت پر کراچی آئے ہوئے تھے۔ ان دونوں بزرگوں سے بڑی دیر تک مسئلہ حیدر آباد کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو ہوئی۔ بعد نماز جمعہ میں مولانا عبدالحامد بدایونی کی قیام گاہ پر گیا۔ اور ان سے حیدر آباد کے مؤقف کی مناسب تشہیر اور پاکستانی عوام کو اس مسئلہ سے صحیح طور پر روشناس کرانے اور اس کے مضمرات کو سمجھانے کے لیے مجوزہ اقدامات کے بارہ میں تبادلہ خیال ہوا۔ اس کے بعد میں بھارت کے ہائی کمشنر سری پرکاش سے ملاقات کے لیے ان کی قیامگاہ پر گیا۔ یہ محض رسمی ملاقات تھی۔ اور ساری گفتگو اسی نہج پر ہوتی رہی۔ میرے تقرر۔ فرائض اور سفارتی دائرہ عمل کا میں نے ذکر کیا اور نہ ہی انہوں نے کوئی سوال کیا۔ وہاں سے مُسرّت حسین زبیری جائنٹ سیکرٹری مواصلات اور ابو طالب نقوی جائنٹ سیکرٹری دفاع سے ملاقات کے لیے گیا۔

ہفتہ ۲۹ مئی ۱۹۴۸ء آج سیکرٹری جنرل چودھری محمد علی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ چند ضروری امور کے متعلق وزیر اعظم تبادلہ خیال کرنا چاہتے ہیں شام کو میٹنگ ہوئی جس میں چودھری صاحب کے علاوہ کرنل اسکندر مرزا اور مسرّت حسین زبیری بھی شریک تھے۔ ہمارے بعض حالیہ اقدامات اور طریق کار سے وزیر اعظم مطمئن نہیں تھے۔ بہر حال انہوں نے اس بات کا یقین دلایا کہ وہ میری ہر قسم کی اخلاقی مدد اور عملی تعاون کریں گے۔ اس میٹنگ کے خوشگوار نتائج کے امکانات سے مجھے بہت اطمینان ہوا۔

اتوار ۳۰ مئی ۱۹۴۸ء آج صبح میں نے سردار شاہ ولی خان سفیر افغانستان کو ٹیلی فون کیا اور ۹ بجے ان سے ملنے کے لیے گیا۔ سفیر صاحب بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ہمارے مؤقف میں بظاہر بہت ہمدردی کا اظہار کیا۔ لیکن میرا تاثر یہ تھا کہ اپنی رائے کے اظہار میں وہ کسی قدر ذہنی تحفظات سے کام لے رہے ہیں اور واشگاف الفاظ میں ہماری تائید اور حمایت سے گریز کر رہے ہیں۔ بہر حال زبانی ہمدردی اور حکایت درد کا اطمینان سے سن لینا بھی منزل کی طرف پہلا قدم ہے۔ اس لیے میں مطمئن ہوں۔

دوران گفتگو میں سردار صاحب نے کراچی میں مہاجرین کے مصائب اور ان جھگیوں اور جھونپڑیوں کا بہت دردناک انداز میں ذکر کیا، ان کا کہنا یہ تھا کہ پاکستان گورنمنٹ کو ان کے لیے کچھ کرنا چاہیئے۔ ایک غیر ملکی اور غیر متعلق آدمی سے اس قسم کے سوال کا کوئی خاص جواز نہیں تھا بہرحال میں نے ان حالات کا ذکر کیا۔ جو اس بڑے پیمانے کی ہجرت کا باعث بنے۔ میں نے کہا مہاجرین کی اتنی بڑی یلغار کسی بڑی سے بڑی مستحکم حکومت کے لیے بھی کڑی آزمائش ہوسکتی ہے چہ جائیکہ ایک نوزائیدہ مملکت جس کو مالی وسائل کی کمی کے علاوہ ہر قسم کی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس کے لیے لاکھوں مہاجرین کو آباد کرنا ایک بار عظیم ہے۔ ان کی آباد کاری آسانی سے فوری طور پر حل ہونے والا مسئلہ نہیں۔ میرا اپنا تاثر یہ ہے کہ اپنے وسائل اور دشوار حالات کے پیش نظر حکومت اس بڑے مسئلہ کو کامیابی سے نپٹ رہی ہے مجھے یقین ہے کہ وہ جلد ہی اس مسئلہ پر قابو پالے گی۔ سردار صاحب بغور سنتے رہے۔ لیکن صاف ظاہر ہوتا تھا کہ میرے وضاحتی بیان سے جو ایک غیر جانبدار فریق کی حیثیت سے دیا گیا تھا، وہ زیادہ قائل نہیں ہوئے۔

حیدر آباد میں سیاسی حالات تیزی سے بدل رہے ہیں اس کے پیش نظر اور واقعات کی رفتار کا لحاظ کرتے ہوئے یہ انتہائی ضروری ہے کہ حیدر آباد کے سیاسی مؤقف کی مناسب اور مؤثر تشہیر کا انتظام کیا جائے۔ یوں تو سارے ملک میں اس کی ضرورت ہے مگر مغربی پاکستان کے سرحدی علاقے خاص

ضہ کے محتاج ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہر روز کسی نہ کسی علاقہ میں میٹنگ ہو۔ حیدرآباد کے مؤقف میں تقریریں ہوں اور ان کا متن باقاعدہ روزناموں میں بلا پائے۔ اس غرض کے لیے مجھے سرحدی علاقوں میں قابلِ اعتبار رابطے پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ کرنل اسکندر مرزا ان علاقوں میں ذمہ دار عہدوں پر رہ چکے ہیں۔ میں نے ان سے ذکر کیا۔ ان کا ردِ عمل کافی ہمت افزا تھا۔ ان سے گفتگو کی روشنی میں میں نے اپنے پبلسٹی آفیسر کو مجوزہ اقدامات کے ضمن میں مناسب ہدایات دیں۔ مشرقِ وسطیٰ میں بھی تشہیر ضروری ہے۔ اس بارہ میں بھی چند تجاویز جو میرے زیرِ غور تھیں ان کو روبہ عمل لانے کے لیے ہدایات دیں۔ رات کو میں نے صدرِ اعظم کو نوابزادہ لیاقت علی خان صاحب سے گفتگو کی رپورٹ بھیجی۔

پیر ۳۱ مئی ۴۸ء

آج صبح میں پھر قائدِ اعظمؒ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور حیدرآباد سے آئی ہوئی حالیہ خبروں اور حالات سے ان کو آگاہ کیا۔ لیکن مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ ان میں سے بیشتر تفاصیل اور باتوں کا انہیں پہلے ہی سے علم تھا۔ انھوں نے گفتگو کے دوران میں دفعتہً میری طرف مڑ کر کہا "بعض لوگ مجھے مشورہ دیتے ہیں کہ میں حیدرآباد کا کشمیر سے تبادلہ کروں۔ تمہاری اس تبادلہ کے متعلق کیا رائے ہے؟" ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب میرے لیے فی البدیہہ دینا آسان نہیں تھا۔ اور وہ جواب بھی ایسا ہو جس سے ہمارے آزادی کے دعوے پر زد نہ پڑے اور ظاہر ہے اس میں وہ آداب بھی ملحوظ رہیں جو ایک سربراہِ مملکت کے لیے جو امتِ مسلمہ کا قائدِ اعظمؒ بھی ہو لازم ہیں۔ میں نے جواب دینے میں ذرا سا توقف کیا۔ اتنے میں قائدِ اعظمؒ نے سیدھے ہاتھ کی انگشتِ شہادت کو میری طرف اٹھا کر خود ہی جواب دے دیا "کیا تم بھیڑوں کا گلہ ہو۔ جو میں ایک گلہ کا دوسرے گلہ سے تبادلہ کر دوں یہ بتانا تمہارا کام ہے کہ تم اس قسم کا تبادلہ چاہتے ہو یا نہیں۔ اگر تم نہیں چاہتے تو دنیا کی کوئی طاقت تمہیں مجبور نہیں کر سکتی میں تو تمہیں مجبور کرنے کا کیا ذکر دوستانہ ترغیب دینے کے لیے بھی تیار نہیں" پھر ذرا سے توقف کے بعد کہا "میں جانتا ہوں کہ اس سوال کا جواب تم اپنی حکومت سے مشورہ کے بغیر نہیں دے سکتے اور نہ دینا چاہیے" ہمارے سیاسی مسئلہ پر گفتگو کے اس رخ سے مجھے ذرا پریشانی ہوئی، لیکن اس کے ساتھ اطمینان بھی ہوا۔ پریشانی یہ معلوم کر کے ہوئی کہ امتِ مسلمہ میں چند ذمہ دار افراد ایسے بھی ہیں (ظاہر ہے کہ ذمہ دار حضرات نے ہی قائدِ اعظمؒ کو یہ بات کہنے کی جسارت کی ہوگی) جو ہماری آزادی کا سودا کرنے یا کرانے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ اور اطمینان اس لیے ہوا کہ یہ منحنی انسان جو ایک عظیم عظمت کا مالک ہے۔ جذبات اور احساسات والے انسانوں کی اس قسم کی سودا بازی کا روادار نہیں جس طرح اس نے ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے اپنے آہنی عزم اور ناقابلِ شکست ارادہ سے خود ارادیت کا حق تسلیم کرا کے ایک نئی مملکت کی بنیاد ڈالی۔ اسی عزم اور ارادہ سے وہ ہر قوم اور ملک کی خود ارادیت کے حق کا ضامن ہے اور گوشت اور خون کے بنے ہوئے انسانوں کو بھیڑوں کا گلہ سمجھنے کے لیے تیار نہیں۔ اس احساس سے میرے جسم میں چلّوؤں خون بڑھ گیا۔ میرے دل میں اس عظیم انسان کی شخصیت کے لیے پہلے سے بھی زیادہ احترام ہو گیا۔ اور میری گردن اس کی اصول پسندی کے اعتراف میں اظہارِ تشکر کے لیے جھک گئی۔

قصرِ گورنر جنرل سے واپس ہوتے ہی میں نے اس تاریخی گفتگو کا متن صدرِ اعظم کو بھیج دیا۔

شام کو میر نواز جنگ ایجنٹ جنرل متعینہ لندن کے تار سے معلوم ہوا کہ سر والٹر اور لیڈی مانکٹن جمعرات ۳ جون کو کراچی پہنچیں گے۔ ان کے قیام کا انتظام پیلس ہوٹل میں کر دیا گیا۔

بروز منگل یکم جون ۴۸ء

آج صبح اکرام اللہ سیکرٹری وزارتِ خارجہ نے مجھے طلب کیا اور شکایت کی کہ میں قائدِ اعظمؒ سے براہِ راست ملاقاتیں کر رہا ہوں، جن کے بارہ میں وزارتِ خارجہ کو کوئی علم نہیں۔ سربراہِ مملکت سے اس طرح ملاقاتیں کرنا پڑو کول (سفارتی آداب و رسوم) کے منافی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ یہ طریق کار قائدِ اعظمؒ کے اپنے حکم کی تعمیل میں اختیار کیا گیا ہے۔ انہوں نے مجھ سے پہلی ملاقات ہی میں

فرمایا تھا کہ اگر مجھے کوئی ضروری بات کہنا ہو تو وہ مجھے بہت ہی مختصر نوٹس پر باریابی کا موقع دے سکیں گے۔ اس پر بھی اگر وزارتِ خارجہ کو اصرار ہے تو میں پروٹوکول کی پابندیوں کا لحاظ رکھوں گا۔ لیکن ایسی صورت میں دیری کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہونی چاہئے۔ اس پر اکرام اللہ نے کہا کہ اگر ایسی بات ہے تو ٹھیک ہے وہ اصرار نہیں کریں گے۔

آج شام کو موسیو مارشل سفیر جمہوریہ فرانس نے مجھے پیلس ہوٹل میں مدعو کیا۔ حکومت فرانس بھارت سے اپنے مقبوضات کے بارہ میں بہت نالاں ہے۔ موسیو مارشل کی گفتگو کے ہر پہلو سے یہ بات مترشح ہوتی تھی۔ انہوں نے ہمارے موقف سے بہت ہمدردی کا اظہار کیا اور مجھ سے ہر قسم کے تعاون کا وعدہ کیا۔ یہ ہمدردانہ رویہ یقیناً بھارت سے کشیدہ تعلقات کا نتیجہ تھا۔ بہرحال ان کی طرف سے یہ یقین دہانی میرے لیے بہت تسکین کا باعث تھی بڑی طاقتوں میں فرانس پہلا ملک ہے جس نے میرے مشن میں اتنی دلچسپی کا اظہار کیا۔

صدرِ اعظم کا ایک خط مورخہ ۳۱ مئی ۴۸ء مجھے آج ملا۔ اس میں اس بات کی بطور خاص تاکید کی گئی تھی کہ حمل و نقل کے انتظامات میں ان کے نامزد سربراہ کے ساتھ کسی دوسرے شخص کو شریک نہ کیا جائے۔ کیونکہ ان کی رائے میں وہ تنہا زیادہ بہتر کارکردگی دکھا سکتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی تاکید تھی کہ اس پر بہت کڑی اور موثر نگرانی کی ضرورت ہے۔ مجھے کسی ایسی تجویز کا براہ راست یا بالواسطہ علم نہیں ہے۔ جس میں اس بزرگوار کے ساتھ کسی دوسرے کو شریک کرنے کا سوال پیدا ہوا ہو۔ اس خط سے یہ تو بات صاف ہو گئی ہے کہ اس شخص کے رویہ اور طبیعت کی افتاد سے وہ بھی خائف ہیں۔ میں نے اسی وقت اس خط کا جواب دیا اور حمل و نقل کے انتظامات کے ضمن میں چند نکات کی وضاحت کی درخواست کی۔

بروز بدھ ۲ جون ۴۸ء

آج صبح میں انجمن ترقی اردو کے دفتر گیا۔ وہاں کئی بزرگوں اور دوستوں سے ملاقات ہوئی۔ ان میں بابائے اردو مولوی عبدالحق۔ سید ہاشمی فرید آبادی۔ سید تقی الدین اور مولانا مظہر علی کامل صاحب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آخر الذکر دو احباب مشرق وسطیٰ میں حیدر آباد کے موقف کی تشہیر کے لیے عنقریب دورہ پر جانے والے ہیں اور تیاری میں مصروف ہیں۔ سہ پہر میں اکرام اللہ سے وزارتِ خارجہ میں ملا۔ اور ان سے درخواست کی کہ حیدر آباد میں پاکستان کے ایجنٹ جنرل مقرر کرنے کی ہماری تجویز پر جلد از جلد غور کیا جائے۔ اکرام اللہ نے بتایا کہ اس تجویز پر ایک بار غیر رسمی طور پر غور ہو چکا ہے لیکن کوئی فیصلہ نہیں ہوا۔ اب چونکہ میں نے اس مسئلہ کو رسمی طور پر پھر اٹھایا ہے اس لیے وہ اس معاملہ کو عنقریب کابینہ میں پیش کر کے حکومت کے فیصلہ سے مجھے مطلع کر دیں گے۔

شام کو مجھے بھارتی ہائی کمشنر سری پرکاش کا ایک خط ملا جو انتہائی شائستگی کا حامل تھا۔ انھوں نے مجھے اتوار ۶ جون کو چائے پر مدعو کیا۔ اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ ہم دونوں تھوڑی دیر مل بیٹھیں اور "مشترکہ مسائل" پر تبادلہ خیال کریں۔ انہوں نے اس خط میں میرے "حسن اخلاق" کا شکریہ ادا کیا۔ غالباً یہ ان کی قیام گاہ پر ملاقات کیے جانے کی طرف اشارہ ہے۔ اتفاق سے میں اتوار کو خالی نہیں ہوں۔ ایک دوسری مصروفیت ہے۔ اس لیے میں نے اپنے جواب میں دعوت نامہ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے پیر کے دن آنے کی اجازت مانگی ہے۔

بروز جمعرات ۳ جون ۴۸ء

آج محکمہ فینانس کے ایک تار میں مجھ سے میرے موازنہ کی تفصیلات مانگی گئی ہیں۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ یہ سوال مجھ سے اس مرحلہ پر کیوں کیا جا رہا ہے جب کہ منظور شدہ موازنہ پر پہلے ہی سے عمل درآمد ہو رہا ہے۔ اور اسی کے مطابق مختلف مدوں میں اخراجات بھی ہو رہے ہیں۔ میں نے اپنے جواب میں اس استفسار کی وضاحت مانگی ہے۔ جو غالباً کسی غلط فہمی کی بنا پر کیا گیا ہے۔ آج سہ پہر کو مسٹر والٹر مانکٹن معہ اپنی لیڈی صاحبہ کے بی۔ او۔ اے۔ سی کے جہاز سے کراچی پہنچے۔ میں نے

ں سے پیلس ہوٹل جاکر ملاقات کی۔ حیدرآباد کے مسئلہ پر تفصیلی گفتگو ہوئی۔ سروالٹر کا ایک عرصہ سے ہمارے مقدمہ سے تعلق رہا ہے اور ہماری بہت
امیدیں لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے ان کے دوستانہ تعلقات اور ایک کامیاب مصالحت کنندہ ہونے کی عالمی شہرت سے وابستہ ہیں۔ ان کی گفتگو سے
رتاثر یہ تھا کہ وہ عنقریب شروع ہونے والی گفت و شنید کی کامیابی کے بارہ میں زیادہ پُرامید نہیں ہیں۔ اس سے لازماً مجھے مایوسی ہوئی۔ دوران گفتگو میں
سروالٹر نے ان مشکلات اور پیچیدگیوں کی طرف واضح اشارہ کیا۔ جن کا انہیں مذاکرات کے دوران میں اتحاد المسلمین کے چند ارکان کی طرف سے خدشہ
ہے جب میں نے مزید وضاحت چاہی تو وہ ماہرانہ چابک دستی سے ٹال گئے۔

سروالٹر اور لیڈی مانکٹن آج حیدرآباد کے لیے براستہ بمبئی روانہ ہوگئے۔

بروز جمعہ ۴ جون ۱۹۴۸ء آج رات کو وزیراعظم کے پرائیویٹ سیکرٹری نواب صدیق علی خاں کے عشائیہ میں شرکت کی۔ نوابزادہ صاحب
نے مجھے دیکھا اور باتیں کرتے ہوئے ایک طرف لے گئے۔ انھیں اپنے مخاطب کو مکمل سکون قلب دلانے میں خاص ملکہ ہے۔ اپنے مخصوص انداز میں
انہوں نے مجھ سے حمل و نقل اور رسل و رسائل کے انتظامات کے بارہ میں کئی سوالات کئے جس ہمدردانہ طریقہ سے انہوں نے اس مسئلہ پر گفتگو
کی اس سے میرے لیے آسان ہوگیا کہ میں بغیر کسی ذہنی تحفظات کے ساری صورت حال کی وضاحت کروں اور ان سے تعاون کی درخواست کروں۔ انہوں نے
یقین دلایا کہ اگرچہ انہیں ہمارے طریق کار سے اختلاف ہے مگر وہ ہر قسم کی امداد اور تعاون کے لیے آمادہ ہیں۔

آج اشد ضروری سامان جس میں پینے کے پانی کو صاف کرنے کی دوائی بھی شامل تھی، بھیجنے کا انتظام کیا گیا۔ میں خوش ہوں کہ آج میری محنت
ٹھکانے لگتی نظر آرہی ہے۔ اگر اشیاء کی فراہمی سے معاشی مقاطعہ کے مُضر اثرات کی شدت میں کمی ہوجائے اور ابنائے وطن کو مہذب زندگی سے
متعلقہ اشیاء کی بہم رسانی سے اطمینان قلب نصیب ہوجائے تو یہ بڑی کامیابی ہوگی۔ وزارت خارجہ کے ایک مراسلہ سے پتہ چلا کہ حکومت فی الوقت
حیدرآباد میں اپنا ایجنٹ جنرل مقرر کرنا مناسب نہیں سمجھتی۔ لیکن کسی موزوں وقت اس پر دوبارہ غور کرنے کے لیے تیار ہوگی۔ یہ جواب غیر متوقع نہیں
تھا۔ کیونکہ سیکرٹری وزارت خارجہ سے ۲ جون کی گفتگو میں مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ فی الحال وہ حیدرآباد کے معاملہ میں مزید الجھنا نہیں چاہتے

میں نے صدر اعظم کو اس مراسلہ کا متن روانہ کر دیا ہے

سری پرکاش بھارتی ہائی کمشنر نے ہماری ملاقات کے لیے آئندہ بدھ کا دن تجویز کیا ہے۔

بروز ہفتہ ۵ جون ۱۹۴۸ء آج غلام محمد صاحب نے مجھے ٹیلیفون کرکے بُلایا۔ بہت دیر تک مختلف مسائل پر گفتگو ہوتی رہی۔ وہ اب بھی
کچھ خفا ہیں۔ مگر اب ان کی خفگی میں وہ شدت نہیں رہی جو چند روز پہلے تھی۔

لندن سے میر نواز جنگ نے لکھا ہے کہ چند ضروری معاملات میں تبادلہ خیال کرنے کے لیے انہیں میری لندن میں ضرورت ہے۔ انہوں
نے ان مسائل کی نوعیت اور اہمیت کی وضاحت نہیں کی۔ اگر وہ مجھے واضح طور پر بتا دیتے تو مجھے فیصلہ کرنے میں آسانی ہوتی۔

فی الوقت تو صورت یہ ہے کہ میرے اہم فرائض کی ابتدا ابھی ابھی ہوئی ہے۔ اس مرحلہ پر موقعہ پر سے میری غیر حاضری انتظامات کو درہم
برہم کر دے گی۔ میں یہ خطرہ مول نہ لوں گا۔ اس لیے میں نے میر نواز جنگ کو اپنے فرائض کی نزاکت اہمیت اور عجلت کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا
کہ فی الوقت میرا لندن جانا ممکن نہیں ہے۔ اگر ان کو حکومت سے کوئی فوری ہدایات حاصل کرنا ہیں تو میں انہیں اپنے ذرائع سے حاصل کرنے کی کوشش
کروں گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اپنے سیکرٹری کو ان کے پاس بھیج دوں یا وہ خود تکلیف کرکے کراچی آجائیں۔

آج دستور ساز اسمبلی پاکستان کی طرف سے ایک مراسلہ آیا جس میں انہوں نے اپنے کتب خانہ کے لیے مختلف محکموں کی رپورٹیں، جامعۂ عثمانیہ اور دارالترجمہ کی کتابیں وصول ہونے پر حیدرآباد گورنمنٹ کا شکریہ ادا کیا ہے اور خواہش ظاہر کی ہے کہ حیدرآباد کے اسلامی اداروں مثلاً دائرۃُ المعارف کی تصانیف اور دوسرے قومی اداروں مثلاً عبدالحق اکادمی اور ادارۂ ادبیات اردو کی کتابیں بھی اسمبلی کے کتب خانہ کے لیے بطورِ عطیہ بھیج دی جائیں۔ میں نے یہ درخواست صدرِ اعظم کی خدمت میں بھیج دی ہے۔

بروز اتوار ۶ رجون ۴۸ء

میرے بیوی بچے آج پاک ائیر کے ہوائی جہاز سے کراچی پہنچے۔ بچوں کی چھٹیاں تھیں۔ سکول اور کالج بند تھے اس لیے ان لوگوں نے پاکستان دیکھنے اور میرے ساتھ چھٹیاں گزارنے کا ارادہ کر لیا۔ آجکل ہوائی جہازوں میں اتنی سیٹوں کا ایک ساتھ ملنا دشوار ہے۔ حسین ملک صاحب کی مہربانی سے یہ مشکل آسان ہو گئی۔

آج مجھے بھیجے ہوئے سامان پہنچنے کی اطلاع مل گئی ہے۔ سامان کی وصولی کی مجوزہ رسید کا مسوّدہ بھی ملا۔ یہ بالکل مناسب ہے بشرطیکہ اس کا صحیح استعمال ہو۔ اور سامان کی سپردگی اور تحویل ذمہ دار ہاتھوں میں ہو اور رسائد بروقت پہنچ جایا کریں۔

صدر اعظم کو کسی ذریعہ سے پتہ چلا ہے کہ ان کے بھیجے ہوئے سپیشل سٹاف میں سے ایک شخص ہوٹل میں بیٹھ کر غیر ذمہ دارانہ باتیں کرتا ہے۔ میں نے اسی وقت اسے بلایا۔ اور اسے سختی سے تنبیہ کی۔ شام کو مسٹر حسین زبیری صاحب سے ملاقات ہوئی۔

بروز پیر ۷ رجون ۴۸ء

آج سہ پہر کو میں قائدِ اعظم رح کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور حیدرآباد کی حالیہ خبروں اور واقعات کی رفتار سے انہیں مطلع کیا۔ ان کے سوال پر میں نے انھیں یقین دلایا کہ میری اطلاع کے مطابق حیدرآباد کے عوام کے اعتمادِ نفس کو ہر ممکن طریقہ سے استوار کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ وہاں کی معاشی اور اقتصادی زندگی کو برقرار رکھنے کی ضرورت کا ذکر کرتے ہوئے میں نے یہ عرض کرنے کی جسارت کی کہ اگر انسانی زندگی کے لیے ضروری اشیا کی فراہمی کی کوئی بہتر صورت نکل آئے۔ تو وہ ہمارے موقف میں استقامت اور عوام کے اعتمادِ نفس کو تقویت بخشے گا۔ قائدِ اعظم رح کی طبیعت کی مناسبت کا لحاظ کرتے ہوئے مجھے یہ درخواست ذرا احتیاط سے کرنی چاہیئے تھی۔ کیونکہ انھوں نے فوراً مجھ سے سوال کیا "کیا یا آپ مدد نہیں کر رہے ہیں؟" میں نے عرض کیا کہ میری درخواست کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے۔ وہ ہر ممکن مدد کر رہے ہیں اور میں ان کی ہمدردی، دلچسپی اور تعاون کے لیے ان کا بیحد ممنون ہوں لیکن قائدِ اعظم رح کی طرف سے ایک کلمۂ خیر ہمارے لیے موجب خیر و برکت ہوگا۔ اس پر انھوں نے نوابزادہ صاحب سے ذکر کرنے کا وعدہ کیا۔

بروز بدھ ۹ رجون ۴۸ء

آج میں اپنی فیملی کے ساتھ بھارتی ہائی کمشنر سری پرکاش کے ہاں چائے پر گیا۔ سری پرکاش ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ خاندان کے سپوت ہیں۔ شائستگی اور رکھ رکھاؤ ان کو خاندانی ورثہ میں ملا ہے۔ ان کی اپنی شخصیت کا نمایاں پہلو ان کا حسنِ اخلاق ہے۔ انہوں نے نہایت تپاک سے ہمارا استقبال کیا اور اپنے سفارت خانہ کے تمام اعلیٰ افسروں سے ہمارا تعارف کرایا!

ہماری ملاقات بہت دوستانہ ماحول میں ہوئی۔ گفتگو کا موضوع کوئی خاص نہیں تھا۔ نہ انھوں نے کوئی سیاسی مسئلہ چھیڑا۔ اور نہ ہی میرے مشن کے بارہ میں کوئی سوال اٹھایا۔ البتہ گفتگو کے دوران وہ ایک ایسا سوال کر بیٹھے جس کا جواب دینے میں مجھے ذرا الجھن ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ ان کی اطلاع کے مطابق میری ملازمت ریلوے اور مواصلات سے متعلق رہی ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ نظام گورنمنٹ نے ایک ایسے کام کے لیے جو ہر اعتبار سے ایک سفارتی عہدہ ہے، ایک ماہرِ مواصلات کا کیوں انتخاب کیا۔ بالکل یہی سوال اپنے تقرر کے وقت میں نے اپنی حکومت سے کیا تھا۔ لیکن اسے قابلِ توجہ

نہیں سمجھا گیا۔ ظاہر ہے یہ بات میں سری پرکاش سے تو نہیں کہہ سکتا تھا۔ اسی وقت ایک خیال میرے ذہن میں آگیا۔ جس نے مجھے اس مخمصہ سے نکالا۔ میں نے جواب دیا کہ اول تو جو شخص کسی کام کے لیے حکومت کی طرف سے مقرر ہو۔ وہ اپنے تقرر کے جواز یا عدم جواز کو نہ خود سمجھ سکتا ہے نہ دوسروں کو سمجھا سکتا ہے، حکومت اپنی مصلحتوں کو خود بہتر سمجھتی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ میرے فرائض کا اہم پہلو حیدرآباد اور پاکستان میں تجارتی اور ثقافتی تعلقات کو استوار کرنا اور فروغ دینا ہے۔ ایک ایسے شخص کے لیے جو ہندوستان کی ایک بڑی ریلوے کا چیف کمرشیل منیجر رہ چکا ہو۔ حیدرآباد اور پاکستان میں جو تھوڑی بہت تجارت ہے اسے سنبھالنا اور ترقی دینا زیادہ مشکل کام نہیں ہونا چاہیئے۔ باقی رہے ثقافتی تعلقات تو جو اخلاقی اور علمی اقدار حیدرآباد اور پاکستان کا مشترک ورثہ ہیں ان میں مناسب رابطہ اور تعلق پیدا کرنا بھی ایک پڑھے لکھے مسلمان کے لیے ایک خوشگوار کام ہے۔ سری پرکاش نے جواب دیا کہ ان کا سوال محض ایک شوقیہ تجسس کی بنا پر ہے۔ انھیں یقین ہے کہ میں اپنے مشن سے متعلقہ فرائض کو باحسن وجوہ انجام دے سکوں گا یہ تو انہوں نے کہہ دیا۔ مگر مجھے یقین ہے کہ گو میری وضاحت کا کوئی مناسب جواب نہیں دے سکے۔ اور ایک سمجھے ہوئے سیاست دان کی طرح اپنے کسی شبہ کا اظہار نہیں کیا۔ مگر میری بات کی معقولیت کے بارہ میں ان کا قائل ہونا ذرا مشتبہ تھا۔

بروز جمعرات ۱۰؍ جون ۴۸ء

وزیر خارجہ نے مجھ سے خواہش کی ہے کہ ایجنٹ جنرل متعینہ لندن کے سیکرٹری اقبال جنید کی اہلیہ اور اس کی بہن کے لیے پاس پورٹوں کا بروقت انتظام کردوں تاکہ وہ سر دالٹر کی معیت میں سفر کرسکیں۔

میں نے حکم کی تعمیل کردی ہے مگر میں سمجھتا ہوں کہ مرکس و ناکس کو جن کے سیاسی خیالات، رجحانات اور وفاداریوں کے متعلق پورا یقین نہ ہو، ایسی خصوصی مراعات نہیں ملنی چاہیئے۔

آج حیدرآباد اور بھارت کے مذاکرات کی چھپی ہوئی روئداد اور دستاویز ابھی وصول ہوئی۔ مجھے یہ ہدایت کی گئی ہے کہ جیسے ہی مذاکرات کے قطع انقطاع کی خبر ملے جو زین یا جنگ دیں کے ہیں اس دستاویز کی فوری تشہیر کا بندوبست کروں۔

بروز جمعہ ۱۱؍ جون ۴۸ء

آج پھر کچھ ضروری سامان کی ترسیل کا انتظام کیا۔ شام کو کرنل اسکندر مرزا سے ملنے کے لیے گیا وہ بہت اچھے موڈ میں تھے اور مجھ سے کہا کہ شام کے وقت اگر میرا کہیں اور پروگرام نہ ہو۔ تو میں ان کے ہاں چلا آیا کروں۔ گپ بازی رہے گی آج بھی برآمدہ میں بیٹھ کر ایک گھنٹہ تک دنیا بھر کی باتیں کرتے رہے۔ مغرب کے بعد ان کے خاص احباب کا اجتماع ہوتا ہے۔ میں مخل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس لیے چلا آیا۔

بروز ہفتہ ۱۲؍ جون ۴۸ء

مجھے آج اطلاع ملی کہ حیدرآباد کے چند فوجی سپاہیوں کو جو چھٹی پر پاکستان آئے ہوئے تھے بمبئی میں حیدرآباد جانے سے روک دیا اور جہاز پر سے اترنے نہیں دیا گیا۔ چنانچہ ۲۶ فوجیوں کی پہلی پارٹی واپس کراچی آگئی ہے۔ دوسری پارٹی جس میں ۱۶ آدمی ہیں عنقریب پہنچنے والی ہے۔ آج شام کی ملاقات میں کرنل اسکندر مرزا سے ان بیچاروں کے لیے عبوری کیمپ میں ٹھہرانے کی سہولت کی درخواست کی۔ انہوں نے فوراً اس کا انتظام کردیا۔

بھارتی حکومت کے اس اقدام کا کوئی جواز نہیں۔ میں نے سری پرکاش کو ایک احتجاجی مراسلہ میں اس نامناسب رویہ کے بارہ میں توجہ دلائی۔ اور وضاحت سے بتایا کہ یہ لوگ رنگروٹ نہیں ہیں جن کی نئی بھرتی ہوتی ہے بلکہ بہت پہلے ہی سے حیدرآباد کی فوج میں ملازم ہیں۔ جس کی تصدیق ان کے کاغذات سے بھی کی جاسکتی ہے۔ ان میں سے بہتوں کے بیوی بچے بھی حیدرآباد میں ہیں۔ ایسی صورت میں انہیں اپنی ڈیوٹی پر جانے سے روکنا

بہت زیادتی ہے۔

آج مجھے ایک ذریعہ سے انڈین نیشنل کانگریس کے بمبئی میں حالیہ خفیہ اجلاس کی روئداد کی ایک نقل ملی۔ اس میں جتنی تقریریں ہوئیں ان میں سے ہر ایک میں حیدرآباد کے خلاف بہت زہر اگلا ہوا تھا۔ باہر کی دنیا کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے بھارتی حکومت جو کچھ بھی کہے اس اجلاس کی کارروائی سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ بھارتی لیڈروں کی نیت ٹھیک نہیں اور وہ کسی موقعہ یا بہانہ کی تلاش میں ہیں۔ پنڈت جواہر لعل نہرو کا بیان خاص طور پر قابل توجہ ہے وہ معاہدہ جاریہ کی مقررہ میعاد تک ہاتھ روکنے کا مشورہ دیتے ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ انتہا پسندوں اور شر پسند عناصر کو اکسانے کا رجحان بھی ان کی تقریر میں نظر آتا ہے۔ ان کا مقصد ایسے حالات کا پیدا کر دینا ہے جن سے حیدرآباد کے اندرونی معاملات اور اس کے اقتدار اعلیٰ میں مداخلت کا جواز پیدا ہو سکے۔ میں نے اس دستاویز کو بجنسہٖ صدرِ اعظم کو بھیج دیا۔

بروز پیر ۱۴ جون ۱۹۴۸ء

صدرِ اعظم کو میں نے بطورِ خاص توجہ دلائی ہے کہ دھولی سے دفتی سامان میں کمی کی جو رپورٹیں آ رہی ہیں وہ تشویشناک صورت حال کی نشاندہی کرتی ہیں۔ یہاں میری تنظیم اس قسم کی ہے کہ سامان کی روانگی کے دفت کسی قسم کی کمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ضروری ہے کہ سامان کی دھولی۔ تحویل اور نگرانی کے انتظامات کی نظر ثانی کی جائے اور جو لوگ اس کام سے متعلق ہوں ان کی بنظرِ احتیاط حفاظتی جانچ پڑتال ہونی چاہیئے تاکہ مقامی شر پسند عناصر میں سے کسی کو دشمن سے ملی بھگت کا موقعہ نہ ملے اور نہ ہی کسی فرد یا جماعت کو اپنا اُلّو سیدھا کرنے کی جسارت ہو۔

بھارتی ہائی کمشنر سری پرکاش نے اپنے خط میں انتہائی رنج و افسوس کا اظہار کیا کہ اخبارات کی اطلاع کے مطابق بھارت اور حیدرآباد کے مذاکرات میں تعطل پیدا ہو گیا ہے۔ لیکن وہ پُر امید ہیں اور مجھ سے کسی وقت میری سہولت سے اس مسلہ پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔ اسی خط میں انھوں نے بتایا کہ حیدرآباد کے جن فوجی ملازمین کو ان کی حکومت نے بمبئی میں اُترنے سے روک دیا ہے۔ اس کے متعلق وہ ایک مراسلہ اپنی حکومت کو بھیج چکے ہیں۔ اور ایک تار بھی بطور یاددہانی ارسال کر دیا ہے۔

گذشتہ دس دنوں میں بلکہ دہلی سے واپسی کے بعد ہی میں نے چند حضرات سے وقتاً فوقتاً ایک ایسے نازک معاملہ پر گفتگو کی ہے جس کی نزاکت کے اعتبار سے میں نے اپنی ڈائری میں بھی اب تک اس کا اندراج مناسب خیال نہیں کیا۔ آج یہ پتہ چلا کہ ہمارے فریق مخالف کے ایک ذمہ دار سربراہ ایک مناسب "قیمت" پر حیدرآباد کے مسئلہ کو فی الوقت ایک عارضی مختصر مدت کے لیے "کھٹائی" میں ڈالنے یا ڈلوانے کے لیے آمادہ ہیں گویا وہ ہمارے موقف کو ماننے کے لیے تو تیار نہیں مگر کسی مجوزہ فوری اقدام پر "بریک" لگوا سکتے ہیں۔

خدا معلوم بیچ میں پڑنے والے حضرات کے بیان میں حقیقت کتنی ہے اور اپنی اختراع کتنی ہے۔ بہرحال جس نازک دور سے ہم دوچار ہیں اس میں "تنکے کے سہارے" کو بھی نظر انداز کرنا دانشمندی سے بعید ہے۔ اس لیے میں نے اس تجویز کو صدرِ اعظم کو بھیج دیا ہے اور اپنی رائے کا اظہار کر دیا ہے کہ وہ اپنے طور پر اس کی تصدیق کر لیں۔ اگر اس میں ذرا سی بھی حقیقت ہے، تو معاملہ کو آگے بڑھانے کی سبیل کی جائے۔

بروز منگل ۱۵ جون ۱۹۴۸ء

کسی ذریعہ سے صدرِ اعظم کو اطلاع ملی ہے کہ مجھے ضروری سامان کی فراہمی میں دقت ہو رہی ہے۔ اس لیے اپنی توقع اور اندازہ کے مطابق کامیابی کا امکان نہیں نظر آتا۔ معلوم نہیں اس قسم کی خبریں کون اڑاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بھی مخالفین کا پروپیگنڈہ ہے۔ جو یہ چاہتے ہیں کہ اس قسم کی افواہیں اور جھوٹی خبریں پھیلا کر ہمیں پست ہمت بنا دیں اور اس طرح ہم بددلی

کا شکار ہو جائیں۔ میں موقعہ پر ہوں۔ اور باوجود گوناگوں مشکلات کے جو کچھ بھی اور جس طرح بھی ممکن ہے ہر ضروری چیز کی فراہمی کا انتظام کرنے کی پوری کوشش کر رہا ہوں۔ اگر کسی مرحلہ پر حالات میرے قابو سے باہر ہو گئے تو میں خود ان کی توجہ منعطف کراؤں گا۔ میرے خطوط نہ ملنے کی بھی انہیں شکایت ہے۔ صورت یہ ہے کہ جب رسل و رسائل کا کام اتنا دشوار ہو گیا ہو کہ ایک دوسرے سے رابطہ قائم رکھنے کے لیے خاص جدوجہد کی ضرورت ہو تو اس قسم کی تاخیر کوئی تعجب کی بات نہیں۔ میں روزانہ ایک یا دو اور کبھی تین خط لکھتا ہوں اور تمام استفسارات کے جواب دینے میں ذرا بھر تاخیر کو روا نہیں رکھتا۔ میں نے جواب میں درخواست کی ہے کہ حیدرآباد اور نئی دہلی دونوں جگہ ڈاک کے انتظامات کی جانچ پڑتال کرائیں تاکہ اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ بیچ میں کوئی ڈاک تو غائب نہیں کر دیتا۔ ناگہانی حالات میں اس قسم کی شرارت انگیزی کا قوی امکان ہے۔

میں نے آج سر دالٹر مانکٹن کے پروگرام سے متعلق امور دستوری کے محکمہ سے بذریعہ تار دریافت کیا ہے۔ صدرِ اعظم کا یہ بھی مشورہ ہے کہ اپنے کارپردازوں کے رویّہ اور کارگزاریوں پر گہری نظر رکھوں۔ صورتِ حال یہ ہے کہ میری نقل و حرکت پر بھارت کا سفارت خانہ اور کسی حد تک دولت انگلشیہ کے نمائندے بڑی کڑی نظر رکھ رہے ہیں۔ اس لیے نگرانی تو کی جا رہی ہے مگر احتیاط لازم ہے۔ میں کھلّم کھلا کوئی ایسا طریقِ کار اختیار نہیں کر سکتا جو خواہ مخواہ ان کی خاص توجہ کو اپنی طرف موڑ لوں۔ اسی وجہ سے میں اپنے خاص لوگوں سے آدھی رات کو ملتا ہوں اور میری یہ نیم شبی مصروفیت میرے دفتر والوں کے لیے ایک اچنبھا بن گئی ہے۔

بروز بدھ ۱۶ رجون ۴۸ء — آج صبح فریر گارڈن ٹہل قدمی کے لیے گیا تو چودھری محمد علی صاحب مل گئے وہ دفتر پیدل ہی جا رہے تھے میں بھی ان سے باتیں کرتا ہوا دفتر تک گیا۔ شام کو عصر و مغرب کے درمیان حسبِ معمول کرنل سکندر مرزا صاحب سے ملاقات ہوئی۔ سہ پہر میں سری پرکاشن صاحب کے ہاں چلنے کی دعوت تھی۔ یہ ملاقات بہت ہی غیر رسمی اور بڑی پُر لطف فضا میں ہوئی ان کی ساری فیملی موجود تھی اور میرے بیوی بچے بھی میرے ساتھ تھے۔ سری پرکاش صاحب کی تواضع، شائستگی، علمی ذوق اور حسنِ اخلاق سے میں بہت متاثر ہوا۔ نظریات اور رائے میں اختلاف کی ہمیشہ گنجائش ہوتی ہے۔ مگر یہ ضروری نہیں کہ ان کے اظہار میں اخلاق اور شائستگی کو خیرباد کہہ دیا جائے۔ سری پرکاش نے حیدرآباد اور بھارت کے سیاسی مذاکرات کے بارہ میں زیادہ بات چیت نہیں کی۔ مگر یہ امید ظاہر کی کہ حالات ایسے ہو جائیں کہ جانبین اپنے اپنے نقطۂ نظر کو ایک دوسرے کو ٹھیک طور پر سمجھا کر کسی خوشگوار نتیجہ پر پہنچ جائیں۔

بروز جمعرات ۱۷ رجون ۴۸ء — مولانا رشید ترابی صاحب آج میرے مکان پر تشریف لائے اور دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھایا۔ مولانا کا اتحاد المسلمین میں جو مقام ہے اور خطابت میں جو درجہ انہوں نے حاصل کیا ہے وہ بہت بلند ہے۔ آج کی گفتگو سے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ اتحاد المسلمین کے پروگرام اور طریقِ کار سے وہ زیادہ مطمئن نہیں۔ انہیں حیدرآباد سے آئے چند ہی روز ہوئے تھے اس لیے انہوں نے حالیہ واقعات اور اقدامات پر اپنے نقطۂ نظر سے روشنی ڈالی۔

جنرل العیدروس نے اپنے خط میں مشورہ دیا ہے کہ پاکستان چھٹی پر آئے ہوئے فوجیوں کو معمولی شہریوں کی طرح بھیجا جائے۔ میں نے یہ ترکیب بھی کر کے دیکھ لی ہے۔ بھارتی حکومت اس کو بھی نہیں چلنے دیتی۔ اب تو سری پرکاش نے جو مراسلہ اپنی حکومت کو لکھا ہے اس کے جواب کا انتظار ہے۔ دیکھئے وہ کیا فیصلہ کرتے ہیں۔

بروز جمعہ ۱۸ رجون ۴۸ء — آج جمعہ کی نماز جیکب لائنز کی مسجد میں ادا کی۔ نماز کے بعد مولانا احتشام الحق تھانوی صاحب کے

ساتھ کچھ دیر نشست رہی۔

سہ پہر میں مواصلاتی نظام کے قائم کرنے کے سلسلہ میں چند احباب سے تبادلہ خیال ہوا۔

ساری دشواری یہ ہے کہ حیدر آباد میں فنی کام انجام پاناہے۔ اس میں تاخیر ہو رہی ہے جس کی وجہ غالباً فنی مہارت رکھنے والوں کی کمی ہے۔ میں یہاں سے چند ماہرین کو بھیجنے کا انتظام کر رہا ہوں۔ ان کے وہاں پہنچنے کے بعد بہت سی رکاوٹیں دور ہو جائیں گی۔ میں نے انہیں یہ بھی ہدایت کی ہے کہ کام کرنے والوں کی مناسب تربیت اور ٹریننگ کا بھی کوئی منصوبہ بنائیں تاکہ ہمیں کسی مرحلہ پر بھی فنی ماہروں کی کمی محسوس نہ ہو۔ آج صدرِ اعظم کے خط سے پتہ چلا کہ میرا ۱۴ ؍ جون والا خط انہیں مل گیا ہے اور جس تجویز کا میں نے ذکر کیا ہے وہ زیرِ غور ہے۔

بروز ہفتہ ۱۹ ؍ جون ۴۸ء

آج سر والٹر مانکٹن دہلی سے یہاں پہنچے۔ وہ بہت افسردہ معلوم ہوتے تھے۔ میں نے ان کے اعزاز میں ایک عشائیہ کا انتظام کیا مگر ان کی افسردگی سے اس تقریب پر اوس پڑ گئی۔ ان سے گفتگو میں پتہ چلا کہ وہ گفت و شنید کے دوران حکومت کے نقطۂ نظر اور طریق کار سے متفق نہیں تھے۔ انہوں نے مقامی احباب سے مشورے کیے اور اس کے بعد ایک یادداشت تیار کی جو صدرِ اعظم کو بھیجنے کے لیے میرے حوالہ کی۔

اس یادداشت کے اہم نکات حسبِ ذیل تھے۔

(الف) ہمارا مقدمہ بین الاقوامی عدالت میں نہیں بلکہ بین الاقوامی امن کے خطرہ کی بنا پر حفاظتی کونسل میں پیش ہونا چاہیئے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ مقدمہ کسی دوسرے ملک کے توسط سے نہیں بلکہ براہِ راست بلا تاخیر پیش ہونا چاہیئے۔

(ب) وفد کی قیادت صدرِ اعظم خود کریں، یا اگر مقامی حالات اس کی اجازت نہ دیں تو معین نواز جنگ کریں۔ کسی انگریز کو (بشمول ان کی اپنی ذات کے) اس کام کے لیے منتخب نہیں کرنا چاہیئے۔ کیونکہ بین الاقوامی حلقوں میں خاص کر برّاعظم امریکہ کے ممالک میں ایسا انتخاب پسندیدہ نگاہ سے نہیں دیکھا جائے گا۔

(پ) وفد کے دوسرے ارکان کے بارہ میں یہ ضروری ہے کہ وہ صلاحیت۔ کردار۔ شخصیت کے اعتبار سے ایسے پایہ کے لوگ ہوں جو ہندوستان کے منجھے ہوئے سیاست دانوں کا عالمی میدان میں برابر کا مقابلہ کر سکیں۔

(ت) سر والٹر مانکٹن علی یاور جنگ کی قابلیت کے بہت مداح ہیں۔ ان کا مشورہ ہے کہ صدرِ اعظم یا معین نواز جنگ کی قیادت میں وفد کے رکن کی حیثیت سے اگر علی یاور جنگ کی صلاحیتوں سے بھی استفادہ کر لیا جائے تو مناسب ہوگا تاکہ (ان کے اپنے الفاظ میں) اغیار کو یہ کہنے کا موقعہ نہ ملے کہ حیدر آباد مردم خیز خطہ نہیں ہے۔

(ٹ) مقدمہ کو پیش کرتے وقت انگریزوں کے کیے ہوئے وعدوں اور دوستی (غالباً حکومت برطانیہ کے نظام کو دیے ہوئے خطاب "یارِ وفادار" کی طرف اشارہ ہے) پر زیادہ زور نہیں دینا چاہیئے۔ مقدمہ کی بنیاد بہت سے اہم نکات مثلاً وسائل۔ تاریخی اہمیت۔ اقلیتی مسئلہ وغیرہ پر رکھی جا سکتی ہے۔

(ٹ) جہاں تک حکومتِ برطانیہ کی حمایت کا تعلق ہے دو باتوں کو پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور ان کے حواریوں کی طرف سے ہمارے موقف کی شدید مخالفت ہوگی۔ دوسری بات جو نہیں بھولنی چاہیئے وہ یہ ہے کہ حکومت برطانیہ نے اگر حیدر آباد

کی حمایت میں کسی قسم کی ہمدردی کا اظہار کیا یا کوئی منصفانہ اقدام کیا۔ تو انہیں یہ ڈر لاحق ہو گا کہ کہیں بھارت بدک کر کامن ویلتھ سے نہ نکل جائے انہوں نے یہ یقین دلایا کہ وہ لندن پہنچتے ہی مسٹر بیون اور ان کی پارٹی سے اور حزبِ اختلاف کے سر برآوردہ ارکان سے بات چیت کریں گے۔

بروز اتوار ۲۰ جون ۱۹۴۸ء

اگرچہ ہمارے سیاسی مذاکرات ختم ہو چکے۔ مگر نواب زین یار جنگ نے اس بارہ میں کوئی اطلاع نہیں بھیجی تاکہ میں حکومت کے منشا کے مطابق اپنے موقف کی تشہیر کا انتظام کروں یہ صحیح ہے کہ مذاکرات میں تعطل یا انقطاع کی خبر مجھے حیدر آباد سے براہ راست نہیں ملی۔ مگر اس کی تصدیق بھارت کے ہائی کمشنر تک نے کر دی ہے۔ ان حالات یہ اشد ضروری ہے کہ ہم دنیا کے سامنے اپنا مقدمہ اور موقف پیش کرنے میں سبقت کریں اور بھارت کو اپنی دروغ بافی کا بازار چمکانے کا موقعہ نہ دیں۔ لیکن بہرحال سرکاری ذرائع سے تصدیق ضروری ہے۔ اس لیے میں اپنے اسسٹنٹ سکرٹری عبدالمنعم کو دہلی بھیج رہا ہوں تاکہ نواب زین یار جنگ سے مل کر وہ یہ معلوم کریں کہ دستاویز ابیض کی تشہیر کب کی جائے ۔

بروز پیر ۲۱ جون ۱۹۴۸ء

خواجہ سرور حسن سیکرٹری انسٹی ٹیوٹ آف انٹرنیشنل افیرس کراچی کو وفد میں بحیثیت رکن شامل کرنے کیلئے میں نے مشورہ دیا ہے۔ خواجہ صاحب کو حیدر آباد میں ساری عمر گزارنے کی وجہ سے اس مملکت سے جذباتی لگاؤ ہے (اور جو دشوار کام ہمیں درپیش ہے اسے وہی لوگ کامیابی کے ساتھ انجام دے سکتے ہیں جنہیں اس سرزمین سے جذباتی محبت اور لگاؤ ہو) پھر وہ اقوام متحدہ کے منشور (چارٹر) اور اس کے طریقِ کار سے ماہرانہ واقفیت رکھتے ہیں اور ہمارے لیے بہت مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔

آج شام کے پیغام میں میں نے صدرِ اعظم کو پھر توجہ دلائی ہے کہ جب سے میں نے سامان کی وصولی میں کمی کی رپورٹ کو تسلیم نہیں کیا۔ مجھے ہر قسم کے سامان کی رسائی آنا بند ہو گئی ہیں۔ حالانکہ میں کئی بار ان کے بارہ میں لکھ چکا ہوں۔ اس سے میں کیا سمجھوں؟ کیا میرے شبہات میں کچھ حقیقت کی رمق ہے؟

ظہیر احمد سیکرٹری محکمہ امورِ خارجہ نے حیدر آباد میں پاکستان کے ایجنٹ جنرل کے تقرر کے بارہ دریافت کیا ہے۔ غالباً صدرِ اعظم کے نام میرے اطلاع نامہ کی انہیں خبر نہیں ہوئی۔ موجودہ دشوار حالات میں نظم و نسق میں زیادہ قریبی رابطہ کی ضرورت اور گنجائش معلوم ہوتی ہے۔

بروز منگل ۲۲ جون ۱۹۴۸ء

میرا اسسٹنٹ سیکرٹری عبدالمنعم کل رات دہلی سے واپس آیا۔ وہ زین یار جنگ کے برتاؤ سے بہت نالاں ہے۔ اس کا بیان ہے کہ انھوں نے میرے استفسار کے جواب میں چھوٹتے ہی کہا "کون کہتا ہے کہ مذاکرات ختم ہو گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس جواب کے بعد دستاویز ابیض کی تشہیر میں مَیں ان سے کسی تعاون کی توقع نہیں کر سکتا۔ میں اس سے کیا سمجھوں؟ میرے دہلی کے ساتھی حکومت کی پالیسی میں اس کے ہم نوا نہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ ان سے تشہیر کے بارہ میں کسی قسم کی اطلاع ملنا خارج از بحث۔ اب اگر حیدر آباد سے بھی کوئی اطلاع بر وقت نہ ملی تو مجھے خود ہی فیصلہ کرنا پڑے گا کہ کب اور کس طرح تشہیر ہونی چاہیئے۔ کیونکہ موثر تشہیر کا پہلا اصول یہ ہے کہ اپنا نقطۂ نظر پیش کرنے میں سبقت کی جائے۔ اگر بھارت نے کاغذات ہم سے پہلے شائع کر دیے تو پھر ہماری طرف سے کتنی ہی تردید کی جائے۔ وہ محض تضیع اوقات ہو گی۔

بروز بدھ ۲۳ جون ۱۹۴۸ء

میرے ۱۵ جون کے تار کے جواب میں معتمدی امورِ دستوری نے مجھے اطلاع دی ہے کہ سر والٹر مانکٹن دہلی روانہ ہو چکے ہیں اور جہاں تک انہیں علم ہے وہ وہاں سے سیدھا انگلستان چلے جائیں گے۔ یہ عجیب بات ہے کہ مذاکرات کے ختم ہونے سے پہلے ہی سر والٹر نے واپسی کا ارادہ کر لیا۔ کیا اس سے سمجھا جائے کہ مذاکرات کی ناکامیابی کا پہلے ہی سے یقین تھا، اور یہ گفت و شنید محض ایک رسمی کارروائی تھی۔ اور پھر معتمدی امورِ دستوری اپنے ایک اہم مشیر کے پروگرام کے بارہ میں اتنی غیر یقینی کا کیوں اظہار کر رہی ہے۔

لندن کے ڈیلی ٹیلیگراف نے ایک خبر چھاپی ہے جس میں حیدرآباد میں مختلف ذرائع سے اسلحہ کے پہنچنے کا ذکر ہے۔ صدرِ اعظم چاہتے ہیں کہ مناسب تردید کر دوں۔ میں نے ایک تردیدی بیان جاری کر دیا ہے۔

بروز جمعرات ۲۴ جون ۱۹۴۸ء

صدرِ اعظم کا ایک خط مورخہ ۲۰ جون ۱۹۴۸ء مجھے آج وصول ہوا ہے۔ جس میں انہوں نے مجھے اطلاع دی ہے کہ سیاسی گفت و شنید قطعی طور پر ناکام ہو گئی ہے۔ جس کی وجہ سے کسی وقت بھی ناخوشگوار حالات کے پیدا ہونے اور بھارت کی طرف سے جارحانہ اقدامات کا اندیشہ ہے اور ہمیں ہر صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیئے۔ ضروری سامان کی ترسیل کے لیے انہوں نے پھر زور دیا ہے۔ یہ کام تو بہرحال ہو رہا ہے۔ میں نے انہیں آئندہ چند روز کے مجوزہ پروگرام سے مطلع کیا اور درخواست کی کہ چونکہ سامان کی رسائد وصول نہ ہونے سے مجھے پریشانی ہے۔ اس لیے اس خصوص میں توجہ کی جائے۔

صدرِ اعظم کے ایک دوسرے استفسار کے جواب میں میں نے انہیں اطلاع دی کہ فضیلت مآب قائدِ اعظمؒ کی ۲۹ جون کو کوئٹہ سے واپسی کی توقع ہے۔

بروز جمعہ ۲۵ جون ۱۹۴۸ء

صدرِ اعظم چاہتے ہیں کہ میں چودھری اسد اللہ خاں صاحب بار ایٹ لا سے لاہور میں رابطہ پیدا کر کے یہ معلوم کروں کہ کیا وہ ہمارے وفد کے رکن کی حیثیت سے اقوامِ متحدہ جانے کے لیے تیار ہوں گے۔ میں نے اپنے اسسٹنٹ سیکرٹری عبد المنعم کو ان سے ملنے کے لیے لاہور روانہ کر دیا ہے۔

بروز ہفتہ ۲۶ جون ۱۹۴۸ء

ٹائمز آف انڈیا کے نامہ نگار نے کل اپنے روزنامہ کو ایک خبر بھیجی تھی جو آج شائع ہوئی ہے اس خبر میں کہا گیا ہے کہ بھارتی حکومت نے برطانیہ، پاکستان اور دوسرے ممالک کی حکومتوں کو مطلع کیا ہے کہ چند روز سے ہندوستان کی فضائی حدود کی خلاف ورزی ہو رہی ہے جو بین الاقوامی قانون اور فضائی معاہدوں کے منافی ہے۔ یہ خلاف ورزی بڑی اور اونچی پروازوں کے ذریعہ ہو رہی ہے اور ان کی منزلِ مقصود حیدرآباد ہے۔ اس میں مزید یہ بیان کیا گیا ہے کہ ان پروازوں کی ابتداء سرحدی علاقوں سے ہوتی ہے اور مقصد حیدرآباد کو اسلحہ کی فراہمی ہے۔ خبر کی نوعیت کے اعتبار سے اسے شائد "ہوائی خبر" کہنا غلط نہ ہو۔ میں نے اپنے پبلسٹی آفیسر کے ذریعہ اس کی پر زور تردید کر دی ہے۔ صدرِ اعظم تمسکات کے بارہ میں فکر مند ہیں اور ان کی موجودہ صورتِ حال معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے سہ پہر میں زاہد حسین صاحب سے ملاقات کی۔ انھوں نے وعدہ کیا ہے کہ وہ اس ضمن میں مناسب اقدام کریں گے۔

بروز اتوار ۲۷ جون ۱۹۴۸ء

صدرِ اعظم نے میر نواز جنگ کو میرے واسطہ سے ایک پیغام بھیجا ہے جس میں سر والٹر مانکٹن کے شان خاص کر ڈیسمنڈ ینگ اور رچرڈ پرونیٹ کے بارہ میں چند ہدایات ہیں۔ پیغام کے ساتھ کوئی وضاحتی نوٹ نہیں ہے۔ اس لیے ان ہدایات کا میں پوری طرح سے مفہوم نہیں سمجھ سکا۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ یہ حضرات ہمارے مقدمہ کی تیاری میں مدد دینے کے لیے مقرر کیے گئے ہیں۔

آج اعلحضرت کا رائٹ آنریبل ونسٹن چرچل کے نام ایک پیغام وصول ہوا، جسے مجھے کراچی سے بذریعہ تار لندن بھیجنا ہے۔ پیغام کا متن یہ ہے " ذرائع رسل و رسائل کی مکمل مسدودی کی وجہ سے میں یہ پیغام آپ کو اپنے کراچی کے نمائندہ کے واسطہ سے بھیج رہا ہوں۔ دارالعوام میں آپ نے اپنی بیباک اور نڈر تقریر میں مملکت حیدرآباد۔ میری ذات اور میری رعایا سے جس قلبی لگاؤ کا اظہار کیا ہے اور انصاف اور سچائی کے حق میں جو باطل شکن آواز اٹھائی ہے اس کے لیے میں آپ کا بیحد ممنون ہوں۔ آپ کے اس جرأت مندانہ اقدام سے میں بہت پُر امید ہو گیا ہوں مجھے یقین ہے کہ آپ جیسے انصاف پسند اور مخلص دوستوں کے تعاون اور اخلاقی مدد سے اُن کڑی آزمائشوں میں سے جن سے کہ ہم دوچار ہیں کامیابی سے گزر سکیں گے۔" اس پیغام کو تار سے بھیجنا میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ اس لیے ایک خاص آدمی کے ذریعہ میر نواز جنگ کو دستی بھیج دیا ہے۔

صحافی برادری کے چند احباب جن کو حیدرآباد کے مقدمہ سے دلچسپی ہے آج میرے پاس آئے۔
مقدمہ کے مختلف پہلوؤں پر تبادلہ خیال ہوا۔ ان کی رائے یہ ہے کہ بھارتی پروپیگنڈہ حیدرآباد کے خلاف دن بدن تیز ہو رہا ہے۔ مسئلہ کی نوعیت کے اعتبار سے کراچی ہی سے اس پروپیگنڈہ کا جواب دیا جانا کافی نہیں ہے۔ اس کا موثر جواب حیدرآباد سے دیا جانا چاہیئے۔ کراچی سے معاملہ کو آگے بڑھایا جا سکتا ہے۔ مجھے اس تجویز سے اتفاق ہے کیونکہ اس پروپیگنڈہ میں بہت سی ایسی باتیں کہی جاتی ہیں جس کا جواب حیدرآباد ہی سے دیا جانا چاہیئے۔

صدر اعظم کے ایک دوسرے پیغام سے اس تشویش کا اظہار ہوتا ہے کہ مجھے مجوزہ کوڈ "حروف رمز" کیوں دیر سے پہنچا۔ وہ چاہتے ہیں کہ اس دیری کی تحقیق کی جائے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر یہ اغیار کے ہاتھ میں پڑ گیا۔ یا دیری کی وجہ سے اس کا راز منکشف ہو گیا تو اس پر اعتبار نہیں کرنا چاہیئے اور اسے فوری طور پر بدل دینا چاہیئے۔

بروز پیر ۲۸ جون ۱۹۴۸ء

صدرِ اعظم نے اپنے آج کے خط میں اس خدشہ کا اظہار کیا ہے کہ کہیں لندن کی طرح میرے دفتر سے بھی راز نہ افشا ہو جاتے ہوں۔ اور مجھے مشورہ دیا ہے کہ راز کا سارا کام حتی الامکان میں خود کروں۔ میں نے اس کا پہلے ہی سے لحاظ رکھا ہے جن نازک حالات میں سے ہم گزر رہے ہیں اس کے پیش نظر جتنی بھی احتیاط کی جائے کم ہے۔ چونکہ صدر اعظم نے یہ سوال خاص طور پر اٹھایا ہے۔ اس لیے میں آج کی ڈائری میں اپنے طریق کار کی تفصیلی وضاحت کروں گا اور یہی صدر اعظم کو بھی لکھ رہا ہوں۔

میں نے اوائل جون سے یہ طریقہ رکھا ہے کہ سوائے معمولی دفتری کارروائیوں کے باقی سارا راز کا کام میں خود ہی کرتا ہوں۔ دفتر میں ایک آدھ گھنٹہ بیٹھتا ہوں۔ ملاقاتیوں سے ملتا ہوں۔ احباب اور حیدرآباد سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب سے تبادلہ خیال کرتا ہوں۔ باقی سارا وقت سفارتی فرائض کی انجام دہی ۰ اشیائے ضروری کی فراہمی۔ رسل و رسائل اور حمل و نقل کے انتظامات۔ حکومت پاکستان اور اپنی حکومت سے ساری خط

کتابت ۔ یہ سب کام میں اپنے مکان کی اوپر کی منزل پر ایک چھوٹے سے کمرہ میں کرتا ہوں ۔ سارا ریکارڈ وہیں رہتا ہے ۔ اور کام ختم ہونے کے بعد وہ کمرہ مقفل ہو جاتا ہے ۔ میرے دفتر والے غالباً یہی سمجھتے ہیں کہ میں یا تو اوپر کی منزل پر سوتا رہتا ہوں اور یا جاسوسی کے ناول پڑھتا رہتا ہوں ۔ انہوں نے ایک دو بار اشارتاً اور کنایتاً مجھ سے میرے کام کی نوعیت اور کارروائیوں کے بارہ میں پوچھنے کی کوشش کی ۔ مگر میں نے ٹال دیا ۔ کیونکہ ایسے نازک حالات میں کسی کو اعتماد میں لے کر اپنے آپ کو پریشان کرنے سے یہ ہزار درجہ بہتر ہے کہ تمام راز اپنے ہی سینہ میں محفوظ کروں ۔ صدر اعظم کا یہ بھی مشورہ ہے کہ میری طرف سے ان کے نام جو پیغامات بھیجے جائیں وہ پہلے فارسی زبان میں لکھے جائیں اور پھر انہیں کوڈ میں تبدیل کیا جائے ۔ وہ اپنے پیغامات بھی اسی طرح فارسی زبان میں لکھ کر بھیجیں گے ۔ فارسی زبان میں میرا مبلغ علم بس اتنا ہے کہ ساتویں جماعت تک پڑھی تھی ۔ اب اتنی مدت کے بعد انتہائی پیچیدہ اور سیاسی نوعیت کے پیغامات میں اس زبان میں کیسے لکھوں ؟ مگر جب آن پڑتی ہے تو سب کچھ کرنا پڑتا ہے ۔ چنانچہ آمدن نامہ خرید لیا گیا ۔ فارسی لغت حاصل کی گئی ۔ اور ساتویں جماعت کے ایسے طالب علم کی طرح جو پڑھا ہوا سبق بھول گیا ہو اور آموختہ یاد کرنے کے لیے لگا دیا گیا ہو ۔ میں نے فارسی پڑھنی شروع کی ۔ خوش قسمتی سے میری اہلیہ مجھ سے بہت زیادہ فارسی زبان سے واقف ہیں ۔ ان کی مدد سے چند روز میں میں اس قابل ہو گیا کہ ٹوٹی پھوٹی فارسی میں پیغامات لکھ کر بھیجے جانے لگے ۔ مجھے یقین ہے کہ اگر چند برس کے بعد فارسی زبان میں اپنے لکھے ہوئے مسوّدوں کو دیکھوں تو بے اختیار ہنسی آ جائے گی ۔ مسوّدات کا مسئلہ حل ہوا تو دفتر والوں سے بالا بالا بھیجے والے پیغامات کو خفیہ لغت (کوڈ) میں تبدیل کرنے کے لیے اور آنے والے پیغامات کو اسی طرح خفیہ لغت سے عام عبارت میں بدلنے کے لیے (ڈی کوڈ) مدد کی ضرورت محسوس ہوئی ۔ دفتر والوں میں کوئی ایسا نہیں تھا جن کے سپرد یہ کام کیا جا سکتا ۔ اس لیے " ڈی کوڈنگ " یعنی خفیہ لغت میں عبارت کو پڑھنے کا کام میں نے اپنی بڑی لڑکی کے سپرد کیا اور " کوڈنگ " (خفیہ لغت میں تبدیل کرنے کا کام) اپنے لڑکے کو تفویض کیا ۔ ان دونوں بچوں نے میرے اس بوجھ کو ہلکا کرنے میں بہت مفید خدمات انجام دیں ۔ رات کے دس اور گیارہ کے درمیان جس وقت موٹر سائیکل کی آواز آتی ہے ۔ لڑکی پیغام وصول کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوتی ہے اور " ڈی کوڈنگ " کا کام شروع ہو جاتا ہے ۔ پیغام مکمل ہونے تک میں انتظار کرتا رہتا ہوں ۔ پھر اسے پڑھ کر اہلیہ کی مدد سے فارسی میں جواب لکھتا ہوں اور پھر لڑکے کو سوتے میں سے اٹھا کر اسے " کوڈنگ " کے لیے دے دیتا ہوں ۔ اس طرح میری بیوی اور ان دو بچوں کی آدھی رات اسی تگ و دو میں گزر جاتی ہے ۔ آئی ہوئی ہدایات کے جن حصوں پر فوری اقدام کرنا ضروری ہوتا ہے ۔ ان کے متعلق میں صبح سویرے اصحابِ متعلقہ سے ملنے کے لیے چلا جاتا ہوں تاکہ بروقت کارروائی ہو سکے ۔

———

تخلیق اور ٹکنیک

ڈاکٹر احسن فاروقی

ہمارے یہاں اس وقت یہ ایک تنقیدی رسم سی ہوتی جارہی ہے کہ کسی ناول کی تعریف میں یہ کہہ دیا جائے کہ "یہ جدید ٹکنیک میں لکھی گئی ہے" اور دوسری کی مذمت میں کہا جائے "ہاں پرانے سپاٹ طریقہ پر لکھی گئی ہے"۔ اس سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ٹکنیک ہی سب کچھ ہے تخلیق کوئی چیز نہیں۔ اصل میں ایسی باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جو تخلیق کا اثر لینے کے اہل نہیں اور ٹکنیک کو بھی پورے طور پر سمجھے بغیر اس کا رعب کھاکر اپنے کو اس کے سمجھنے کا اہل دکھانے کے لیے اُس کی تعریف کر دیتے ہیں۔ بات کوئی نئی نہیں۔ ہر تخلیق کے ساتھ کوئی ٹکنیک ضرور ہوتی ہے اور ہر فن کے سلسلے میں ایسے لوگ ضرور سامنے آتے ہیں جو ٹکنیک ہی پر رُک جاتے ہیں۔ کیا ہمیں وہ لوگ یاد نہیں ہیں جو مشاعروں میں اپنے ادبی ذوق کا ثبوت دینے کے لیے یہ چیخ اٹھتے تھے واہ کیا قافیہ ہے کیا ردیف" اور مجھے تو ایک بڑے خاص صاحب یاد آتے ہیں جنھوں نے اقبالؔ کا یہ شعر سن کر ؎

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں !   کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

کہا تھا "واہ! کیا شعر ہے "کبھی اے حقیقتِ منتظر" کا قافیہ اور "نظر آ لباسِ مجاز میں" کی ردیف۔ وہ ہر شعر میں قافیہ اور ردیف کا اسی طرح تعین کیا کرتے تھے اور آج کل کے ناول کا ذوق رکھنے والوں سے بھی ٹکنیک کی بابت اسی قسم کے اظہار ملتے ہیں۔ اکثر لوگ جو "آگ کا دریا" کی ٹکنیک کی تعریف کرتے آئے ان سے اس کی بابت بات چیت کی گئی تو اسی طرح کی مضحک باتیں کرنے لگے۔ اصل بات یہ نہیں ہے کہ کونسی "ٹکنیک" برتی گئی بلکہ یہ ہے کہ کیا تخلیق ہوئی۔ جیسے یہ ضروری نہیں ہے کوئی کس سواری پر آیا۔ ضروری یہ ہے کہ آنے والا کون ہے۔ پرانے زمانے کی محبوبہ رتھ میں بیٹھ کر آتی ہوگی آج کل کی موٹر میں آتی ہے۔ اہم چیز محبوبہ ہے۔ ایک حد تک یہ بھی ضروری ہے ؎

یکّہ میں آنے لگی کاہے کو وہ غیرتِ مس   عشق ٹیں ٹیں ہے سواری کو جو موٹر نہ ملا

اس وقت جبکہ تانگے اور موٹر دونوں چل رہے ہیں تو یہ عاشق کی شان کے خلاف ہے کہ وہ معشوق کو تانگے میں لائے۔ مگر موٹر میں لانے سے نہ اس کے معشوق کے حسن میں اور نہ اس کے عشق ہی میں کوئی فرق آتا ہے اصل فن تو حسن اور عشق میں اور ان کی تخلیق میں ہے۔ ناول کی ٹکنیک کے سلسلے میں جو شخص سب سے زیادہ اہم ہے وہ ہنری جیمس HENRY JAMES ہے۔ اس کا پہلے اسی سلسلہ میں ویلز WELLS سے تنازع ہوا اور پھر ڈی ایچ لارنس D.H. LAWRENCE نے صاف کہہ دیا کہ ناول کی "فارم" کی بابت بات کرنے کے معنے یہ ہوئے کہ کسی اور کا بنایا ہوا طریقہ اپنے تجربے پر عائد کیا جائے۔ جیمس بھی باوجود ٹکنیک پر اس قدر زور دینے کے یہی کہتا ہے کہ کسی ناول کو وجود میں رہنے کا حق ہی نہیں ہے جب تک کہ وہ دلچسپ نہ ہو۔ اس لیے یہ کہہ دینا زیادہ مبالغہ نہ ہوگا کہ ٹکنیک کچھ نہیں تخلیق ہی سب کچھ ہے۔

مگر اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ ٹکنیک کچھ ہے نہیں۔ ہر تخلیق کا ذریعہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی ٹکنیک ضرور ہوئی۔ تجربہ ایک پری ہے اس پر قابو کرنے کے لیے اسے شیشے میں اتارنا ضروری ہے اس لیے شیشہ بھی ضروری ٹھہرا۔ ہر صنف کے سلسلے میں اس کے موجد نے جن طریقوں پر تخلیق کی وہ طریقے بھی واضح

ہوئے ۔ ناظر کو صاف صاف معلوم ہوگیا کہ یہ اثر اس طریقہ کی وجہ سے پیدا ہوا۔ سب سے پہلے قصہ گو نے قصہ کو یوں بیان کیا کہ خاتمے کو چھپاتا رہا تاکہ سننے والوں کا تجسس قائم رہے۔ سننے والوں نے دیکھا کہ راز کھلنے سے پہلے کسی طرح کوئی ضمنی بات آجاتی ہے اور خاتمہ دور جا پڑتا ہے۔ شہزادی شہرزاد نے اس لیے کہ صبح تک قصہ ختم نہ ہونے پائے ہر قصہ میں قصے نکالے تاکہ مرکزی قصہ کی بابت شہریار کا تجسس قائم رہے۔ الف لیلےٰ میں قصہ گوئی کی یہی ٹکنیک ہوگئی اور سابق کے قصہ گویوں نے بھی اسی کو برتا۔ ناول ایک زیادہ شعوری دور یعنی اٹھارھویں صدی کی قصہ گوئی ہے لہٰذا اس کے مؤجد ہنری فیلڈنگ HENRY FIELDING نے اپنی ٹکنیک کو اپنی پہلی تصنیف "جوسف اینڈ روز" JOSEPH ANDREWS کے دیباچہ میں اور پھر اپنے شاہکار ٹوم جونس TOM JONES کی اٹھارہ جلدوں کے اٹھارہ دیباچوں میں واضح کیا۔ اسی ٹکنیک کو اپنے اپنے طریقہ پر کچھ نہ کچھ بدل کر اُنیسویں صدی کے آخر تک ہر ناول نگار نے برتا اور انہی ٹکنیکی جدّتوں کا اظہار بھی ضرور کیا یہاں تک کہ بیسویں صدی شروع ہونے سے کچھ پہلے ہنری جیمس HENRY JAMES کو یہ محسوس ہوا کہ پرانی ٹکنیک جدید دور کے تجربے کی ترجمانی نہیں کرتی۔ اس کے بھائی ماہر نفسیات ولیم جیمس WILLIAM JAMES نے یہ نظریہ بھی پیش کیا کہ انسانی ذہن مختلف قوتوں کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ ایک جاری رو یا دھارہ ہے جس میں ہر قوت سیال ہے۔ اس تصور کے نتیجے میں قصہ گو کو جو انسانوں کی انفرادیت سے قصے بنایا کرتا تھا۔ اب شعور کی رو سے قصے بنانا پڑے اور اس کے لیے ایک نئی ٹکنیک بھی وجود میں آجانا ضروری تھی۔ قصے بنانے والوں ہی نے اپنی ٹکنیک کو سمجھایا بھی اور جو لوگ جدید دور کے ساتھ چلنا چاہتے ہیں وہ اسی ٹکنیک کو استعمال کرتے ہیں۔ یہ ویسا ہی ہوا جیسے کہ رتھ پر سفر کرنے کے بجائے اب موٹر پر سفر کیا جاتا ہے اور ہر شخص موٹر ہی پر سفر کرتا ہے مگر قصہ کی تخلیق موٹر اور رتھ دونوں سے بالاتر ہے حالانکہ سواریوں کے اختلاف سے قصہ کی نوعیت میں ضرور فرق آگیا یا یوں کہیے کہ سواریوں کے بدل جانے سے قصوں کی نوعیت کا بدل جانا لازمی تھا۔ ٹکنیک بھی ایک لازمی چیز ہے مگر لوازمات ہی نہیں۔ لوازمات کا سب سے اہم حصہ ہے مگر مرکزی چیز نہیں۔ مقصد نہیں بلکہ ذریعہ ہے۔

بات پرانی ہی ہے جس کو نئے طریقہ پر اور ایک نئی صنف کا خیال رکھ کر کہا جا رہا ہے۔ شاعری کی ٹکنیک دو چیزیں تھیں جنکو ہم بیان و بدیع اور عروض کے دائرے میں لاتے ہیں۔ شاعروں کے عمل سے کچھ اصول بیان کے اخذ کیے گئے اور کچھ عروض کے۔ مگر ان کی محض پابندی بناوٹ، آورد و ٹیکنک بندی وغیرہ کہلائی۔ کبھی کسی شاعر کی محض استعارہ استعمال کرلینے اور بحر متقارب برت لینے پر تعریف نہیں ہوتی۔ استعارے کی مناسبت اور آمد ہی کو کامیابی مانا گیا۔ بحر کے موضوع سے مناسب ہونے ہی کی تعریف کی گئی۔ یعنی ٹکنیک بذاتِ خود کچھ نہیں ہے جب کہ وہ تخلیق کے ذریعہ کی حیثیت سے کامیاب نہ ہو۔ ناول کو شعور کے رو کی ٹکنیک یا شعور کے مرکز کی ٹکنیک پر لکھ ڈالنا کافی نہیں ہے۔ اس ٹکنیک پر سب سے پہلے عمل کرنے والی ڈوروتھی رچاڈسن DOROTHY RICHARDSON کی چودہ جلدوں والی پلگریمیج PILGRIMAGE بالکل کامیاب نہیں ہے۔ تاریخ میں ایک نئی ٹکنیک کی ایجاد کی حیثیت سے اس کا نام ضرور آئے گا مگر تخلیقی ادب میں اس کا کوئی مقام نہ رہے گا۔ اصل میں اس جدید ٹکنیک کے برتنے والوں کی خامی یہی ہے کہ وہ ٹکنیک ہی میں پھنسے رہ گئے اور تخلیق تک نہ پہنچ سکے اور اس ٹکنیک کو جو کوئی محض اپنے کو نمایاں کرنے کے لیے خواہ مخواہ برتتے اس کا تو کوئی ٹھکانہ ہی نہیں۔ ہولاک ایلس HAVELOCK ELLIS نے کہا کہ بیسویں صدی نے دو شاہکار پیش کیے ایک پروست کا "آلا ریشرش" اور دوسرا جوائس JOYCE کا "یولیس" ULYSSES ایک پڑھا ہی نہیں جاسکتا اور دوسرا سمجھ ہی میں نہیں آتا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد سے ناول نگاروں نے یہ محسوس کیا کہ یہ جدید ٹکنیک (جو اردو میں لکھنے والوں کے لیے اب بھی جدید ترین ہے) بہت انتہا پسند ہے اور اس لیے ۱۹۵۳ء سے جو تحریک شروع ہوئی ہے اور جس کے نمائندہ ناول نگار جون وین JOHN WAIN جون برین JOHN BRAINE

کنگسلے ایمیس KINSLEY AMIS اور آئرس مرڈک IRIS MURDOCK ہیں۔ یہ لوگ پھر پرانے طریقہ پر واپس گئے ہیں اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس کے برتنے میں تخلیق کے کامیاب ہونے کی کتنی گنجائش ہے۔ اصل میں کسی نئی ٹکنیک کی ایجاد محض تجربہ ہی رہتی ہے۔ جب تک کہ کامیاب تخلیق کا ذریعہ نہ ہو جائے۔ عموماً ٹکنیک کے موجد اپنے انہماک میں حدوں سے باہر نکل جاتے ہیں اور پھر ایک دور آتا ہے جو نئے پرانے کا امتزاج کرتا ہے اور پھر کوئی ایسی تخلیق سامنے آتی ہے جو شاہکار ہو جاتی ہے۔ اردو میں نئے ٹکنیک کے بھی تجربے کر ڈالے گئے ہیں۔ مگر یہ ضروری حدوں سے ضرور باہر نکل گئے جس کا ثبوت یہ ہے کہ عام پڑھنے والے ان کو معمہ سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے۔ ضرورت یہ ہے کہ کوئی بڑا واقف کار نئے اور پرانے کو اس طرح اپنی زوردار انفرادیت کے ماتحت سمو دے کہ ایک عظیم تخلیق وجود میں آجائے۔

سالک ، ماجرائے عشق

ڈاکٹر عبد السلام خورشید

یہ اُس طوفانی دور کی داستان ہے۔ جب پہلی عالمی جنگ کے بعد برِ عظیم پاک و ہند کے طول و عرض میں برطانوی سامراج کے خلاف عوامی غم و غصے کی آندھیاں چل رہی تھیں۔ رہنما اور کارکن دار و رسن کی آزمائشوں سے گزر رہے تھے۔ تحریکِ عدم تعاون یا ترکِ موالات اور تحریکِ خلافت کا آغاز ہونے کو تھا۔ صحافت سامراج کے عتاب کا شکار تھی اور صحافی پسِ دیوارِ زنداں کی کشمکش زندگی بسر کرنے کے لیے تڑپ رہے تھے۔ اور پھر عوامی احتجاج کا ایک ایسا ریلا آیا۔ کہ عزت و افتخار کی قدریں بدل گئیں۔ سرکاری خطابات سرکاری ملازمت، اجنبی راج کی عدالتوں میں وکالت، اجنبی امداد سے چلنے والے اداروں میں حصولِ تعلیم اور بدیشی لباس، عزت کے نہیں ذلت کے آثار قرار پائے۔ ہزارہا مسلمانوں نے اپنی املاک اونے پونے بیچ کر اس ملک سے ہجرت کر دی اور قافلہ در قافلہ افغانستان کا رُخ کیا۔ ہندوؤں مسلمانوں اور سکھوں میں پہلی اور آخری مرتبہ اتحاد ہُوا۔ مسجدوں میں، مندروں میں، گوردواروں میں یا کھلے میدانوں میں جو جلسے ہوتے وہاں ست سری اکال، بندے ماترم اور اللہ اکبر کے نعرے بلند ہوتے۔ مسلمان اس تحریک میں پیش پیش تھے اُنھوں نے انگریز کے جیل بھر دیے۔ اُس کی عدالتوں اور تھانوں اور سرکاری محکموں کا مقاطعہ کر دیا۔ چونکہ علی گڑھ یونیورسٹی کو سرکاری امداد ملتی تھی۔ اس لیے وہاں کے سینکڑوں طلبہ نے محمد علی اور شوکت علی کی اپیل پر لبیک کہتے ہوئے کلاسوں کو خیرباد کہا یہیں سے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بُنیاد پڑی۔

اس زمانے میں لاہور کا روزنامہ "زمیندار" برِ عظیم کے مسلمانوں کی آنکھ کا تارا تھا۔ اور مولانا ظفر علی خان کی شخصیت سے والہانہ عقیدت اور شیفتگی کا دَور دورہ تھا۔ ۱۹۱۹ء کے اواخر میں مولانا ظفر علی خان نے "زمیندار" کا احیا کیا۔ اُس وقت والدِ مرحوم مولانا عبدالمجید سالک پچیس سال کے نوجوان تھے۔ ادیب، افسانہ نگار اور شاعر تھے۔ دارالاشاعت پنجاب میں مولوی ممتاز علی مرحوم کے زیرِ نگرانی "پھول" "تہذیبِ النسواں" اور "کہکشاں" کی ادارت پر فائز تھے۔ ایک دن مولانا ظفر علی خان اُن سے ملے اور کہا۔ آپ جیسا ادیب اور شاعر بچوں اور عورتوں کے رسالوں میں محدود ہو کر رہ جائے۔ یہ دردناک بات ہے۔ اب ذرا کھلی فضاؤں میں کام کیجیے اور "گُستنہ مہار" ہو کر قلم کے جوہر دکھائیے۔ والد نے جواب دیا۔ كُلُّ اَمْرٍ مَرْهُوْنٌ بِاَوْقَاتِهَا ۔ اس پر مولانا ظفر علی بولے۔ ابن الوقت بننے سے کچھ نہ ہوگا۔ ابوالوقت بنیئے۔ دُوسرے دن پیغام بھیجا۔ کہ "زمیندار" کے عملۂ ادارت میں شریک ہو جائیے۔ والدِ مرحوم وہاں پہنچے۔ یکم اپریل ۱۹۲۰ء سے مقالۂ افتتاحیہ لکھنے اور کچھ ترجمہ کرنے کا کام مل گیا۔ یہاں سے اُن کی زندگی کا ایک نیا موڑ شروع ہُوا۔ اور وہ سیاست و صحافت کے خارزار میں ایسے اُلجھے کہ پھر کبھی نجات کا راستہ نہ ملا۔

اُن دنوں "زمیندار" کے عملے میں چودھری غلام حیدر رضان اور مرزا سعید بیگ بھی شامل تھے۔ جب مولانا ظفر علی خان نے

چند روز سالک کا کام دیکھا۔ تو اخبار اُن کے سپرد کر دیا۔ خود زیادہ تر دورے پر رہتے۔ کبھی ایک آدھ دن کے لیے آتے مضامین کی داد دیتے۔ اور پھر روانہ ہو جاتے۔ اِس دور میں اُنھوں نے اخبار کے لیے چار پانچ سے زیادہ مقالے نہ لکھے۔ کچھ عرصہ تحریکِ ہجرت کا بازار گرم رہا۔ پھر یکم اگست ۱۹۲۰ء کو الٰہ آباد میں مختلف سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں نے ترکِ موالات یا عدم تعاون کا پروگرام پیش کیا۔ پانسو جلیل القدر علمائے نے ترکِ موالات کے حق میں ایک فتویٰ صادر کیا۔ حکومت نے اِسے ضبط کر لیا۔ سالک رقمطراز ہیں:

"میں نے دُوسرے ہی دن زمیندار میں وہ تمام احادیث و آیات مع ترجمہ شائع کر دیں جن کی بنا پر اس فتوے کی ایک ایک دفعہ مرتب کی گئی تھی۔ اور حکومت کو چیلنج دیا کہ" زمیندار" کے اس پرچے کو ضبط کرے لیکن اربابِ حکومت اس چیلنج کو پی گئے۔"

اس زمانے میں" زمیندار" کا دفتر ساری تحریکوں اور رہنماؤں کا مرکز تھا۔ اس لیے سالک مرحوم کا مولانا عبدالقادر قصوری، آغا محمد صفدر سیالکوٹی، ڈاکٹر کچلو، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا مظہر علی اظہر، خواجہ عبدالرحمٰن غازی، ملک لال خان، شیخ حسام الدین اور مولوی حبیب الرحمٰن سے اوّلین رابطہ یہیں پیدا ہُوا۔

۱۵ راگست ۱۹۲۰ء کا ذکر ہے۔ مولانا ظفر علی خان کو گرفتار کر لیا گیا۔ یہ گرفتاری کسی تحریر کے سلسلے میں نہیں، ایک تقریر کی وجہ سے ہُوئی۔ جو اُنھوں نے حضرو کے ایک جلسہ عام میں کی تھی۔ حکومت کی آرزو تھی۔ کہ وہ ترکِ موالات کی تحریک میں نمایاں حصہ نہ لے سکیں۔ اس لیے انھیں پانسال قید کی سزا کا حکم سُنا دیا گیا۔ اور وہ پُورے پانچ سال قید رہے۔ اسی سال کے آخر میں مولانا اختر علی خان بھی پکڑ لیے گئے۔ الزام یہ تھا کہ وہ" زمیندار" کے ایڈیٹر ہیں۔ اور اس اخبار میں قابلِ اعتراض مواد شائع ہُوا ہے۔ والد مرحوم نے اس مقدمے میں شہادت کے دوران میں بیان کیا۔ کہ اختر علی خان کو ایڈیٹری سے کوئی تعلق نہیں۔ لکھنے والا تو میں ہُوں لیکن عدالت نے یہ پوزیشن تسلیم نہ کی اور اختر علی خان کو تین سال قید کا حکم سُنا دیا گیا۔ والد مرحوم لکھتے ہیں:

"مجھے اب سیاست و صحافت کے سوا کسی اور بات کا ہوش نہ تھا۔ جیل خانہ سامنے نظر آرہا تھا۔ اس لیے فرصت کو غنیمت جان کر ترکِ موالات کو کامیاب بنانے کے لیے دل و جان سے مصروفِ کار تھا۔"

والدہ مرحومہ نے بتایا تھا کہ گرفتاری سے ایک دو مہینے پہلے وہ تنہائی پسند ہو گئے تھے۔ کمرے میں کافی کافی دیر اکیلے بیٹھے رہتے تھے اور سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اُن کی طبیعت میں یہ تبدیلی کیوں رُونما ہُوئی ہے۔ بعد میں معلوم ہُوا کہ یہ تبدیلی دیدہ دانستہ کی گئی تھی۔ مقصود یہ تھا کہ جیل کی زندگی کے لیے اپنے آپ کو تیار کیا جائے۔ آخر وہ مبارک ساعت آپہنچی۔ جس کا مدت سے انتظار تھا۔ گرفتاری کیسے ہوئی؟ یہ سالک کی زبانی سُنیے۔ یہ عدالت میں اُن کے تحریری بیان کا پہلا پیراگراف ہے:

"۴ر نومبر (۱۹۲۱ء) کو شام کے وقت غروبِ آفتاب کے بعد غلام حسین صاحب انسپکٹر پولیس تھانہ نولکھا لاہور منشی نذیر احمد صاحب سیماب (ناشر زمیندار) کو ساتھ لیے ہُوئے میرے مکان پر آئے۔ اور مجھے تانگے پر بٹھا کر تھانہ نولکھا میں لے گئے۔ میں نے اس غیر متوقع کرم فرمائی

کی وجہ دریافت کی تو آپ نے کہا کہ کچھ نہیں، صرف چند باتیں دریافت کرنی ہیں۔ لیکن میں سمجھ چکا تھا۔ کہ معاملہ نوعِ دگر ہے۔ چنانچہ راضی برضائے خدا ہو کر میں اُن کے ساتھ چلا گیا۔ تھانے میں پہنچ کر انسپکٹر صاحب نے مجھے وارنٹ دکھایا اور کہا کہ آپ زیر دفعہ ۱۵۳ تعزیرات ہند گرفتار کر لیے گئے ہیں۔ میں اس وقت بھی حیران تھا اور آج تک حیران ہوں۔ کہ آخر اس چالاکی اور عیاری کی کیا ضرورت تھی۔ پہلے ہی کیوں وارنٹ نہ دکھا دیا۔ لیکن خیر۔ ان باتوں پر کچھ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ آج کل نودفتری حکومت کے اُونٹ کی کوئی بھی کل سیدھی نظر نہیں آتی۔ سراپا بے قاعدگیوں کی ایک پوٹ اور بے ضابطگیوں کا ایک انبار ہے۔ کوئی کس کس بات پر اپنا سر کھپائے۔ وُہی مثل ہے۔ کہ اندھے کے آگے رونا۔ اپنے دیدے کھونا۔" [صفحہ ۲]

ابھی تھانے پہنچے ہی تھے کہ گرفتاری کی خبر شہر میں اُڑ گئی۔ والد مرحوم کے دوست حضرت بیدل شاہجہان پوری، سید احمد شاہ بخاری (پطرس) سید امتیاز علی تاج اور شفاعت اللہ خان پہنچ گئے۔ تحریکِ خلافت کے رضاکاروں کے بہت سے جیش تھانے کے باہر پہنچ کر نعرے لگانے لگے۔ انھوں نے ملاقات پر اصرار کیا۔ چونکہ مزاحمت سے بدامنی کا اندیشہ تھا۔ اس لیے پولیس نے یہ درمیانی راستہ نکالا کہ رضاکار ایک ایک کر کے داخل ہوتے۔ مصافحہ کرتے اور چپ چاپ نکل جاتے۔ یہ سلسلہ کافی دیر جاری رہا۔ پھر دو گھنٹے دوستوں سے گپ ہوئی اس کے بعد ایک کوٹھڑی میں بند کر دیے گئے۔ سالک "سرگزشت" میں رقمطراز ہیں:

"میں اس تنگ و تاریک کوٹھڑی میں بستر بچھا کر ایسا غافل سویا۔ کہ اس سے قبل ایسی غفلت اور بے فکری کی نیند کبھی نہ آئی تھی، کیونکہ آدھی رات تک اخبار پڑھنے اور زمیندار کے لیے مضامین لکھنے کی مشقت سے نجات ہو گئی تھی۔ ایک آدھ دفعہ گھر والوں کی پریشانی اور آئندہ مشکلات کا خیال آیا۔ لیکن دل نے یہ کہہ کر ٹال دیا۔ کہ اللہ اُن کا مالک و رازق ہے۔ وہ خود ہی بندوبست کرے گا۔" [صفحہ ۳۹-۱۳۸]

صبح نو بجے انسپکٹر صاحب تشریف لائے ہتھکڑی لگائی۔ عدالت میں لے گئے۔ ایک منٹ میں آئندہ تاریخ مقرر ہوگئی اور پھر قیدیوں کی گاڑی میں سنٹرل جیل روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچے۔ تو دفتر میں مرزا نواب بیگ جیلر سے ملاقات ہوئی۔ سالک لکھتے ہیں:

"آپ نے نگاہ اُٹھا کر میری طرف دیکھا۔ اور کہا۔ اچھا۔ آپ بھی آگئے؟ ہُوں نہہ۔ جن لوگوں کی باہر ضرورت ہے۔ وہ اندر چلے آرہے ہیں۔ میں اُن کی اس قدر افزائی پر شکر گزار ہُوا۔ کہ آخر کہیں تو مرزا صاحب نے ہماری ضرورت بھی محسوس کی۔ اندر نہ سہی۔ باہر ہی سہی۔ حکم ہُوا۔ کہ ان کو حوالات میں لے جاؤ۔"

ایک قیدی نے بستر اور ٹرنک اُٹھایا۔ اور آپ ڈپٹی جیلر کی معیت میں حوالات بارک نمبر ۲ کے کمرہ نمبر ۱۸۹ میں جا پہنچے اس کوٹھڑی کا طول دس فٹ اور عرض آٹھ فٹ تھا۔ درمیان میں چھ فٹ لمبا، دو فٹ چوڑا اور دو فٹ اُونچا ایک چبوترہ بنا ہوا تھا۔ جسے قیدی کھڈی کے نام سے یاد کرتے تھے۔ اس پر ایک موٹا سا ٹاٹ بچھا ہوا تھا۔ آپ نے بستر کھول کر اس پر بچھا دیا۔ قرآن حکیم تکیے پر رکھا۔ ٹرنک دیوار سے لگا دیا۔ اور بیٹھ گئے۔ کونے میں ایک چھوٹا گملا اور ایک تسلا دکھائی دیا یہ علی الترتیب پیشاب اور پاخانے کے لیے مخصوص تھے۔ کھڈی کچی مٹی سے بنی تھی۔ فرش بھی کچا تھا اور دیواروں پر مٹی کا پلستر تھا۔ اس سے صفائی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ دن میں دو بار قفل کھول کر قیدیوں کو احاطے میں گھومنے کی اجازت تھی چونکہ ابھی حوالاتی تھے اور مقدمہ زیرِ سماعت تھا۔ اس لیے جیل کی خوراک کھانا ضروری نہیں تھا۔ روپے جمع کرا دیے گئے۔ لیکن جیل والے خراب پکا کر کھانے کا ستیاناس کر دیتے تھے۔ اسی دوران میں مشہور سکھ رہنما بابا گوردت سنگھ ("کوما گاٹا مارو" جہاز والے) بھی اسی جیل میں آ گئے۔ سات سال "زمین دوز" رہنے کے بعد مہاتما گاندھی کی ہدایت پر ظاہر ہوئے اور پکڑے گئے۔ والد مرحوم کی بہت قدر کرتے تھے۔ اور گھنٹوں اُن سے باتیں کیا کرتے تھے۔

چند دن بعد یہ سعادت اور لوگوں کو بھی حاصل ہوئی۔ ایک دن لالہ لاجپت رائے، پنڈت کے سنتانم، ڈاکٹر گوپی چند بھارگو اور ملک لال خان احاطے میں آ پہنچے۔ لالہ لاجپت رائے ہندوؤں کے مشہور رہنما تھے۔ اور دس بارہ سال بعد لاہور میں لاٹھی چارج سے زخمی ہو کر اس دُنیا سے کوچ کر گئے۔ پنڈت سنتانم مشہور تاجر تھے۔ ڈاکٹر گوپی چند بھارگو گاندھی جی کے وفادار چیلے تھے۔ تقسیم سے پہلے پنجاب اسمبلی میں حزبِ اختلاف کے قائد منتخب ہوئے اور تقسیم کے بعد مشرقی پنجاب کی وزارتِ عظمیٰ پر فائز رہے۔ ملک لال خان مشہور خلافتی رہنما تھے۔ ساری عمر تحریکوں سے وابستگی اور جیل یاترا میں گذری، اب ضعیف ہیں۔ لیکن خدا کے فضل سے زندہ ہیں۔ جب حکومت نے یہ فیصلہ کیا کہ سیاسی قیدیوں کو یکجا کر دیا جائے تو احاطے کی رونق دوچند ہو گئی۔ مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ثناء اللہ عثمانی پانی پتی، صوفی اقبال احمد پانی پتی، مولانا اختر علی خان، راجہ غلام قادر خان، سردار سردول سنگھ کویشر، سردار منگل سنگھ اور پنڈت نیکی رام شرما بھی اس گروہ میں شامل ہو گئے۔ اس یکجائی نے سالک کو سب کے ساتھ شیر و شکر کر دیا۔ اور اسیری کے زمانے کی بعض دوستیاں تو مدتوں قائم رہیں۔

اُس زمانے میں جب سیاسی قیدیوں پر مقدمے چلتے تھے۔ تو وہ کارروائی میں حصہ نہیں لیتے تھے۔ البتہ اپنے بیان میں استغاثے کے کیس کو کمزور بنانے کے لئے اس کا تار و پود بکھیر دیتے تھے۔ سالک نے بھی مقدمے کی کارروائی میں حصہ نہ لیا۔ اور صاف کہہ دیا۔ کہ نہ جرح کروں گا۔ نہ صفائی پیش کروں گا۔ البتہ اگر جیل میں کاغذ، قلم، دوات مہیا ہو جائیں۔ تو ایک تحریری بیان ضرور دوں گا۔ یہ سہولت فراہم کر دی گئی۔ اور انہوں نے اپنا تحریری بیان مرتب کر لیا۔

یہ بیان پمفلٹ کی صورت میں چھپ گیا تھا۔ میں نے بچپن میں پٹھانکوٹ میں دادا مرحوم کے ہاں اس کا مطالعہ کیا تھا۔ بعد میں دوسری کتابوں کے ساتھ یہ پمفلٹ بٹالہ میں ہمارے آبائی مکان میں منتقل ہو گیا۔ برعظیم کی تقسیم میں مکان بھی گیا۔ اور کتابیں بھی۔ اب یہ پمفلٹ ایک نوجوان محمد اشرف کی وساطت سے جناب سید بشیر حسین ضیائی سے عاریتاً حاصل ہوا ہے۔

اس بیان کے دو حصے ہیں پہلا حصہ "اتمامِ حجت" کے عنوان سے ہے اور دوسرے حصے کی سُرخی ہے "ماجرائے عشق"
"اتمام حجت" میں استغاثے کے کیس کا جواب دیا گیا ہے۔ اور "ماجرائے عشق" میں اپنے سیاسی عقیدے کا اعلان کیا گیا ہے۔
"ماجرائے عشق" اس قابل ہے کہ اسے لفظ بلفظ پیش کیا جائے۔ ملاحظہ فرمائیے:۔

پختہ ہوتی ہے اگر مصلحت اندیش ہو عقل
عشق ہو مصلحت اندیش تو ہے خام ابھی

مندرجہ بالا بحث محض اس لیے کی گئی کہ حکومت اور اس کی پولیس کے طریق ہائے کار کا
تار و پود بکھیرا جائے اور موجودہ نظامِ حکومت کے خلاف نفرت پھیلانے
کے ذرائع میں ایک اور ذریعے کا اضافہ کیا جائے۔ حاشا و کلا۔ یہ ہرگز نہ سمجھا جائے۔ کہ میں دفعہ
۱۵۳۔ الف کے ماتحت کسی سزا و تعزیر سے بچنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ راستی اور راستبازی کے معاملے
میں جو شخص مصیبت قبول کرنے سے جی چراتا ہے۔ وہ غدار ہے۔ اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ
بہت ہی بڑی جگہ ہے۔ جیل خانہ تو وہ منزلِ محبوب و مطلوب ہے جس کے لیے میں سال ہا سال
سے تڑپ رہا تھا۔ اور آخر خدائے رحیم نے مجھے یہ سعادت بخش ہی دی۔ یہ اس کی ذرہ نوازیاں
ہیں ورنہ میں ذرۂ حقیر کہاں اور فرنگی جیل خانے میں داخل ہونے کی فضیلت کہاں؟

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

"قوموں کے درمیان نفرت و حقارت اور دشمنی کے جذبات پھیلانا فی الحقیقت
جُرم ہے۔ جو شخص تمام انگریزوں اور تمام ہندوستانیوں کے درمیان من حیث القوم جذباتِ
منافرت برانگیختہ کرتا ہے، وہ یقیناً جُرم کا ارتکاب کرتا ہے۔ کیونکہ انگریزوں میں بھی بعض
راستی پسند اور انصاف پرور لوگ موجود ہیں اور دنیا کی کوئی قوم نیکوں اور راست بازوں سے
خالی نہیں ہے۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ ہم ان انگریز سرمایہ داروں، دفتری حکومت کے اقتدار
پسندوں، فوجیانہ حکمتِ عملی کے علم برداروں سے بھی محبت کریں۔ جنہوں نے حکومتِ برطانیہ کے
موجودہ قابلِ نفرت نظام سے فائدہ اُٹھا کر جلیانوالہ کی خاک پر ہمارا خون بہایا اور تمام جزیرۃ العرب
کو کفار کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے ناپاک کیا اور جن کے ہاتھوں نے خلافتِ مقدسۂ اسلامیہ کا
پیرہن پارہ پارہ کر دیا اور جو ہندوستان پر بزورِ شمشیر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ تو میں صاف
صاف کہے دیتا ہوں کہ ایسے لوگوں سے اور ان کے طریق کار سے مجھے نفرت اور سخت
نفرت ہے۔ اور جو شخص موجودہ نظامِ حکومت سے نفرت نہیں کرتا۔ وہ سچا ہندوستانی

نہیں، وہ سچا مسلمان نہیں، وہ سچا ہندو نہیں، وہ سچا سکھ نہیں، وہ انسان نہیں، اولائک کالانعام بل ھم اضل و اولائک ھم الخاسرون ۔"

"میں مسلمان ہوں۔ حامیٔ ترکِ موالات ہوں۔ ہندوستانی ہوں اور ابھی تک عدم تشدد کا حامی ہوں۔ میری یہ دلی خواہش ہے۔ کہ ہندوستان میں انگریزوں کے موجودہ نظامِ حکومت کی دھجیاں فضائے آسمانی میں اڑتی ہوئی نظر آئیں اور اس نظام کی جگہ ہندوستان کی کامل و مکمل آزادی قائم ہو جائے۔ اور انشاء اللہ عنقریب ایسا ہی ہوگا۔ اور دنیا دیکھے گی۔ کہ جو اقتدار پسند اور سرمایہ دار اور نوکرشاہی لوگ اس وقت ہندوستان کے کمزور جسم سے پلٹے ہوئے اسے غلامی اور محکومی کے بارگراں کے نیچے پیسے ڈالتے ہیں۔ ہندوستانیوں کی اولوالعزمی کا لوہا مان جائیں گے اور یہ جبر و تشدد اور ظلم و تعدی کا بازار سرد ہو جائے گا۔ عسی اللہ ان یکف باس الذین کفروا واللہ اشد باسا و اشد تنکیلا (ترجمہ) قریب ہے کہ خدا کفار کی لڑائی کو بند کر دے اور خدا لڑائی کے اعتبار سے بہت ہے اور عذاب کے لحاظ سے بھی زیادہ سخت ہے۔

حضرت سعدی فرماتے ہیں کہ ؎

نماند ستم گار بد روزگار

بماند برو لعنتِ پائیدار

بندے ماترم۔ ست سری اکال۔ اللہ اکبر" (صفحہ ۱۶ - ۱۰)

اب ہم "اتمام حجت" کی طرف آتے ہیں۔ مقدمہ کی وجہ ایک مضمون تھا۔ جس کا عنوان "خونخوار انگریز" تھا اور جو ۱۱ رستمبر ۱۹۲۱ء کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ استغاثے کو دو باتیں ثابت کرنی تھیں:۔

اول:۔ مضمون چھپتے وقت مولانا ساالک مدیرِ مسئول تھے تاکہ ان پر اس اشاعت کی ذمہ داری ڈالی جاسکے۔

دوم:۔ اس مضمون سے "ملکِ معظم کی رعایا کے مختلف طبقوں میں منافرت و مخالفت کے جذبات برانگیختہ ہوئے یا ہونے کا احتمال ہے۔"

سالک کا کیس یہ تھا۔ کہ جس وقت یہ مضمون چھپا۔ وہ "مدیرِ مسئول" نہیں تھے۔ لالہ بھگت رام مستغیث کے بارے میں کہا۔ کہ وہ "سرکاری ملازم ہیں۔ جو کچھ سرکار نام دار نے کہا۔ وہ کر دیا۔ اور جس کی طرف اشارہ ہوگیا۔ اس کو بندھوانے کے لئے مستغیث بن گئے۔ لہٰذا ان کا بھے ابڈ بیڑ کہنا عرفاً و قانوناً کوئی وزن نہیں رکھتا۔" انہوں نے یہ بھی کہا۔ کہ مقدمے میں سوہنی لچھمن پرشاد کا نام بہ حیثیت گواہ درج تھا۔ جو سرکار کے دائمی گواہ ہیں۔ لیکن جب پیش ہونے کا وقت آیا۔ تو وہ اگرچہ عدالت میں موجود تھے۔ ان کی جگہ سید احمد شاہ شمسی کو پیش کر دیا گیا۔ یہ صاحب انہیں پہچانتے بھی نہیں تھے۔ اس کے باوجود ان

ہے ار تھا۔ کہ مدیرِ مسئول اُس وقت سالک ہی تھے۔ سالک نے لکھا :۔

"اس بیان کا ناظر دل میں غور تو کرے۔ کہ جو شخص 'زمیندار' والوں سے بالکل واقف نہیں ہے بلکہ آئے دن احرار پر بالعموم اور 'زمیندار' کے محترم مالکوں پر بالخصوص نہایت ذلیل اور سفیہانہ حملے کرنے کا عادی ہے اور جس نے عبدالمجید سالک کو کسی جلسے میں بہ حیثیت مدیرِ 'زمیندار' شریک ہوتے نہیں دیکھا۔ اس کی شہادت اس معاملے میں کیا وقعت رکھتی ہے اس احمد شاہ کا شروع ہی سے یہ وتیرہ رہا ہے کہ سرکار کے گُن گاتا اور احرار کی پگڑیاں اچھالتے پھرنا —— مجھے ایڈیٹر 'زمیندار' ثابت کرنے میں استغاثہ کی ناکامی و نامُرادی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے۔ کہ پولیس کو صرف ایک گواہ ملا۔ اور وہ بھی دشمنِ ترکِ موالات۔ مخالف احرار۔ بدخواہ 'زمیندار' کسی نے شاید ایسے ہی موقع پر کہا ہے کہ ایک ہی انڈہ اور وہ بھی گندا" (صفحہ ۴)

استغاثہ نے مدیرِ مسئول ثابت کرنے کے لئے رجسٹر قبض الوصول تنخواہ، بعض سلپیں، دفتر میں آنے والے بعض خطوط اور کچھ اور دستاویزیں بھی پیش کی تھیں۔ جنہیں سالک نے اپنے بیان میں غیر وقیع ثابت کیا اور پھر بیان کیا۔ کہ حقیقت کیا ہے؟ ملاحظہ فرمائیے !۔

"میں 'زمیندار' کا ایڈیٹر ہوں یا نہیں۔ اس کے متعلق حقیقت یہ ہے کہ جب مولوی اختر علی خان صاحب دفتری حکومت کے پنجۂ استبداد میں گرفتار ہو چکے۔ تو کارپردازانِ 'زمیندار' نے جُوں توں کر کے 'زمیندار' کے عارضی التوا کو توڑا۔ اور مل جُل کر اخبار دوبارہ نکالا۔ اس وقت ذمہ داری یا غیر ذمہ داری کا کوئی سوال نہیں تھا۔ سب کو یہی دُھن تھی۔ کہ 'زمیندار' دوبارہ نکل آئے۔ چنانچہ میں، مولوی شفاعت اللہ خان، چودھری غلام حیدر خان، مولوی مصطفےٰ کامل، مسٹر ریاض الدین احمد سبھی کام کرتے تھے۔ اور اخبار اپنے گرفتار شدہ ایڈیٹر کی قائم کردہ پالیسی پر برابر نکل رہا تھا۔ آخر جب دو مہینے تک اخبار اچھی طرح نکلتا رہا۔ اس کی مالی حالت بھی درست ہو گئی۔ تو مولوی شفاعت اللہ خان نے مجھ سے کہا۔ کہ نومبر کے آغاز سے آپ 'زمیندار' کے چیف ایڈیٹر ہوں گے۔ اور پبلشر اور پرنٹر بھی آپ ہی ہوں گے۔ میں فی الفور اس کے لئے تیار ہو گیا۔ چنانچہ ۲ ، نومبر کو میں نے پریس کا انتظام کر کے 'سالک پرنٹنگ پریس' کے نام سے دفترِ ضلع میں پبلشر اور پرنٹر 'زمیندار' کا ڈیکلریشن داخل کیا۔ اور اُسی دن سے اپنے آپ کو 'زمیندار' کا ذمہ دار سمجھنے لگا۔ لیکن ابھی ڈیکلریشن منظور ہوا تھا کہ دوسرے ہی دن ۴ ، نومبر کو میں گرفتار کر لیا گیا۔ ع

اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

رہی ذمہ داری۔ اس کے متعلق میرا کہنا یہ ہے۔ کہ جب سے 'زمیندار' نکلا۔

ہے۔ یعنی اپریل ۱۹۲۰ء سے میں اس کے ایک ایک لفظ کی ذمہ داری اپنے سر پہ لینے کو
آمادہ و تیار ہوں۔ اور غالباً ہر ہندوستانی اور ہر مسلمان اس بوجھ کو اٹھانے کے لئے مستعد ہے۔
صداقت اور راست بازی کی ذمہ داری اٹھانے سے کون انکار کرے گا۔ مندرجہ بالا بحث
تو محض اس لئے کی گئی ہے کہ استغاثہ کی ناکامی و نامرادی ثابت کر دی جائے۔" (صفحہ ۹-۱۰)

اب ہم اُس مضمون کی طرف آتے ہیں۔ جسے دفعہ ۱۵۳۔ الف کی رُو سے قابلِ اعتراض قرار دیا گیا تھا۔ یہ ایک خبر پر مبنی تھا۔ جس میں بتایا گیا تھا کہ میرٹھ کے ایک انگریز نے بچوں کا خون پیا ہے۔ یہ خبر یکے بعد دیگرے چار اخباروں میں چھپی۔ ان میں "فتح" (دہلی)، "الامان" (نگینہ)، "سیاست" (لاہور)، اور "پیسہ اخبار" (لاہور) تھے۔ اس کے بعد اسے "زمیندار" میں چھاپا گیا اور "خونخوار انگریز" کے عنوان سے ایک ادارتی شذرے میں اس پر رائے زنی کی گئی اور پھر بھی یہ احتیاط کی گئی کہ ساتھ ہی لکھ دیا کہ اگر یہ اطلاع درست ہے تو ہماری یہ رائے ہے۔ ستمبر کے آغاز میں دوسروں نے خبر چھاپی۔ ۱۱ ستمبر کو "زمیندار" نے تبصرہ کیا۔ بقول سالک۔

"خونخوار انگریز کے معاملے میں دفتری حکومت کے ارکان کی سستی یا نااہلیت
ملاحظہ ہو۔ جب یہ خبر مشہور ہوئی تو مجسٹریٹ غازی پور نے اس کی تردید میں کوئی سرکاری
اطلاع شائع نہ کی حالانکہ وہ خود اپنی شہادت میں اس امر کو تسلیم کر چکے تھے۔ کہ انہیں
اس قسم کی افواہ کے پھیلنے کی اطلاع موصول ہوئی تھی۔ مجسٹریٹ صاحب غازی پور
اب میرے مقدمے میں اس خبر کی تردید کر رہے ہیں لیکن یہ مُشتے بعد از جنگ ہے۔ اور اس
کا صحیح مصرف بر کلّہ خویش باید زد ہی ہو سکتا ہے ——— غرض ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ دفتری حکومت کے تمام اعضاء خواہ وہ یورپین ہوں یا ہندوستانی کچھ مفلوج سے ہو رہے
ہیں۔ اور کوئی شخص اپنا کام دل لگا کر نہیں کرتا۔ اس سُستی اور پھُسپھُسے پن سے ظاہر ہو رہا
ہے۔ کہ موجودہ نظامِ حکومت کا محل عنقریب دھڑام سے گر جانے کو ہے ؎

یہ بوسیدہ گھر اب گرا کا گرا ہے
ستوں مرکزِ ثقل سے ہٹ چکا ہے"

(صفحہ ۱۰-۱۱)

خبر کی تردید اُس وقت ہوئی۔ جب سالک کے خلاف مقدمے کی سماعت ہو رہی تھی۔ "زمیندار" نے یہ تردید چھاپی اور اس پر "ندامت و انفعال" کا اظہار بھی کیا۔ سالک جیل کی سلاخوں میں بند تھے۔ اس لئے وہ "ندامت و انفعال" کے اظہار کو رد کرنے سے قاصر تھے۔ بہرحال انہوں نے اس پر اپنے بیان میں جو وضاحت کی وہ اس قابل ہے کہ درج کی جائے۔

"اخباروں میں جو خبریں ہوتی ہیں ان کے متعلق کوئی ایڈیٹر وثوق سے یہ نہیں

کہہ سکتا کہ وہ قطعاً درست ہیں۔ صرف بعض تحریروں اور بعض ماخذوں کی بنا پر درستی یا نادرستی کا حکم لگایا جاتا ہے۔ مثلاً اگر رائٹر خبر بھیجتا ہے۔ کہ ترکوں نے سمرنا پر قبضہ کر لیا تو ہم اسے اخبار میں درج ضرور کر دیں گے۔ لیکن اگر ہم سے اس واقعہ کی درستی کا ثبوت طلب کیا جائے تو ہم رائٹر کے تار یا سول اینڈ ملٹری گزٹ کے پرچے کے سوا اور کوئی دلیل پیش نہیں کر سکتے۔ کیونکہ ہم خود سمرنا جا کر نہیں آئے کہ قطعی طور پر حق و یقین ظاہر کر سکیں"۔ (صفحہ ۱۱-۱۲)

"اب چونکہ "زمیندار" جیسا صداقت شعار اخبار اسی اطلاع کی تردید کر رہا ہے میرٹھ کے وہ متقی و متشرع لوگ، جو جمعیۃ العلماء کے اجلاس میں شرکت کے لئے آئے، اس خبر کو جھٹلا رہے ہیں اور مجلس خلافت پنجاب کے کارپرداز اس اطلاع کو غلط بتاتے ہیں تو میں بھی صاف صاف علی الاعلان ڈنکے کی چوٹ کہے دیتا ہوں۔ کہ میرٹھ کی یہ خبر غلط ہے۔ اور وہاں کسی انگریز نے بچوں کا خون نہیں پیا۔ جب یہ خبر غلط ہے۔ تو استنباط بھی غلط ٹھہرا۔ کیونکہ وہ تو مشروط تھا۔ ذا فات الشرط فات المشروط۔"

"ہم راست بازی کا دامن کسی حالت میں نہیں چھوڑ سکتے۔ جو شخص جھوٹ بول کر یا جھوٹ پر اصرار کر کے موجودہ نظام حکومت کے خلاف نفرت پھیلانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ کمینہ اور جھوٹا ہے۔ کیونکہ وہ اخلاق کے اصول کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ اور پھر موجودہ نظام حکومت کے خلاف نفرت پھیلانے کے لئے تو کسی جھوٹ کی ضرورت بھی نہیں۔ اس مقصد کے لئے تو سچی باتیں ہی بے شمار موجود ہیں"۔

ندامت و انفعال کیا معنی؟

"زمیندار نے اس خبر کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ ہمیں اس غلط خبر کے درج ہونے پر ندامت و انفعال ہے۔ لیکن میں بتائے دیتا ہوں۔ کہ مجھے اس پر کوئی ندامت و انفعال نہیں۔ صرف افسوس ہے اور وہ بھی حکومت پر ہے۔ جس نے بقول اپنے مخالفت و منافرت پھیلنے دی۔ اور اس خبر کی تردید نہ کی۔ اگر منافرت و مخالفت پھیلانا جرم ہے تو اس کا پھیلنے دینا بھی جرم سے کم نہیں۔

"زمیندار کے پاس اس خبر کی درستی کا ثبوت یہ تھا۔ کہ چار ہم عصروں نے اس خبر کو درج اخبار کیا۔ تردید کی بنا یہ ہے کہ متشرع اور متورع گواہ اس خبر کو جھٹلاتے ہیں۔ چونکہ تردید کے شاہد درستی کے گواہوں سے زیادہ معتبر ہیں۔ اس لئے تردید کر دی گئی۔ قصہ فیصل ہوا۔ اس میں ندامت کیسی اور انفعال کس کا؟ زمیندار کا رویہ خونخوار انگریز کا مضمون

لکھنے میں بھی راست بازانہ تھا۔ اور اس کی تردید کرنے میں بھی اس نے راستی کا دامن ہاتھ سے نہیں دیا۔ راستی پر ندامت کے کیا معنی ہیں"

"زمیندار کا اور ہر ایماندار اخبار کا دستور ہے۔ کہ رائٹر، ایسوسی ایٹڈ پریس، نامہ نگارانِ خصوصی اور دیگر اخبارات کے چہارگانہ ذرائع سے جو خبریں موصول ہوں۔ ان کو اخبار میں درج کر دیا۔ اُس کے بعد اگر کسی ذریعے سے کسی خبر کی تردید موصول ہوئی تو وہ بھی درج کر دی۔ تاکہ ناظرین اخبار خود اس کے متعلق صحت یا عدم صحت کا اندازہ کریں۔ اور ایڈیٹر اپنے فرائض سے سبکدوش ہو۔ ہم نے آج تک کسی ایڈیٹر کو نہیں دیکھا۔ کہ مندرجہ بالا چہارگانہ ذرائع سے جو خبریں موصول ہوں۔ اُنہیں دفتری حکومت کے کسی اقتدار پسند سے پاس کراتا پھرے اور اس کے بعد انہیں درج اخبار کرے۔"

زمیندار کو کوئی مٹا نہیں سکتا

"میرا یہ دعوٰی ہے کہ حکومت ہمیشہ ایسے حیلے بہانے تلاش کرتی رہتی ہے جن کی آڑ میں زمیندار کا گلا گھونٹنے کا مقصد پوشیدہ ہوتا ہے۔ اور یہ مقدمہ بھی اسی قسم کا ایک حیلہ ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے۔ کہ جن اخباروں میں یہی خبر زمیندار سے پہلے درج ہو چکی تھی۔ ان پر کوئی مقدمہ نہیں چلایا گیا۔ اور ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ نزلہ اگر گرا۔ تو زمیندار ہی کے ارکان پر گرا۔"

"میں حکومت کو جتا دینا چاہتا ہوں۔ کہ وہ اس ناپاک اور ذلیل مقصد میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکتی کیونکہ قوم نے اس بے باک مجاہدِ اسلام اور پُرجوش علمبردارِ حریت کو زندہ رکھنے کا عزم مصمم کر لیا ہے۔ اور سرفروشوں کی ایک جماعت اس شمع انجمنِ مصطفوی پر نثار ہونے کے لیے مستعد ہو چکی ہے ؎

چراغے را کہ ایزد بر فروزد
ہر آں کس تف زند ریشش بسوزد

ایک آدمی یا پوری قوم؟

"یہ خبر صحیح ہو یا غلط۔ اس سے قطع نظر کر کے میں نہیں سمجھ سکتا کہ اس کی اشاعت سے مختلف طبقاتِ رعایا کے درمیان منافرت پھیلانے کا جرم کس طرح عائد ہو سکتا ہے۔ اگر اس خبر سے نفرت کا جذبہ پیدا بھی ہو سکتا ہے تو صرف اس شخصِ واحد کے خلاف ہو سکتا ہے۔

جس نے ایسا خلافِ انسانیت فعل کیا ہو۔ یا اُس مجسٹریٹ کے خلاف جس نے اس خونی کو کافی سزا نہ دی ہو۔"

"کسی فرد واحد کے قابلِ ملامت فعل پر جائز یا ناجائز، صیح یا غلط نکتہ چینی اور اظہارِ ملامت پر اگرچہ اس فرد کو قانون کی امداد کا حق مل جاتا ہے۔ لیکن اُسے قومی منافرت کا مترادف ٹھہرانا اور اس شخصِ واحد کو اس لحاظ سے تمام قوم کا قائم مقام بنانا قواعدِ منطق کا منہ چڑانا اور قانون کو اُلٹی چھری سے حلال کرنا ہے۔ جب ایک شخص کے قاتل یا ڈاکو ہونے سے قوم کی قوم پر قتل اور ڈاکے کا الزام نہیں لگایا جا سکتا تو ایک آدمی کے خلاف نفرت وحقارت پیدا کرنے سے جملہ افراد قوم کے خلاف منافرت پھیلانے کا استنباط کیونکر کیا جا سکتا ہے۔ درحقیقت قومی منافرت پھیلانے کی ذمہ داری اخبار نویسوں کی بجائے واقعاتِ قانون اور عمالِ حکومت پر ہے۔ جنہوں نے یہ خلافِ عقل والنصاف امتیازات پیدا کر رکھے ہیں اور ان کے قائم رکھنے کے لئے ایڑی سے چوٹی تک زور لگا رہے ہیں۔"

اینگلو انڈین اخبارات

"سول اینڈ ملٹری گزٹ، پانیر، انگلش مین، سٹیٹسمین اور ان کے دوسرے بھائی بند آئے دن ہندوستانیوں کے جذبہ حریت کو مجروح کرنے کی ناپاک غرض سے ہمارے مقتدر رہنمایانِ قوم کے خلاف زہر اُگل کر مختلف طبقاتِ رعایا کے درمیان منافرت پھیلانے کا ارتکاب کرتے رہتے ہیں۔ لیکن آج تک کسی ایسے اخبار کے خلاف حکومت نے کوئی کارروائی نہیں کی۔ اس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ حکومت ان لوگوں کے افعال کو، جو اُس کی ہم نوائی، ہم آہنگی کریں، ہرگز قابلِ گرفت نہیں سمجھتی خواہ وہ افعال کتنے ہی خلافِ قانون اور بدنتائج پیدا کرنے والے کیوں نہ ہوں۔ اور خواہ اس سے حکومت اور رعایا کے درمیان اختلاف کی خلیج، جو حکومت کی مستبدانہ اور جابرانہ روش سے پہلے ہی بے انتہا وسیع ہو چکی ہے، بُعد المشرقین ہی کے برابر کیوں نہ ہو جائے۔

سچ ہے۔ احسان کا بدلہ احسان ہے۔ ان اخباروں نے حکومت کے ہر ناجائز رویہ کی تائید وحمایت کا ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ اور حکومت نے اس احسان کے بدلے میں ان اخباروں کو قانون کی تمام قیود اور پابندیوں سے آزاد کر رکھا ہے۔" (صفحہ ۱۱ - ۱۵)

چند روز بعد ایک سال قید بامشقت کا حکم سنایا گیا۔ جیل کو لوٹے۔ تو جیلر نے حکم دیا۔ کہ انہیں قیدیوں کا لباس پہناؤ اور سیاست نے میں داخل کر دو۔ سیاست خانہ جیل کے اُس حصے کو کہتے تھے۔ جہاں قیدیوں سے چکی پیسنے کی مشقت لی جاتی تھی۔ بستر اور

ٹرنک چھن گئے۔ وردی خانے میں پہنچے۔ سالک رقمطراز ہیں۔

"وہاں پرانے ٹاٹ کا کُرتا۔ پاجامہ اور کنٹوپ پہنا۔ لوہے کی باٹی (تسلہ) ایک بغل میں اور قرآنِ مجید دوسری بغل میں داب کر چلا تو خدا ہی جانتا ہے۔ کہ دل پر کیا کیا عالم گذر گئے۔ نفس کتنا ذلیل و خوار ہوا۔ اور اطمینانِ قلب کی کتنی بڑی دولت ارزانی ہوئی"

لیکن اطمینان قلب کی یہ دولت صرف چند لمحوں کی مہمان تھی کہ فوراً پیغام آیا۔ لباس بدل دیا جائے۔ کیونکہ حکومت نے انہیں سپیشل کلاس قیدی قرار دیا ہے۔ شام کے دُھندلکے میں سیاست خانے پہنچے۔ کوٹھڑی میں داخل ہوئے۔ تو چکی نے استقبال کیا۔

کندا ڈاکو سے ملاقات ہوئی۔ جو امیروں کو لوٹتا اور غریبوں کی مدد کرتا تھا۔ اُس پر قتل اور ڈاکے کے سات مقدمات تھے۔ اُس نے سالک سے تعویز کی فرمائش کی۔ تاکہ مقدمات میں فتح نصیب ہو۔ انہوں نے کہا۔ مجھے تعویز لکھنے نہیں آتے۔ لیکن جب کندے نے اصرار کیا۔ تو کاغذ کے ایک پُرزے پر آیت کریمہ لکھ دی۔ جسے اُس نے بازو سے باندھ لیا۔ اس کے خلاف دو مقدمے خارج ہو گئے۔ تو عقیدت دو آتشہ ہو گئی۔ لیکن آخرکار ایک مقدمے میں پھانسی پا گیا۔ ایک اور شخص بنیا خاکروب تھا۔ جو جیل کے کمروں کی صفائی کیا کرتا تھا اُس کی سات سالہ قید میں چند مہینے باقی تھے اور وہ خوش تھا۔ کہ رہائی پا کر بیس ہزار روپے کا وہ دفینہ مل جائے گا۔ جو اس نے ایک سرکاری خزانہ کو لوٹ کر کسی جگہ زمین میں دبا رکھا تھا۔ پینسٹھ سالہ سفید ریش بابا بختا پینتیس سال کی مسلسل قید کی وجہ سے جیل کی زندگی سے اس حد تک مانوس ہو چکا تھا۔ کہ رہائی کے خیال سے کانپ اٹھتا تھا۔ عہدِ شباب میں وہ بہت بڑا ڈاکو تھا۔ اُس نے بہت سے غریبوں کو خوشحال کر دیا اور یتیموں اور بیواؤں کی پرورش کا سامان مہیا کر دیا۔ لیکن جب درِ قفس وا ہونے کو تھا۔ تو حیران و ششدر تھا۔ کہ پرواز کس طرف کو کرے۔ کہ پینتیس سال کے طویل عرصے میں بیوی بچے، بھائی بند، سب مر کھپ چکے تھے۔

رات کے وقت سیاسی قیدیوں کی پُر لطف صحبت ہوتی۔ نو بجے سے گیارہ بجے تک بابا گوردت سنگھ اپنی سات سالہ روپوشی کی داستان اپنی میٹھی میٹھی پنجابی زبان میں سُناتے۔ لیکن چند روز بعد یہ محفل اجڑ گئی۔ والد مرحوم، مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولوی لقاء اللہ عثمانی صوفی اقبال احمد پانی پتی، مولانا اختر علی خان، راجہ غلام قادر خان، نذیر احمد سیماب، سردار سردول سنگھ کولیشر، سردار منگل سنگھ، پنڈت نکی رام شرما اور ہریانہ کے ایک ہندو جاٹ لیڈر پر مشتمل گیارہ افراد کی ٹیم لاہور سے میانوالی جیل کو منتقل کر دی گئی۔ وہاں مولانا احمد سعید (ناظم جمعیت العلمائے ہند)، عبدالعزیز انصاری، سید حبیب، مولانا داؤد غزنوی، ڈاکٹر ستیہ پال، ورش بندھو گپتا اور متعدد دوسرے قیدی موجود تھے۔ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے الگ الگ باورچی خانے تھے۔ کام مشقتی اخلاقی قیدیوں کے سپرد تھا۔ لیکن مسلم باورچی خانے کی نگرانی ایک سیاسی قیدی مولانا عبداللہ چوڑی والے کے سپرد تھی۔ جو دلی کے مرغوب کھانے تیار کراتے۔ سید حبیب اپنے مزاج کے تلون کے سبب سے یارانِ محفل کا ساتھ نہ دے سکے۔ اس لئے اُن کی سکونت کا الگ انتظام ہو گیا۔ سالک رقمطراز ہیں:

"ہم لوگوں کا پروگرام یہ ہوتا تھا۔ صبح اٹھ کر ضروریات سے فارغ ہوئے۔ نماز باجماعت ادا کی۔ اور چائے پی۔ اس کے بعد میں اور عبدالعزیز انصاری مولانا احمد سعید سے ادبِ عربی، صرف و نحوِ عربی، اور منطق کا سبق لینے لگے۔ اختر علی خان اور راجہ غلام قادر خان

سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے قرآن صحیح کرنے لگے۔ مولانا لقاء اللہ عثمانی اپنی سازشوں اور چوریوں میں مصروف ہوگئے۔ یعنی فلاں فلاں مطلوب چیز کیونکر چوری چوری باہر سے منگائی جائے۔ اور فلاں پیغام فلاں شخص کو کس تدبیر سے پہنچایا جائے۔ مولوی لقاء اللہ نماز میں ہم سب کے پیش امام بھی تھے۔ اور یہ چوری چھپے کے کام بھی انہی کے سپرد تھے۔ چنانچہ میں نے اُن کا لقب امام السارقین مقرر کیا تھا۔"

ہر قیدی کو مشقت بھی ملتی تھی۔ لیکن بہت مختصر۔ چرخے پر پانچ تار کا سوت دری بنانے کے لئے بٹ دیا کرتے تھے۔ یہ کام بیس منٹ میں ختم ہو جاتا تھا۔ ایک بجے تک درس و تدریس کا کام جاری رہتا۔ پھر کھانا کھاتے۔ اس کے بعد سب قیلولہ کرتے۔ نمازِ ظہر اور نمازِ عصر کے بعد چائے کا دوسرا دَور چلتا۔ مغرب کے بعد کھانا ہوتا۔ اور رات دیر تک مباحثے ہوتے۔ سالک لکھتے ہیں۔

"کبھی کبھی قوالی بھی ہوتی تھی۔ جس میں اختر علی خان گھڑا بجاتے۔ صوفی اقبال تالی بجا کر تان دیتے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری غزل گاتے۔ مولانا احمد سعید شیخِ مجلس بن کر بیٹھتے۔ اور مولانا داؤد غزنوی اور عبدالعزیز انصاری حال کھیلتے۔ غرض ہم لوگوں کے مشاغل، صوم و صلوٰۃ، تلاوتِ قرآن، تعلیم و تعلّم اور تفریح و تفنن کے تمام پہلوؤں سے مکمل تھے۔"

مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے والد مرحوم کے خصوصی تعلقات تھے۔ وہ لکھتے ہیں۔ کہ:۔

"یوں تو سبھی احباب شفیق اور محبت پرور تھے مگر مولانا احمد سعید بے تکلف دوست ہونے کے علاوہ عربی میں میرے اُستاد بھی تھے۔ عبدالعزیز انصاری بڑے قابل اور مخلص انسان اور تحصیل عربی میں میرے ہم سبق تھے۔ لقاء اللہ عثمانی، صوفی اقبال احمد، اختر علی خان سبھی سے برادرانہ تعلقات تھے۔ لیکن جو خصوصیت سید عطاء اللہ شاہ بخاری سے تھی، وہ اپنے رنگ میں مثال نہ رکھتی تھی۔ شاہ صاحب اُس زمانے میں شعر تو نہ کہتے تھے لیکن اُردو اور فارسی میں شعر فہمی اور سخن سنجی کا ملکۂ خصوصی رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ اُن کی شگفتگیٔ طبع، ان کا خلوص، اُن کی محبت پروری بے مثال تھی۔ بارہا ایسا ہوا۔ کہ رات کے وقت دوسرے احباب خوابِ غفلت میں پڑے خراٹے لے رہے ہیں۔ اور میں شاہ جی جو باتیں کرنے لگے تو رات کے تین بج گئے۔ خدا جانے وہ کون سے موضوع تھے جن پر اسقدر طویل گفتگوئیں ہوتی تھیں۔ لیکن دلچسپی کا یہ عالم تھا کہ وقت گزرتا جاتا تھا اور ہمیں احساس تک نہ ہوتا تھا۔"

اب انہی محفلوں کی ایک جھلک سید عطاء اللہ شاہ بخاری کی زبانی سنیئے۔ فرماتے ہیں۔

" میانوالی ڈسٹرکٹ جیل میں احباب کی ایک یادگار بزم تھی۔ سب

اہل ذوق، اہل دل اور اہل علم جمع تھے۔ مولانا احمد سعید دہلوی حدیث پڑھایا کرتے تھے۔ عبدالمجید سالک دربار اکبری کا سبق دیتے۔ مولوی بقاء اللہ کی نپی تلی باتیں گفتگو میں رس پیدا کرتیں۔ صوفی اقبال احمد کے "اشلکے" خدا کی پناہ۔ عبداللہ چوڑی والے کی ٹکسالی گالیاں تبرک کی طرح تقسیم ہوتیں۔ اور آصف علی کھلتے تو بہروں کے تختے بچھ جاتے۔ جی خوش کرنے کے لئے مشاعروں کا بھی اہتمام ہوتا۔ شاعر طرحی و غیر طرحی کلام سناتے۔ کہیں سالک صدر ہوتا، کہیں آصف اور کہیں ؎

قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند

.... جب طبیعت ذرا اور شگفتہ ہوتی تو مولانا ڈھول بجاتے۔ صوفی مرحوم تالی پیٹتا۔ داؤد غزنوی حال کھیلتے۔ کبھی اختر گاتا، کبھی سالک، کبھی تنویل۔ وہ رنگ بندھتا کہ در و دیوار جھومتے اور کائنات بھی جھک کر گوش بر آواز ہو جاتی ؎

اب کہاں لیکن وہ رنگا رنگ بزم آرائیاں
یعنی سب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہو گئیں

(امروز ۲۶ ، اگست ۱۹۶۵ء)

سالک نے جیل میں کچھ غزلیں بھی کہیں ان کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

اسیر پہنچے ہیں لاہور سے میانوالی ‏ ‏ ‏ یہاں سے دیکھئے ہوتا ہے انتقال کہاں
کمی تو قید میں احباب کی نہیں سالک ‏ ‏ ‏ مگر بخاری و بیدل سے ہم خیال کہاں

قیام آشیاں ہو یا سکونت قید خانے کی ‏ ‏ ‏ جو سچ پوچھو تو سب نیرنگیاں ہیں آب و دانے کی
نہیں کوئی بھی سد راہ پرواز تخیل کا! ‏ ‏ ‏ قفس کی تیلیاں ہوں یا سلاخیں قید خانے کی
قفس میں نغمہ ریزی کا ہے باعث تو گرفتاری ‏ ‏ ‏ ابھی آئی نہیں ہے طرز درد دل چھپانے کی
سنا ہے آجکل ہیں بجلیاں گلشن میں آوارہ ‏ ‏ ‏ الٰہی خیر رکھنا میرے اجڑے آشیانے کی
جفا سے ہے وفا کی جنگ دونوں کو تمنا ہے ‏ ‏ ‏ انہیں تیغ آزمانے کی ہمیں دل آزمانے کی
ترے فرزند اے خاکِ وطن تیری محبت میں ‏ ‏ ‏ خوشی سے جھیل لیں گے سختیاں سارے زمانے کی

فصلِ گل آمد و گلزار ہمانست کہ بود ‏ ‏ ‏ غمزۂ نرگسِ بیمار ہمانست کہ بود
سرم از جوشش سودائے کہن شد خالی ‏ ‏ ‏ ورنہ آں طرۂ طرار ہمانست کہ بود
جملہ احباب اسیرِ غمِ دنیا گشتند ‏ ‏ ‏ سالک دل زدہ را کار ہمانست کہ بود

شوقِ زنجیر کسے فصلِ بہاراں میں نہیں!   ان دنوں کون سا وحشی ہے جو زنداں میں نہیں
عزت و غربت و بربادی و بے سامانی   کون سی شے مرے کاشانۂ ویراں میں نہیں
اے جنوں اٹھ گئے وہ دشت نوردانِ کہن   کچھ مزا اب خلشِ خارِ بیاباں میں نہیں
آہ! اے یاس ہوئیں ہجر کی آہیں بھی تمام   اب تو اک شمعِ فسردہ بھی شبستاں میں نہیں
دورِ صیّاد میں مامن ہے فقط کنجِ قفس!   ان دنوں ہے وہی خطرے میں جو زنداں میں نہیں

شوق کی ناکامیاں خارِ رگِ جاں ہو گئیں   آرزوئیں دل میں یوں بیٹھیں کہ پیکاں ہو گئیں
میرے دل کی ہر تمنّا ان نگاہوں پر نثار   جو نگاہیں میرے شکووں پر پشیماں ہو گئیں
غیر کے لب پر تبسم، او وفا نا آشنا   بزم میں تیری نگاہیں کتنی ارزاں ہو گئیں
لگ گئی فریادِ بلبل سے گلستاں بھر میں آگ   گل بداماں ٹہنیاں آتش بداماں ہو گئیں

سوز میں ساز ہے تو ساز میں سوز!   یادِ جاناں ہے کیا خیال افروز
ہائے وہ زلفِ آرزو انگیز   ہائے وہ چشمِ عاشقی آموز
فرصتِ عاشقی جنوں میں کہاں   بند ہے کاروبارِ شوق ہنوز
نیند سے لطف اٹھا لو سالک   پھر کہاں یہ فراغتِ شب و روز

میں مستیٔ گل کا راز جو ہوں!   بیگانۂ ذوقِ رنگ و بو ہوں!
گردش کا اسیر ہوں ازل سے   اک ساغرِ دردِ جستجو ہوں!
خمیازۂ یاس چیز کیا ہے   سرمستِ شرابِ آرزو ہوں
تو میں ہے، یہ ہے مرا عقیدہ   کافر ہوں جو یہ کہوں میں تو ہوں
حیرت کدہ ہے جمالِ ہستی   اللہ! میں کس کے روبرو ہوں
نفرت ہے مجھے سکوں سے سالک   ہنگامہ پرستِ ہاؤ ہو میں

رمضان کا مہینہ آیا تو کیا رہنما اور کیا رضاکار، سب مسلمان اسیرانِ فرنگ نے اس مبارک مہینے کی لذتوں سے لطف اندوز ہونا شروع کیا۔ سارے قیدی اکٹھے نمازِ تراویح ادا کرتے۔ پہلی چار رکعتوں میں مولانا احمد سعید پورا پارہ پڑھ دیتے۔ باقی سولہ رکعتوں میں ثناء اللہ عثمانی ایک پارہ ختم کرتے۔ رات کے گیارہ بجے سب اپنی اپنی کوٹھڑیوں میں چلے جاتے۔ سحری کے وقت پھر اکٹھے ہوتے۔ نماز ہوتی، تلاوتِ

قرآن حکیم کرتے۔ پھر عید آئی تو سب نے مل کر خوشیاں منائیں۔ جب خبر آئی کہ مصطفےٰ کمال پاشا (کمال اتاترک) کی افواج قاہرہ نے یونانیوں کو سمرنا سے نکال باہر کیا ہے۔ تو جیل کی چار دیواری میں شاندار جشن منایا گیا۔

جب "زمیندار" کے متعدد ایڈیٹر اسیرِ فرنگ ہو گئے تو ادارے کو ایک نئی بات سوجھی۔ اصل ایڈیٹری تو اخبار نویس کرتے لیکن مدیر مسئول اور پرنٹر اور پبلشر کے طور پر کسی "ڈمی" ایڈیٹر کا نام دے دیا جاتا تاکہ گرفتاری کی نوبت آئے۔ تو اصل آدمی نہ پکڑا جائے۔ اس رسم کی صدائے بازگشت میانوالی جیل میں بھی سنائی دی۔ ایک دفعہ حکومت پنجاب کے ہوم ممبر سر جان مینارڈ نے جیل کا معائنہ کیا۔ تو سیاسی قیدیوں سے بھی ملاقات کی۔ جب والد مرحوم سے تعارف ہوا تو پوچھنے لگے "سالک صاحب! 'زمیندار' کا اصل ایڈیٹر کون ہے؟"۔ بولے "کم از کم میں تو اصل ہوں"۔ اس پر سر جان مینارڈ نے ہنس کر کہا۔ "آپ کو تو ہم جانتے ہیں لیکن 'زمیندار' پر آجکل جس ایڈیٹر کا نام دیا جاتا ہے، وہ تو پان فروش ہے"۔ اس پر سالک نے کہا "اگر آپ اصلی ایڈیٹروں کو دھڑا دھڑ پکڑتے چلے جائیں گے تو ظاہر ہے پان فروش کو آگے آنا پڑے گا تاکہ اصل لکھنے والے محفوظ رہیں"۔

عید کے بعد والد مرحوم کو بھگندر کا پھوڑا نکلا۔ ڈاکٹر سینہ پال کے مشورے پر جیل کے ہسپتال میں داخل ہوئے۔ انہی نے اپریشن کیا اور تین ہفتے تک صحت پائی۔ ان کے خلاف ازالۂ حیثیت عرفی کا ایک مقدمہ مسٹر آر ایس مونگر انسپکٹر جنرل پولیس نے دائر کر رکھا تھا۔ بات یہ تھی کہ جب سالک 'زمیندار' کے مدیر تھے تو اس میں ایک خبر کے دوران میں یہ لکھا کہ مسٹر آر ایس مونگر نے میاں فیروز الدین احمد خادم خلافت کو چھڑی سے مارا۔ اس مقدمے کی تاریخ تھی چنانچہ مولانا ظفر علی خاں کو منٹگمری جیل سے اور سالک کو میانوالی جیل سے لاہور لایا گیا۔ سماعت تو بہت مختصر تھی لیکن اس سے فائدہ یہ ہوا کہ احباب (مولانا ظفر علی خاں، سید امتیاز علی تاج، مولوی ممتاز علی، شفاعت اللہ خاں، مرتضےٰ احمد خاں میکش اور بیدل شاہجہان پوری) سے ملاقات ہو گئی۔

جب رہائی کا دن آیا تو آپ نے نہ کسی کو تار بھیجی نہ کسی کے ہاتھ اطلاع بھیجی۔ چپ چاپ لاہور پہنچ گئے۔ مولانا عبدالقادر قصوری نے پیغام بھیجا کہ "یہ کیا غضب کیا تم سٹیشن پر پہنچ جاؤ۔ میں رضاکاروں کے بیسیوں بھیج رہا ہوں وہ تمہیں جلوس کے ہمراہ لائیں گے۔ والد نے کہا۔ یہ تکلف چھوڑ دیجئے گا۔ اب میں آرام سے گھر بیٹھوں گا۔ رہائی کے بعد بٹالے پہنچے۔ اس کی داستان انہی کی زبانی سنئے۔

"وہاں ریلوے سٹیشن پر بہت شاندار استقبال کیا گیا اور شہر کے سب سے بڑے بازار میں جلوس نکلا۔ مردوں کے ہجوم کے علاوہ کوٹھوں پر دو رویہ ہزارہا ہندو مسلمان عورتیں موجود تھیں جنہوں نے بے شمار پھول نتاشے اور پیسے مجھ پر نچھاور کئے اور میں کوئی پچیس گیندے کے ہار گلے میں ڈالے "جغد" بنا ہوا موٹر کار میں بیٹھا چلا جا رہا تھا۔ موٹر کے ارد گرد دوستوں، رشتہ داروں اور سیاسی کارکنوں کا ہجوم تھا۔ مجھ سے بار بار تقریر کا مطالبہ کیا گیا لیکن میرا گلا بیٹھا ہوا تھا۔ اس لئے معذرت کرنی پڑی۔ ہاتھی دروازے کے محلہ گگے زئیاں میں میرا مکان تھا۔ وہاں پہنچ کر میں نے اہل بٹالہ کا شکریہ ادا کر کے ان کو رخصت کیا اور دوسرے دن والد محترم اور والدۂ محترمہ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے پٹھان کوٹ پہنچا۔ وہاں بھی وہی استقبال اور جلوس کی مصیبت تھی، جس

سے مجھے دلی نفرت ہوتی تھی۔"

چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا۔ گاندھی جی نے چوری چوراہ کے مقام پر ہجوم کے تشدد سے متاثر ہو کر ساری تحریک بند کر رکھی تھی اور وہ یاد بہ خیم ہو چکی تھی۔ جس نے چند مہینے برطانوی سامراج کی بنیادیں متزلزل کر رکھی تھیں۔ اب اس داستان کا ایک چھوٹا سا حصہ رہ گیا ہے کہ اس اجڑے آشیانے پر کیا بیتی جسے سالک خدا کے بھروسے پر چھوڑ کر جیل چلے گئے تھے۔

ان کے جیل جاتے ہی ہمارے کنبے کی آمدن بند ہو گئی۔ مجلس خلافت پنجاب کے قائد مولانا عبدالقادر قصوری نے والدہ کو پیش کش بھیجی کہ وہ بال بچوں کے خرچ کے لئے ایک سو روپے ماہانہ قبول کر لیں۔ وہ غیرت مند تھیں۔ قوم کے چندے سے اپنے لئے رقم لینا مناسب نہیں سمجھتی تھیں اس لئے معذرت کر دی۔ پھر بٹالہ کی مجلس خلافت کی طرف سے حاجی عبدالرحمان صاحب نے ایسی ہی پیش کش کی۔ وہ بھی مسترد کر دی بلکہ جب بٹالہ میں خلافت کانفرنس ہوئی تو چندے کی اپیل پر والدہ نے رہے سہے دو زیور بھی نذر کر دیئے۔ "زمیندار" کی طرف سے کچھ آتا تو شاید قبول کر لیا جاتا۔ لیکن نہ آیا۔ امتیاز علی تاج نے والد کی دو کتابیں چھاپیں۔ ایک "چمپا اور دیگر افسانے" دوسری "راہ رسم منزل ہا" ان کے معاوضے کے طور پر سال بھر میں تین ساڑھے تین سو روپے ملے اور تنگی ترشی سے گذارا کیا۔

سالک جیل سے لوٹنے پر پھر "زمیندار" میں آ گئے۔ گھر کی کیفیت سرگزشت میں یوں بیان کی۔

"میں نے اپنے گھر کی حالت پر نظر ڈالی تو معلوم ہوا۔ عجب بے سروسامانی کا عالم ہے گھر کی استعمالی چیزوں کی حالت خراب، پہننے کے لئے کسی کے پاس ڈھنگ کا کپڑا نہیں۔ بستر پھٹ چکے تھے۔ سال بھر آمد بند رہی اور خرچ جاری رہا۔ اس کا یہی نتیجہ ہونا چاہیئے تھا۔ اگرچہ قومی فنڈ اب بھی معمور تھے۔ لیکن میں دفتر "زمیندار" کے سوا اور کسی ادارے سے ایک پیسہ لینا بھی جائز نہیں سمجھتا تھا۔ وہاں سے کچھ رقم پیشگی تنخواہ کے طور پر ملی جو بمشکل کھانے پینے کے لئے مکتفی ہو سکتی تھی باقی مصارف کا کوئی انصرام نہیں تھا۔"

چنانچہ انہوں نے مولانا عبدالقادر قصوری سے چھ سو روپے بطور قرض لئے۔ علامہ راشد الخیری کی کتاب "طوفان حیات" کے حقوق قید سے پہلے حاصل کر رکھے تھے۔ چنانچہ اس کتاب کا دوسرا اور تیسرا ایڈیشن چھاپا۔ قرضہ بھی ادا ہو گیا اور گھر کی حالت بھی سدھر گئی۔ اس طرح "طوفان حیات" نے معاشی طوفان حیات کو فرو کرنے میں مدد دی۔ والد کی اسیری کے دوران میں والدہ اور ہم بال بچوں پر کیا بیتی؟ مجھے خود تو یاد نہیں کیونکہ رہائی کے وقت چار سال کا تھا لیکن والدہ مرحومہ نے اس زمانے کے جو واقعات سنائے وہ سینے پر لکھے ہوئے ہیں۔ اور بہتر ہے کہ سب کچھ سینے ہی میں محفوظ رہے۔

عشق اسکول کی اصلاحی تحریک

ڈاکٹر جعفر رضا

سید حسین میرزا عشق (۱۲۳۳ھ / ۱۸۱۷ء – ۱۳۰۲ھ / ۱۸۸۵ء) کو اپنی اصلاحی تحریک کی بنا پر بھی اردو مرثیہ کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ ان اصلاحی تحریک کو سمجھنے کے لیے ان کے دور کے سماجی، معاشی اور معاشرتی روابط پر بھی نظر رکھنے کی ضرورت ہے جن کی سست رفتاری میں زندگی کی بوجھ بھی جاری تھیں اور چاروں طرف ایک مہلک آسودگی اور قناعت کا دور دورہ تھا۔ جس کے زوال آمادہ مزاج نے علم و عمل کی تمام جاندار قدروں کو معطل کر کے رکھ دیا تھا۔ اس طرح کے سماج کا تجزیہ پروفیسر سید احتشام حسین یوں کرتے ہیں۔

"ایک ایسے سماجی نظام میں جو ایک رو بہ انحطاط فرسودہ معاشی نظام سے وابستہ ہو، بڑھنے اور نئی خصوصیتیں پیدا کرنے کی طاقت نہیں ہوتی ... ... اور ایک ایسا فلسفہ وجود میں آجاتا ہے جو معنی کے مقابلہ میں صورت کو مواد کے مقابلہ میں ہیئت کو زیادہ اہمیت دیتا ہے وہ زندگی کے چھوٹے چھوٹے مسائل میں خوشی کے پہلو نہ دیکھ کر مبالغہ، تصنع اور آرائش پر جان دیتا ہے۔" [1]

میر عشق بھی اسی سماج کے فرد تھے اور اپنے ماحول سے پوری طرح متاثر تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ اپنے سماج سے ہم آہنگ بھی رہیں اور اپنے لیے کوئی ایسا راستہ تلاش کر لیں جو ان کی انفرادیت کو نمایاں کر سکے۔ اس کوشش میں ان کی نظر اصلاح زبان کی تحریک کی طرف خصوصیت سے گئی جس نے ناسخ کے دور سے نظم اور باقاعدگی اختیار کر لی تھی [2]

ناسخ کی اصلاحی تحریک زیادہ تر غزل کو اپنا مرکز بنائے ہوئے تھی اور اس کے اصول ان کے شاگردوں کیلئے علم سینہ تھے۔ اس کی وراثت میر عشق کے والد میر انیس کے ذریعہ ان کے گھر بھی آئی تھی۔ میر عشق نے اس سرمایہ کا جائزہ لے کر اس میں نکات پیدا کیے اور انہیں اردو شاعری خصوصاً مرثیہ میں رائج کرنے کی کوشش کی۔

عشق اسکول نے زبان و بیان کو آراستہ کرنے کے لیے علم بدیع کے بہت سے شعبوں پر اپنی رائے ظاہر کی ہے اور بیشتر ان کی رائیں تعمیر و تشکیل کے جذبات سے لبریز ہیں۔ ان کا مقصد ان کے دور کے دیگر اہل فن کی طرح یہ تھا کہ فارسی معیار کو سامنے رکھا جائے۔ اور اسی کسوٹی پر اردو شاعری اور خصوصاً فن مرثیہ گوئی کو کس کر دیکھا جائے۔ یہ باتیں کبھی واضح ہو گئی ہیں اور کبھی اشارے کنائے میں بات کو بیان کر دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میر عشق کے دور میں زبان کو بہتر سے بہتر بنانے کی تحریک شعوری اور غیر شعوری دونوں ہی طرح سے کار فرما تھی۔ کچھ لوگ

---

(۱) پروفیسر احتشام حسین : روایت اور بغاوت ص ۱

(۲) پروفیسر مسیح الزماں : اردو تنقید کی تاریخ پہلی جلد ص ۳۰۴

اعتراضات کے جواب میں اپنے دور کے مرثیہ گویوں کے مسلک کی وضاحت کر رہے تھے اور کچھ لوگ شعوری طور پر اپنا ایک نصب العین بنا کر اس سلسلہ میں جدوجہد کر رہے تھے۔ شعوری جدوجہد کرنے والوں میں عشق اسکول کے بانی میر عشق کا نام ممتاز ہے۔ انھوں نے اپنے رسالہ میں اصلاح کے دیگر شعبوں کے بارے میں بھی اشارے کیے ہیں۔

الفاظ کا تقطیع میں گرنا اس کو عموماً معائب شعر میں شمار کیا جاتا ہے اور زیادہ تر احتراز کیا جاتا ہے کہ کوئی لفظ شعر میں پوری طرح ادا ہونے سے قاصر نہ رہ جائے۔ پھر بھی ضرورت شعری کے لحاظ سے بعض رعایتیں بھی دی گئی ہیں جن میں حروف علت یعنی الف، واؤ وغیرہ اہم ہیں۔ میر عشق اس رعایت کو غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ چاہے دس کے بجائے پانچ ہی شعر کیوں نہ ہوں لیکن تعیناً نظم کیا جائے، وہ صحیح ہو، انھوں نے اپنے رسالہ میں اس سلسلہ میں اپنے مسلک کی وضاحت بہت واضح طور کر دی ہے:-

"افسوس اگر ضعف و نقاہت سے مجبور اور ہر روز کے افکار تازہ و فکر رباعیات بے اندازہ سے معذور نہ ہوتا تو گرنا حروف علت یعنی الف، و واؤ کا الفاظ ہندی میں روا نہ رکھتا۔ ... جتنی باتیں محل فصاحت ہیں اور جو لفظ صاحبان تہذیب کے نزدیک کروہ ہیں ان سب کو ترک کرے اگرچہ دس شعر کی جگہ پانچ ہی شعر ہوں۔ ہزاروں لفظ، سیکڑوں ترکیبوں میں کیا کیا اس مختصر رسالہ میں لکھا جائے:

باہر سے آہ گھر میں جو تشنہ لب لاتے ہیں   کیسی پچھاڑیں حضرت شبیر کھاتے ہیں

تقطیع میں کھات ہیں، لات ہیں، رہ جاتا ہے۔ اسی طرح کہتا تھا۔ کہتے تھے، چلتے تھے، ڈگمگاتے ہیں، لڑکھڑاتے ہیں تقطیع میں اگر کہت تھا، کہت تھے، چلت تھے، پھرت تھے، ڈگمگات ہیں، لڑکھڑات ہیں ... یہ ذکر ہندی الفاظ کا تھا۔ جن میں حروف علت میں اسقاط یعنی تقطیع میں گرنا فقط محل فصاحت ہوتا ہے۔ الفاظ عربی و فارسی جن میں اسقاط انھیں حرفوں کا یعنی الف، واؤ، یا کا محض غلط ہے۔ کیا کیا جائے لفظ کبرا کہ اسم ہے۔

ع   فاطمہ کبرا نے دولہا کا جو لاشا دیکھا

گرنا کبرا کے الف کا قیامت ہے

جب بانو کو تقدیر نے اکبر سے چھڑایا

بانو کے واؤ کا گرنا کیا مصیبت ہے

غصہ میں کہہ کے یا علی کھینچی جو شہ نے تیغ

علی کے ی کا گرنا کیا جسارت و جرأت ہے۔

شعرائے ہند نے بجائے خود ایک قاعدہ مستمر دیا ہے کہ بدوں ترکیب یعنی بغیر مضاف، مضاف الیہ، یائے نسبتی کا گرنا جائز ہے جیسے مشکل کشائی، پیشوائی، تنہائی، مسیحائی۔ شاہی، پیری، پیروی، حاجی، ہادی، خاکسار نے یائے نسبت و یائے مصدری و یائے اسم فاعل کسی کا گرنا اپنے کلام میں تو اچھا نہیں جانا۔ ممکن ہے کہ ان کا اسقاط روا نہ رکھے جائیں۔ اس لیے کہ اہل ہند متبع ہیں شعرائے فرس کے۔ اُن کے کلام میں کہیں نہیں

پایا جاتا ہے۔[1]

میر عشق کے بیان کردہ اصولوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی نظر میں الفاظ کا تقطیع میں گرنا ایک بڑا فنی جرم ہے اور اپنے مسلک کے پیروؤں کو انھوں نے اس سے بچنے کی ہدایت کی ہے۔ انھوں نے واضح طور پر کہہ دیا ہے کہ ان کی نظر میں اشعار کی کم قابل معافی ہے لیکن غلط اشعار پیش کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ ان کا بیان ہے کہ انھوں نے اپنے کلام میں حروف علت کو کہیں بھی گرنے نہیں دیا ہے۔ اور اس سلسلہ میں عربی فارسی الفاظ کے ساتھ ہندوستانی اور اردو الفاظ میں اس کا اہتمام کرتے ہیں۔ انھوں نے بہت تفصیل سے اس کی وضاحت کی ہے کہ مختلف الفاظ کا تقطیع میں گرنا بعض اوقات کتنا مکروہ و بدنما معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنا اجتہاد بہ روئے کار لاتے ہوئے عربی الفاظ کے ساتھ ہی اردو الفاظ میں بھی ان کا گرنا بالکل غلط قرار دیا ہے۔ حالانکہ ان کے بیان کے مطابق ہی شعرائے ہند نے بجائے خود ایک قاعدہ قرار دیا ہے کہ بدون ترکیب یعنی بغیر مضاف، مضاف الیہ، یائے نسبتی کا گرنا جائز ہے۔ یہ عمومی قاعدہ بھی میر عشق کو ناگوار خاطر ہے اور انھوں نے اس کی بھی مخالفت اپنے پیروؤں کو کر دی ہے انھوں نے تقطیع میں حروف کے گرنے پر ایک دوسری جگہ بھی روشنی ڈالی ہے:۔

"ردی کو مستحکم و مستقل سب نے کہا ہے۔ بعد اضافت گرنا ی کا بالاتفاق جائز نہیں ہے۔ یہاں قافیوں میں یہی صورت واقع ہے عجب نہیں کہ عروض کی رو سے موزوں ہونے میں کلام ہو:

ہر جنگ میں بندھی ہوئی ڈھالیں ہماری ہیں	تلواریں ہم نے مرحب و عنتر کو ماری ہیں
اب روئے کون جتنے مرے رونے والے ہیں	زنداں میں سب اہلِ جفا کے حوالے ہیں
پنجہ لہو میں ڈوبا ہے دستِ حنائی کا	کیا حال ہو گیا ہے مرے دولہا بھائی کا
موقع نہیں ہے ظالمو! تیغ آزمائی کا	کیونکر لڑوں ہے داغ مرے دل میں بھائی کا
ناحق تجھے غرور عبث لن ترانی ہے	کم زور مار کھانے کی تیرے نشانی ہے

تقطیع میں ہمار ہیں، مار ہیں، وال ہیں، حوال ہیں، دست حنا کا، بھا کا، لن تران ہے، نشان ہے، رہتا ہے۔ نہیں معلوم اس ترکیب کے قافیوں میں ردی کس کو قرار دیتے ہیں اور حروف ردی کس سے مراد لیتے ہیں۔"[2]

یہاں بھی انھوں نے قافیہ کی ردی کے سلسلہ میں بحث کرتے ہوئے اپنے اُنھیں اصولوں کی وضاحت کی ہے جن کا تذکرہ اُوپر کی سطروں میں ابھی آ چکا ہے۔ میر عشق نے کلام میں حروف کا گرنا قطعاً ممنوع قرار دیا ہے اور اسے عیوب شعر میں شمار کیا ہے۔ ان کے بعد ان کے خاندان نے اس کی پابندی تو خیر پوری طرح سے نہیں کی لیکن اس کا تاثر ان کے مزاج پر پوری طرح حاوی رہا۔ چنانچہ مہذب نے عشق اسکول کو ذہن نشین کرنے کے لیے اساتذہ دہلی و لکھنؤ کے کلام میں حروف علت کا گرنا تلاش کر کے دکھایا ہے[3]

---

(۱) میر عشق : رسالہ میر عشق، نیا دور لکھنؤ: اگست ۱۹۶۲ء،

(۲) میر عشق : رسالہ میر عشق، نیا دور لکھنؤ: اگست ۱۹۶۲ء،

(۳) مہذب لکھنوی : دور شاعری حصہ اوّل ص۶۹ تا ص۷۱

اعلان نون

میر عشق نے اپنے رسالہ میں لکھا ہے :
" اعلان نون مع اضا الاضافت ممنوع۔ اکبر جوانی۔ خنجر بران، غلط ایسے اعلان کا خیال بھی نا واجب :

لے اکبر جوان تجھے موت کھا گئی

یا

جب حلق شاہ خنجر بران سے کٹا " ۱

اس طرح ظاہر ہوتا ہے کہ میر عشق اعلان نون مع اضافت غلط قرار دیتے تھے لیکن اعلان بغیر اضافت ہو تو انھیں اس کو جائز قرار دینے میں کوئی قباحت نہ ہوگی۔ مودب نے اعلان نون باعطف کو بھی غلط کہا ہے :۔

"بتیغ کستاں خوب نہ دریائے خون ہے باعطف وہ ہے اور بہ اضافت یہ نون ہے" ۲

مہذب کا بیان ہے کہ اعلان نون مستند شعرائے ایران کے کلام میں نہیں ملتا " فردوسی کے پورے شاہنامے میں صرف تین یا چار جگہ اعلان نون ہے " لیکن اس کے پہلو بہ پہلو انھوں نے لکھا ہے کہ :۔

" ہم اہل ہند قواعد میں اہل ایران کے مقلد ہیں جو ان کی طرز عمل ہے وہی ہماری طرز ہے اور آج تک ایسا ہی ہوتا آیا کہ کل قواعد میں پابندی نظم میں کرتے آئے۔ چونکہ اہل ایران یعنی مستند شعرائے عجم نے اعلان نون کو ناجائز قرار دیا ہے اور کہیں مستند شعرا کے کلام میں نہیں ملتا اس لیے اہل ہند کو اعلان نہ کرنا چاہیئے " ۳

قطع نظر اس سے کہ اعلان نون کلام میں مستحسن ہے یا مکروہ یہاں مہذب کے بیان میں تضاد بھی ہے۔ انھوں نے پہلے یہ کہا ہے کہ اردو میں اعلان نون کے عدم جواز کی وجہ یہ ہے کہ شعرائے ایران نے اسے ناجائز قرار دیا ہے اور دوسرے ہی لمحہ میں یہ بھی کہا ہے کہ فردوسی نے اپنے شاہنامے میں اعلان نون کیا ہے۔ اس طرح یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایران میں اعلان نون یکسر ممنوع نہیں ہے اور مستند شعرا نے بھی اسے اپنے کلام میں جگہ دی ہے۔

استعارہ

اس سلسلہ کا عام و مستند اصول وہی ہے جسے پروفیسر سید مسعود حسن رضوی نے اپنی کتاب میں بیان کیا ہے کہ :۔
" کلام میں ایسی تشبیہیں اور ایسے استعارے نہ لائے جائیں جن تک ذہن کی رسائی مشکل ہو تشبیہ اور استعارے کا کام ہے مطلب کو واضح کرنا نہ کہ اس پر اور پردہ ڈال دینا خیالی تشبیہوں اور مجازی استعاروں سے شعر فہم سے بعید اور سادگی سے دور ہو جاتا ہے " ۴

---

(۱) میر عشق : رسالہ میر عشق (نیا دور لکھنؤ : اگست ۱۹۶۲ء)
(۲) مودب لکھنوی : مرثیہ غیر مطبوعہ مطلع ۔ دونوں جہاں میں آل نبی انتخاب ہیں
(۳) مہذب لکھنوی : دور شاعری حصہ اول ص ۹۱
(۴) پروفیسر سید مسعود حسین رضوی : ہماری شاعری ص ۱۹۵

میرعشق بھی استعاروں کو بیان کی وضاحت کے طور پر استعمال کو مستحسن سمجھتے تھے۔ اور صرف خیال اور مجازی استعاروں کا بیان نامناسب سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنے رسالہ میں ایک مثال دیتے ہوئے لکھا ہے:-

"دیکھا گہن میں آج گل آفتاب کو
غل تھا کہ شاخ تیغ کے جوہر عیاں ہوئے

جب آفتاب کو گل فرض کر لیا تو گہن سے کیا کام۔ جب تیغ کا استعارہ کیا شاخ سے تو جوہر سے کیا تعلق"۔ [۱]

استعارہ کے استعمال میں میرعشق اس کے حقیقت آمیز پہلو کو مقدم قرار دیتے ہیں۔ ان کی نظر میں استعارہ کی خوبی یہ ہے کہ وہ بیان کے مفہوم کو واضح کرنے میں مدد کرے۔ استعارہ کے انتخاب میں اس کی بھی خوبی برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ وردراز قیاس استعارے میرعشق کو پسند نہیں تھے اسی لیے انھوں نے گل میں گہن اور شاخ کے جوہر کی طرح کے استعارہ کو ناپسند کیا ہے اور ان سے بچنے کی تاکید کی ہے۔

ردیف

اردو نے ردیف کی روایت فارسی سے لی ہے۔ ایرانیوں نے قافیہ کے حسن کے پیچھے اس پر ردیف کا اضافہ کیا تھا جس سے خیالات میں وسعت، بیان میں رنگینی اور موضوع میں تنوع پیدا ہو۔ مولوی غلام علی آزاد اپنی کتاب میں لکھتے ہیں

" ودر ردیف و صاحب مخصوص زبان فارسی است کہ ابیات را خلخال می پوشاند و طرفہ آرائش می دہد بہ سبب ردیف تنوع شعر فارسی از دائرہ انحصار بیرون است"۔ [۲]

مولانا سلیمان ندوی نے بھی ردیف کو حسن شعر کی آراستگی کا سامان مانا ہے:-

" ردیف بجائے خود شعر کا ایک زیور ہے اور ترنم و موسیقیت پر اس کا بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔ اس لیے ردیف ہمیشہ اچھوتی اور خوش گوار اختیار کرنی چاہیئے"۔ [۳]

میرعشق نے بھی ردیف کو کلام کی آراستگی کا ذریعہ مانا ہے ان کا کہنا ہے کہ ردیف کو شعر و قافیہ کے ساتھ اس طرح پیوست ہونا چاہیئے کہ اس کے بغیر شعر کا کوئی حصہ چھوٹتا ہوا معلوم ہو۔ انھیں اس طرح کی ردیفیں پسند نہیں جن کے بغیر بھی شعر کا مفہوم مکمل ہو جاتا ہے:-

" ردیف کا لحاظ بھی ضروری ہے کہ بیکار نہ ہو یعنی قافیہ پر معنی قطعاً تمام نہ ہو جائیں کہ ردیف سے کچھ غرض نہ رہے جس طرح اس مطلع میں ہے:-

جس کو غفلت سے نہیں کام وہ ہشیار ہے پھیر   جب تعلق نہ کوئی گل سے رہا خار ہے پھیر

پھیر کا لفظ دونوں مصرعوں میں زائد ہے"۔ [۴]

---

(۱) میرعشق : رسالہ میرعشق (نیا دور لکھنؤ، اگست ۱۹۶۲ء)
(۲) مولانا غلام علی آزاد : خزانہ عامرہ ص ۲۶۹
(۳) مولانا عبدالسلام : شعر الہند حصہ دوم ص ۲۰۴
(۴) میرعشق : رسالہ میرعشق (نیا دور لکھنؤ: اگست ۱۹۶۲ء)

رعایت لفظی

میر عشق کے دور میں رعایت لفظی اور ضلع جگت کا بہت زور تھا اور اس سلسلہ میں بعضوں کی انتہا پسندی سے تاثیر شعر پر بھی اس کی ظاہری زیبائش کو مقدم قرار دیا جانے لگا تھا اور اس کی شعری خوبیاں بھی متاثر ہوئیں۔ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی کہتے ہیں :-

"جس تعلیل کی صنعت تخئیل کی قوت، بیان کی قدرت اور الفاظ کی مناسبت چاہتی ہے اور تینوں چیزوں کے نتیجے کا نام شاعری ہے، اسی طرح صنعت تعجب اور مبالغے کے لیے شاعرانہ تخئیل اور شاعرانہ بیان کی ضرورت ہوتی ہے" [1]

میر عشق نے بھی رعایت لفظی کو حسن شعر میں شمار کیا ہے لیکن وہ اسے شعر کی بنیادی ضرورتوں میں نہیں ملاتے۔ اپنے رسالہ میں لکھتے ہیں :-

"عوام اکثر، خواص کم تر، بنائے نظم رعایت اور ذومعنی پر رکھتے ہیں۔ پس ایسی ترکیب جس سے ذم کا پہلو نکلتا ہو یا وہ مضمون باعث سوء ادب یا شان ممدوح کے خلاف ہو اور وہ لفظ، وہ محاورے جو انفاسک زبان ہوں ان کی طرف قطعاً توجہ نہ چاہیئے بلکہ احتراز واجب، اگرچہ پسند عوام ہوں" [2]

حالانکہ عوام میں رعایت لفظی اور ذومعنی الفاظ کی پسندیدگی بہت نمایاں حیثیت رکھتی تھی لیکن میر عشق کی خواہش تھی کہ اول تو کلام میں رعائتوں کا بالقصد اہتمام روا نہ رکھا جائے کیونکہ عوام اکثر اور خواص کمتر بنائے عظیم رعایت اور ذومعنی پر رکھتے ہیں اور اگر ان کا بیان ناگزیر ہو تو حفظ مراتب کا لحاظ بہت ضروری ہے۔

ایطا یا شائگاں

میر عشق ایطا کو اپنے کلام میں جگہ دینا پسند نہیں کرتے تھے اور اسے عیوب شعر میں شمار کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے رسالہ میں ایطا یا شائگاں کے متعلق حسب ذیل ہدائتیں درج کی ہیں :-

(۱) "اکثر شعرا کا قول ہے کہ اس طور کے قافیے (چلا، پھرا، بیٹھا، اٹھا، دیکھا، سنا، بندھا، کھلا، دھرا، کہا، گرا، ملا، گھٹا، بڑھا، اسی طرح چلو، پھرو، اٹھو، بیٹھو، دیکھو، سنو، اسی طرح چلے، پھرے، بیٹھے، اٹھے، بندھے، کھلے، گرے، ملے، کہے، سنے، بگڑے، دھرے، بڑھے، لازمی غلط ہیں کہ ایطا جلی ہوتا ہے مگر متعدی جائز ہیں یعنی اٹھایا، بٹھایا گرایا، ملایا، اسی طرح گراؤ، ملاؤ، اٹھاؤ، بٹھاؤ، لیکن میرا مذہب احتیاط ہے۔ میں لازم اور متعدی دونوں کا ترک لازم چاہتا ہوں، ہر چند نظم میں بہت ضیق ہو جائے گی، ہو"

(۲) "جو حکم شائگاں ہے کہ ایک قافیے سے زیادہ نہ ہو۔ قول ضعیف یہ ہے کہ بعد چند شعر مسدس کے چار مصرعوں میں بھی اگر ایک قافیہ ایسا ہو تو عیب نہیں صحیح ہو"

(۳) "آستینوں کو، جبینوں کو، زمینوں کو، حسینوں کو، اس میں سینوں کو، سفینوں کو، نظم کرنا اچھا نہیں کہ آخر

---

(۱) پروفیسر سید مسعود حسن ادیب : ہماری شاعری صفحہ ۹۵

(۲) میر عشق : رسالہ میر عشق (نیا دور لکھنؤ۔ اگست ۱۹۶۲ء)

میں (ں) لکھی جاتی ہے اسی طرح کماں کی، باوں کی، نہاوں کی، اس میں رساوں کی، قباوں کی، اسی طرح بیماروں میں گلزاروں میں، زواروں میں، ان کے ساتھ نقاروں میں، نظاروں میں، درست نہ ہوگا۔ نازوں سے، عشق بازوں سے، اس میں جنازوں سے وہی صورت ہے۔ ... یں سے بہ نظر اختصار ایک ایک دو دو لفظ ہر جگہ نظیر میں لکھ دیے جس طرح میں جس زمین میں یہ صورت واقع ہو وہاں احتیاط ملحوظ خاطر رہے۔ تمام غزل تمام قصیدے میں ایک قافیہ اس قسم کا اگر موزوں ہو تو مضائقہ نہیں"

(۴) "جن قافیوں سے معنی فاعل پیدا ہوں وہ سب غلط۔ جس طرح درخشاں، غلطاں، گریاں، شائگاں میں؛ ان پر وہی حکم ہے کہ ایک سے زیادہ نہ ہو" [۱]

میر عشق نے کلام میں شائگاں کے امکانات کو مثالیں دے کر واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے مجموعی اعتبار سے اپنے اصولوں کی وضاحت بھی نہیں کی ہے بلکہ مثالوں کے ذریعہ مختلف قافیوں میں شائگاں کے امکانات بیان کیے ہیں۔ مودب نے یہی شائگاں کو عیب کہا ہے۔ لیکن عیوب شعر کے منظوم بیان میں اس کی تعریف یا تفصیل کا امکان نہ ہو سکتا تھا۔ انھوں نے اپنے مرثیہ میں ایک جگہ کہا ہے

قانون دانِ نظم سنیں داستانِ نظم   ایطے سے قافیے سوں بری یہ ہے شانِ نظم
بے اعتبار سنت ہوئی ہے دکانِ نظم   اردو میں شائگاں سے ہے مملو مکانِ نظم
اب اور آگے بڑھنے میں زحمت کمال ہے
مجھ کو تو بعض کی خفگی کا خیال ہے [۲]

مہذب نے اپنی کتابوں میں شائگاں پر تفصیل سے بحث کی ہے اور اس کے تمام امکانات کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کا بیان ہے:

"حروف زائدہ کے دور کرنے کے بعد اگر قافیہ باقی رہے تو ایطا نہیں ہوتا اور اگر قافیہ باقی نہ رہے تو اسی کو ایطا کہتے ہیں ... مثال اس کی یہ ہے کہ اگر مطلع میں (فاضلات، باقیات، قوافی لائے گا تو حروف زائدہ نکالنے کے بعد یعنی (الف و تا) صرف فاضل اور باقی، باقی رہ جانے گا جو قافیہ نہیں قرار پا سکتا۔ اسی کا نام ایطاء جلی ہے۔ لیکن اگر شالات حالات کو قوافی کسی مطلع میں لائے گا تو ایطا یعنی شائگاں نہیں باقی رہے گا" [۳]

ایک دوسری جگہ بھی انھوں نے ایطا کی مختلف قسمیں بتائی ہیں اور ان کے متعلق مشق اسکول کے نظریات کی تشریح کی ہے:۔

"ایطا کے دو معنی ہیں (۱) پامال کرنا (۲) قافیہ کا مکرر لانا۔ ایطا کی دو قسمیں ہیں (۱) خفی (۲) جلی (۱) خفی اس

---

(۱) میر عشق: رسالہ میر عشق (نیا دور لکھنؤ اگست ۱۹۶۲ء)

(۲) مودب لکھنوی: مرثیہ غیر مطبوعہ، مطلع۔ دونوں جہاں میں آلِ نبی انتخاب ہیں

(۳) مہذب لکھنوی: دورِ شاعری حصہ دوم ص ۴۹

کو کہتے ہیں کہ قافیہ ظاہر نہ ہو۔ دانا، بینا، آب، گلاب وغیرہ چونکہ ان قوافی میں واضح طور پر تکرار ظاہر نہیں ہے اس لیے اس کو خفی ایطا کہتے ہیں۔

(۲) جلی وہ ہے کہ جس میں تکرار قافیہ ظاہر بہ ظاہر ہو مثلاً خوشتر اور زیبا تر، اگر دو مصرعوں میں سے آئیں گے تو جلی ایطا ہو جائے گا اس لیے کہ لفظ تر ظاہر بہ ظاہر آ گیا باقی رہے خوش اور زیبا ان میں قافیہ نہیں" [۱]

ایطا میر عشق اور ان کے متبعین کی نظر میں فن عروض کی سب سے بڑی غلطی ہے اور ان کا خیال ہے کہ اس غلطی سے عموماً مرثیہ گو بے بہرہ ہیں یا تساہل برتتے ہیں جس کے نتیجہ میں فن کی غلطیاں مراثی میں نظم ہو جاتی ہیں۔ میر عشق اور ان کے متبعین نے ایطا جلی او رخفی دونوں کو غلط مانا ہے

تعقید شعر میں تعقید قواعد زبان اور اصول بیان کی خلاف ورزی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے لیے شعرا کو رعایت دی گئی ہے کہ جہاں ضرورت شعری مجبور کرے، وہ مروجہ اصول و قواعد زبان کی ترتیت کے خلاف اپنے کلام میں ان کی ترتیب بدلیں۔ اور جس طرح چاہیں استعمال کریں۔ پروفیسر سید مسعود حسن رضوی نے اس سلسلہ میں ایک شرط لگائی ہے۔

" اگر شعر کا وزن مجبور کرے تو لفظوں کی ترتیب میں فرق کرنا جائز ہے۔ مگر صرف اتنا کہ معنی سمجھنے میں دقت نہ ہو اور کانوں کو ناگوار نہ ہو۔ بلکہ بغیر غور کیے ہوئے اس کا فرق احساس بھی نہ ہو" [۲]

تعقید کے اصلاح کی ضرورت میر عشق نے بھی محسوس کی تھی اور انھوں نے اپنے رسالہ میں اس کے بارے میں بھی لکھا ہے۔ ان کا مسلک بھی یہ ہے کہ الفاظ کی ترتیب اتنی نہ بگڑنے پائے کہ مطلب سمجھنے میں دشواری ہو اور چیستان بن جائے۔ یا شعر کا ترنم مجروح ہو اور سماعت پر بار ہو۔ انھوں نے اس سلسلہ میں دو مثالیں بھی دی ہیں:۔

ہے جلنے کو قریب شمع پروانہ آتا

یا

دل مانگنے جو ہم سے وہ شیریں ادا لگا

میر عشق نے انھیں تعقید سے بری کرتے ہوئے اس طرح نظم کرنے کے لیے کہا ہے:۔

جلنے کو قریب شمع پروانہ آتا ہے

یا

دل ہم سے جو وہ شیریں ادا مانگنے لگا!

میر عشق تعقید کو عیوب شاعری میں شمار کرتے تھے وہ لکھتے ہیں:۔

---

(۱) مہذب لکھنوی: دورِ شاعری حصہ اوّل صفحہ ۶۸

(۲) پروفیسر سید مسعود حسن رضوی: رسالہ میر عشق (مطبوعہ ماہنامہ نیا دور شمارہ اگست ۱۹۶۲ء)

"چاہیئے تھا کہ اس عیب سے بھی کلام پاک رہے تو خوب ہے" ؎۱

ان کے متبعین نے بھی تعقید کو عیب سمجھا ہے اور اس سے بچنے کو افضل کہا ہے مہذب نے اس سلسلہ میں مزید وضاحتیں کی ہیں:-

"تعقید کے لیے بس اس قدر سمجھنا کافی ہے کہ زبان و محاورہ و طبع سلیم جس کی اجازت دے رہی ہو۔ اگر طبع سلیم اجازت نہ دے تو وہ تعقید معیوب ہے اور اگر طبع سلیم اجازت دے کہ نہیں یہ تعقید مستحسن ہے تو عیب نہیں" ؎۲

مہذب کی بیان کردہ تعریف کئی طرح کے ابہام میں گرفتار ہے۔ انھوں نے تعقید کی ساری ذمہ داری طبع سلیم کے کاندھوں پر ڈال دی ہے اور اس طبع سلیم سے ان کا کیا مطلب ہے اس کی وضاحت نہیں کی ہے۔ جس سے میر عشق کے بیان کردہ اصولوں میں کسی طرح کا اضافہ نہیں ہوتا اور نہ اس کو سمجھنے میں ہی آسانی ہوتی ہے۔

ثقال

میر عشق نے اثقال کی تعریف اپنے رسالہ میں ان الفاظ میں کی ہے:-

ایک جنس کے حرفوں کا باہم ہونا جیسے ہیں، مایوس، داغ، غم، تو، طاؤس، تو، اب، دم مرا، کر رہے۔ یہ بھی گونہ فصاحت کے خلاف ہے،، ؎۳

انھوں نے اس سلسلہ میں یہ مثالیں پیش کی ہیں:-

"میں محبوب ہوں اور میں مایوس ہوں — یہ ہیں داغ غم ہیں تو طاؤس ہوں
میں مرتا ہوں تو اب یہ ہے دم مرا — بتاؤ تو تم اب یہ کیا کر رہے ہو"

عشق اسکول نے اسے فن شعر کے عیوب میں شمار کیا ہے۔ مہذب نے اثقال کی اس طرح وضاحت کی ہے:-

"اصطلاح شعرا میں ایک جنس کے حرفوں کا باہم جمع ہونا (اثقال) کہلاتا ہے۔ چونکہ پڑھنے میں ثقل و تکلف ہوتا ہے۔ اس لیے اس کا نام (اثقال) رکھا" ؎۴

اثقال سے شعر کا ترنم بھی مجروح ہوتا ہے اور حرفوں کا ٹکراؤ سماعت کی کیفیت کو پامال کر دیتی ہے۔ عشق اسکول نے اس کے استعمال پر پابندی عائد کر کے اصلاح فن کے فرائض انجام دینے کی کوشش کی ہے۔ میر عشق نے بھی اسے اپنے کلام میں ممنوع قرار دیا ہے اور بعد کے افراد نے اسے عیب شاعری میں ہی شمار کیا۔

شتر گربہ

میر عشق نے اسے عیوب شاعری میں شمار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"جس کی نظیر سیفی نے مادمن میں لکھی ہے۔ ایک مصرع میں لفظ تین ایک میں تم ایک میں آپ ایک میں تو۔

---

(۱) میر عشق: رسالہ میر عشق (مطبوعہ ماہنامہ نیا دور شمارہ اگست ۱۹۶۲ء)
(۲) مہذب لکھنوی: دور شاعری حصہ دوم صہ ۸۵
(۳) میر عشق: رسالہ میر عشق (نیا دور لکھنو اگست ۱۹۶۲ء)
(۴) مہذب لکھنوی: دور شاعری حصہ اول صہ ۱۹

ہم اپنا حال اہلِ زمیں کیا بیاں کریں　　رہتا ہوں مثلِ برق فلک بے قرار میں
سحر ہو گئی آپ ہرگز نہ آئے　　کٹی کس طرح شب تمہیں کیا خبر
اس خیال کی تائید مودب نے بھی کی ہے :۔

وادی میں شعر کے ہمیں سب اختیار ہے　　عیب و ہنر بتانے میں اک ننگ و عار ہے
کھیلا ہوا ہمارا یہ تازہ شکار ہے　　اب شتر گربہ بیت میں صاف آشکار ہے
آپ اہلِ فن ہیں صاحبِ توقیر دیکھئے
ہے تم سے عرض عیب کی تصویر کھینچئے [1]

شتر گربہ فنِ شعر کے عیب میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے نام میں ہی اونٹ اور بلّی کو یکجا کرنے معنی میں بیان کے مضحک پہلو کو نمایاں کر دیتا ہے۔ زبان کے ابتدائی دور میں اس کا استعمال کیا جاتا تھا لیکن بعد کے لوگوں نے اسے عیب سخن قرار دے کر ترک کر دیا۔ عشق اسکول بھی اسے عیب شاعری سمجھتا ہے اور اس کے ترک کو مقدم جانتا ہے۔

الحاق میر عشق نے شعر کی خوبصورتی کے لیے اس کے دونوں مصرعوں کو مربوط ہونے کے باوجود بجائے خود مکمل ہونا ضروری قرار دیا ہے اور توڑ کر جملوں کو دو مصرعوں میں اس طرح باندھنے کو "الحاق" نام دیا ہے۔

گزری شبِ فراق پر افسوس ہے کہ تم　　آتے تو دیکھتے جو قلق تا سحر رہا!

یہاں تم کو دوسرے مصرع سے تعلق ہے اور اس کا بیان پہلے مصرع میں ہے۔ میر عشق نے اپنے متبعین کو ہدایت کی ہے کہ وہ اس طرح کی غلطیوں سے بچنے کی کوشش کریں اور کلام کو بہتر بنائیں۔

اضمار قبل الذکر : میر عشق نے اسے عیوب شعر میں شمار کیا ہے اور اس کی مثال اپنے رسالہ میں یہ دی ہے۔

جو سیر اس کی دیکھو تو لالے گل بجا ہے　　چمن دل کے زخموں سے پھولا پھلا ہے

انھوں نے اس کے عیوب کی تشریح یں لکھا ہے :

"اس مصرع اول میں ضمیر، چمن دل کے زخموں کا مصرع ثانی میں ذکر"

جمع الجمع بنانا : میر عشق اردو میں اس طرح کے استعمال کو غلط قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے اس سلسلہ میں ایک مثال بھی اپنے رسالہ میں درج کی ہے :۔

سامان جو دہاں جنگ کا کفاروں میں دیکھا　　ہر ایک کا منہ شاہ نے انصاروں میں دیکھا

اور اس کی اس طرح وضاحت کی ہے :۔

"کفار و انصار دونوں جمع۔ جمع کا جمع خوب نہیں اس کا بھی لحاظ رہے تو بہتر ہے"

---

[1] مودب لکھنوی: مرثیہ غیر مطبوعہ مطلع۔ دونوں جہاں میں آلِ نبی انتخاب ہیں۔

جمع کی جمع بنانے کی ترکیب عربی کی تقلید میں اردو میں رواج میں آئی۔ عشق اسکول اس سلسلہ میں ہندوستانی قاعدہ کو مقدم قرار دیتا ہے جس میں جمع الجمع بنانے کا رواج نہیں ہے۔

○

زبان و بیان کے متعلق عشق اسکول کے اصول و ضوابط کا مطالعہ کئی اعتبار سے نتیجہ خیز ہے اور مجموعی اعتبار سے اس کی تاثیر تعمیری جذبات سے مملو نظر آتی ہے۔ میر عشق اور ان کے متبعین نے زبان و بیان کو آراستہ کرنے کے لیے اس کے تمام متفرق اور منتشر پہلوؤں پر نظر رکھی ہے اور ان کے متعلق اصول و ضوابط اخذ کیے اور ان کی پابندی کی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا اور دشوار کام الفاظ کی چھان بین تھی بہت سے لفظوں کو ترک کرنا اور ان سے بہتر الفاظ کا انتخاب عمل میں لانا۔

اس منزل پر انھوں نے مذاق سلیم کے علاوہ عربی و فارسی اساتذہ کے کلام کو سند مانا اور اسی کے معیار پر اردو شاعری کو بھی پہنچانے کی کوشش کی۔ اس سلسلہ میں دوسری دشواری ہندوستانی الفاظ سے متعلق تھی۔ انہوں نے یہ مہم اس طرح طے کی کہ امرا اور تعلیم یافتہ طبقہ کی زبان کو سند مان لیا۔ یہی صورتِ حال محاوروں سے متعلق بھی تھی۔ انھوں نے یہ منزل اسی طور پر طے کی۔ ساتھ ہی مختلف ترکیبوں پر غور کر کے ان کے اصول بھی مدون کیے۔ اور عربی و فارسی الفاظ کو ہندوستانی الفاظ کی اختلاط سے جدا رکھا۔

عشق اسکول نے زبان و بیان کے متعلق قواعد تیار کرنے میں بڑی کاوش کی ہے جس کے لیے ان کی اہمیت ناگزیر ہے عشق اسکول کے بانی میر عشق نے بہ حیثیت مرثیہ گو پہلی بار اصلاح زبان کی بحث میں الگ سے ایک تصنیف چھوڑی ہے جس کی بنا پر زبان کے مصلحین میں ان کا نام نمایاں طور پر سامنے آتا ہے۔ مراثی کی اصلاحی مہم میں ان کی اہمیت وہی ہے جو غزل کی اصلاح میں شیخ امام بخش ناسخ کی ہے۔ میر عشق نے زبان و بیان کی اہمیت پر اپنے رسالہ میں اکثر بحث کی ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ :-

"بندش کی صفائی کا بہت خیال رہے۔ مضمون لاکھ اچھا ہو گا کچھ لطف نہ دے گا"

اسی بات کا اعادہ دوسری جگہ بھی کیا ہے :-

"ہاں مضموں بھی متبذل و رکیک و پیش پا افتادہ نہ ہو۔ محاورات بازاریوں کے نہیں۔ زبان میر زبان شہر"

میر عشق زبان و بیان کے معاملہ میں طرز بیان اور مفہوم کو یکساں اہمیت دیتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ مضمون بہتر سے بہتر ہو لیکن متبذل محاوروں اور غریب الفاظ سے ان کا استعمال بدنما ہو سکتا ہے۔ اسی طرح پیش پا افتادہ مضامین کو صرف زبان کی تراش خراش سے خوبصورت نہیں بنایا جا سکتا۔

———

فسانۂ آزاد کی کہانی

عظیم الشّان صدیقی

فسانۂ آزاد کا اُردو ادب میں اہم درجہ ہے اور یہی اُردو کا وہ پہلا ناول ہے جس کو سب سے زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔ عوام و خواص نے اسے پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ اس کے زیر اثر متعدد ناول لکھے گئے ہیں۔ ستر سال کے عرصہ میں اس ضخیم ناول کے تقریباً سترہ ایڈیشن شائع ہوئے۔ اس وقت یہ کمیاب کتابوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس کا کوئی ایڈیشن اہتمام کے ساتھ شائع نہیں کیا گیا چنانچہ آج جب کوئی شخص اُردو ادب کے اس شہ پارے کے بارے میں کام کرنا چاہتا ہے تو ہندوستان کی تمام لائبریریاں کھنگالنے کے بعد بھی اس کے بارے میں مکمل معلومات فراہم نہیں ہوتیں۔ ہندوستان کی تقریباً تمام بڑی لائبریریاں دیکھنے کے بعد فسانۂ آزاد کے بارے میں میں نے جو معلومات فراہم کی ہیں۔ وہ میں اس خیال سے زیرِ نظر مضمون میں پیش کر رہا ہوں کہ ممکن ہے کہ آئندہ اس قدر معلومات بھی فراہم نہ ہو سکیں یا پھر کسی اہلِ ذوق کے لیے میرا یہ مضمون معاون و مددگار ثابت ہو سکے۔ اس مختصر مضمون سے فسانۂ آزاد کے ایڈیشنوں کے بارے میں جہاں کچھ حقائق سامنے آئیں گے وہاں کچھ روایات کی تردید بھی ہو جائے گی۔

فسانۂ آزاد کا آغاز ابتدائے دسمبر ۱۸۷۸ء میں ہوا اور یہ بالاقساط بطور ضمیمہ دو سفید ورقوں پر اودھ اخبار لکھنؤ کے ساتھ دسمبر ۱۸۷۹ء تک شائع ہوتا رہا۔ اس زمانے میں اودھ اخبار روزنامہ تھا۔ اور ہر سنیچر کو اس کا ایک ہفتہ واری ایڈیشن بھی شائع ہوتا تھا اس کے محرکات کیا تھے ابتدا میں فسانۂ آزاد کا نام کیا تھا۔ اس کی اقساط کس عنوان کے تحت شائع ہوتی تھیں۔ ان چار صفحوں میں کس قدر مواد شائع ہوتا تھا کہ درمیان میں صفحات میں اضافہ کر دیا گیا تھا۔ موجودہ فسانۂ آزاد کے متن اور اصل متن کی عبارت میں کیا اختلاف ہے ان سب معلومات کا صحیح و واحد ذریعہ اس زمانہ کے اودھ اخبار کا فائل ہو سکتا تھا لیکن بدقسمتی سے ۱۸۷۸ء-۱۸۷۹ء کا یہ فائل نایاب ہے۔

فسانۂ آزاد کے محرکات کیا تھے یہ ایک بحث طلب موضوع ہے اور اس مختصر مضمون میں اس کی گنجائش نہیں ہے البتہ اس سلسلہ میں بیک لسٹ نے جو بیان کیا ہے۔ یہاں اس کا اقتباس دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا

> "اصل کیفیت فسانۂ آزاد کی بنیاد پڑنے کی یوں ہے کہ جب حضرت سرشار کھیری سے لکھنؤ آئے تو یہاں شب و روز یارانِ دقیقہ رس و صبح نفس کی صحبت میں گزرتے تھے اس صحبت میں جہاں ایک سے ایک حاضر جواب و طرار موجود ہوتا تھا۔ وہاں منشی سجاد حسین صاحب ایڈیٹر اودھ پنچ و پنڈت تربھون ناتھ ہجر مرحوم بھی شریک ہوا کرتے

تھے۔ اسی صحبت میں ایک روز پنڈت ترببون ناتھ ہجر نے کہا کہ اگر کوئی ناول ایسا ہے کہ جس کا ایک صفحہ پڑھیے اور ممکن نہیں کہ بیس مرتبہ نہ ہنسیے تو وہ ڈان کوئکسٹ اٹ (DON QUIXOT) ہے اگر اردو میں اس طرز کا فسانہ لکھا جائے تو خوب ہے۔ حضرت سرشار کے دل میں اس وقت کی بات ایسی کارگر ہوئی کہ اردو میں ڈان کوئکسٹ اٹ کے انداز پر مضامین لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ اودھ اخبار میں ظرافت کے عنوان سے مختلف مضامین شائع ہونے لگے۔ یہ مضامین عموماً لکھنؤ کے رسم و رواج سے متعلق ہوا کرتے تھے۔ مثلاً کبھی محرم پر ایک مضمون نکل گیا۔ کبھی چہلم پر کبھی عیش باغ کے میلہ پر۔ اس وقت تک لوگوں کا یہ خیال تھا کہ دس بیس مضامین نکل کر یہ سلسلہ ٹوٹ جائے گا اور حضرت سرشار کا بھی شاید یہی منشا ہو مگر لوگوں کو یہ سلسلہ مضامین ایسا بھایا کہ اس کے قائم رکھنے کی کوشش کی گئی۔“

(ماخوذ از مضامین چک بست)

اس اقتباس سے کئی باتیں سامنے آتی ہیں اور چک بست سرشار کے ہم عصر بھی تھے اس لیے ان کا بیان زیادہ قابلِ اعتماد ہے۔ اودھ اخبار کے ساتھ اس فسانہ کے جو مضامین چھپتے تھے وہ بغیر کسی نام اور بغیر کسی عنوان و باب کی تقسیم کے شائع ہوتے تھے۔ اس ناول کا نام فسانۂ آزاد کیسے رکھا گیا اس کی بھی دلچسپ حکایت ہے۔ جب اس ناول کی مقبولیت اور عوام کے اصرار اور خریداروں کی طلب کے پیشِ نظر مطبع نولکشور کے مالک نے اس کو کتابی شکل میں شائع کرنے کا ارادہ کیا تو اس کے لیے نام کی تلاش ہوئی اور اودھ اخبار ۲۷ جنوری ۱۸۸۰ء کے شمارے میں اس کے نام کے انتخاب اور زبان کی اغلاط کے سلسلے میں اعلان شائع کیا گیا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں مختلف لوگوں نے اپنی رائیں بھیجیں۔ رانادلیپ سنگھ نے چار تاریخی نام تجویز کیے جس میں ایک نام ”مرآتِ سخن داستانِ آزاد“ بھی تھا۔ چنانچہ رانا صاحب کے مجوزہ نام کا پہلا حصہ حذف کر کے اس کا نام ”فسانۂ آزاد“ رکھا گیا لیکن جولائی ۱۸۸۰ء کے اشتہار کے مطابق اس وقت اس کو ”ناول آزاد فرخ نہاد“ کے نام سے ہی پکارتے تھے۔ اگر ناظرین کی رائے طلب نہ کی جاتی تو عین ممکن تھا کہ اس کا نام ”ناول آزاد فرخ نہاد“ ہی ہوتا۔ اور اس طرح ناقدین کو لفظ ”فسانہ“ پر اعتراض کا موقع نہ ملتا۔ البتہ ۱۲ راگست ۱۸۸۰ء کے اشتہار میں اس کا نام فسانۂ آزاد ہی لکھا ہے۔ فسانۂ آزاد کس طرح لکھا گیا اس کے بارے میں مختلف بیانات اور متعدد روایتیں ہیں کہ سرشار نے قلم برداشتہ لکھا ہے۔ سر پر کاتب کھڑا ہے اور تقاضا کر رہا ہے سرشار نے اسی وقت چند صفحے لکھے اور کاتب کو دے دیے اب ایک عینی شاہد کا بیان بھی ملاحظہ فرمائیے۔

”جہاں تک ہم کو ان معاملات میں دخل ہے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جس طرح قلم برداشتہ اور بلاخوف و فکر پنڈت صاحب نے فسانۂ آزاد لکھا۔ اس طرح لکھنا کارے دارد۔“

(ماخوذ از اشتہار فسانۂ جدید۔ ۶ر جولائی ۱۸۸۰ء)

یہ بیان شیو پرشاد کا ہے جو اودھ اخبار کے منیجر تھے جن کے سامنے فسانۂ آزاد کے اکثر حصے لکھے گئے ہوں گے۔

اب رہا عنوانات کا معاملہ تو ابتدا میں یہ اقساط بغیر کسی عنوان کے شائع ہوا کرتی تھیں۔ فسانۂ آزاد کی جلد اول کا کتابی ایڈیشن تو میری نظر سے نہیں گزرا البتہ جلد سوم ماہوار اشاعت کے کچھ حصے جو ۱۸۸۱ء کے مطبوعہ ہیں میں نے دیکھے ہیں ان میں کوئی عنوان نہیں دیا گیا ہے۔ قسط ختم ہونے پر صرف باقی آئندہ لکھ کر اگلی قسط شروع کی گئی ہے۔ عنوانات کے سلسلے میں فسانۂ جدید (جام سرشار) کی اشاعت کے دوران نومبر ۱۸۸۱ء میں ایک قاری نے اس طرف توجہ دلائی تھی۔

"پنڈت صاحب تسلیم

بغیر عنوان کے مضمون اچھے نہیں معلوم ہوتے خدا جانے آپ سرخیاں

کیوں نہیں لکھتے۔ مہربانی کر کے اس کی طرف متوجہ ہوجیے۔"

آپ کا خادم۔ از کوہ آبو۔ (فسانۂ جدید نمبر ۵ ماہ نومبر ۱۸۸۱ء) طبع ثانی

عنوانات کا سلسلہ غالباً فسانۂ آزاد کی طبع ثالث سے شروع کیا گیا۔ یہاں یہ دلچسپ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ فسانۂ آزاد کے سلسلہ میں قارئین کے جو خطوط آتے تھے وہ ہر قسط کے آخر میں شائع کر دیے جاتے تھے۔

فسانۂ آزاد کے ایڈیشنوں کے بارے میں ہماری معلومات کا دائرہ عموماً سنی سنائی باتوں تک محدود ہے اس کے پہلے مکمل ایڈیشن کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ

"کتابی شکل میں اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۸۱ء میں شائع ہوا۔"

لیکن ایسا نہیں ہے۔ بلکہ ۱۸۸۰ء میں اس کی پہلی جلد کی کتابت و طباعت کا انتظام کیا گیا تھا۔ میرے اس قول کی تصدیق ۱۲ اگست ۱۸۸۰ء کے اس اشتہار سے ہوتی ہے جو فسانۂ جدید کے بارے میں شائع ہوا تھا اور اس میں ضمنی طور پر فسانۂ آزاد کا ذکر کیا گیا ہے۔

"شائقان نکتہ پرور کو مژدہ ہو کہ فسانۂ آزاد کی جلد اول بطریق کتاب علیحدہ طبع ہوئی ہے۔ اس کی کتابت ایک لائق فائق خوشنویس مطبع کے سپرد تھی۔ جلد اول کے بارے میں قیمت پیشگی جلد اول ولایتی للعہ قسم دوم سفید رمی سے محصول ڈاک تخمیناً ۸ر آنہ جلد اول کے قریب الاختتام ہونے پر اشتہار دیا جائے گا کہ اب کتاب چھپ کر تیار ہوگئی ہے۔"

اشتہار کے آخر میں "العبد شیو پرشاد منیجر اودھ اخبار لکھنؤ ۱۲ اگست ۱۸۸۰ء" لکھا ہے۔ یہ اشتہار فسانۂ آزاد جلد سوم ماہانہ رسالہ بابت ماہ مئی ۱۸۸۱ء میں میری نظر سے گزرا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ اشتہار فسانۂ جدید کے بارے میں اودھ اخبار میں دیا گیا ہوگا اور پھر مذکورہ رسالہ میں بھی اسے شائع کر دیا گیا ہے۔ لیکن سنہ اور تاریخ کی موجودگی میں ہم

اس کے بارے میں کوئی شبہ نہیں کر سکتے۔ اس اشتہار کی روشنی میں ہم یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہیں کہ فسانہ آزاد جلد اوّل کا پہلا کتابی ایڈیشن ۱۲ اگست ۱۸۸۰ء تک شائع نہیں ہوا تھا۔ مزید یہ کہ اس کی قیمت و کاغذ کے بارے میں بھی معلوم ہو جاتا ہے لیکن "شائقان نکتہ پرور" اور ناظرین فسانۂ آزاد اس قدر انتظار کب کر سکتے تھے کہ جلد دوم کی کتابت ہو، چھپے، جلد بندھے تب کہیں جا کر کتابی شکل میں ان کے سامنے آئے چنانچہ یہ اصرار کیا گیا کہ جلد دوم کے چار صفحے ہر روز اخبار میں حسب سابق شائع ہونے چاہئیں۔ فسانہ جدید کے بارے میں جو اشتہار ۶ (مہینہ کا نام نہیں دیا گیا) ۱۸۸۰ء کا ہے اس میں اس طرف اشارہ کیا گیا ہے جس کا اقتباس ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

"اس عرصہ میں اکثر احباب اور ناظرین اودھ اخبار نے باصرار یہ خواہش ظاہر کی کہ حصۂ دوم ناول "آزاد فرخ نہاد" ہر روز اخبار کے ساتھ شائع ہونا چاہیے جیسا کہ سابق میں قاعدہ تھا اور ہفتے کے اخبار کے ساتھ چار صفحے جدید ناول کے چھپنے چاہئیں۔"

یہ اشتہار ۶ جون یا جولائی ۱۸۸۰ء کا معلوم ہوتا ہے کیونکہ ۱۹ جولائی ۱۸۸۰ء سے فسانہ جدید کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ اس کی تصدیق دوسرے اشتہار سے بھی ہو جاتی ہے جو ۱۲ اگست ۱۸۸۰ء کا ہے جس میں یہ تحریر ہے کہ

"یکم جولائی سے فسانۂ آزاد کی جلد ثانی کے چار صفحے پھر جلوۂ اشاعت پانے لگے۔"

چنانچہ یکم جولائی ۱۸۸۰ء سے فسانۂ آزاد جلد ثانی کے طبع ثانی کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور یہ اودھ اخبار کے ساتھ روزانہ چار صفحوں پر چھپنا شروع ہو گیا۔ لیکن ان چار صفحوں سے لوگوں کی سیری نہیں ہوئی۔ اور اس بات کی خواہش ظاہر کی گئی کہ بجائے چار صفحوں کے ایک ماہ کی کل اقساط پندرہ روزہ یا ماہوار رسالہ کی صورت میں شائع کی جائیں جس کا ثبوت اس اشتہار سے ملتا ہے:

"یکم جولائی سے فسانۂ آزاد کی جلد ثانی کے چار صفحے پھر جلوہ اشاعت پانے لگے۔ ایسا اکثر ناظرین اودھ اخبار نے خواہش ظاہر کی کہ یہ مرقع خیالات تنگرف مہینے میں دو بار یا ایک بار آب و تاب کے ساتھ بطور رسالہ علیحدہ شائع ہو۔ اس کے کئی باعث لکھے ایک یہ کہ اس داستان دلکش کے چار صفحے پڑھنے سے سیری نہیں ہوتی۔ دوسری وجہ۔ اودھ اخبار آیا اور ادھر اصحاب جوہر شناس نے جوتہ دل سے اس فسانہ کے شائق ہیں ظرافت کے پرچے کو ہاتھوں ہاتھ اُڑا یا اگر کوئی چاہے کہ فیل میں کل پرچوں کو جمع کرے تو محال ہے۔ پس اگر بطریق رسالہ شائع ہو تو لطف مزید بخشے۔ تیسرے یہ کہ علاوہ خریداران اودھ اخبار کے اور صاحبان صرف اسی فسانہ کی خریداری سے اپنے اشتیاق کو تسکین دیتے ہیں۔ انشاءاللہ ماہ اگست سے فسانۂ آزاد کی جلد ثانی اخبار سے علیحدہ مہینے میں بطور ماہواری رسالہ کے ایک بار شائع ہو گی۔ قیمت خریداران اودھ

اخبار نظیم لکھنؤ کے لیے ۸ر ماہواری خریداران اودھ اخبار کے لیے جو لکھنؤ میں نہیں ہیں ۸ر ۶ پائی ماہواری مع محصول ڈاک عام خریداران فسانہ کے لیے جو لکھنؤ میں ہیں ۱۰ آنہ عام خریداران فسانہ کے لیے جو لکھنؤ میں نہیں ہیں ۱۰ آنہ ۶ پائی ماہواری مع محصول ڈاک فسانہ آزاد کا حجم فی اشاعت ایک سو صفحات پر ہوگا۔ یہ جلد غالباً چھ مہینہ میں ختم ہو جائے گی ——— ماہواری ساتھ فسانۂ آزاد بلا قیمت بھی بھیجا جا سکتا ہے۔

جن مشتریان یا نکین اودھ اخبار نے دسمبر ۱۸۸۱ء تک کی قیمت اخبار پیشگی ادا کر دی ہے یا آئندہ دسمبر ۱۸۸۱ء تک بیباق کر دیں اور ان کی والا خدمات میں فسانۂ آزاد کی جلد دوم ماہواری اور پھر جلد سوم کا حصّہ بھی بلا قیمت اور بلا معاوضہ منت مطبع کی طرف سے بطریق نذر پیش کیا جائے گا۔ جو رؤسا نامدار اور عمائد و اعیان ملک پچاس روپے سالانہ اصلی قیمت اودھ اخبار مطبع کو اعانت پہونچاتے ہیں اون کی خدمات بابرکات میں بلا انتظار تکمیل شرط مذکورہ بالا فسانہ آزاد بھیجا جائے گا۔

العبد۔ شیو پرشاد مینجر مطبع اودھ اخبار لکھنؤ۔ ۱۲ر اگست ۱۸۸۰ء

مذکورہ عبارت میں جہاں فسانۂ آزاد جلد ثانی طبع ثانی ماہانہ قسط بصورت رسالہ قیمت اور کاروباری رجحان کا اندازہ ہوتا ہے وہاں جلد سوم کی اشاعت کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے اور اس کی مقبولیت کا حال بھی معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس کے پڑھنے کے لیے کس قدر بے چین تھے۔ اور اس کی اس قدر مقبولیت ہی اس کے طبع اوّل و دوم کے ضائع ہونے کا سبب بھی بنی۔ چنانچہ ہندوستان کی کسی لائبریری میں اس کی اشاعت اوّل و دوم کا کوئی مکمل سیٹ نہیں ملتا۔ بعد کے ایڈیشنوں کی جو جلدیں مختلف لائبریریوں میں ملتی ہیں ان میں بھی اکثر و بیشتر مختلف ایڈیشنوں کی جلدوں کو ملا کر ایک سیٹ بنا یا گیا ہے۔ مذکورہ اشتہار کے مطابق وعدہ پورا کیا گیا اور فسانۂ آزاد ماہانہ رسالہ کی صورت میں شائع کیا جانے لگا۔ جلد دوم کے ماہانہ رسالہ کی کوئی کاپی تو نہیں ملتی البتہ جلد سوم کے ۹ رسالے خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ میں موجود ہیں۔ ان رسائل کی تفصیل اس طرح ہے:

فسانۂ آزاد کی جلد ثانی رسالہ نمبر۱ بابت ماہ اپریل ۱۸۸۱ء

〃 〃 〃 نمبر۱۱ 〃 〃 مئی ۱۸۸۱ء صفحات ۳۰۵ تا ۴۰۸

〃 〃 〃 نمبر۱۲ 〃 〃 جون ۱۸۸۱ء صفحات ۴۰۹ تا ۶۱۲

مطبوعہ ماہ جون ۱۸۸۱ء مطبع نولکشور لکھنؤ

〃 〃 〃 نمبر۱۳ 〃 جولائی ۱۸۸۱ء صفحات ۶۱۳ تا ۶۸۴

مطبوعہ ماہ جولائی ۱۸۸۱ء مطبع نولکشور لکھنؤ

〃 〃 〃 نمبر۱۴ 〃 اگست ۱۸۸۱ء صفحات ۶۸۵ تا ۷۴۸

مطبوعہ ماہ اگست ۱۸۸۱ء مطبع نولکشور لکھنؤ

فسانۂ آزاد کی جلد ثانی رسالہ نمبر ۱۵ بابت ماہ ستمبر ۱۸۸۱ء صفحات ۷۹۶ تا ۸۴۳

مطبوعہ ماہ ستمبر ۱۸۸۱ء مطبع نولکشور لکھنؤ

" " " نمبر ۱۶ " اکتوبر ۱۸۸۱ء صفحات ۸۴۴ تا ۹۴۴

مطبوعہ ماہ اکتوبر ۱۸۸۱ء مطبع نولکشور لکھنؤ

" " " نمبر ۱۷ " نومبر ۱۸۸۱ء صفحات ۹۴۵ تا ۱۰۴۸

مطبوعہ ماہ نومبر ۱۸۸۱ء مطبع نولکشور لکھنؤ

" " " نمبر ۱۸ " دسمبر ۱۸۸۱ء صفحات ۱۰۴۹ تا ۱۱۴۸

مطبوعہ ماہ دسمبر ۱۸۸۱ء مطبع نولکشور لکھنؤ

خاتمہ۔ "آخرکار ۱۲ دسمبر ۱۸۸۱ء کو معہ خواجہ بدیعان اور مس میڈا اور مس کلیرسا جہاز پر سوار ہو کر روانہ ہندوستان ہوئے۔" فسانۂ آزاد جلد سوم کے صفحے بھی ۱۱۴۸ ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ جلد سوم کا پہلا رسالہ جنوری ۱۸۸۱ء میں رسالہ نمبر ۷ صفحہ نمبر ا سے شائع ہوا ہوگا اور اس سے قبل چھ رسالے جولائی ۱۸۸۰ء تا دسمبر ۱۸۸۰ء نمبر ا تا ۶ جلد دوم کے شائع ہوئے ہوں گے۔ جیسا کہ اشتہار میں تحریر ہے۔

مذکورہ تفصیل میں "فسانۂ آزاد کی جلد ثانی" بھی تحریر ہے۔ اس جلد ثانی سے مراد طبع ثانی ہے۔ یہاں ایڈیشن کے شمار کا مسئلہ بھی طے ہو جاتا ہے یعنی اودھ اخبار کے ساتھ جو فسانۂ آزاد چھپا ہے اس کو اشاعت اوّل اور ماہانہ رسائل کی صورت میں فسانۂ آزاد کو اشاعت دوم تسلیم کیا گیا ہے۔ رسالہ نمبر ۱۲ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ حصہ پہلی مرتبہ اودھ اخبار کے ساتھ ماہ اپریل ۱۸۷۹ء میں شائع ہوا تھا۔ ان رسائل میں اصل متن بالکل اسی طرح شائع کیا گیا ہے جس طرح وہ اودھ اخبار کے ساتھ بطور ضمیمہ چھپتا تھا۔ ہر چار صفحوں پر قسط ختم ہو جاتی ہے۔ اور آخر میں باقی آئندہ لکھ کر نئے صفحے سے نئی قسط شروع کی گئی ہے۔ قسط کے شروع میں کوئی عنوان نہیں دیا گیا ہے خریداروں کے خطوط بھی ہر قسط کے آخر میں شائع کیے گئے ہیں۔ جلد سوم تیسری مرتبہ رسائل کی صورت میں مارچ ۱۸۸۲ء تا دسمبر ۱۸۸۲ء شائع کی گئی اور اس کی قیمت فی جزو ۳ پیسہ قرار پائی۔ اس کی تصدیق فہرست منشی نولکشور ۳۰ اپریل ۱۸۹۱ء سے ہوتی ہے جو رفاہ عام کلب لکھنؤ کی لائبریری میں موجود ہے۔

۰ ماہواری فروخت کا اعلان۔

بابت جولائی ۱۸۸۰ء تا دسمبر ۱۸۸۱ء (جلد اوّل و دوم کے بارے میں ہے) فسانۂ آزاد جلد ثالث بابت ماہ مارچ ۱۸۸۲ء تا دسمبر ۱۸۸۲ء قیمت فی جزو ۳ پیسہ"

(ص ۴۴ فہرست کتب منشی نولکشور ۳۰ اپریل سنہ ۱۸۹۱ء)

اس کے معنی یہ ہیں کہ مارچ ۱۸۸۲ء سے قبل جلد دوم کے کتابی شکل میں چھاپنے کا انتظام کیا جا چکا تھا۔ جلد چہارم کے ماہانہ

رسائل کسی لائبریری میں نہیں ملے البتہ ایک اشتہار سے جس میں جلد سوم و چہارم کا سائز ۱۸ × ۱۱ دیا گیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جلد چہارم بھی رسائل کی صورت میں شائع کی گئی تھی لیکن کب اور کتنے رسالوں میں شائع ہوئی تھی یہ ہنوز تحقیق طلب ہے۔ اس طرح فسانۂ آزاد کی ابتدائی اشاعت کی تفصیل یہ ہوئی۔

بار اوّل میں فسانۂ آزاد از آغاز تا اختتام اودھ اخبار کے ساتھ چار سفید ورقوں پر ابتدائے دسمبر ۱۸۷۸ء تا دسمبر ۱۸۷۹ء شائع ہوا۔

بار دوم میں جلد اوّل کتابی شکل میں ۱۱ × ۹ کے سائز میں ۱۸۸۰ء میں طبع ہوئی۔

جلد دوم ماہانہ رسائل کی صورت میں جولائی ۱۸۸۰ء تا دسمبر ۱۸۸۰ء شائع ہوئی۔

جلد سوم ماہانہ رسائل کی صورت میں جنوری ۱۸۸۱ء تا دسمبر ۱۸۸۱ء میں شائع ہوئی۔

جلد چہارم ۱۸ × ۱۱ سائز میں طبع ہوئی۔

فسانۂ آزاد جلد اوّل کا تیسرا ایڈیشن ۱۸۹۱ء سے قبل اور چوتھا ایڈیشن ۱۸۹۳ء اور پانچواں ایڈیشن ۱۸۹۸ء میں شائع ہوا۔

جلد دوم کا تیسرا ایڈیشن اکتوبر ۱۸۹۰ء میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔ چوتھا ایڈیشن ۱۹۰۷ء میں مع تقریظ مولانا مولوی حضرت ابو ناظم محمد حامد علی خان حامد شاہ آبادی مطبع نولکشور کانپور سے شائع ہوا۔ پانچویں ایڈیشن کا متن دسمبر ۱۹۲۹ء میں بسرپرستی بشن نرائن اور باہتمام بابو کیسری داس سیٹھ میں چھپا اور سرورق ماہ اکتوبر ۱۹۳۰ء میں لکھنؤ میں طبع ہوا۔

جلد سوم کا تیسرا ایڈیشن ماہانہ رسائل کی صورت میں ۱۸۸۲ء تا دسمبر ۱۸۸۲ء طبع ہوا۔ جلد چہارم کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ۱۸۹۱ء کی اسی فہرست سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک جلد اوّل و دوم تو کتابی شکل میں چھپ گئی تھیں اور جلد سوم و چہارم کا کتابی شکل میں اس وقت تک شائع ہونے کا انتظام نہیں ہوا تھا۔ البتہ جلد چہارم کا چوتھا ایڈیشن جنوری ۱۸۹۹ء مطبع نولکشور کانپور سے شائع ہوا۔ کتابی شکل میں فسانۂ آزاد کا سائز ۹ × ۱۱ اور رسائل کا سائز ۱۸ × ۱۱ تھا۔ اس بیان کی تصدیق اس فہرست سے بھی ہوتی ہے جس میں سائز دیا گیا ہے۔

" فسانہ آزاد جلد اوّل و دوم ۱۱ × ۹

فسانہ آزاد جلد سوم و چہارم ۱۸ × ۱۱ "

(ص ۴۵ فہرست کتب منشی نولکشور لکھنؤ ۔ ۳۰ راپریل ۱۸۹۱ء)

یہاں یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ ممکن ہے کہ جلد سوم و چہارم اپریل ۱۸۹۱ء سے قبل کتابی شکل میں چھپی ہو اور اس کا سائز ۱۸ × ۱۱ رکھا گیا ہو۔ لیکن اس خیال کو تقویت اس لیے نہیں پہنچتی کہ جب جلد اول و دوم ۱۱ × ۹ کے سائز میں طبع کرائی گئی تھیں تو پھر کوئی وجہ نہیں تھی کہ جلد سوم و چہارم کو بھی اسی سائز میں نہ چھپوایا جاتا۔ اس لیے یہ خیال ہی زیادہ قرین قیاس ہے کہ ۱۸۹۱ء تک یہ رسائل کی ہی شکل میں طبع ہوئی تھیں۔

اس کے بعد فسانۂ آزاد کے صرف ایک ایڈیشن کے علاوہ باقی ایڈیشن ۱۱ × ۹ کے سائز میں شائع ہوتے رہے ہیں جن کا مسطر ۲۵ سطری ہے۔ اس درمیانی ایڈیشن کا سائز بانگ درا والا یعنی ۶½ × ۸ ہے یہ اشاعت جو ہارڈنگ لائبریری دہلی میں موجود ہے لیکن ناقص الطرفین ہے اس کے سنہ اشاعت اور مطبع کا نام معلوم نہیں ہوسکا۔ فسانۂ آزاد کی طباعت و فروخت اس طرح نہیں ہوئی کہ اس کی جلد اوّل تا چہارم ایک ساتھ چھپ گئی ہوں اور ان کا مکمل سیٹ ہی فروخت کیا گیا ہو بلکہ اس کے مختلف حصّے مختلف اوقات میں خریداروں کی ضرورت اور مطبع کی سہولت کے مطابق چھپتے رہے ہیں۔ اس کا کوئی بھی ایڈیشن مکمل ایک سال میں نہیں چھپا۔ اس کی طباعت میں کم از کم دو سال لگے ہیں۔ مطبع نولکشور لکھنؤ سے اس کے نو ایڈیشن شائع ہوئے۔ آخری ایڈیشن کی جلد اوّل کا متن نومبر ۱۹۴۸ء اور سرورق ۱۹۲۹ء کا طبع شدہ ہے۔ پھر اس کے ساتھ دلچسپ لطیفہ یہ بھی رہا ہے کہ اصل متن اور سرورق کے سن طباعت میں اختلاف ہے اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ عموماً سرورق بعد میں ہی چھپتا ہے اور دو چار مہینوں کا فصل ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن سالوں کے فرق کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا پھر اصل متن کے ایڈیشن اور سرورق کے ایڈیشن میں بھی اختلاف ہو تو کیا کہا جائے۔ مثلاً فسانۂ آزاد جلد چہارم کا ایک نسخہ جو میری لائبریری میں موجود ہے۔ اس کے خاتمۃ الطبع کی عبارت یہ ہے:

"فسانۂ آزاد کا دفتر چہارم . . . . . . منشی نول کشور واقع لکھنؤ میں بسر پرستی عالی جناب معلی القاب بشن نرائن صاحب بھارگو دام اقبالہ مالک مطبع بماہ مئی ۱۹۲۶ء بار ششم باہتمام سیٹھ کیسری داس منیجر مطبع زیور سے آراستہ ہو کر مطبوعہ طبائع خاص و عام ہوا۔"

اور سرورق کی عبارت یہ ہے:

"فسانۂ آزاد جلد چہارم ——— اودھ اخبار میں سن ابتدائے دسمبر ۱۸۷۸ء لغایت دسمبر ۱۸۷۹ء شائع ہوتا رہا۔ اس کے بعد سے اب تک بسبب ہردلعزیزی بحیثیت کتابی چار جلدوں میں سات مرتبہ طبع و شائع ہو چکا ہے اب حسب الحکم منشی بشن نرائن صاحب بھارگو مالک مطبع باہتمام سیٹھ کیسری داس سپرنٹنڈنٹ بار ہشتم مطبع منشی نول کشور لکھنؤ میں چھپا اور شائع ہوا۔ ۱۹۲۶ء"

مذکورہ اقتباس سے ظاہر ہے کہ اصل متن چھٹے ایڈیشن کا ہے اور سرورق آٹھویں ایڈیشن کا ہے۔ مزید دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ دونوں ایک ہی سال میں طبع ہوئے ہیں۔

اسی طرح جلد سوم جو حال ہی میں مطبع نولکشور لکھنؤ سے خریدی گئی ہے وہ ماہ اکتوبر ۱۹۳۵ء کا ساتواں ایڈیشن ہے لیکن سرورق ماہ نومبر ۱۹۱۶ء بار چہارم کا ہے۔ اب ان حصّوں کے ایڈیشنوں کا بُعد بھی ملاحظہ فرمائیے۔ جلد اوّل بار پنجم دسمبر ۱۸۹۸ء کی طبع شدہ ہے اور جلد دوم بار پنجم دسمبر ۱۹۲۹ء سرورق اکتوبر ۱۹۳۰ء کا ہے یعنی جلد اوّل کے پانچویں

اور جلد دوم کے پانچویں ایڈیشن میں تقریباً ۳۱ سال کا فرق ہے۔

منشی نولکشور کے انتقال کے بعد ان کا ترکہ ورثا میں تقسیم ہو گیا تھا۔ فسانۂ آزاد کے حقوق بھی دونوں وارثوں کے حصّہ میں آئے اب ایک کے بجائے دو مطبع ہو گئے۔ ایک کا نام تو وہی رہا دُوسرے کا نام مطبع تیج کمار قرار پایا۔ چنانچہ اس دُوسرے مطبع سے بھی اس کے سات ایڈیشن شائع ہوئے۔ پہلا ایڈیشن کب شائع ہوا یہ تو معلوم نہیں ہو سکا البتہ اس کا آخری ایڈیشن ۱۹۵۲ء میں یا اس کے بعد تمام ہوا۔ میرے پاس فسانۂ آزاد جلد دوم مطبوعہ منشی تیج کمار لکھنؤ کی جو جلد ہے اس میں بھی وُہی بے قاعدگی پائی جاتی ہے جو نولکشور کے یہاں ہے۔ یعنی اس جلد کا اصل متن دسمبر ۱۹۲۹ء کا طبع شدہ ہے۔ ایڈیشن تحریر نہیں ہے اور سرورق بار ہفتم فروری ۱۹۵۲ء کا ہے اس جلد کا اصل متن بہ سرپرستی منشی بشن نرائن صاحب مالک مطبع نولکشور بہ اہتمام بابو کبیری داس صاحب سیٹھ سپرنٹنڈنٹ مطبع بعد تصحیح تمام شائع ہوا ہے اور آخر میں "حق تصنیف اس افسانہ آزاد جلد دوم کا بحق مطبع نولکشور محفوظ ہے۔ (مینجر مطبع نولکشور صیغہ بک ڈپو لکھنؤ)"۔ یہاں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ترکہ کی تقسیم کے وقت فسانۂ آزاد کی مطبوعہ جلدیں بھی دونوں کے حصّہ میں آئی ہوں گی اور دونوں نے اپنا اپنا سرورق لگا کر فروخت کی ہوں گی لیکن ایسا نہیں ہے کیونکہ فسانۂ آزاد جلد دوم جو مطبع نولکشور کے یہاں کی ہے اور دسمبر ۱۹۲۹ء کی طبع شدہ ہے اس پر ایڈیشن بار پنجم لکھا ہوا ہے لیکن منشی تیج کمار والی جلد میں ایڈیشن تحریر نہیں۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ فسانۂ آزاد کا اصل متن مطبع نولکشور میں چھپوایا کرتے تھے اور سرورق ان کے اپنے یہاں چھپتا تھا ان دونوں جگہ سے فسانۂ آزاد کے ۱۶ ایڈیشن شائع ہوئے۔ مذکورہ بالا تضاد کی موجودگی میں اس کے جملہ ایڈیشنوں کے بارے میں کوئی واضح بات آسانی سے نہیں کہی جا سکتی۔

فسانۂ آزاد کا ایک ایڈیشن پاکٹ سائز میں راجہ رام کمار پریس مالک مطبع نولکشور نے ۱۹۶۱ء میں شائع کرنا شروع کیا تھا لیکن اس کی صرف ایک سیری نکل کر رہ گئی — اسی کا ایک ایڈیشن ۱۸۸۲ء میں مطبع ریاض الاخبار، گورکھپور سے بھی شائع ہوا تھا اس کی تین جلدیں اوّل تا سوم سبحان اللہ اورینٹل لائبریری میں موجود ہیں اور یہ ذخیرہ کتب اب مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ میں آ گیا ہے۔ فسانۂ آزاد کی تلخیص روحِ فسانۂ آزاد کے نام سے ابو تمیم نے کی تھی جو مارچ ۱۹۵۴ء طبع ہوئی ہے۔ ناگری رسم الخط میں اس کی تلخیص جو تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے۔ سرسوتی پریس بنارس نے ۱۹۴۷ء میں شائع کرائی تھی۔

رنگے سیار کو اکثر لوگوں نے سرشار کی الگ تصنیف بتایا ہے یہ کوئی علیحدہ تصنیف نہیں ہے بلکہ مطبع نولکشور والوں نے فسانۂ آزاد کے اشتہار کے لیے فسانۂ آزاد جلد اوّل کا پانچواں قصہ صفحہ ۱۸ تا ۲۱ اخذ کر کے ایک کتابچہ کی صورت میں شائع کیا تھا جس کا سنہ طباعت غالباً ۱۹۰۳ء ہے اسی طرح ڈاکٹر احسن فاروقی نے خوجی سے متعلق قصّہ فسانۂ آزاد سے اخذ کر کے بعنوان "خوجی" کتابی صورت میں ۱۹۵۲ء میں راجہ رام کمار پریس لکھنؤ (وارث نولکشور پریس) سے شائع کرایا تھا۔

فسانۂ آزاد کے یہ ایڈیشن کتنی تعداد میں چھپتے تھے اس کا کوئی ریکارڈ نہیں ملتا کیونکہ تعداد اشاعت تحریر نہیں ہے ممکن ہے کہ مطبع نولکشور کے آفس ریکارڈ سے اس کے بارے میں کوئی معلومات فراہم ہو سکے لیکن مجھے یقین ہے کہ اس کے تمام ایڈیشنوں کے مکمل سیٹ وہاں بھی موجود نہ ہوں گے فسانۂ آزاد کل ۳۳۴۴ صفحات پر مشتمل ہے جس کی تقسیم اس طرح ہے —

جلد اوّل ۶۷۲، جلد دوم ۲۴۴۲، سوم ۱۱۴۸، چہارم ۱۰۷۲ (کل صفحات ۳۳۴۴) ماہانہ رسائل میں بھی اسی تقسیم کو برقرار رکھا گیا ہے۔ جلد اوّل میں میاں آزاد کی ہرزہ گشتی۔ خوجی سے ملاقات۔ حسن آرا سے معاشقہ۔ سپہر آرا اور ہمایوں سے ملاقات۔ حسن آرا کا آزاد کو جنگ ترکی و رُوس میں شرکت اور اہلِ اسلام کی مدد کے لیے آمادہ کرنا۔ اور آزاد و خوجی کا ترکی کے لیے روانہ ہونے تک کا حال درج ہے۔ جلد دوم میں آزاد کے لکھنؤ سے بمبئی اور بمبئی سے ترکی و رُوس کے سفر کے حالات اور جنگ میں شرکت تک کے حالات ہیں۔ جلد سوم میں جنگ ترکی و روس کے واقعات، آزاد کی معرکہ آرائیاں، خوجی کے کارنامے، آزاد و حسن آرا کی بے چینی۔ ہمایوں فر کا قتل اور اس کے بھائی کا واپس آنا۔ اور میاں آزاد کا قید ہونا، رہائی پانا، شادی کرنا اور آخر ہندوستان کو روانہ ہونے تک کے حالات و واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ اس جلد میں میاں آزاد ہندوستان سے باہر رہے ہیں — جلد چہارم میں آزاد کا فتح یاب ہو کر وارد ہندوستان ہونا۔ شادی۔ آزاد کی اصلاحی کوششیں۔ اولاد کی پیدائش تک حالات ہیں۔ اگر ضمنی قصوں کو نظر انداز کر دیا جائے تو یہ تقسیم کسی حد تک منطقی ہے اس میں ابتدا و ارتقا عروج اور اختتام کا احساس پایا جاتا ہے۔

اگست ۱۸۸۱ء میں فسانۂ آزاد جلد اوّل کی قیمت کے بارے میں جیسا کہ اوپر تحریر کیا جا چکا ہے۔ قسم اوّل کاغذ ولایتی چار روپیہ اور قسم دوم سفید رسمی تین روپے تھی۔ رسائل کی قیمت مقامی خریداروں کے لیے ۸ آنہ فی رسالہ بیرونی خریداروں کے لیے ۱۰ آنہ فی رسالہ تھی۔ ۱۸۹۱ء میں جلد دوم و سوم تین پیسہ فی جز کے حساب سے فروخت ہوتا تھا۔ جلد پر کوئی قیمت تحریر نہیں ہوتی تھی بلکہ فہرست و اشتہار کے مطابق وصول کی جاتی تھی۔ مختلف اوقات میں اس کی مختلف قیمتیں رہی ہیں۔ فہرست کتب راجہ رام کمار بک ڈپو، وارث نولکشور بک ڈپو ۱۹۶۵ء کے مطابق جلد اوّل کی قیمت پندرہ روپے، دوم دس روپے، سوم و چہارم بیس بیس روپے تھی اور منشی تیج کمار بک ڈپو کی حالیہ فہرست کے مطابق اس کی جلد اوّل آٹھ روپے، دوم پانچ روپے، سوم چھ روپے، چہارم زیر طبع۔ آج کل فسانۂ آزاد کا مکمل سیٹ کمیاب ہے۔ مختلف ایڈیشنوں کے حصّے ملا کر سیٹ بنائے جاتے ہیں۔ مکمل سیٹ کی قیمت عموماً ۸۰ سے ۱۰۰ روپے تک ہے۔ مذکورہ بک ڈپو میں جلد دوم و سوم اور آخر الذکر میں جلد سوم آسانی سے مل جاتی ہیں۔

فسانۂ آزاد کے متن میں تصحیح کا کام بھی ہوتا رہا ہے۔ کتابت کی غلطیوں میں اضافہ و کمی بھی ہوئی ہوگی۔ اس

مختصر مضمون میں اختلافات سے بحث نہیں کی گئی ہے اگر تمام ایڈیشنوں کا مقابلہ کیا جائے تو متن میں کافی اختلاف مل جائیں گے۔ چنانچہ اس بات کی ضرورت ہے کہ کوئی اہلِ ذوق اس کام کا بیڑا اٹھائے اور اس کے نقشِ اوّل کے متن سے مقابلہ کر کے ایک صحیح ایڈیشن شائع کرایا جائے۔ نیز اس زمانہ کا اودھ اخبار بھی کتابی شکل میں شائع کرایا جائے تاکہ اس کی روشنی میں اُردو ادب کے اس عظیم شاہکار کو سمجھنے اور اس کا تجزیہ کرنے میں آسانی ہو۔

——— —

جدید افسانے کا ذہنی سفر

دیوندر اسّر

جدید افسانے کا اگر سب سے بڑا کوئی کارنامہ ہے تو یہ کہ اس نے انسان کے آزاد اور ذاتی وجود کو ہر طرح کی جبریت کے خلاف ادب میں مستقل حیثیت عطا کی۔ اس کا فخر ایک ایسے فلسفے کر ہے جو فلسفے کی رُو سے ہی نہیں بلکہ اس سے باہر ادبی فکر کے رُوپ میں بھی کافی مشہور رہے۔ یہ فلسفہ ہے وجودیت کا۔ وجودیت پرستی نے جہاں زندگی کے بے معنی ہونے کے تصوّر کو ادب کا مرکزی موضوع بنانے کی کوشش کی ہے وہاں انسان کے ارادے اور عمل کی آزادی کی قدر کو بھی قبول کیا ہے۔

جدید افسانہ آدمی کو ایک وی۔ آئی۔ پی کی حیثیت سے تسلیم کرتا ہے اور فطرت پرست نقطۂ نظر کے خلاف شخصیت کے پیچیدہ اور پوشیدہ محرکات اور محسوسات کی عکاسی کرنے میں کافی حد تک کامیاب ثابت ہُوا ہے۔ اِس میں شک نہیں کہ فرائیڈ نے انسان کے دل کی گہرائیوں میں جھانک کر اُس کے لاشعور کا تجزیہ کر کے افسانے میں عمیق کردار نگاری کو زیادہ مقبول بنایا ہے۔ لیکن اپنے آخری تجزیہ میں فرائیڈ نے انسان کو اپنی لاشعوری محرومیوں بچپن کے کامپلکس اور اندھی جبلتوں کا نابینا غلام بنا دیا اور اس طرح انسان سے اُس کے انتخاب ارادے اور عمل کی آزادی، اخلاقی نظر اور جمالیاتی لذّت چھین کر اُسے عدم اقدار کے گہرے خلا میں پھینک دیا۔

فرائیڈ کے نظریات نے جہاں انسان کو سماج اور تہذیب کے خلاف بلند رُتبہ دیا۔ وہاں انجام کار اُسے نفسیاتی جبریت کا حقیر شکار بھی بنا دیا۔ فرائیڈ کے نظریات نے نئی طرح کی حقیقت نگاری کو جنم دیا۔ نفسیاتی حقیقت نگاری جسے عمیق حقیقت نگاری بھی کہا جاتا ہے۔ حالانکہ فرائیڈ کے نظریات کی اشاعت سے قبل بھی فطرت نگاری اور حقیقت پرستی کے رُجحانات افسانے میں غالب رہے ہیں۔ لیکن اُن میں نفسیات کے سائینٹفک تجزیے اور لاشعور کے نظریے کی اہمیت نہیں تھی۔ فرائیڈ نے نفسیاتی حقیقت نگاری کو ہی نہیں سالزم اور خواب کی علامتوں پر مبنی سرریلزم کی بھی ترویج کی جو نفسیاتی حقیقت نگاری کا ہی نمونہ قرار دی جائے گی۔

فرائیڈ کے زیرِ اثر نفسیاتی حقیقت نگاری بھی جبریت کے نظریے کا شکار ہو گئی۔ دراصل حقیقت پرستی کے ہر رُوپ میں جبریت کا یہ نظریہ ضرور کار فرما رہا ہے۔ چاہے وہ فطرت نگاری ہو یا مارکس کی سماجی حقیقت نگاری، فطرت نگاری، حیاتیات، فلسفے، نفسیات، سماجیات اور سائنس میں رواج پانے والے جبریت کے نظریے کی پروردہ ہے۔ فطرت نگاری آدمی اور اُس کی دُنیا کی ڈاکومنٹری یا سائنٹفک رپورٹ پیش کرنے کا دعوےٰ کرتی ہے۔ اِس میں کسی اخلاقی پہلو یا آدرش کو دخل نہیں۔ یہ حقیقت کو بے لاگ خارجیت سے پیش کرتی ہے۔" اِن زندگی کے ٹکڑے" قسم کے افسانوں میں ایک

خاص قسم کا تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جو زندگی کے قنوطی اور تاریک پہلو کو عیاں کرتا ہے۔ اس رجحان کے تحت چھوٹی چھوٹی جزئیات اور روزمرہ کی معمولی تفصیلات کو نہایت باریک بینی سے پیش کرنا فن کا معراج ٹھہرایا جانے لگا۔ فطرت نگاری میں زندگی کی ہوبہو عکاسی کو اہمیت حاصل ہے۔ زندگی اپنے وسیع اور پیچیدہ دائرے سے نکل کر تجربہ گاہوں میں خوردبین کے ذریعے معائنہ کیے جانے والا کیس (C A S E) بن گئی۔ فطرت نگاری زندگی کے بارے میں میکانکی طرزِ فکر اور جبریت کو قبول کرتی ہے۔

لیکن دُوسری طرف ایسے فطرت نگار افسانہ نگار بھی ہیں جو سماجی ناانصافی کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں۔ ان افسانوں میں جمالیاتی پہلو پر کم انسانی اپیل اور پرچار پر زیادہ زور دیا گیا۔ بعض حقیقت نگار افسانہ نگاروں کا خیال ہے کہ انسان ماحول اور وراثت سے صرف اثر ہی قبول نہیں کرتا بلکہ اُس کا کردار بھی اُن سے متعین ہوتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہُوا کہ آدمی کے کردار کا اُس کی منزل سے کوئی تعلق نہیں۔ اس طرح کردار کی عظمت اور ٹریجڈی کے امکانات ختم ہو گئے۔ ان میں انسانی ذہن کی پیچیدگی نہیں ملتی۔ بلکہ مکمل سیاہ اور مکمل سفید کردار ملتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کچھ فطرت نگاروں نے انسانی رُوح میں جھانکنے کی کوشش کی۔ انھوں نے موت، درد، خیر و شر کے مسائل کو سماجی پس منظر میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ فرد کے سماجی اور معاشی پس منظر پر سب سے زیادہ زور مارکسیت نے دیا ہے۔ بہت سے افسانہ نگار مارکسیت سے براہِ راست متاثر ہوئے ہیں۔ مارکسیت نفسیاتی جبریت کے مقابلے میں مادی جبریت کا فلسفہ ہے۔ مارکسزم نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ حقیقت دراصل سماجی حقیقت ہوتی ہے، فرد کی حیثیت ثانوی ہے۔ اس میں طبقاتی کشمکش کو اہمیت دی گئی۔ انسان کی اخلاقی ذمہ داری کے بجائے سماجی جبر اور ارادے کی آزادی کے بجائے معاشی اور تواریخی جبریت کو مارکسزم نے ادب میں رائج کیا۔ ترقی پسند تحریک اسی نظریے کے تحت عروج پائی۔ مارکس نے طبقاتی کشمکش پر مبنی سماج اور استحصال اور معاشی خرابیوں میں جکڑے انسان کو ایک عدم طبقاتی خوشحال سماج میں آزاد زندگی بسر کرنے کا یقین دلایا تھا۔ لیکن جلد ہی ادیبوں نے یہ محسوس کیا کہ آزادی کا یہ نعرہ ایک پارٹی اور پھر ایک شخص کی آمریت کی دہشت میں بدل گیا۔ ادب میں مارکس کے نظریات نے سماجی حقیقت نگاری کے رجحان کو رائج کیا۔

لیکن فرائیڈ کے نظریات کا اتنا گہرا اثر پڑا کہ ادب کے نظریے میں ہی نہیں تکنیک اور اسٹائل میں بھی تبدیلی آ گئی۔ اور آج فرائیڈ کے نفسیاتی جبریت کو تسلیم نہ کرتے ہُوئے بھی جنس اور لاشعور کی اہمیت سے اِنکار ممکن نہیں۔ کہانی ارسطو کی زمان مکان اور تاثر کی تثلیث سے جو چھٹکارا حاصل کر گئی اُس کا بہت کچھ صلہ فرائیڈ کو ہی ملتا ہے۔ جدید افسانہ جہاں البیر ٹیفی لغویت کے فلسفے سے متاثر ہُوا ہے۔ تکنیک اور اسٹائل میں شعور کے بہاؤ کے نظریے کو بھی اپنے اندر جذب کیے ہوئے ہے۔

شعور کے بہاؤ کی تکنیک کے تحت لکھنے والا ادیب بنیادی طور پر وقت کے داخلی اور فلسفیاتی نوعیت کو پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔ اُن کی تحریروں میں برگساں کے اثر کے تحت افسانے میں وقت کے شعور کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس

نظریے کی رُو سے ماضی اور حال میں کوئی حدِ فاصل نہیں رہ گئی اور وقت ماضی حال اور مستقبل کے دائروں میں مستقل طور پر تقسیم نہیں رہتا۔ جیسا کہ خارجی یا تصوراتی وقت کے نظریے کا تقاضہ ہے۔ وقت کا تسلسل اس طرح ضروری نہیں۔ ماضی حال اور مستقبل۔ یہ سب کچھ اضافی ہے۔ وحدتِ مکان و زماں کے نظریے کو اب تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اب برسوں کے واقعات، تاثرات اور یادداشتیں لمحوں میں سمٹ آتے ہیں۔ اس لیے اگر اہم ہے تو وہ لمحہ جو عمل پذیر تجربات سے پکڑ میں لایا جاتا ہے۔ "ہم لمحہ کو حاصل کرنے کے لیے تسلسل سے فرار کرتے ہیں اور لمحے سے اپنے آپ کو تسلسل میں کھو دیتے ہیں۔" جدید افسانے میں لمحے کی عکاسی کو جو اہمیت حاصل ہوئی ہے اُس میں وقت کے اسی فلسفے اور نفسیاتی پہلو کا بڑا اہم رول ہے۔ افسانہ اب جسم کا سفر پیش نہیں کرتا بلکہ ذہن کے سفر کا پراثر ذریعہ بن گیا ہے۔

ولیم جیمز، کارل ژونگ اور فرائیڈ کے نظریات میں وقت کے شعور کی اہمیت موجود ہے۔ جب وہ لاشعور کی گہرائیوں میں ڈوب کر انسان کے اصلی کردار کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خاص طور پر ژونگ کے اجتماعی لاشعور کا نظریہ وقت کے اسی نظریے کی روشنی میں سمجھا جا سکتا ہے۔ اجتماعی لاشعور نوعِ انسانی کا مشترکہ لاشعور ہے۔ ژونگ کا آرکی ٹائپ کا نظریہ نوعِ انسانی کے لاشعور کو واضح کرتا ہے۔ جس کے باعث ادب میں کردار نگاری کی نئی راہیں وا ہوئی ہیں۔ کردار نگاری کی نئی تکنیک میں تمثیل، خاص طور پر خواب کی تمثیلات، داخلی ہم کلامی، خود حرکی تحریریں، شعور کا بہاؤ، سرریلزم، اور تحلیلِ نفسی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

اگرچہ موجودہ افسانے پر فرائیڈ کا اثر غالب نہیں رہا۔ لیکن اِن ماہرینِ نفسیات نے ادب میں کردار کے عمیق مطالعے پیش کرنے کی تحریک کو مستحکم کر دیا ہے۔ حالانکہ موجودہ افسانوں کو پڑھ کر کچھ نقادوں کی رائے ہے کہ اِن کرداروں کا تجزیہ ژونگ یا فرائیڈ کے نظریات سے نہیں بلکہ ایڈلر کے نظریات کے تحت ہی ممکن ہے۔ انٹی ہیرو (ANTI - HERO) احساسِ کمتری کا پروردہ ہے۔ کچھ بھی ہو افسانوی کردار کے زوال کا باعث بھی یہی ہے کہ کوئی بھی آدمی ماہرِ نفسیات کے سامنے ہیرو نہیں رہ جاتا۔ افسانے میں کردار کی اگر تحلیلِ نفسی شامل ہو تو اُس کا ہیرو پن تو ختم ہو ہی جائے گا۔ آج افسانے میں اسی انٹی ہیرو کا رواج ہے۔ جلا وطن، اکیلا، کجرو، بے یار و مددگار اور ضمیر سے عاری۔ اپنی گم شدہ ذات کی تلاش میں بھٹکتا ہوا۔

دُوسری جنگِ عظیم کے بعد ادب میں ایک بڑا انقلاب رُونما ہوا۔ بہت سے ادیب مارکسزم سے انحراف کر بیٹھے تھے۔ اس ازالہ سحر کا اثر اتنا ہمہ گیر اور گہرا ہوا کہ یورپ میں ادیب نئے فلسفہ کا سہارا ڈھونڈنے لگے۔ سب سے بڑا حملہ جبریت کے نظریے کے خلاف تھا۔ آلڈس ہکسلے، کرسٹوفر اشروڈ اور آرتھر کوئسلر نے روحانیت میں پناہ لی۔ لیکن سارتر اور کامو اور دُوسرے ادیب وجودیت پرست کے مفسّر بن گئے۔ اُنھوں نے آدمی کی ذمہ داری اس کے کندھوں پر ڈال دی۔

وجودیت پرست افسانہ نگار انسان کو مشیت یا خُدا کی رضا کا پرزہ یا غلام نہیں مانتے اور نہ ہی مقدّر کو تسلیم کرتے ہیں۔ کیرک گارڈ کا خیال ہے کہ ہماری دُنیا رُجحانات یا خیالات کی نہیں انسانوں کی ہے۔ اُن میں ہر ایک اپنے لیے اور دُوسروں کے لیے ایک اسرار ہے۔ اُن کے نزدیک انسان کا خُدا سے رشتہ بڑا اہم ہے۔ عقل، خدا کے وجود اور اُس

کی اچھائی کو ثابت کرنے سے قاصر ہے۔ یقین اندھیرے میں چھلانگ ہے۔ کافکا کے افسانوی ادب میں بھی وجودیت پرست رجحانات ملتے ہیں۔ کیا کوئی آخری قوت ہے اور اگر ہے تو کیا وہ انصاف پر مبنی ہے۔ اگر خدا نہیں تو پھر ہر فرد کو اپنے لیے خود ہی انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ ہر انتخاب جو فرد کرتا ہے وہ نوعِ انسانی کے لیے بھی ہوتا ہے۔ اس لیے اس پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ افسانوی ادب میں یہ نیا رجحان غالب رجحان ہے کیونکہ اس نے ہمارے عہد کی جذباتی مایوسی کو آواز عطا کی ہے۔

افسانوی ادب میں یہ رجحان ایک دُوسری سطح پر اینگری ینگ مین اور بیٹس (Beats) کی تحریروں میں نمایاں ہوا ہے۔ اینگری ینگ مین موجودہ سماج کی اقدار سے منکر ہیں۔ وہ انسانی خلوص کے شاکی ہیں۔ وہ باغی ہیں لیکن اُن کا کوئی آدرش نہیں۔ وہ برہم ہیں لیکن کسی سے ہمدردی کے باعث نہیں۔ 'آؤٹ سائڈر' روحانی طور پر مزاجی سماج میں ایک باغی رُوح ہے کولن ولسن فوق البشر کی تلاش میں مذہبی احیا کا نظریہ بھی پیش کر چکا ہے اور اپنی نئی کتاب Beyond the New Existentialism میں وجودیت پرست فلسفے کو انسانیت پرست اور رجائیت پرست نظریے کا رُوپ دینے میں کامیاب ہُوا ہے۔

اخلاقی غیر یقینی صُورتِ حالات کے باعث ادیب حقیقت کے زیادہ قریب ہو گیا ہے۔ کیونکہ وہ کسی مطلق قوت یا قدر سے بندھا ہُوا نہیں۔ بیٹس ادیب اِسی اخلاقی خلا کے تحت ہر قسم کے رواج اور اقدار کے خلاف ہیں وہ 'Square' اور Other Directed لوگوں کے خلاف ہیں۔ جن سے یہ دُنیا بھری پڑی ہے۔ اور جو اس تکنیکی دُنیا سے اپنے آپ کو ہم کنار کر رہے ہیں۔ وہ Shock Treatment کے قائل ہیں۔ وہ سنسنی پھیلانا چاہتے ہیں۔ وہ تنظیم کے خلاف ہیں خلفشار کے پرستار ہیں۔ جنس، تشدّد، جاز، کاروں کی برق رفتاری، خام تجربہ، اور ماری ہونا کا نشہ۔ ہر وہ چیز جو ہیجان انگیز ہو اُن کو عزیز ہے۔ وہ ایسے افسانے نہیں لکھتے۔ جو نقطۂ عروج کی طرف بڑھتے ہیں (جن میں وہ اس نقطۂ عروج کے قائل ہیں)۔ وہ تکنیک کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اُن کے افسانے غیر منظم، بے ربط اور بے ترتیب ہوتے ہیں۔

اِسی طرزِ فکر نے Absurd یا لغویت کے ادب کو جنم دیا ہے جو اینٹی تھیٹر کے ساتھ ساتھ اینٹی افسانے کو بھی رائج کر رہی ہے۔ لغویت کا نظریہ روایتی طرزِ فکر اور اندازِ تحریر سے بغاوت ہے۔ یہ افسانہ نگار حقیقت کو زمان و مکان سے ماورا پیش کرتے ہیں اس لیے اِن میں تجریدی طرز کا امتزاج ناگزیر ہے۔ اور اسرار کا پردہ حقیقت پر حاوی رہتا ہے۔ وہ ہر لحظہ نئی حقیقت کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ انسان کے مستقبل میں انھیں کوئی خوش فہمی نہیں۔ بلکہ اُس کا خیال ہے کہ موجودہ صُورتِ حال انتہائی مضحکہ خیز ہے۔ لیکن اِس میں کوئی تبدیلی ممکن نہیں۔ اِس لیے ان کے افسانوں میں مایوسی، تلخی، اور جارحانہ ذہنیت اور مضحکہ خیز واقعات کی جھلک ملتی ہے۔ وہ زندگی اور سماج کا مذاق اڑاتے ہیں اور غصّے بھرے فتوے دیتے ہیں۔ وہ جہالت، میکانکی تہذیب، مروجہ روایتی اصول زندگی، دقیانوسی فکر، رسمی باتوں، جھوٹ، مکر و فریب اور منافقت، سیاسی پینترے بازی اور الفاظ کی شعبدہ بازی کے خلاف ہیں۔ اُن کا ادب جدید دور کی زندگی، انحطاطی تہذیب اور اُس کے پیچیدہ مسائل سے پروردہ ہے۔ اُن کے نزدیک تمام اقدار کا بھرم کھُل چکا ہے اور کوئی ایسا نصب العین نہیں جس سے

لیے جد و جہد کی جائے۔ انقلاب اور اصلاح کے نعرے بے کار ہیں۔ انسان بنیادی طور پر گمرہی اور الجھنوں کا شکار ہے پرانی روایات مر چکی ہیں۔ ہم موجودہ فکر کے خلاف ایک نفرت انگیز پروٹسٹ کر سکتے ہیں۔ لیکن اُسے بدل نہیں سکتے۔ یہ ذہنیت اُن ہی حالات کی پروردہ ہے جس نے اینگری ینگ مین اور بیٹلس کو جنم دیا ہے۔

جدید افسانے میں انسان کو ایک فرد کی حیثیت سے قابل سمجھا جا رہا ہے۔ اس میں فطرت پرست نقطۂ نظر کے خلاف شخصیت کے پیچیدہ اور پوشیدہ عناصر کو سمجھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ جس کے باعث سماجی حقیقت نگاری کو زیادہ اہمیت حاصل نہیں رہی اور اسی باعث فرائیڈ کا نظریہ بھی قابلِ قبول نہیں رہا۔ یہ دونوں نظریات فلسفہ، جبریت کے حامل ہیں۔ جدید افسانے میں انفرادی احساسات اور ردِ عمل کو نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ انفرادی عمل، ارادے کی آزادی، اخلاقی ذمہ داری اور شخصیت کے نقطۂ نظر کو افسانے میں پیش کیا جا رہا ہے۔ نئے افسانے کے کردار مثال میں منفرد ہیں۔ اس میں فن، شخصیت اور نقطۂ نظر کی آمیزش ملتی ہے۔ یہی باعث ہے کہ موجودہ افسانوی ادب میں بہت سی تحریکیں وجودیت کے فلسفے سے متاثر ہیں۔

جدید افسانہ نئے ذہن کا عکاس ہے۔ یہ دَور سائنس کا دور ہے، سائنس کی دریافتیں، فطرت اور کائنات کے اسرار کو عیاں کر رہی ہیں۔ لیکن انسان کی رُوح ابھی تشنہ ہے۔ غم زدہ ہے، شدید تنہائی اور محرومی کا شکار ہے۔ خواہشِ مرگ نت نئے رُوپ بدل بدل کر سامنے آ رہی ہے۔ زندگی ایک مستقل آلام اور خطرے میں مُبتلا ہے۔ مبہم اور غیر مبہم خوف کا شکار، ہر لمحہ نابود ہونے، بھک سے اُڑ جانے کا خطرہ، آرگنائزیشن مین، جلاوطنی، فرد کی شخصیت کے فنا ہونے کا عمل، ذات کا سرائیسس، اخلاقی خلا، سیاسی شعبدہ بازی، معاشی پھیلاؤ اور تصادم، عدم یقین، تشکیک، ذہنی تذبذب، انسان کی داخلی اور خارجی زندگی میں انقلاب رُونما ہو رہے ہیں اور جدید افسانہ اس مکمل حقیقت کے مختلف پہلوؤں کو منفرد حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

دراصل جدید افسانہ، اُس گناہ کے بوجھ اُٹھانے پر مجبور ہے جو اُس کے کرداروں نے کیا نہیں اور یہی درد لئے منزل منزل بھٹک رہا ہے جس کا نہ کوئی آغاز ہے نہ انجام ——————"

———————

نظم

جوش ملیح آبادی

بلبل با احتیاط چہک شاخسار سے
اُڑتی ہے گُل کی نیند نسیمِ بہار سے

گو بوستاں نژاد ہے تُو پھر بھی آج تک
واقف نہیں ہے نازکیِ برگ و بار سے

تیری نوا میں آنچ ہے تیری فغاں میں آگ
اُٹھنے لگے دھواں نہ کہیں مرغزار سے

کیوں کر تجھے بتاؤں کہ پھولوں کے رنگ میں
پڑتی ہے اوس موجِ صبا کے غبار سے

نرگس کراہتی ہے تڑپتی ہے یاسمن
ننھی سی اک شعاع کے بوس و کنار سے

تجھ کو خبر نہیں کہ لرزتی ہیں پتّیاں
صرف ایک نیم قطرۂ شبنم کے بار سے

نرمی سے نغمہ زن ہو اے عندلیبِ زار
کٹ جائے پنکھڑی نہ ترانوں کی دھار سے

شیشوں سے کھیلتے ہیں کس آہستگی کے ساتھ
یہ نکتہ سیکھ جوشِ لطافت شعار سے

حفیظ ہوشیار پوری

○

اک نظر اور سوادِ منزلِ دوست،
اک قدم اور ہزار ہا فرسنگ
حیرت آبادِ چشم و گوش سے دُور
کوئی دل میں لگا رہا ہے سُرنگ
بڑھتی جاتی ہے وسعتِ آفاق
ہوتا جاتا ہے دامنِ دل تنگ
جامِ مے اور آشتی کی نوید —
عالمِ ہوش اور حواس میں جنگ!
رنگ در رنگ آبگینے ہیں
آبگینوں میں بادۂ خود رنگ
بُو سفر ہے تو رنگ عزمِ سفر
گُل ہے پیمانۂ شتاب و درنگ
عشق سازِ ہزار پردہ حفیظؔ
جنّتِ گوش نو بنو آہنگ

خرابات

حکیم احمد شجاع ساحر

مرجعِ رندانِ بے پروا خرابا تم ہنوز
فارغ از اندیشۂ فردا خراباتم ہنوز

در خورِ من نیست آں صہبا کہ ریزندش بخاک
مایہ دار از خوردۂ مینا خراباتم ہنوز

بر نہ چینم رنگِ نواز گلعذارانِ چمن!
پُر زخونِ لالۂ صحرا خراباتم ہنوز

گرچہ مینا شد تہی از بادہ و ساقی نہ ماند
در نگاہِ آں بُتِ ترسا خراباتم ہنوز

قیس گر بیگانہ شد از رسمِ جاں بازی چہ باک
گرم از افسانۂ لیلےٰ خراباتم ہنوز

جُرعۂ دُزدید از جامِ من و مے خانہ ساخت
آں کہ از کم ظرفیش رسوا خراباتم ہنوز

می چکد از جانِ ساحرؔ خونِ رنگینے چو لعل
بے نیازِ منّتِ رزہا خراباتم ہنوز

تجربے

جمیل مظہری

ارتقا کی راہوں میں وہ بھی وقت آیا تھا
سو بتوں کو توڑا تھا اک خدا بنایا تھا
اقتدارِ مطلق کے منفعل تصوّر کو پیکرِ خودی دے کر عرش پہ بٹھایا تھا
اپنے عکس کے آگے اپنا سر جھکایا تھا کمتری کے جذبے کو فلسفہ بنایا تھا
ارتقا کی راہوں میں یہ بھی وقت آیا ہے
بندگی کی ذلّت نے دل کو گدگدایا ہے
جذبۂ تمرّد نے، فطرتِ تعدّد نے، وحشتِ تجدّد نے، گرز پھر اُٹھایا ہے
اب خودی بھی زد میں ہے اب خدا بھی زد میں ہے اب یقیں بھی زد میں ہے واہمہ بھی زد میں ہے
اب مزاج جمہوری، اقتدار وحدت کا یہ طلسم توڑے گا، اپنا سر بھی پھوڑے گا
لیکن اے خطا کارو، عہدِ نو کے معمارو
عقل کے پرستارو، وہم کے گرفتارو
طمع ہے اگر دل میں، خوف ہے اگر دل میں تو یہ بُت شکن جذبہ، یہ خدا شکن جذبہ
تجربوں کی محفل میں، ارتقا کی منزل میں اک خدا کے ٹکڑوں سے سو خدا بنائے گا
جب بھی کچھ نہ پایا تھا اب بھی کچھ نہ پائے گا
جب بھی سر جھکایا تھا اب بھی سر جھکائے گا

جمیل مظہری

○

یہ کس نے رخ سے نقاب اُلٹی کہ شمعِ احساس جھلملائی
نظر کے سارے طلسم ٹوٹے عقیدے دینے لگے دہائی

کوئی تو ڈالے گا اس میں ایندھن کوئی تو پھونکے گا دل کا چولھا
یہ راکھ میں آگ کی امانت رہے گی کب تک دبی دبائی

یہ ساری دنیا ہے قید خانہ سبھی ہیں اک سلسلے کے قیدی
کسی کی زنجیر آہنی ہے کسی کی زنجیر ہے طلائی

یہی ہے جب روشنی کی یورش تو پھر اندھیرے کی کیا شکایت
نہ جب بھی دیتا تھا کچھ سجھائی نہ اب بھی دیتا ہے کچھ سجھائی

کسی کی آنکھوں میں سرمہ کھینچا کسی کی آنکھوں میں دھول جھونکی
اِدھر بگولے اُدھر بگولے یہ کس کی وحشت نے خاک اڑائی

اک آہ پیچیدہ و تپیدہ - زمیں کے سینے میں ناکشیدہ
نجانے کیونکر ہوئی دمیدہ کہ بوٹے گل بن کے مسکرائی

جو گھاس پر تھی ذرا سی شبنم تمھاری کرنوں نے وہ بھی پی لی
غرض کہ چمکے بھی بن کے سورج تو پیاس ذرّات کی بڑھائی

شکایتِ باغباں نہیں ہے حکایتِ گلستاں یہی ہے
زباں مانگی تھی برگِ گل نے ہنسی ملی وہ بھی رسمسائی

دماغ کی تیرگی بڑھا دی ضمیر کی شمع بھی بجھا دی
تمھارے آنچل نے بھی ہوا دی مگر نہ اس دل کو نیند آئی

ابھی تو تھا مظہریؔ کے دل پر اک انفعالی سکوت طاری
یہ کس نے تاروں پہ رکھ دی انگلی کہ ساز کی روح جھنجھنائی

ہے کب دلِ غم طراز اپنا انھیں کی بخشش گداز اپنا
نہ سوز اپنا نہ ساز اپنا جمیلؔ کیسی غزل سرائی

ایک صدا

احمد ندیم قاسمی

تیرگی جب در و دیوار پہ چھا جاتی ہے
کتنی صدیوں سے — مرے کانوں میں
دُور سے ایک صدا آتی ہے
اس میں کچھ طنز بھی ہے
درد بھی ہے
فن بھی ہے
آسیب بھی ہے
واہمہ بھی
راز بھی ہے

میں نے داناؤں سے پوچھا
تو وہ کچھ ڈر سے گئے
اور لرزتی ہوئی آواز میں بولے
کہ یہ آثارِ قیامت ہیں
یہ معمول نہیں قدرت کا

کس نے داناؤں سے حق بات سُنی ہے
یہ تو وہ لوگ ہیں
جو ظلم کو انصاف بھی کہتے ہیں تو آنکھیں نہیں جھکتیں اُن کی
سچ بھی کہتے ہیں تو اُس وقت
کہ جب جھوٹ دغا دے جائے

کس سے پوچھوں
یہ صدا کیا ہے
جو دنیا کی سماعت کی حدوں میں نہیں آئی اب تک
اور راتوں کو مجھے آ کے ستائے
مرے افکار پہ منڈلائے
مری روح کی گہرائی میں اُترے تو سوالوں کے الاؤ سے لگا جائے

یہ آوارہ عناصر کی صدا ہے ؟
کہ خدا عظمتِ تخلیق کے غرفے میں کھڑا بول رہا ہے ؟
کہ یہ انساں ہے
جو سقاکیِ تقدیر پہ مصروفِ بُکا ہے ؟

کمالِ دانش

احمد ندیم قاسمی

سنا ہے
ایک ایک ذرّے کے گرد
ایسا ایسا نظامِ گردش رواں دواں ہے
کہ ذہن اُس کے رموز پر غور کرتے کرتے
خود ایک گردش میں مبتلا ہے

فضا کا ایک ایک ذرّہ اک آفتاب ہے
اور کتنے مریخ و مشتری
اَن گنت زمینیں
ہزاروں چاند
اس کے گرد محوِ طواف ہیں

میں زمین پر اک مہین نقطے کی حیثیت میں یہ سوچتا ہوں
کہ اُن زمینوں پہ —
ایک ذرّے کے گرد جو اُڑتی پھر رہی ہیں —
کوئی تو مخلوق بستی ہوگی
وہاں بھی صبحوں کے اور شاموں کے رُوپ میں
زندگی مسرّت کے اور اداسی کے مرحلوں سے گزرتی ہوگی

یہ عصرِ حاضر کی دانشِ بے پناہ ہے
جس نے میری دُنیا کو
ایک کرّے سے ایک ذرّہ بنا دیا ہے

رباعیات

اختر انصاری (دہلوی)

اے عظمتِ افلاک! تجھے شرم نہ آئی
اے سطوتِ افلاک! تجھے شرم نہ آئی
پستے ہی رہے چکّی میں پستی کے مکیں
اے رفعتِ افلاک! تجھے شرم نہ آئی

لاریب کسی والیٔ تقدیر سے پوچھ
ذی مقدرت و صاحبِ تدبیر سے پوچھ
روداد سبو! مجھ سے نہیں دادرِ حشر!
کے خسرو و جمشید و جہاں گیر سے پوچھ

یہ زیست ہے ایّام کی سازش ساقی
ہے ہے یہ غم و آلام کی یورش ساقی
جاری ہی رہے گردشِ ساغر، ورنہ
لے ڈوبے گی افلاک کی گردش ساقی

وہ یاس کہ اُمید کے چشمے پھوٹیں
وہ غم کہ طرب زار بہاریں لوٹیں
کیا چیز ہے واللہ یہ مسلک اپنا
وہ کفر کہ ایمان کے چھکّے چھوٹیں!

تقدیرِ جم و کَے ہے کہ خونِ آدم؟
پینے کی کوئی شے ہے کہ خونِ آدم؟
پی شوق سے، لیکن تحقق کرلے
ساغر میں ترے مَے ہے کہ خونِ آدم؟

تشکیک نے ایقان سے محروم رکھا!
تدقیق نے عرفان سے محروم رکھا!
القصہ نہ درپے ہو ہمارے کہ ہمیں
اللہ نے ایمان سے محروم رکھا!

ماضی کی روایات میں گڑ جاتے ہیں!
مُردوں کی طرح قبر میں سڑ جاتے ہیں!
میں دوست سے بچھڑا ہُوا شاعر ہی سہی
لوگ اپنے زمانے سے بچھڑ جاتے ہیں!

اختر یہ روش تیری ہے فطرت کے خلاف
یہ طور کچھ اچھے نہیں، تقصیر معاف!
دل ضبطِ غم و درد سے پھٹ جائے گا
پڑ جائیں گے پتھر کے کلیجے میں شگاف

افسردۂ احساس و نظر پیتا ہوں
درد و تپش و جذب و اثر پیتا ہوں
اندیشۂ بازپرسِ محشر کیسا؟
میں بادہ نہیں خونِ جگر پیتا ہوں!

قانونِ خدائی نہ بدل جائے کہیں!
تقدیرِ زمانہ نہ پگھل جائے کہیں!
یہ مدھ بھری رفتار، یہ قامت کی لہک
للہ قیامت نہ کچل جائے کہیں!

کیسے یہ غمِ زیست کے بادل چھائے
ہے ہے یہ حوادث کے بھیانک سائے
یا رب مری سوچوں کی قبائے زریں
یہ ٹاٹ کے پیوند کہاں سے آئے؟

نالے مرے جاتے ہیں ثریا سے بلند
پھینکی ہے بہت میں نے ستاروں پہ کمند
ہے عمر مری عمرِ ازل کی ہم دوش
صدیاں ہیں مری زیست کے ہر لمحے میں بند!

عدم

○

نیاز و صدق سے لبریز، باصفا سجدے
نہ ہوں قبول تو سب خونِ مدعا سجدے

ترے دروغ و تصنّع کی انتہا نخوت
مرے خلوص و محبّت کی ابتدا سجدے

خلوصِ سجدہ میں بھی مُدّعا تو ہوتا ہے
کہاں سے لاؤں میں بے لوث بے ریا سجدے

وہ رقص کرتی ہوئی تابناک سرمستی
وہ لڑکھڑاتے ہوئے میکدہ نما سجدے

اِدھر فقیرِ محبت کی منفرد لغزش
اُدھر فقیہہ زماں کے ہزار ہا سجدے

زمانہ دیکھ تو لے کیا نماز ہوتی ہے
درِ حبیب سے میرے اُٹھا کے لا سجدے

میں ڈھونڈتا ہوں تحیّر سے نامرادوں کو
نکل گئے ہیں کدھر میرے باوفا سجدے

نہ جانے لوٹ کے کب آئیں گے سیاحت سے
وہ گم شدہ، وہ رمیدہ، وہ لاپتا سجدے

نہ بیٹھ صحنِ مساجد میں عمر بھر زاہد
نکل جا پھینک کے دو چار دلربا سجدے

سفینہ عزم سے چلتا ہے۔ التجا سے نہیں
نہ کر خدا کو بہت میرے ناخدا سجدے

زمانہ سونا بکھیرے کہ سیم چھیڑ کا ئے
تو اُن کی راہ گزر میں عدم بچھا سجدے

عدم

(۰)

بعض چیزوں کا تصرّف ہی بجا ہوتا ہے
سجدہ جھوٹا بھی اگر ہو تو کھرا ہوتا ہے

ظلم سہتے چلے جاؤ اسی خوش فہمی پر
بد قماشوں کے تعاقب میں خدا ہوتا ہے

اُف وہ نادان نگاہوں کا تصادم جس میں
اور کچھ بھی نہیں ہوتا تو گلہ ہوتا ہے

شہرتِ خلق سے سرشار چلا آیا تھا
مجھ کو کیا علم تھا اس شہر میں کیا ہوتا ہے؟

ہم کو جنّت سے ہے صرف اس لیے رغبت کہ وہاں
تیرا کافور شدہ رنگِ قبا ہوتا ہے

حشر پہ بھول تو بیٹھے ہیں جفاکش انساں
دیکھنا یہ ہے وہاں ہو بھی تو کیا ہوتا ہے

جس کو کہتے ہیں محبّت کا صِلا لوگ عدم
وہ تو خمیازۂ تقصیرِ وفا ہوتا ہے

گیت

قتیل شفائی

دیکھا ہے تمھیں جب سے، اے جانِ غزل ہم نے
تعمیر کیے دل میں سو تاج محل ہم نے

چاہا تھا کہ خلوت میں تم سے ہوں ملاقاتیں
زلفوں کی گھٹا چھائے، نغموں کی ہوں برساتیں
ہے آج وہی منظر سوچا تھا جو کل ہم نے
تعمیر کیے دل میں سو تاج محل ہم نے

ہر آن یہی سوچا کب شامِ وصال آئے
کب جاگیں نصیب اپنے، کب تم کو خیال آئے
اب جھیل سی آنکھوں میں پائے ہیں کنول ہم نے
تعمیر کیے دل میں سو تاج محل ہم نے

لہرانے لگے جھونکے، موسم کا بھی دل جھوما
جب پھول کے دھوکے میں بھنورے نے تمھیں چوما
پایا ہے کچھ اپنی بھی نیندوں میں خلل ہم نے
تعمیر کیے دل میں سو تاج محل ہم نے

دیدار کا ہر لمحہ سو سال پہ بھاری ہے
جی بھر کے تمھیں دیکھیں نیت یہ ہماری ہے
پھیلا دیے صدیوں پر سمٹے ہوئے پل ہم نے
تعمیر کیے دل میں سو تاج محل ہم نے

میکش اکبر آبادی

○

یہ جہاں ایک نظر، اور نظر کچھ بھی نہیں
وہ جہاں صرف خبر، اور خبر کچھ بھی نہیں

اُن کی خوشبو سے مہکتی مری سانسوں کے سوا
اور اس باغ میں اے بادِ سحر کچھ بھی نہیں

رنگ و بُو کا یہ جہاں کارگہِ لالہ رخاں
دیکھنے میں تو بہت کچھ ہے مگر کچھ بھی نہیں

جلوہ ہی جلوہ ہے اِن آئینوں کو چُھو کے نہ دیکھ
پردہ ہی پردہ ہے اور زلف و کمر کچھ بھی نہیں

رات شبنم کی طرح ہو گئی پھولوں میں بسر
اب یہ کیا غم ہے اگر وقتِ سحر کچھ بھی نہیں

نقشِ پا بھی تو ٹھہرتے نہیں راہی کی طرح
منزلِ عشق بجز راہگزر کچھ بھی نہیں

ایک ہی رنگ پہ ہے حالتِ دل اے میکشؔ
یہ وہ دنیا ہے جہاں شام و سحر کچھ بھی نہیں

ری یاد

دگن ناتھ آزاد

رات پھر تیرے خیالوں نے جگایا مجھ کو
ٹمٹماتی ہوئی یادوں کا ذرا سا شعلہ
آج بھڑکا تو پھر اک شعلۂ جوالہ بنا

عقل نے تجھ کو بھلانے کے لیے لاکھ جتن
لے گئی مجھ کو کبھی مصر کے بازاروں میں
کبھی اٹلی کبھی اسپین کے گلزاروں میں
بلجیم کے، کبھی ہالینڈ کے میخانوں میں
اور میں عقل کی باتوں میں کچھ ایسا آیا
میں یہ سمجھا کہ تجھے بھول چکا ہوں شاید

دل نے تو مجھ سے کئی بار کہا ہے وہم ہے یہ
اس طرح تجھ کو بھلانا کوئی آسان نہیں،
میں مگر وہم میں کچھ ایسا گرفتار رہا
میں یہ سمجھا کہ تجھے بھول چکا ہوں شاید

کل مگر پھر تری آواز نے تڑپا ہی دیا
عالمِ خواب سے گویا مجھے چونکا ہی دیا
اور پھر تیرا ہر اک نقش مرے سامنے تھا

تری زلفیں، تری زلفوں کی گھٹاؤں کا سماں
تری چتون، تری چتون وہی باطن کا سراغ
ترے عارض وہی خوش رنگ مہکتے ہوئے پھول
ترے لب جیسے سجائے ہوئے دو برگ گلاب
تری ہر بات کا انداز تری چال کا حسن
ترے آنے کا نظارا ترے جانے کا سماں
ترا ہر نقش تو کیا تو ہی مرے سامنے تھی
دل نے جو بات کئی بار کہی تھی مجھ سے
شب کے انوار میں بھی دل کے اندھیروں میں بھی
مرے احساس میں اب گونج رہی تھی پیہم
اس طرح تجھ کو بھلانا کوئی آسان نہیں
دل حقیقت ہے کوئی خوابِ پریشاں تو نہیں
یاد مانندِ خرد مصلحت اندیش نہیں
ڈوبتی یہ نہیں ہالینڈ کے میخانوں میں
گم نہیں ہوتی یہ پیرس کے صنم خانوں میں
یہ بھٹکتی نہیں اسپین کے گلزاروں میں
بھولتی راہ نہیں مصر کے بازاروں میں
یاد مانندِ خرد مصلحت اندیش نہیں
ورعقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے"
یاد کا آج بھی انداز وہی ہے کہ جو تھا
آج بھی اس کا ہے آہنگ وہی رنگ وہی
بھیس ہے اس کا وہی طور وہی ڈھنگ وہی
پھر اسی یاد نے کل رات جگایا مجھ کو
اور پھر تیرا ہر اک نقش مرے سامنے تھا

چشمۂ حیواں

ادا جعفری

آبلہ پاؤ! رفیقو! ٹھہرو
آؤ صدیوں کا سفر ختم کریں

زندگی کہتے ہیں جس بُت کو اسی بُت کے لیے
زندگی بھر کھو گیا کچھ نہ کیا ہے ہم نے
درد سا درد سہا ہے ہم نے
سنگریزوں سے چٹانوں کسے محبت کی ہے
وہم پوجا ہے، گمانوں کی عبادت کی ہے
کتنی معصوم سی خواہش تھی کہ اس دنیا میں
تھام کر ہاتھ کسی لمحے کا ہم بھی چلتے
اپنی راہیں بھی ستاروں سے منوّر ہوتیں
اپنے (مرقد پہ نہیں) گھر میں دیئے بھی جلتے
یہ الف لیلہ نہ تھی ہم کوئی شہزادے نہ تھے
روز و شب تلخ و گرانبار حقیقت تھی یہاں
پھر بھی گھومے ہیں طلسمات کے ویرانوں میں
راہ میں کوہِ گراں بھی آئے
جن کی ہیبت سے لرزتی تھی نگاہ
ہم کو کیا خوف کہ ہم سر سے کفن باندھے تھے
اور تپتے ہوئے وہ ریت کے چٹیل میداں
بے اماں، ظالم و بے برگ و گیاہ

اور کبھی گھر گئے ہم آگ کے طوفانوں میں
ان گنت شعلوں کی ڈسنے کو زبانیں لپکیں
آگ اپنی تو نہ گلزار بنی
منزلِ چشمۂ حیواں نہ ملی
ہاتھ خالی ہیں تمھارے مرا دامن ہے تہی
سالہا سال سے دکھ درد کے ہم ساتھی ہیں

جان پہچان مگر ہم میں نہیں
میں تمھیں تم نہ مجھے جان سکے
حد یہ ہے کہ خود کو ہی ہم لوگ نہ پہچان سکے
کبھی غیروں سے کبھی اپنوں سے ہم نے پوچھا
اپنی منزل کا سراغ اپنی امنگوں کا پتا
میں نے جھنجھلا کے ہر الزام تمھی پہ رکھا
تم نے مجرم مجھے گردانا تھا
ہم کہ آوارہ و سرگشتہ و درماندہ رہے
دل کے گنبد سے ندائیں آئیں
اور ہم نے نہ سنیں
ہم تھے جس جنتِ انساں کے لیے سرگرداں
وہ تو ہم اپنے ہی سینوں میں لیے پھرتے ہیں
اور وہ آبِ حیاتِ ابدی
اس کا سرچشمہ ہیں آنکھیں اپنی
کہیں بے لوث محبت، کہیں ممتا کا دیا
اور وہ آنسو جو کسی اور کے غم میں ڈھلکا
ہے وہی جنتِ انساں کا نقیب
آبلہ پاؤ! رفیقو! آؤ
آؤ صدیوں کا سفر ختم کریں

ادا جعفری

○

شکوہ بھی کیجیے تو کہاں ہے روا ہمیں
سب کچھ ملا ہے ایک خوشی کے سوا ہمیں

رہزن کہاں کہ شومیٔ تقدیر جانتے
رستے میں مل گیا تھا کوئی خضر سا ہمیں

زنجیرِ پا بنے گی یہ خوشبوئے گل کبھی
وارفتگی میں دھیان کب اتنا رہا ہمیں

پانی میں ڈوب کر بھی چٹانیں وہیں رہیں
اور ہم کہ جذبِ دل پہ بھروسہ رہا ہمیں

دل داغ داغ ہے تو بہاروں کا کیا قصور
دھوکا فصیلِ رنگ پہ خود ہو گیا ہمیں

آئینے تھے مگر کئی ٹوٹے ہوئے بھی تھے
خود اعتنا دیوں نے صلہ کیا دیا ہمیں

ہو گئی کوئی تو بات جو ہم ان کے ہو رہے
سب کچھ بھلا کے یاد بس اتنا رہا ہمیں

ہم سے تو کچھ کہا تھا کسی کم نگاہ نے
اوروں کی بات چھوڑیے اوروں سے کیا ہمیں

کٹتی رہی ہیں عمرِ گریزاں کی منزلیں
لے لو قسم جو کوئی شناسا ملا ہمیں

ہونٹوں کو مسکرانے کی عادت سی ہو گئی
دل بھی کسے میں ہوتا تو کیا تھا برا ہمیں

سامانِ فصلِ گل سے گریزاں رہے ادا
اعلانِ فصلِ گل پہ بھروسہ رہا ہمیں

معذرت

ادا جعفری

سنتے ہیں کسی ہمدمِ دیرینہ کو اے دل!
فنکار کے ہونٹوں سے صداقت کا گِلہ ہے

آدرش کے افلاک سے ہاں موڑ لیا منہ
ذرّوں کی محبت کے گنہ گار رہے ہیں
دل — جن کے دھڑکنے کی صدا گونج رہی ہے
عیسیٰ نہ سہی پھر بھی صلیبوں پہ چڑھے ہیں
دامن جو پکڑ لے وہ بھلا غیر کہاں کے
کانٹے بھی رہِ شوق کے ٹھکرا نہ سکے ہیں
گزری ہے اسی دل سے ہر اک نکہتِ رفتہ
ہر پھول کی آنچ اپنی نگاہوں میں لیے ہیں
ہر شاخِ بریدہ پہ جگر خون ہوا ہے
ہر برگِ گلِ تر کے لیے جاں سے گئے ہیں
پلکوں میں پروئے ہیں ہر اک آنکھ کے موتی
کہنے کو تہی دست و تہی جام رہے ہیں
ہر چوٹ اسی شیشے پہ آ آ کے پڑی ہے
اک مرگِ تمنا پہ کئی بار مرے ہیں،

جھلسیں کہ سلامت رہیں وہ ہاتھ ہوں دل ہوں
بھڑکی ہے جہاں آگ رہا جا نہ سکا ہے

قیوّم نظر

○

غلط کہ حسن کو لاکھوں اداشناس ملیں
مگر ستم ہے کہ وہ خود بھی بدحواس ملیں

مری نظر سے جو دیکھیں تو میری دنیا میں
نہ شہر خالی نہ گلیاں کبھی اُداس ملیں

کہیں تو ہوگا دلِ مطمئن زمانے میں
سکوں کی رہ نقیں شاید جنوں کے پاس ملیں

بھرم نہ کھول سکیں گے تری عنایتوں کا
ہزار شکوہ بہ لب چند ناسپاس ملیں

نہ چھیڑ تذکرہ اُس کائنات کا کہ جہاں
بجائے آدمی اب بوتلیں، گلاس ملیں

بھٹکتی عظمتوں کے سائے میں تلاش کریں
نئے جہاں کے لیے سیم و زر، کپاس ملیں

ہزار چاہتا ہے جی کہ وہ یہیں ہوں کہیں
نظر ہوا نہ مگر اصل اور قیاس ملیں

شاعر لکھنوی

○

اک تبسم سے بھی جو کم ٹھہرے
وہی آنسو متاعِ غم ٹھہرے

کتنے دل تھے جو ہو گئے پتھر
کتنے پتھر تھے جو صنم ٹھہرے

آندھیوں نے اُسے سلام کیا
چھاؤں میں جس شجر کی ہم ٹھہرے

سر بکف تھے جہاں پہ دیوانے
فصلِ گل کے وہیں قدم ٹھہرے

جو چمکتے رہے اندھیروں میں
روشنی کا وہیں بھرم ٹھہرے

چپہ چپہ تھا عشق کا مقتل
ہر جگہ ایک اک قدم ٹھہرے

شکوۂ جور لب پہ کیا لائیں
ہم تو شرمندۂ کرم ٹھہرے

رقص سائے کا دیکھنے کے لیے
دیر تک دھوپ ہی میں ہم ٹھہرے

کوچۂ یار تھا وہیں شاعر
چلتے چلتے جہاں قدم ٹھہرے

شاعر لکھنوی

○

فسردہ رنگِ چمن ہے ذرا نکھار تو ہو
مرے لہو سے کچھ آرائشِ بہار تو ہو

نگاہ میں یہ تڑپ بے سبب نہیں آتی
مری طرح کوئی مجروحِ انتظار تو ہو

ہوس یہ کہتی ہے میں بھی اُٹھاؤں نازِ حیات
میں سوچتا ہوں مجھے زندگی سے پیار تو ہو

شعورِ لذّتِ آزار سو نہ جائے کہیں
کبھی کبھی سہی، بر ہم نگاہِ یار تو ہو

میں قہقہوں پہ بھی جن کو معاف کرتا ہوں
مری ہنسی ہے اگر اُن کو ناگوار، تو ہو

ملے حیات کا انعام، سر کٹا کے سہی
ہمارے نام سے روشن چراغِ دار تو ہو

سوال یہ ہے کہ کانٹوں کو پھول کیوں سمجھیں
بہار اپنی جگہ ہے، مگر بہار تو ہو

اُسے بھی سر پہ بٹھائیں گے باغباں کی طرح
گلوں کو عظمتِ گلچیں کا اعتبار تو ہو

کبھی ہے اُن کا تعاقب کبھی صبا کی تلاش
مزاجِ نکہتِ گل کو کہیں قرار تو ہو

تلاش ہے کئی چہروں کی کارواں میں مجھے
اس انتظار میں ہوں، کم ذرا غبار تو ہو

میں صرف اُن کے کرم ہی پہ کیا جیوں شاعر
مرے لیے کوئی آشوبِ روزگار تو ہو

خلیل الرحمٰن اعظمی

○

آتے ہیں اور گزرتے ہیں کتنے ہی ماہ و سال
صدیوں سے راستے میں کھڑے ہیں کئی سوال

ہو کوئی ہم پیالہ تو وہ اس کی داد دے
راتوں کا زہر پی کے نہیں دن میں ہم نڈھال

کوئی تو بات ہو گی جو کرنے پڑے ہمیں
اپنے ہی خواب اپنے ہی قدموں سے پائمال

اس فکر میں کہ کل بھی نہ ہو آج کی طرح
ہم کر سکے نہ آج کے زخموں کا اندمال

یہ گردشِ زمیں ہے جو لاتی ہے شامِ غم
ورنہ شعاعِ مہر تو ہوتی ہے لازوال

ہم سا کوئی ملے تو کہیں اس سے حالِ دل
ہم بن گئے زمانے میں کیوں اپنی ہی مثال

نور بجنوری

○

چڑھتے سورج کی پجاری دُنیا
ہم سے کیا لے گی بچاری دُنیا

لے اُڑا ایک ترا غم ہم کو
دیکھتی رہ گئی ساری دُنیا

رقصِ مے، نغمۂ دل، سازِ جنوں
محتسب دیکھ ہماری دُنیا

مٹ گئے ہم تو سبھی کہتے ہیں
کون تھا، کس نے سنواری دُنیا

ہم ہیں وہ خاک نشیں، جب چاہا
ذرّے ذرّے سے اُبھاری دُنیا

جب ذرا وقت نے تیور بدلے
پھر ہماری نہ تمھاری دُنیا

نور بجنوری

○

زلزلہ آیا وہ دل میں وقت کی رفتار سے
خود بخود تصویر تیری گر پڑی دیوار سے

چپکے چپکے کھینچتا جاتا ہوں کانٹوں کا حصار
یوں کہ اب ڈرنے لگا ہوں پھول کی مہکار سے

جن کو آنکھوں سے لگایا جن کو رو رو کر پڑھا
ہائے وہ خط بھی نظر آنے لگے بے کار سے

دیدۂ یعقوب ہر چہرے میں ہے گریہ کناں
ہم بہت اکتا گئے ہیں مصر کے بازار سے

زندگی شاید اسی مردہ دلی کا نام ہے
ولولے سہمے ہوئے سے حوصلے بیمار سے

ڈھونڈنے آیا ہوں خود کو بے حسی کی دھوپ میں
سُن رہا ہوں اپنے قصّے سایۂ دیوار سے

ہم بلا نوشوں نے زہرِ آگہی بھی پی لیا
چلتے چلتے ہم بھی ٹھوکر کھا گئے کہسار سے

ہم سے شکوہ کر رہا تھا آج دامانِ تہی
توڑ لائے ماہ و انجم فکر کے گلزار سے

نورؔ صاحب کھل نہ جائے ترکِ اُلفت کا بھرم
آپ کی خاموشیوں سے آپ کے اشعار سے

خالد میناؒئی

○

اب آپ کو کیا حال سُنائیں شبِ غم کا
دامن کا رہا ہوش نہ کچھ دیدۂ نم کا

کرنے لگے وحشت میں شبِ تار سے باتیں
جب کوئی ٹھکانا نہ رہا رنج و الم کا

یا آپ نہیں ہیں تو یہ دُنیا ہے جہنّم
یا ہم کو بھی ہوتا تھا گماں اس پہ ارم کا

اب وعدۂ فردائے قیامت بھی نہ کیجے
اب دل کو نہ آئے گا یقیں قول و قسم کا

نام آپ کا ہر دم لبِ خالدؔ پہ رہے گا
پاس آپ کریں یا نہ کریں دیدۂ نم کا

پھولی شام کی لالی

عبد المجید بھٹی

بیت گیا دن شام آئی ہے
کل کی خوشخبری لاتی ہے
جھوم رہی ہے اُٹھتی جوانی
مستی بھری متوالی
پھولی شام کی لالی

آج کا دن بھی ہم بھر پائے
جانے کل آئے نہیں آئے
ختم ہوئی جاتی ہے کہانی
دل دہلانے والی
پھولی شام کی لالی

کیسی جوانی ؟ کیا ہے بڑھاپا
جاگ رہا ہو جب اپنا پا
رنگ بسی ہے دُنیا فانی
پل پل میں ہے نرالی
پھولی شام کی لالی

○

عبد المجید بھٹی

نوازش حسن پر کی بھی تو کیا کی ؟
محبّت میں اگر ہم نے وفا کی

حجاب آلود ہیں اب ان کی نظریں
کہ ہم کیوں پا گئے شوخی حیا کی

ہم اپنی پیاس کو بہلا رہے ہیں
انھیں ملتی ہے داد اک اک ادا کی

جوانی میں امنگوں پر جوانی
روایت بن گئی برگِ حنا کی

وہیں حرف آگیا اپنی وفا پر
جہاں بھی جی میں کچھ آئی جفا کی

دعاؤں کا اثر پہچانتے ہیں
مقدّر دیکھیے پھر بھی دعا کی

دلیلِ راہ کوئی بن گیا ہے
یہ ہے معجز نمائی نقشِ پا کی!

فنکار

جمیل ملک

تو جب تک مری روح میں
میرے احساس میں
میرے دل کی ہر اک موج میں نغمہ خواں تھا
تو میں کتنا مسحور تھا، کتنا مسرور تھا
جیسے تو اور میں ایک ہیں
اور پُرکیف خوابوں کے بجرے پہ رقصاں و خنداں
بہے جا رہے ہیں

تجھے میں نے جب لفظ و معنی کے پیکر میں ڈھالا
ترے چشم و لب، زلف و رخسار کو خونِ دل سے نکھارا
تو جس نے بھی دیکھا، یہی کہہ اُٹھا
یہ تو میرا ہی معبود ہے، یہ تو میرا ہی شہکار ہے
اس کو میں نے تراشا ہے
یہ میری برسوں کی کاوش کا اظہار ہے،

وہ کافر صنم جس کو میں نے زباں دی
جسے خواب کی خلوتوں سے اُٹھا کر
حقیقت کے جلوت کدے میں سجایا
وہی اب تماشائیوں میں گھرا، خود نمائی پہ اِترا رہا ہے
کبھی اس کو فرصت ملے تو نگاہِ غلط سے
ہنسی اپنے ہونٹوں پہ لا کر
مری سمت یوں دیکھتا ہے
کہ جیسے وہ اب مجھ سے بھی، اپنی بیداد پر
داد کا منتظر ہے

مری بے بسی اُس کی بے اعتنائی سے دست و گریباں ہے
اپنی وفاؤں پہ نادم ہے
حیرت میں گم ہے
مَیں پتھر کا بُت بن گیا ہوں

شفقت کاظمی

○

ترے حضور جو لب پر نہ آسکا ہوگا
وہ حرف ہم نے اشاروں میں کہہ دیا ہوگا

خبر نہ تھی کہ سرِ جادۂ وفا ہم کو
قدم قدم پہ بلاؤں کا سامنا ہوگا

بہارِ جن کا مقدّر نہ ہو سکی ہوگی
چمن چمن ابھی پھولوں کا تذکرا ہوگا

تجھے خیال بھی اُس کا نہیں مگر اب تک
کوئی غریب تری راہ دیکھتا ہوگا

کسی نے ہم کو دیا ہے جو دردِ تنہائی
کبھی تو اُس کا مداوا بھی سوچتا ہوگا

اُسی قدر مرے دل کی ہوس بڑھی ہوگی
تری نگاہ نے جتنا کرم کیا ہوگا

بسا ہوا ہے جو اک اجنبی مرے دل میں
ضرور مجھ سے وہ شفقتؔ کہیں ملا ہوگا

○

ختم ہے اب مرا فسانہ بھی
کھو گیا نیند میں زمانہ بھی

برق چمکی تھی شاخساروں پر
آگیا زد میں آشیانہ بھی

یہ سفر کی صعوبتیں کب تک
کیجیے اب کہیں ٹھکانہ بھی

کچھ مرا راستہ بھی تھا دشوار
کچھ مزاحم رہا زمانہ بھی

ہم کو سمجھا نہیں کوئی اب تک
کام آیا نہ دوستانہ بھی

اعتبارِ حیات کیا معنی
کوئی دم کا ہے یہ فسانہ بھی

اس چمن میں یہیں کہیں شفقتؔ
تھا کبھی اپنا آشیانہ بھی

فارغ بخاری

○

جبیں کا چاند بنوں، آنکھ کا ستارا بنوں
کسی جمالِ شفق تاب کا سہارا بنوں
محبتوں کی شکستوں کا اک خرابہ ہوں
خدارا مجھ کو گراؤ کہ میں دوبارا بنوں
یہ بھیگی بھیگی ہواؤں کی سرد سرد مہک
جو دل کی آگ میں اُترے تو کچھ گوارا بنوں
ہر ایک غنچہ دہن کا یہی تقاضا ہے
جمالیات کا میں آخری شمارہ بنوں
زمانہ منظرِ موہوم کا ہے سودائی
یہ آرزو ہے کوئی دُور کا نظارا بنوں
ہر ایک موجِ ہوا اُٹھتی جوانیوں کی دھنک
بنوں تو ایسے سمندر کا میں کنارا بنوں
مجھے لگن کہ میں آئینے کی مثال رہوں
اسے ہوس کہ روایاتِ سنگِ خارا بنوں

○

فضا ابن فیضی

یہ جبیں لب، یہ سیہ زلفیں، یہ پیاری آنکھیں
آپ کو دیکھے کوئی لے کے ہماری آنکھیں

میں بھی موجود ہوں محفل میں، کسے ہوش یہ تھا
نگراں آپ کی جانب رہیں ساری آنکھیں

انقلابات کی خاموش تماشائی ہیں
کاش کچھ بول بھی سکتیں یہ ہماری آنکھیں

ہائے پہنچا یہ کہاں سلسلۂ کاوشِ غم
میرے اشکوں سے ہیں لبریز تمھاری آنکھیں

میکدے آج گھٹاؤں کو ترس جائیں گے
میرے محبوب کی کاجل سے ہیں عاری آنکھیں

جیسے پھیلے کسی دیوار پہ انگور کی بیل
اس طرح اُٹھتی ہیں مجھ پر وہ خماری آنکھیں

زلف ہے بین کی لہروں پہ مچلتی ناگن
تم سپیرن ہو تو جادو کی پٹاری آنکھیں

پی گئیں اشک بنا کر غمِ حالات کو بھی
اور کیا کرتیں بھلا درد کی ماری آنکھیں

یہ تضادات کی رَو کیسی چلی ہے یارو!
چہرے حسّاس ہیں، جذبات سے عاری آنکھیں

عام ہے مشغلۂ کورنگاہی اے دوست
ڈھونڈھ مت وقت کے چہرے پہ ہماری آنکھیں

کتنی صدیوں سے اندھیروں میں سفر ہوتا ہے
اُف یہ رنگین دھندلکوں کی پُجاری آنکھیں

بھیگا بھیگا ہے جوانی کے ترشح سے بدن
کشتِ صہبا کی ہیں نکھری ہوئی کیاری آنکھیں

بند کر دو یہ فسانوں کے دریچے، سو جاؤ
ہو چلیں ہم نفسو! نیند سے بھاری آنکھیں

فضا ابنِ فیضی

○

کاش اُسی کے ساتھ کٹے یہ دن نغمے کا رات غزل کی
جس کا البیلا پیکر ہے اک نازک سوغات غزل کی

میرے نغموں کو ڈس لے گی یہ خاموشی ناگن بن کر
شہد لبو! کچھ تم بھی بولو، چھیڑ رہا ہوں بات غزل کی

جب بوندوں کی پائل چھنکے ہم دیوانے ساز اُٹھائیں
کالی کالی اُن زلفوں میں لہرائے برسات غزل کی

چُپ جو رہے تو سحر سا پھُونکے بات کرے تو موہ لے من کو
ان نینوں کا چنچل افسوں پیاری پیاری گھات غزل کی

میں ہوں اپنی راہ گزر میں سایہ دار شجر کی صورت
ایک مہکتی چھاؤں میں ہیں میرے پیار بھرے نغمات غزل کی

فرطِ حیا سے پانی پانی، چُستیِ بندش، شوخیِ مضموں
تیرے بدن کی شعریت کے آگے کیا اوقات غزل کی

شاہدِ فن کی جامہ زیبی اِترائی ہے خود پر کیا کیا
نکلے ہیں پوشاک پہن کر جب میرے جذبات غزل کی

دل کو لگی ہے اور نہ لگے گی یہ تحسینِ شعر فروشاں
فن کا صلہ یہ خوب ملا ہے چپ کی داد اور بات غزل کی

نازک سی اس صنفِ سخن پہ کیا کچھ گزری یہ مت پوچھو!
ٹوٹ گئی ہے ناوک بن کر پہلو میں بہتات غزل کی

ظلمت سے پرے

شاذ تمکنت

اک دستِ شکستہ سازِ کہن
تم سُن نہ سکو، میں گا نہ سکوں
پچھتاتے ہُوئے اک عمر ہوئی
اب چاہوں تو پچھتا نہ سکوں

میرے بھی فلک پر شمس و قمر
چمکے تھے چمک کر گہنائے
میں نے بھی ستارے ٹانکے تھے
سب ٹوٹ گئے سب کجلائے

شبنم سے لکھے تھے کچھ نغمے
پانی پہ لکیریں کھینچی تھیں
پتھر سے پھُول کھلائے تھے
اشکوں سے زمینیں سینچی تھیں

اک شاخ چنی، کچھ ہار بُنے
وہ ساری لڑیاں ٹوٹ گئیں
میں جن سے شفق کو چھُوتا تھا
رنگوں کی وہ کڑیاں ٹوٹ گئیں

دیکھو یہ چراغ کشتہ ہیں
سب ان کے اُجالے بیچ دیے
آنکھوں کا تبسم لُٹ سا گیا
قسمت کے قبالے بیچ دیے

کچھ خواب تھے میری جھولی میں
ان خوابوں کا نیلام اُٹھا
اب تم سے کہوں کیا جینے کا
کس مشکل سے الزام اُٹھا

دیکھو تو اُدھر ظلمت سے پرے
ماضی کا مہاجن بیٹھا ہے
سب رہن ہیں میرے روز و شب
تُم لے آؤ تو اچھا ہے

○

شاذ تمکنت

وہ کون ہے جس کی وحشت پر سنتے ہیں کہ جنگل روتا ہے
ویرانے میں اکثر رات گئے اک شخص ہے پاگل روتا ہے

پھر سَن سے کہیں پُروائی چلی کھلتے نہیں دیکھی دل کی کلی
یہ جھوٹ ہے برکھا ہوتی ہے یہ سچ ہے کہ بادل روتا ہے

ہے اس کا سراپا دیدۂ تر دنیا کو مگر کیا اس کی خبر
سب کے لیے آنکھیں ہنستی ہیں میرے لیے کاجل روتا ہے

وہ کس کے لیے سنگھار کرے چندن سا بدن یوں روپ بھرے
جب مانگ جھکا جھک ہوتی ہے آئینہ جھلاجھل روتا ہے

بنتی نہیں دل سے شاؔذ اپنی یہ دوست ہے یا دشمن کوئی
ہم ہیں کہ مسلسل ہنستے ہیں وہ ہے کہ مسلسل روتا ہے

مظہر امام

○

ایک مدت سے مرے گھر میں کوئی آیا نہیں
ان شناساؤں میں کوئی آشنا چہرہ نہیں

میرے حصے میں فقط خاموشیاں ، ویرانیاں
یہ جہاں ، سب کا جہاں ، میرا نہیں ، میرا نہیں

پل ہی پل ، سڑکیں ہی سڑکیں "عشق ہے بے امتحاں"
آج رستے میں کوئی دریا نہیں صحرا نہیں

آسماں بھی سر پہ ہے ، تارے بھی ، مہر و ماہ بھی
اپنے پیروں کے تلے لیکن کوئی دنیا نہیں

خود غرض ہیں انجمن آرائیاں ، تنہائیاں
آدمی کا آدمی سے اب کوئی رشتا نہیں

آج کے بونے اڑاتے ہیں ہمالہ کا مذاق
ہاتھ میں پتھر بہت ہیں ، سر کوئی اونچا نہیں

آ گیا ہے اب سوا نیزے پہ "تازہ آفتاب"
آنکھ والوں نے قیامت کا سماں دیکھا نہیں

جس میں نسخے درج ہوں بیمار انساں کے لیے
وہ صحیفہ آسماں سے آج تک اترا نہیں

مظہر امام

○

ہے غم کی رات، تیز کریں گردشِ سبو
بزمِ طرب نہیں ہے یہ، پھر کیا یہ "ہاؤ ہو"!

دیکھو یہ اتفاق، ملا آج پھر کوئی
بالکل تمھاری طرح، تمھیں جیسے ہو بہو

حسرت سے دیکھتے ہیں ہر اک آئینے کو ہم
یہ تیری جستجو ہے کہ ہے اپنی جستجو!

اپنی ہی چیخ چار طرف سے اُبھر گئی
آواز دوستوں کو لگائی جو کو بکو

یہ دورِ مصلحت ہے، سُنو حکمِ شہر یار
لُٹنے دو، لُٹ رہی ہے اگر داں کی آبرو

اچھا ہوا کہ غیر سے سب فیصلے ہوئے
آؤ کہ تم سے بات کریں ہم بھی دُو بدُو

ہم خود ہی اعتبار کے قابل نہیں رہے
کس مُنہ سے تم کو دوست کہیں اور اُسے عدو؟

صدیوں کا خون پی کے بھی اب تک وہی ہے پیاس
دھرتی پکارتی ہے ابھی تک "لہو! لہو!"

چیزوں کے اژدہام میں تنہا ہے آدمی
اے زندگی! بتا، کہ کدھر جا رہی ہے تو؟

○

جانے وقت کی سرکش موجیں غرق کریں کس دریا میں
آ اے غمِ محبوب! میں تجھ سے پہلے جنم کی بات کروں

شاید اک دن دل کا مسافر خواب کی چوکھٹ تک پہنچے
دریا دریا صبح کر دوں اور صحرا صحرا رات کروں

دن کا سورج آگ اُگل کر آخر خود بھی راکھ ہوا
سُوکھی پیاسی رات پہ اپنے سپنوں کی برسات کروں

سناٹے کے گہرے پن میں گُم ہے اپنی بھی آواز
ڈھونڈ کے لاؤ کوئی دشمن، اس سے دو دو بات کروں

رقص گھروں میں، پاؤں میں گرمی، روح میں خنکی، دل بے جان
اپنے خرابے میں ہی اب کیسے میں تو گزر اوقات کروں

قرض کسی سے مانگ کے لاؤں تھوڑی سی موہوم اُمید
شعروں کے نقاد کی خاطر تہذیبِ جذبات کروں

خانم ممتاز مرزا

○

گلستاں کو دل سے بھلانا پڑے گا
قفس کو نشیمن بنانا پڑے گا

کہاں تک فریبِ نظر کھائے جائیں
زمانے کو اب آزمانا پڑے گا

ہمیں اپنی رسوائی منظور لیکن
انھیں آج محفل میں آنا پڑے گا

کلیسا ہو، مسجد ہو یا بُت کدہ ہو
جدھر جائیں وہ آستانہ پڑے گا

گلستاں کی زینت نہیں اتنی آساں
ہر اک خار کو گل بنانا پڑے گا

گزرنا پڑے گا کئی منزلوں سے
کئی راستوں کو بچانا پڑے گا

محبّت کی تصویر بے رنگ سی ہے
ہمیں آج خوں میں نہانا پڑے گا

تبسّم سے عاری یہ پژمردہ کلیاں
انھیں کل مگر مسکرانا پڑے گا

چراغاں تو ممتاز ہم آج کر لیں
فقط یہ نشیمن جلانا پڑے گا!

علی احمد علی جلیلی

○

مبارک اسیرو! قفس کا سجانا
مگر آشیانہ ہے پھر آشیانا

ذرا سوچ کر بجلیو! مسکرانا
چمن کا بھرم ہے مرا آشیانا

انھیں بدنصیبوں میں ہے اک کلی بھی
جنھیں راس آیا نہیں مسکرانا

جہاں سے شروعات ہے میکدے کی
اسی موڑ پر رُک گیا ہے زمانہ

گلستاں سے اب تک دھواں اُٹھ رہا ہے
زمانہ ہوا جل بجھا آشیانا

خیالوں میں اب تک ہیں ان کے اُجالے
ہوا جن چراغوں کو بجھ کر زمانا

علیؔ دور آیا یہ کیسا چمن میں
نظر میں کھٹکنے لگا آشیانا

○

کرم حیدری

ہم کس شبِ سیاہ کے دامن میں بس گئے
تیری ضیائے رُخ کو دل و جاں ترس گئے

گیسو نگارِ زیست کے سمجھے تھے ہم جنھیں
وہ بن کے ناگ رُوحِ محبت کو ڈس گئے

مُرجھا رہی ہیں اپنی امنگوں کی کونپلیں
بادل نہ جانے کون سی جانب برس گئے

شہرِ سخن میں چلنے لگی ہے وہ تیز لُو
نغمے کے پھول سے لبُ عارض جھُلس گئے

اُجڑے تھے دل، سو اُجڑے ہُوئے ہیں کچھ اور بھی
کیا کیا نہ ورنہ کوچہ و بازار بس گئے

آوارگانِ شوق نے منزل نہ کی قبول
گلشن کا در کھلا تو وہ سُوئے قفس گئے

عنواں تھے جو خلوص و محبت کے ذکر کے
وہ نامۂ وفا سے بنامِ ہوس گئے

یہ اپنی زندگی کی کٹھن راہ الاماں
ہر ہر قدم پہ دل کا دھڑکنا کہ بس گئے

ہے ہجرِ دوستاں بھی کرمؔ دردِ جانفزا
آنکھوں میں جو بسے تھے وہ اب دل میں بس گئے

کرم حیدری

○

اس گلستاں میں ہم بھی متاعِ بہار ہیں
سمجھو تو شاخِ گل ہیں نہ سمجھو تو خار ہیں

صحرا کی آبرو ہیں، چمن کا نکھار ہیں
ہم ہیں جہاں بھی، سایۂ ابرِ بہار ہیں

دیکھا ہے ہم نے اُن کی نگاہوں میں جھانک کر
جو اہلِ دل کہ حسن کے پروردگار ہیں

ذوقِ نظر تو دیکھ، کہ جانسوز تھی جو برق
آنکھیں اُسی کے حسن پہ اب تک نثار ہیں

ہم نے تو قطرہ قطرہ لہو اپنا دے دیا
کیا جانے کیوں چراغ ابھی سوگوار ہیں

دلِ گم ہُبے لاشہ ہائے تمنّا کے درمیاں
یہ ایک شمع اور ہزاروں مزار ہیں

موسم کوئی بھی آیا، رہے زخمِ دل ہرے
ہم لوگ زخم خوردۂ تیغِ بہار ہیں

اُٹھی ہے رسمِ مہر و مروّت کچھ اس طرح
اپنے گھروں میں لوگ غریب الدّیار ہیں

پھر نقوشِ فردا وہی ہوں گے مُو قلم
ڈوبے ہُوئے ہمارے لہو میں جو خار ہیں

ہوتی نہ دل کی بات، تو ممکن تھا صبر و ضبط
ہم بے قراریوں ہیں کہ بے اختیار ہیں

پتھّر کو دل بنانا کٹھن ہی سہی کرم
اِس کام میں دِوانے مگر ہوشیار ہیں

پھر آگئی بہار

یوسف جمال انصاری

مہکے ہُوئے گلاب ہیں، دہکے ہُوئے چنار
فرشِ زمیں پہ قوسِ قزح لوٹتی ہوئی
موجِ ہوا کہ روح کو چھوتی ہے جس کی دھار
یہ چاندنی کی نرم چبھن، نکہتوں کا لمس
پھر آگئی بہار!

کلیوں کی ہچکیوں پہ پپیہے کی پی کہاں
یہ لمحۂ نشاط ہے یادوں کی رہ گزار
کہتی ہے رات، جھوم کے پی، ڈگڈگا کے پی
اور دل کہ بہرِ ہمنفساں چشمِ انتظار
پرچھائیاں سی ہیں تو سرِ خاک بے قرار

بھیگی جو رات اور بڑھا جی کا اضطراب
بہتے ہُوئے یہ رنگ، برستی ہوئی پھوار
یہ جوشِ تشنگی
موسم یہ پُرخمار
پینا بھی جبر ہے
اور ہات روکنے پہ بھی کس کو ہے اختیار

آوازوں کا بھنور

(مشرقی پاکستان کے بارے میں زیرِ تحریر نظم کا ایک حصّہ)

ریاض انور

یہ کاکس بازار شہرِ خوباں
"سبک ہواؤں کا دیس" خاموشیوں کا مسکن
نشیلے خوابوں کی سر زمیں
گنگناتی صبحوں، مہکتی شاموں کی ارضِ شاداں
یہ ریگِ ساحل کہ جس کی تابندگی کے آگے
خجل ہے تنویرِ کہکشاں
شمعِ زرفشاں
پھول سے بھی نازک گداز جسموں کا عطر جس میں رچا ہوا ہے
حسین چہروں کے عکس سے جگمگا رہی ہے
سمن بروں، دل زدوں کی منزل
یہ ریگِ ساحل
مہکتے ہونٹوں، تڑپتی روحوں، جھکی نگاہوں کی رازداں ہے
ہر ایک ذرّے کی آنکھ میں مثلِ اشک اک داستاں نہاں ہے
یہاں شبِ مہ کی محفل آرائی دیدنی ہے
فلک پہ اک ماہتاب لرزاں
زمیں پہ ہر لہر مثلِ ماہِ تمام رقصاں
چہار سُو چاندنی کے قدموں کی دھول

بیلے کا پھول بن کر مہک رہی ہے
عمیق ساگر کچھ اس طرح مضطرب ہے جیسے
کسی کنواری کا جسمِ نورس
جوان ہاتھوں کے لمس سے کپکپا رہا ہو
دمِ سحر کس قدر سکوں ہے
تمام شب آرزوِ قلبِ حزیں کی صورت
تڑپ تڑپ کر، مچل مچل کر
نہ جانے لہروں کے قافلے کس کے پاس سے بسمیں میں سو گئے ہیں
یہ شاگو ریکا عظیم ٹیگور کے تخیل کا عکسِ رنگیں
کہ جیسے کوئی سجل کلا کار
رقص کے ایک دلنشیں زاویے پہ آکر
بہ چشمِ حیراں، بہ قلبِ مضطر
کسی حسیں یاد کے سلگنے پہ رک گئی ہو
خدا کرے اس کے لاونج میں قہقہوں کے جھرنے کبھی نہ سوکھیں
خدا کرے اس کے بام و در نورِ چشم و لب سے رہیں فروزاں
خدا کرے اس کے روز و شب کا ہر ایک لمحہ ہو گل بداماں
یہ جلوہ گاہِ پری جمالاں
یہ عافیت گاہِ دلفگاراں
رہے گی تا حشر نیلگوں بحر کے کنارے سدا درخشاں

رنگا رنگ

نریش کمار شاد

اب اتنے بھی اے شاد پریشاں کیوں ہو
انصاف کیا ہے زندگی سے تم نے؟
تبدیلیٔ حالات پہ حیراں کیوں ہو
انصاف کے زندگی سے خواہاں کیوں ہو

معبود! زمانے کی ضرورت کیا تھی
محتاج نہیں تھا تو نمائش کا اگر
یہ کھیل دکھانے کی ضرورت کیا تھی
دنیا کو بنانے کی ضرورت کیا تھی

نشتر جو ضمیر نے چبھویا ہوگا
لکھ کر مری تقدیر ازل میں شاید
احساس میں درد کو سمویا ہوگا
خود کاتبِ تقدیر بھی رویا ہوگا

جو تیرے تخیل پہ نہ چھائے ہوں گے
اے قہرِ خدا! ظلم بکثرت ایسے
جو تیرے تصور میں نہ آئے ہوں گے
انسان نے انسان پہ ڈھائے ہوں گے

کشتی کو ڈبو ڈبو کے کھیتا ہوں میں
جو مجھ میں کمال ہے بخوبی اس کو
پندار کو بھی فریب دیتا ہوں میں
دشمن کی نظر سے دیکھ لیتا ہوں میں

اے دیدہ ورو کمال کرتے ہو تم
نازل جو نہیں ہوا، نہ ہو بھی شاید
بے فائدہ قیل و قال کرتے ہو تم
اس حادثے پر ملال کرتے ہو تم

آلام کو غارت کبھی کرتے ہی نہیں
کچھ لوگ تو ہیں موت سے خائف اتنے
خوشیوں کی زیارت کبھی کرتے ہی نہیں
جینے کی جسارت کبھی کرتے ہی نہیں

آتا نہیں ڈھنگ تاجرانا ہم کو
ہم ہوتے زمانے میں جو بکنے والے
افسوس کہ تو نے نہیں جانا ہم کو
بک بک کے خریدتا زمانا ہم کو

جوہر ہے جو تم میں اسے پہچانتے ہو
اور اس میں جو خامی ہے اسے مانتے ہو
نا قدریٔ دنیا تو مسلّم لیکن
تم خود بھی تو قدر اپنی کہاں جانتے ہو

لیتا ہے ہر اک شخص سہارا اپنا
اپنی ہی نظر اور نظارا اپنا
ہم ہاتفِ غیبی جسے کہہ دیتے ہیں
دل ہے وہ حقیقت میں ہمارا اپنا

پاتال میں کر سکے گی کیا گم مجھ کو
ہر موج پہ آتا ہے تبسّم مجھ کو
لے ڈوبے نہ خود اس کو سفینہ میرا
بے سود ڈراتا ہے تلاطم مجھ کو

میرے لیے بیگانہ نہیں جب کوئی
کیوں مجھ کو تعصّب سے ہو مطلب کوئی
ہیں سارے مذاہب مرے اپنے لیکن
پھر بھی مرا اپنا نہیں مذہب کوئی

الفاظ کی رگ رگ میں رچاتا ہوں لہو
تابندہ خیالوں کو پلاتا ہوں لہو
ہر شعر کی محراب میں مشعل کی طرح
میں اپنی جوانی کا جلاتا ہوں لہو

دن بھر کی تھکی حیات سوئی سوئی
ہر چیز سکوت میں ہے کھوئی کھوئی
کیفیتِ الہام ہے طاری مجھ پر
اس وقت کہوں نہ کیوں رباعی کوئی

بشیر بدر

○

سورج مکھی کے گالوں پہ تازہ گلاب ہے
یہ میرا آفتاب، مرا ماہتاب ہے

ہر تارا۔ کپکپاتے ہُوئے ہونٹوں کی دعا
یہ آسمان۔ حمد و ثنا کی کتاب ہے

بادل ہوا کی زد پہ برس کے بکھر گئے
اپنی جگہ چمکتا ہوا آفتاب ہے

چونکے تو یہ طلسمِ جہاں ٹوٹ جائے گا
عالم تمام حلقۂ زنجیرِ خواب ہے

ناحق خیال کرتے ہو دُنیا کی بات کا
تم کو خراب جو کہے وہ خود خراب ہے

سب رشتے ٹوٹ جاتے ہیں برگِ بہار کے
اُڑنا ہوا کے دوش پہ کیسا عذاب ہے

بشیر بدر

○

کوئی امّید، کوئی آس رہے
جب تلک آتی جاتی سانس رہے

ایک زخمی پرندہ تنہا تھا
شام کے سائے اُس کے پاس رہے

لاؤ سب آنسوؤں کو میں پی لوں
کیوں مری زندگی اُداس رہے

آج آنکھوں میں ہے چمک بے حد
کوئی بیمارِ غم کے پاس رہے

جن دنوں کم اُداس رہتا تھا
اُن دنوں اور بھی اُداس رہے

بشیر بدر

○

بسترِ دل پہ خوں اُگلتے خواب
رات بھر۔ کروٹیں بدلتے خواب

وقت کی دھوپ، ریگ زارِ حیات
برف کی طرح سے پگھلتے خواب

پردۂ نور بن کے چھائے ہیں
آنسوؤں کی طرح مچلتے خواب

بکھرے شیشوں پہ گر کے ٹوٹ گئے
نیند میں ننگے پاؤں چلتے خواب

ایسی سنسان دوپہر میں کہاں
چاند تاروں کی طرح چلتے خواب

رات ٹکرا گئے چٹانوں سے
نیند میں ننگے پاؤں۔ چلتے خواب

یہ ہوائے حقیقتِ فردا
یہ چراغوں کی طرح جلتے خواب

مضطر اکبر آبادی

○

پرسشِ غم سے بھلا چارۂ غم کیا ہوگا
اِس تکلّف سے تو زخم اور بھی گہرا ہوگا

کر دئے کس نے یہ گُل جاگتی آنکھوں کے چراغ
تیری خوشبوئے بدن کا کوئی جھونکا ہوگا

ہر نفَس پر ہیں محبت میں ہزار اندیشے
ہر قدم پر یہی تشویش کہ اب کیا ہوگا

یہ مرے شوق کا عالم یہ تری کم نگہی
دیکھنے والوں نے کیا کچھ بھی نہ سوچا ہوگا

درد جاگ اُٹھا ہے تو دینے لگے بجھنے خیال
دل کے زخموں کو تری یاد نے چھیڑا ہوگا

رات کیا عمر اسی طرح گزر جائے گی
زندگی بھر یونہی چُپ چاپ سلگنا ہوگا

دل لرزتا ہے ہوا چیخ رہی ہے مضطرؔ
پھر کسی شاخ سے پتّہ کوئی ٹوٹا ہوگا

رفعت سلطان

○

تو جو مجھ سے کبھی برہم ہوگا — حسن کا اور ہی عالم ہوگا

او مرے حال پہ ہنسنے والے — ترا دامن بھی کبھی نم ہوگا

میرا کردار زمانے کے لیے — مظہرِ عظمتِ آدم ہوگا

دے کوئی دوست تو میں سوچتا ہوں — جامِ مے میں اثرِ سم ہوگا

میں نے سوچا بھی نہیں تھا اب تک — تجھ سے مل کر بھی مجھے غم ہوگا

تیرے کانوں میں جو آتی ہے صدا — میرے جذبات کا ماتم ہوگا

اہلِ اخلاص و محبت کے حضور — سرِ تسلیم مرا خم ہوگا

ہجر کے درد کا درماں کیسا — ہجر کا درد تو پیہم ہوگا

مسکرا دے کہ تبسم تیرا — زخمِ دل کے لیے مرہم ہوگا

آہ وہ اشک جو اُس دامن پہ — کبھی شعلہ، کبھی شبنم ہوگا

آج جس دور میں ہم زندہ ہیں — اس سے بڑھ کر نہ جہنم ہوگا

جو نہ ہو جبر سے مرعوب کبھی — وہی اک شخص مکرم ہوگا

تو کہ مصروفِ طرب ہے پیہم — تو کہاں چارہ گرِ غم ہوگا

نذرِ سائل جو کرے جان اپنی — وہی اس دور کا حاتم ہوگا

نہ سنا دل کا فسانہ رفعتؔ

وہ مزاج اور بھی برہم ہوگا

اختر ہوشیارپوری

○

جب راز خود ہی فاش ہو غم خوار کیا کرے
روزن جگہ جگہ ہوں تو دیوار کیا کرے

اُٹھ کر کہاں کو جائیے جب روشنی نہ ہو
تاریکیوں میں دیدۂ بیدار کیا کرے

جنسِ وفا کا بھاؤ کوئی کِس سے پُوچھتا
بازار ہی نہ ہو تو خریدار کیا کرے

آنچل کی آڑ لے پسِ دیوار ہو رہے
طوفاں میں اور شعلۂ رخسار کیا کرے

دنیا تمام حشر کے سانچے میں ڈھل گئی
جانے اب اور آپ کی رفتار کیا کرے

کس کے لیے ہو سینہ سپر جلتی دھوپ میں
رہرو نہ ہو تو سایۂ دیوار کیا کرے

جب لوگ چاہتے ہوں کہ گرمی کی رُت رہے
اختر ہوائے پیرہنِ یار کیا کرے

غلام رسول طارق

○

یارا نہیں جن میں دشمنی کا — دعویٰ نہ کریں وہ دوستی کا
عنواں نہ ملے جو خود سری کا — کھُلتا نہیں باب آگہی کا
اُن کو تھا خیال دوستی کا — وہ دَور گزر چکا کبھی کا
دستور نہیں کچھ اس صدی کا — کب دَور نہ تھا رواروی کا
اے دوست گِلا نہ کر کسی کا — احساس ہے یہ بھی کمتری کا
وہ چاند اُتر چکا ہے دل میں — محتاج نہیں جو روشنی کا
بہتان ہے یہ کہ جی رہا ہوں — الزام ہے مجھ پہ زندگی کا
جینے کو تو جی رہی ہے دُنیا — جینا ہے مگر کسی کسی کا
ایماں ہی نہ ہم رکھیں شکوں پر — سوچا ہے علاج بیکلی کا
جس وقت سحر قریب ہوگی — پوچھیں گے مزاج چاندنی کا

وہ پوچھ رہے ہیں مجھ سے طارقؔ
کیا حال ہے تیری شاعری کا

ضمیر اظہر

○

کچھ بھی نہیں زباں پہ اک نام کے علاوہ
اب کام اور کیا ہے اس کام کے علاوہ

فصلِ بہار آئی پیغامِ یار لے کر
کیا دوں بہار کو میں پرنام کے علاوہ

دن رات مندروں میں مسحور رہنے والو
حُسن جہاں بھی دیکھو اصنام کے علاوہ

کیفیتِ محبت قائم اُسی طرح ہے
گو اور بھی ستم تھے اِلزام کے علاوہ

اِک پھول نور کا تھا یا خواب چاندنی کا
دیکھا نہ پھر یہ منظر اس بام کے علاوہ

اک دل کہ باوفا ہے حاضر ہے جانِ اظہر
مخلص ہُوں کچھ نہیں ہے اس جام کے علاوہ

○

فکرِ سخن میں غم کی لہریں بنا رہا ہوں
حسرت کے پیچ و خم کی لہریں بنا رہا ہوں

مشکل پسندئ دل بے تاب ہو رہی ہے
پھر گیسوئے صنم کی لہریں بنا رہا ہوں

دنیا کے مشغلوں میں پھر مبتلا ہُوا ہوں
پھر فکرِ بیش و کم کی لہریں بنا رہا ہوں

بن کر سراب پیچ - صحرائے آرزو میں
ریگِ فریبِ غم کی لہریں بنا رہا ہوں

آوازِ دل سے ڈر کر اظہر شبِ سیہ میں
وحشت کے زیر و بم کی لہریں بنا رہا ہوں

ضمیر اظہر

○

اے یار تری خاطر سب قرض چکا بیٹھے
مدت سے ہیں دنیا میں دنیا سے جدا بیٹھے

ہلکی سی بھی رنجش کا امکاں ہی نہیں اب تو
دل ہم کو بھلا بیٹھا، ہم دل کو بھلا بیٹھے

امید و تمنا کا کیسے ہو سبب پیدا
اک شوق کی خاطر جب سب شوق لٹا بیٹھے

اک فرض شناسی تھی، احساسِ مروت تھا
جو غم بھی ملا تجھ سے سینے سے لگا بیٹھے

اب اور ستم ہم پر ڈھائے گا زمانہ کیا
ممکن تھے ستم جتنے چپ چاپ اٹھا بیٹھے

فرزانے تھے یوں سب تو دیوانے ہوئے لیکن
جو لوگ محبت کی سرکار میں آ بیٹھے

دہراتے رہے پیہم رودادِ وفا میری
مل کر جو کہیں اظہر کچھ اہلِ جفا بیٹھے

○

بن پڑی دل پہ تو غم کام نہ کوئی آیا
بارہا رونے سے آرام نہ کوئی آیا

ایک تدبیر کے انجام کئی ممکن تھے
جانے کیوں سامنے انجام نہ کوئی آیا

شور تھا فیضِ بہاراں کا۔ مگر اہلِ قفس
منتظر ہی رہے پیغام نہ کوئی آیا

جام در جام سرِ بزم کئی جام چلے
ہم تہی دست رہے جام نہ کوئی آیا

جانے کیا ہم کو ہوا ایک حسیں نام کے بعد
لب پہ جز آہ و فغاں نام نہ کوئی آیا

کام کے یوں تو نظر آتے تھے یار و احباب
کام جب ہم کو پڑا کام نہ کوئی آیا

صبر کی تاب کے قابل نہیں نکلا اظہر
دل کہ جس پہ کبھی الزام نہ کوئی آیا

سیف زلفی

○

زخمِ جبیں سے دل کا چمن ہے لہو لہو
اس نیشتر سے سارا بدن ہے لہو لہو

گلشن میں شغلِ ناخنِ گلچیں کے سامنے
یارو ہر ایک غنچہ دہن ہے لہو لہو

مارے شکاریوں نے کمیں گاہ سے وہ تیر
زخموں سے ہر غزالِ ختن ہے لہو لہو

برسی ہیں اتنی سُرخ گھٹائیں کہ الاماں
بہتا ہے خوں، چمن کا چمن ہے لہو لہو

رِستے ہیں کب سے جسم کے ناسور دوستو
کب سے قبائے سرو سمن ہے لہو لہو

تیرِ صبا سے، لالۂ خونیں کفن، ہنوز
مثلِ شہید ارضِ وطن ہے لہو لہو

احساس کی تھکن سے پسینہ ہے لالہ گوں
دکھ سے ہر اک جبیں کی شکن ہے لہو لہو

ہر دل برنگِ خونِ شفق زار، سُرخ سُرخ
ہر آنکھ مثلِ گنگ و جمن ہے لہو لہو

دل قاش قاش زہرِ صداقت نے کر دیا
تھوکا ہے اتنا خوں کہ لگن ہے لہو لہو

زنداں کے خونچکاں در و دیوار چیخ اُٹھے
بس، ہر اسیرِ طوق و رسن ہے لہو لہو

نوکِ قلم سے سُرخ پھریرے اُڑائیے
زلفی مزاجِ اہلِ سخن ہے لہو لہو

بہاء الدّین کلیم

○

شمع پہلے کی طرح لَو دے، یہ اب مشکل ہے
پھر اُسی طرح جمے بزمِ طرب، مشکل ہے

ایک وہ دن تھا کہ چھُوتے تھے فلک کو نالے
ایک یہ دن ہے کہ اب جنبشِ لب مشکل ہے

پھول ہی راہ میں ہوں، پاؤں میں کانٹے نہ چبھیں
یہ تو اے راہ روِ راہِ طلب مشکل ہے

اب تو ہر شاخِ چمن پہ ہے نشیمن بھاری
کیا کرے بلبلِ برباد، عجب مشکل ہے

نغمۂ موجِ صبا، رقصِ شعاعِ مہتاب
ہوش میں اپنے رہے لیلیٰ شب، مشکل ہے

یہ تری مست نگاہی! یہ فروغِ مے و جام
آج ساقی ترے رندوں سے ادب مشکل ہے

تیرے قدموں سے جُدا ہو کے بھی جینا اے دوست
پہلے ممکن ہے کہ آسان ہو، اب مشکل ہے

درِ میخانہ پہ بے خود پڑے رہتے ہیں کلیمؔ
ان کو واپس کوئی لے آئے یہ اب مشکل ہے

وارث کرمانی

○

(بیادِ غالب)

ہمدم خدا کی مار وہ دن بھی گزر گئے
جب دل حریفِ آتشِ قہر و عتاب تھا

جاں دوستوں کی چارہ گری سے لبوں پہ تھی
سر دشمنوں کی سنگ زنی سے عذاب تھا

دامن سگانِ کوئے محبت سے تار تار
چہرہ خراشِ دستِ جنوں سے خراب تھا

واں اعتمادِ مشقِ سیاست کی حد نہ تھی
یاں اعتبارِ نالۂ دل بے حساب تھا

وہ قتل پر بضد تھے ہم افشائے قتل پر
اُن کی نظیر تھی نہ ہمارا جواب تھا

گفت و شنید و شورِ شکایات و احتجاج
ایسے مراسلوں کا وہاں سدِ باب تھا

در پردہ جامِ زہر پلانے کی فکر تھی
ظاہر میں ذکرِ شاہد و شمع و شراب تھا

ہر بات ناقدوں کی طرح پیچ و خم لیے
ہر لفظ شاعروں کی طرح انتخاب تھا

کچھ پھول کچھ نسیمِ بہاراں کچھ آبشار
کیا رنگ خوش کلامی و طرزِ خطاب تھا

وہ مسکرا کے دل پہ گراتے تھے بجلیاں
اس طرفہ دلبری کا بھلا کیا جواب تھا

ہر جلوہ ایک دفترِ آشوبِ روزگار
ہر غمزہ علمِ فتنہ گری کی کتاب تھا

خوابیدہ ہر نظر میں بنائے فسادِ خلق
پوشیدہ ہر روش میں نیا انقلاب تھا

آج اس غزل میں ہم پہ قیامت گزر گئی
کیا گرمئ خیال تھی کیا التہاب تھا

کیف احمد صدیقی

○

دل میں جو سوز ہے وہ کسی پر عیاں نہیں
یہ وہ سلگتی آگ ہے جس میں دُھواں نہیں
اے زلفِ یار جو مرے دل کو نصیب ہیں
تیری تڑپ میں بھی وہ پریشانیاں نہیں
یہ ساعتِ نمازِ محبت ہے زاہدو
دھڑکن ہے میرے دل کی صدائے اذاں نہیں
کرتا ہوں میں تلاوتِ قرآنِ زندگی
آوازِ بندگی ہے یہ شورِ فغاں نہیں
ہر دور میں کھلا ہوں محبت کی شاخ پر
میں غنچۂ بہار ہوں، برگِ خزاں نہیں
اللہ رے یہ میرے مقدر کی تیرگی
اب دل میں تیرے درد کی بھی کہکشاں نہیں
پیراہنِ حیات میں لاکھوں ہیں سلوٹیں
لیکن کسی جگہ بھی شکن کا گماں نہیں
اے کیفؔ دُور تک ہیں ترے فن کی شہرتیں
کیا غم جو گھر میں کوئی ترا قدرداں نہیں

○

میرے فقیرِ دل کی جسے بد دعا ملے
شہرِ طرب میں رہ کے بھی وہ غمزدہ ملے
اوراقِ یادداشت پلٹ کر تو دیکھیے
شاید کسی ورق پہ مرا تذکرہ ملے
وہ درد ہو کہ اشکِ مسرت ہو یا الم
مجھ کو تو راہِ عشق میں سب بے وفا ملے
تم خواب میں بھی آؤ اگر بھول کر کبھی
بیمارِ انتظار تمھیں جاگتا ملے
یوں مجھ کو تیرے غم نے گرفتار کر لیا
جیسے بغیرِ جرم کسی کو سزا ملے
دل میں اگر چراغِ تجسس ہو ضو فگن
تاریک بتکدہ میں بھی تجھ کو خدا ملے
اے نا قدرانِ وقت ذرا غور سے پڑھو
شاید کلامِ کیفؔ میں کچھ فلسفہ ملے

○

اختر انصاری (اکبر آبادی)

اپنی بہار پہ ہنسنے والو، کتنے چمن خاشاک ہوئے
اپنے رفو کو گننے والو، کتنے گریباں چاک ہوئے

دیوانوں کو کون بتائے آج کی رسم اور آج کی بات
اُس نے انھیں کی سمت نظر کی عشق میں جو بیباک ہوئے

شعبدۂ یک طرزِ کرم ہے کیسی سزا اور کیسی جزا
موجِ تبسّم جب لہرائی، تر دامن بھی پاک ہوئے

رُخ دیکھا جس سمت ہوا کا اُس جانب منہ کر کے چلے
دشتِ جنوں کے دیوانے بھی مثلِ صبا چالاک ہوئے

خاکِ نشیمن جب اُڑتی ہے دل سے دھواں سا اُٹھتا ہے
حادثے اِس گلزار میں ورنہ اور بہت غمناک ہوئے

دیکھتے دیکھتے دُنیا بدلی گلشن کیسا ویرانہ کیسا
پربت پربت نقش تھے جن کے مٹتے مٹتے خاک ہوئے

جانِ چمن جو گُل تھے اخترؔ وہ تو ہوئے معتوب و ذلیل
زیبِ گلستاں رونقِ گلشن کل کے خس و خاشاک ہوئے

بشیر منذر

○

ہر روز ہی دن بھر کے جھمیلوں سے نمٹ کے
رو لیتے ہیں ہم رات کے آنچل سے لپٹ کے

ہم کون ہیں، کیوں بیٹھے ہیں یوں رہگزر پر
پوچھا نہ کسی ایک مسافر نے پلٹ کے

یا پھول تھے جو بن نہ سکے ہار گلے کا
یا خار تھے ہم کوئی کہ ہر آنکھ میں کھٹکے

کیا کیا تھے مرے دل کے صحیفے میں مضامین
دیکھا نہ کسی نے بھی ورق کوئی اُلٹ کے

پھرتے رہے آوارہ خیالات کی صورت
کیا چیز تھی ہم جس کے لیے دہر میں بھٹکے

شب کروٹیں لیتے ہوئے گزرے گی نہ مُنذر
سو جاؤ میاں! درد کی بانہوں میں سمٹ کے

زبیر رضوی

○

اپنے گھر کے در و دیوار کو اونچا نہ کرو
اتنا گہرا مری آواز سے پردا نہ کرو

کل نہ ہو یہ کہ مکینوں کو ترس جانے یہ گھر
دل کے آسیب کا ہر ایک سے چرچا نہ کرو

جو نہ اک بار بھی چلتے ہوئے مڑ کے دیکھیں
ایسی مغرور تمناؤں کا پیچھا نہ کرو

اپنی پہچان کے سب رنگ مٹا دو نہ کہیں
خود کو اتنا غمِ جاناں سے شناسا نہ کرو

عشق آثار زلیخاؤں کی اس بستی میں
صاحبو پاکیٔ داماں پہ بھروسا نہ کرو

ہو اگر ساتھ کسی شوخ کی خوشبوئے بدن
راہ چلتے ہوئے مہ پاروں کو دیکھا نہ کرو

چہرہ غیروں کی طرف روئے سخن میری طرف
حالِ دل یوں سرِ احباب تو پوچھا نہ کرو

تازہ غزلوں کو رسائل میں نہ چھپواؤ زبیرؔ
کوئی کہتا ہے مرے نام کو رسوا نہ کرو

○

شوخیٔ عریاں ہے بہت جن کے شبستانوں میں
وہ ملے ہم کو حجابوں کے صنم خانوں میں

وضعِ اربابِ جنوں کھینچ کے ملے ہے ہم سے
پھول ٹانکے ہیں نئے ہم نے گریبانوں میں

کھڑکیاں کھولو کہ در آئے کوئی موجِ ہوا
راکھ کا ڈھیر ہیں کچھ لوگ طرب خانوں میں

شہرِ خورشید کے لوگوں کو خبر دو کوئی
دن کے غم ڈوب گئے رات کے پیمانوں میں

جب کوئی ساعتِ نایاب ملی جام بکف
جان سی پڑ گئی بجھتے ہوئے ارمانوں میں

اے صبا لے کے چلی آ کسی بادل کی پھوار
خاک اڑتی ہے بہت دل کے بیابانوں میں

اک نگاہِ غلط انداز پہ مچلا ہے یہ دل
ہم بھی شامل ہوئے اس شوخ کے دیوانوں میں

اے غزالانِ وطن ناز کرو ہم پہ کہ ہم
آخری پشت ہیں خوباں کے ثنا خوانوں میں

تیرا وجود

احمد وصی

تم سمجھتے ہو، سلگتی ہوئی تنہائی میں
اس جگہ،
کوئی نہیں ہے جو دھڑکتے دل کی،
اور
تمھارے لب اظہار کی خاموشی کی، گفتگو سن سکے
جذبات کی باتیں سمجھے
تم کو یہ بھول ہے سانسوں کا امنڈتا طوفان
اور دھڑکتے ہوئے جذبوں کا مچلتا ہیجان
دیکھنے والا، یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں
کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو بہکتے پاؤں
کانپتے ہاتھوں کے ناپاک ارادوں کے قدم
اور ہوس ناک نگاہوں کی طرف دیکھ سکے
تم سمجھتے ہو کہ ایسے میں یہاں کوئی نہیں
یہ مگر بھول ہے،
اک بھول ہے اور کچھ بھی نہیں
کیونکہ تم دونوں کے اس جرم کا روپوش گواہ
میں بھی موجود ہوں
ایسے میں، یہاں میں بھی ہوں

○

اقبال ماہر

پرتوِ حسنِ یار سے چہرۂ آفتاب فق　　شاخِ نجوم سرنگوں لالہ و گل عرق عرق

تیری تلاش میں کبھی اُلٹے جو پھول کے ورق　　ذکر ترا سطر سطر نام ترا سبق سبق

عشق کی نامرادیاں خشک ہیں دل کی وادیاں　　کشتِ امید بے گیاہ دشتِ حیات لق و دق

غم کی حکایتیں غلط ان کی شکایتیں فضول　　جن سے نہ وعدۂ نباہ جن پہ نہ اپنا کوئی حق

عرضِ نیاز دل پہ تھا دونوں طرف عجیب حال　　عشق کو تھیں ندامتیں حسن بھی تھا عرق عرق

ماہ و نجوم سیرگاہ عرش پہ بھی مری نگاہ　　میرا زمیں سے واسطہ کون و مکاں پہ میرا حق

علم تھا بے اثر مگر عشق کی ایک ضرب سے　　کھل گئے فکر و ذہن پہ آج چہار دہ طبق

عقل ہے گم نجوم چپ درس گہِ علوم بند　　شرحِ وفا بڑی کٹھن دل کی زباں بہت ادق

پرسشِ غم کا شکریہ چشمِ کرم کا شکریہ　　آج رخِ حیات پر آتو گئی ذرا رمق

بطنِ صدف سے ماہ تک سلسلۂ جمالِ یار　　حدِ نظر سے بھی وسیع میرے خیال کا اُفق

بادِ صبا کا بانکپن قوسِ قزح کا پیرہن　　رخ پہ تجلیِ سحر لب پہ تبسمِ شفق

چشمِ غزل طراز نے ان کو ادب بنا دیا　　میری کتابِ شوق کے بکھرے ہوئے تھے جو ورق

رازِ طلسمِ ہست و بود کیا ہے معمۂ وجود　　دفترِ آگہی خموش چہرۂ فلسفی ہے فق

ماہرِ درد آشنا جھیل گیا غمِ حیات
تم نے مگر جو دکھ دیا دل کو بہت ہوا قلق

○

منظر مفتی

زندگی شور ہے تماشا ہے　　اور تو خامشی پہ مرتا ہے

ایک دن میں بھی گھر سے نکلا تھا　　ایک سایہ سا یاد پڑتا ہے

برف پگھلے تو کنج سے نکلیں　　یخ فضاؤں میں سانس جلتا ہے

اس اجالے سے تیرگی اچھی　　اپنا سایہ بھی جس میں ڈستا ہے

ہائے کیا دور آگیا دیکھو　　اپنا گھر بھی پرایا لگتا ہے

شہر جاؤں تو جانے کیا گزرے　　گھر میں ہوں اور دل سلگتا ہے

جانے کیا ہو گیا ہے اس دل کو　　آپ اپنے سے اب الجھتا ہے

اک کرن تک نہیں دریچوں میں　　اور دل ہے کہ پھر بھی ملتا ہے

میں اسے ایک پھول کہتا ہوں　　وہ مجھے خاک پا سمجھتا ہے

اس کو کہتے ہو ارتقا منظر

آدمی آدمی سے ڈرتا ہے

○

مصحف اقبال توصیفی

چاند نے اپنا دیپ جلایا، شام کبھی ویرانے میں
اُس کی بستی دور ہے شاید دیر ہے اُس کے آنے میں

دیا پتھر کی بھاری سِل ہے ایک اک لمحہ ماضی کا
دیکھو، دب کر رہ جاؤ گے اتنا بوجھ اُٹھانے میں

اپنی ذات سے کچھ نسبت تھی وہ بھی اُس کی خاطر سے
میرا ذکر نہیں ملتا ہے اب میرے افسانے میں

ایک ہی دُکھ تھا میرا اپنا وہ بھی اس کو سونپ دیا
آخر دل کی بات زباں تک آ ہی گئی انجانے میں

اب تو تم بھی جان گئے ہو تم کو کیا سُکھ ملتا تھا
میرے گھر کے کام میں میری ماں کا ہات بٹانے میں

میری راتوں میں جھکے ہیں جو سپنوں کی ڈالی ہے
رنگ ہے ان پھولوں کا شامل آج ترے شرمانے میں

جس سے بات بھی کرنی مشکل وہ بھی اس محفل میں ہو گی
مصحفؔ کیسا لطف رہے گا، اُس کو شعر سنانے میں

نثار احمد فاروقی

○

اللہ نہ اتنا بھی کوئی مجبورِ محبت ہو جائے
رو رو کے دعا کرتا ہوں مجھے اک شخص سے نفرت ہو جائے

یہ کس نے اِس سناٹے میں غم خانۂ دل پر دستک دی
حسرت ہو تو اندر آجائے، کہہ دو جو مسرت ہو: جائے!

ہے دور ابھی منزل غم کی، تم درد میں لذت چاہتے ہو
پہلے تو دلِ آرام طلب شائستۂ حسرت ہو جائے

صحرا کی تمنا کیوں کیجے، خود دل کا صحرا کیا کم ہے؟
محفل سے گریزاں کیوں رہیے، جب محفل خلوت ہو جائے

ہر سانس کی آمد و شد میں اب اک نام نکلتا ہے پیہم
اے عشق نہ اتنا مجھ کو ستا ہر سانس قیامت ہو جائے

بے نام خلش سی ہے دل میں، یہ خواہش ہے یا کاہش ہے
گر حرف و بیاں میں آجائے، دنیا کی حکایت ہو جائے

کچھ ہجر کا خوف نہیں ہے ہمیں تو وصل کا دھڑکا رہتا ہے
اتنی ہی دوری بڑھتی ہے یاں جتنی قربت ہو جائے

نثار احمد فاروقی

○

(نذرِ میر)

طالعوں میں لکھی تھیں رسوائیاں
احتیاطیں بھی نہ کچھ کام آئیاں

آج آرے ہو رہے ہیں دل کے زخم
چل رہی ہیں یاد کی پُروائیاں

یہ خرابِ چشمِ ساقی گر نہیں
موجِ مے کیوں لیتی ہے انگڑائیاں

اُف وہ لہجے کا ترنّم اور گداز
خود بخود جوں بج اُٹھیں شہنائیاں

جن پہ تہمت وصل کی دھرتے ہیں سب
ہجر میں گھڑیاں کچھ ایسی آئیاں

خود نہیں ہے تجھ کو بھی جن کی خبر
وہ ادائیں میرے دل کو بھائیاں

جو سُنا کرتے تھے باتیں عشق کی
دل نے آخر سب وہ کر دکھلائیاں

میرؔ جی کے فیض سے ہم بھی نثارؔ
کر رہے ہیں قافیہ پیمائیاں !

نثار احمد فاروقی

○

ہائے دردِ مہجوری خود ہی ہو گیا کم بھی
وقت کتنا ظالم ہے زخم بھی ہے مرہم بھی

لذّتِ غمِ دل سے وہ تو تھے ہی بیگانے
ہم دلبری سے کچھ آشنا نہ تھے ہم بھی

تم سے کیا شکایت ہو کج ادائی کی ہم کو
خود ترس نہیں کھاتے اپنے حال پر ہم بھی

غم کا بوجھ وہ دل پر کس طرح اُٹھاتا ہے
جو نہ دیکھ سکتا ہو گل پہ اشکِ شبنم بھی

یاس کے اندھیروں میں اشکِ غم فروزاں ہیں
جشن سے نہیں ہے کم شہرِ دل کا ماتم بھی

بولتے ہیں سناٹے، جاگتی ہے تنہائی
وحشتوں کی بستی ہے بے کسی کا عالم بھی

تیرے سانس کی خوشبو، تیری آنکھ کا جادو
یاد بن گئے ہیں جب زہر ہو گیا غم بھی

اے نثار جس دن سے روٹھ کر گئے ہیں وہ
کچھ خفا سے رہتے ہیں اپنے آپ سے ہم بھی

نثار احمد فاروقی

○

(میر کی زمین میں ۔ معذرت کے ساتھ)

جب بھی تیرے دیوانے کوچے سے تیرے پھرتے ہیں
شہر کے لڑکے بالے اُن کو گھیرے گھیرے پھرتے ہیں

مہکا ہوا تھا صحرائے جاں جس محمل کی خوشبو سے
اُس محمل کی کھوج میں اب ہم ڈیرے ڈیرے پھرتے ہیں

منگنا تیرے درشن کے ہیں، نینوں کے کچکول لیے
جوگی کا سا بھیس بنائے سانجھ سویرے پھرتے ہیں

کیا کیا اپنی وضع پہ ہم کو ناز تھے، کیسے خوار ہوئے
حال پریشاں، چاک گریباں، بال بکھیرے پھرتے ہیں

یوں پھرتے ہیں اس دُنیا میں نالہ بلب آوارہ ہم
جنگل جنگل بین بجاتے جیسے سپیرے پھرتے ہیں

اپنی متاعِ جان و دل کو شہرِ حسن میں مت لے جاؤ
بستی یہ پُرخوف و خطر ہے اس میں لٹیرے پھرتے ہیں

میر کا قول نثار ہمارے حال پہ کتنا صادق ہے
"بختِ چنیں برگشتہ اپنے کس کے پھیرے پھرتے ہیں"

نظیر صدیقی

○

بدل گئی ہے کچھ ایسی ہوا زمانے کی
کہ عام ہو گئی عادت نظر چرانے کی

انھیں خبر نہیں وہ خود بھی آزمائے گئے
جنھیں تھی فکر بہت مجھ کو آزمانے کی

یہ بات کاش سمجھتے سبھی چمن والے
چمن لٹا تو نہیں خیر آشیانے کی

ملا نہ کچھ تو اثر آئے خود فریبی پر
ہمیں تو ایسی ہے عادت فریب کھانے کی

کوئی کلی نہ رہی پھر بھی مسکرائے بغیر
سزا اگرچہ مقرر تھی مسکرانے کی

برا ہوں میں کہ بھلا، وقت خود بتا دے گا
ابھی سے فکر ہے کیوں مجھ کو آزمانے کی

ہوا یہی کہ وہ تکمیل تک پہنچ نہ سکا
بہت لطیف تھی تمہید جس فسانے کی

اک آپ ہی پہ نہیں منحصر جناب نظیرؔ
بڑے بڑوں کو ہوا لگ گئی زمانے کی

XO-25-193-66-UD

مولانا عبدالسّلام نیازی

شاہد احمد دہلوی

مولانا اپنی وضع قطع سے ریٹائرڈ پہلوان معلوم ہوتے تھے۔ میں نے انہیں اب سے چالیس پہلے قاضی کے حوض پر ایک گندھی کی دکان پر بیٹھے دیکھا تھا۔ یہ گندھی صاحب بھی کچھ اس گت کے آدمی تھے کہ جو بھی ادھر سے گزرتا اس کی نظر خواہ مخواہ ان پر پڑتی تھی۔ لحیم شحیم، گوشت کا ایک کالا پہاڑ دکان کے تھڑے پر دھرا دکھائی دیتا تھا۔ رنگ سیاہ، خوب گھٹا ہوا۔ کالی گول داڑھی، سفید سفید آنکھیں ایسی دکھائی دیتی تھیں جیسے تمباکو کے پنڈے میں کوڑیاں جڑی ہوئی ہوں۔ کرتا پاجامہ اُجلا براق پہنتے تھے۔ یوں ان کا کالا رنگ اور بھی چمک اُٹھتا تھا۔ سامنے تیل کے کنٹر چنے رہتے تھے۔ مولانا کا رنگ میدہ و شہاب تھا۔ سر گھٹا ہوا، اس پر چپنی ہوئی دوپلی۔ گول چہرہ کشادہ پیشانی، جگر جگر کرتی آنکھیں۔ کتاراسی ناک۔ موزوں دہن پتلے پتلے ہونٹ، ان پر پان کی سُرخی جو پھیل کر باچھوں میں بھی آگئی تھی۔ داڑھی مونچھ صاف، جیسے بھدرا کرا دیا ہو۔ گلے میں باریک ململ کا کرتا۔ آڑا پاجامہ نیم ساق تک چوڑیاں پڑی ہوئیں۔ پاؤں میں سلیم شاہی، کندھے پر شالی رومال۔ وضع قلندرانہ، مزاج شاہانہ۔ اس وقت جوانی سے گزر کر ادھیڑ عمر میں قدم رکھ چکے تھے۔ حوض قاضی کی دکان پر گندھی صاحب کے پہلو بہ پہلو بیٹھے دکھائی دیتے تھے۔ ایک صاحب نے رات کا اندھیرا منہ پر مل رکھا تھا دوسرے صاحب نے دن کا اجالا۔ عجب اجتماعِ ضدین تھا۔ یوں اور بھی نظریں ان کی طرف کھنچتی تھیں۔ دنوں نہیں، برسوں، یہ دن رات کا تماشہ ہم دیکھا کیے۔

مولانا کے علم و فضل کی تعریفیں غائبانہ بہت سنیں تو انہیں دیکھنے کا اشتیاق ہوا۔ اور ایک دن سترھویں میں انہیں خواجہ حسن نظامی کے پکھوٹے لگے دیکھا تو میں نے اپنے ایک ساتھی سے پوچھا کہ "یہ کون صاحب ہیں؟" انہوں نے حیرت سے میری دیکھا۔ بولے "آپ انہیں نہیں جانتے؟" میں نے کہا "دیکھا تو اکثر ہے مگر——" وہ بولے "ارے صاحب! یہ مولانا عبدالسّلام صاحب نیازی ہیں۔" میں نے چونک کر ان کی طرف دیکھا اور میں نے ہوئے شمار روائتیں ان کے بارے میں سنی تھیں سب میرے تخیّل میں ہجوم کر آئیں۔

اس واقعے کے بعد کوئی پچیس سال تک میں مولانا کو دیکھتا رہا، اور کبھی کبھی ان کی مختصر گفتگو سننے کا مجھے اتفاق ہوا، مگر مجھے ان سے ڈر لگتا تھا، اس لیے میں نے ان سے قریب ہونے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ میرے لیے وہ ہمیشہ دُور کا جلوہ ہی رہے۔ میں پاکستان چلا آیا تو وہ آنکھوں سے بھی دور ہوگئے، اور اب تو وہ بہت دور ہوگئے — اتنی دور کہ اب آنکھیں انہیں کبھی نہ دیکھ سکیں گی۔

مولانا نے ساری دنیا کا علم چاٹ رکھا تھا۔ عربی، فارسی اور اردو کے منتہی تھے۔ مذہبی علم، معقول و منقول، دونوں ان کے پاس اتنا تھا کہ سوائے مولوی ایوب کے کوئی اور ان کے آگے ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ ہر علم سے خدا کا وجود ثابت کر دیتے تھے۔ یہاں تک کہ علم موسیقی سے بھی۔ حافظہ غضب کا پایا تھا۔ ہر کتاب انہیں ازبر تھی، یہاں تک کہ بعض کتابوں کے صفحے بھی بتا دیتے تھے کہ فلاں صفحے پر دیکھو، یہ عبارت ملے گی۔ مزاج میں درشتی بہت تھی اس لیے اپنی شاگردی میں مشکل ہی سے کسی کو قبول کرتے تھے۔ مگر جس کو انہوں نے پڑھا دیا وہ پارس بن گیا۔ شاگرد سے ناراض ہوتے تھے تو اسے سخت سے سخت سزا دیتے تھے۔ مثلاً اسے ستون سے باندھ دیتے اور زیادہ غصہ آتا تو اسے بید سے ادھیڑ کر رکھ دیتے۔ علم کا ایک سمندر تھا کہ

ان کے دماغ میں موجیں مارتا رہتا تھا۔ چاہتے تھے کہ شاگرد بھی انہی جیسا ہو جائے۔ جب یہ توقع پوری نہ ہوتی تو جھنجلا جاتے اور شاگرد کی شامت آجاتی۔

مولانا کی گفتگو بڑی نستعلیق ہوتی تھی۔ کبھی علمی لہر آجاتی تو ادق استعاروں میں بولنے لگتے۔ مثلاً ایک دفعہ رنڈی کے متعلق فرمایا کہ " اس مشتِ لحمی کو تو عمود زریں چاہیے۔" اور کبھی ٹکسالی لہر آجاتی تو سہلِ ممتنع پیرایۂ بیان اختیار کرتے۔ مثلاً جوش ملیح آبادی کی کافرانہ باتیں سن کر فرمایا کہ " تمہارا دماغ تو شیطان کی کھڈی ہے۔" کبھی درگا کا گانا سنتے تو اس کے گلے کی تعریف بھی کرتے اور اس کی انگلیوں کی بھی۔ فرماتے تھے کہ "تمہاری انگلیاں کیا ہیں ہری مرچیں ہیں۔" نظام دکن میر عثمان علی خاں ایک زمانے میں دنیا کے سب سے زیادہ دولت مند آدمی تھے۔ مولانا کے ایک بہی خواہ نے مولانا سے کہا کہ " آپ اگر نظام کو ایک درخواست لکھ دیں تو آپ کا وظیفہ مقرر ہو جائے گا۔" مولانا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ غصے سے بولے " نظام کی ساری دولت ایک پلڑے میں اور میرا ایک بوسیدہ سے بوسیدہ بال دوسرے پلڑے میں رکھ دو تو میرا بال ہی بھاری اترے گا۔"

مولانا کا بظاہر کوئی ذریعہ آمدنی نہیں تھا۔ معلّمی کا وہ کچھ نہیں لیتے تھے۔ لوگوں کو صرف یہ معلوم تھا کہ مولانا تیل بنا کر بیچتے ہیں۔ ننھو تیلی سے ان کا دوستانہ تھا۔ اس کے لڑکے کو بھی مولانا نے پڑھایا تھا۔ قاضی کے حوض پر جس گندھی کی دکان تھی اس سے بھی ان کا دوستانہ تھا۔ بس یہی دو تیلی تھے۔ جن سے مولانا خرید و فروخت کرتے تھے۔ مگر یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ کیسا تیل خریدتے تھے، کتنا خریدتے تھے، اسے بناتے کس طرح تھے، کس وقت بناتے تھے اور کب بیچتے تھے۔ مولانا کے خرچ بڑے اجلے تھے۔ اور ان کا ہاتھ بھی کھلا ہوا تھا۔ تیل سے ایسی کیا یافت ہو جاتی ہوگی؟ ہم تو کہتے تھے: "میاں تیل دیکھو، تیل کی دھار دیکھو۔" ایک صاحب کہتے تھے کہ مولانا کو تیل کا نسخہ ایک مؤکل نے بتایا تھا، اس لیے ان کا تیل خوب بکتا تھا، کیونکہ کسی اور کو تو یہ تیل بنانا آتا نہیں تھا۔ دلّی والوں میں یہ بھی مشہور تھا کہ مولانا کو دستِ غیب ہے۔ ان کی جیبوں میں ہر وقت نوٹ بھرے رہتے تھے۔

مولانا کو گانا سننے کا شوق تھا۔ نعتیں اور غزلیں سنتے تھے۔ سوئی والوں میں گانے بجانے والوں کا ایک خاندان شاہی زمانے سے رہتا تھا۔ اسی خاندان کا ایک لڑکا جس کی مسیں بھیگ رہی تھیں کسی عرس میں مولانا کی نظر پڑ گیا۔ مولانا حسن پرست بھی تھے۔ حسنِ مجازی میں انہیں حسنِ حقیقی کا جلوہ نظر آتا تھا کیوں نہ ہو، صوفیٔ صافی تھے۔ ہر اچھی شکل میں جلوہ دیکھ لیتے تھے۔ عثمان کا شمار حسینوں میں نہیں تھا۔ ہاں سانولا سلونا لڑکا تھا۔ مولانا نے اسے اپنے کمرے میں بلانا شروع کر دیا۔ اس سے دو چار چیزیں سنتے اور پانچ روپے دے کر رخصت کر دیتے۔ عثمان کے ساتھ اس کا جوڑی دار رمضان بھی جایا کرتا تھا۔ اس کا رنگ کھلا ہوا تھا، عمر میں عثمان سے ایک آدھ سال بڑا تھا۔ اسے پکے گانے کا شوق تھا مگر غزل گانے میں عثمان کو سہارا دیتا رہتا تھا۔ مولانا نے اس جوڑی کو اپنے ڈھب سے خوب سدھا لیا تھا۔ انہیں فارسی اور اردو کا متصوفانہ اور عاشقانہ کلام یاد کرا دیا تھا۔ مولانا ان دونوں کو اپنے کمرے پر بھی سنتے اور اپنے ساتھ دلی اور دوسرے شہروں کے عرسوں میں بھی لے جاتے۔ جب یہ دونوں گاتے تو مولانا کے ساتھ محفل بھی جھوم جاتی۔ ادھر مولانا نے دو چار روپے دیے ادھر روپے کا مینہ برس جاتا۔ دونوں لڑکے جھولیاں بھر بھر کے گھر لاتے۔ حاسدوں نے مولانا کے متعلق طرح طرح کی ہوائیاں اڑانی شروع کر دیں۔ شدہ شدہ یہ باتیں عثمان کے گھر والوں تک بھی پہنچیں۔ خاندان کے بڑے بوڑھے جمع ہوئے اور آپس میں مشورے ہوئے کہ اس بدنامی سے بچنے کے لیے کیا کیا جائے؟ کسی نے کہا "عثمان کو مولانا کے ہاں جانے سے روک دینا چاہیے۔" مگر اس صورت میں جو موٹی آمدنی ہو رہی تھی وہ بھی ماری جاتی۔ زبانِ خلق نے خاندان والوں کو مولانا کی طرف سے بدگمان کر دیا۔ انہوں نے کہا " بھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔ آبرو ہے تو سب کچھ ہے۔" لہٰذا عثمان کو روک لیا گیا۔ مولانا کے ہاں سے طلبی ہوتی تو اڑن گھاٹیاں بتا دی جاتیں۔ جب مولانا کی طرف سے اصرار بڑھا تو خاندان کے دو چار بزرگ مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سارا ماجرا عرض کیا۔ مولانا کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ مگر ضبط کر کے بولے " دنیا کچھ ہی کہا کرے"

بریشم قلندر۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔ ہاں میں تم سے کہتا ہوں کہ عثمان کا بدن میرے لیے ایسا ہے جیسا میری ماں کا بدن۔ عثمان کے بڑے بوڑھوں کا اطمینان ہوگیا اور عثمان کا آنا جانا پھر کھل گیا۔

مولانا قوالی بھی سنتے تھے اور ان پر کیف بھی طاری ہوتا تھا، مگر حال کھیلنے یا دوسرے صوفیوں کی طرح رقص کرنے کی نوبت نہ آتی تھی۔ جو شعر پسند آجاتا تھا اس کی تکرار کراتے تھے۔ خوب جھومتے تھے اور قوالوں کو روپیہ بھی خوب دیتے تھے۔ خسرو کی نعت "نمی دانم چہ منزل بود شب جائے کہ من بودم" بہت پسند تھی۔ مقطع کی تکرار ضرور کراتے تھے۔

عرسوں میں رنڈیوں کا گانا بھی سنتے تھے اور لطف اندوز ہو کر روپیہ بھی دیتے تھے۔ کبھی کبھی شدتِ کیف میں طوائف میں انہیں جلوہ دکھائی دے جاتا تو طوائف کو پاس بلا کر اس کا بوسہ لے لیتے۔ یہ گویا مولانا کی طرف سے انتہائی قدر دانی ہوتی تھی۔ طوائفیں بھی اس عمل کو اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتیں۔

مولانا بڑے خوش مزاج اور فقرے باز تھے۔ ایک دفعہ ایک عرس میں بہت سارے مشائخ اور صوفی جمع تھے کہ ایک حسین نوجوان طوائف اپنا گانا سنانے آبیٹھی۔ ایک صوفی صاحب نے اسے دیکھ "جل جلالہٗ" کا نعرہ لگایا۔ اتنے ہی میں اس کی نائکہ بھی آدھمکی۔ مولانا نے صوفی صاحب کی طرف دیکھ کر فرمایا۔ "لیجئے "عمّ نوالہٗ" بھی تشریف لے آئی ہیں۔" ایک قہقہہ پڑا اور موصوف پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

ریواڑی میں مولانا ایک گانے کی محفل میں شریک ہوئے۔ ایک پڑھی لکھی طوائف گا رہی تھی۔ مولانا نے اس سے فرمائش کی "تمہیں زیادہ سے زیادہ اشعار کی جو غزل یاد ہو سناؤ۔" اس نے کہا "حضور غزل تو نہیں، ہاں ایک خمسہ یاد ہے۔" فرمایا "سناؤ۔" اس نے چالیس بند کا ایک خمسہ سنایا۔ جب اس نے گانا ختم کیا تو مولانا نے تعریف کی اور فرمایا "جو چیز مجھے پسند آجاتی ہے میرے حافظے میں محفوظ ہو جاتی ہے۔" یہ کہہ کر پورا خمسہ اسی ترتیب سے سنا دیا۔

اب سے چالیس سال پہلے دلّی میں ایک لال بیگی تھا۔ نام اس کا صنم تھا۔ اس کی دو لڑکیاں تھیں جنہیں اس نے گانے بجانے پر لگا دیا تھا۔ گریہ دونوں بہنیں کہلاتی "بھنگنیں" ہی تھیں۔ صورت شکل کی بھی بری نہیں تھیں۔ سفید دوپٹہ، سفید کرتا اور سفید ڈھیلا پاجامہ، شریف بہو بیٹیوں کی سی وضع قطع۔ ایک بہن ڈھولک بجاتی تھی، دوسری ہارمونیم، اور دونوں مل کر گاتی تھیں۔ شین قاف درست، کلام اچھا یاد تھا، بھیری آوازیں، سماں باندھ دیتی تھیں۔ خود شائستہ تھیں۔ اس لیے محفل بھی شائستہ ہوتی تھی مولانا ان کا گانا بڑے شوق سے سنتے تھے۔ ایک دن رات کے دو بجے خدا جانے مولانا کو کیوں یاد آگئیں؟ اسی وقت حکیم علی رضا خاں کے گھر پہنچے۔ انہیں جگایا۔ وہ آنکھیں ملتے ہوئے آئے "خیر تو ہے مولانا؟" بولے "انہیں بلواؤ۔ ان کا گانا سنیں گے۔" بھلا مولانا کا کہنا ٹل سکتا تھا؟ اسی وقت آدمی گیا اور انہیں بلوا لایا۔ حکیم صاحب کی بیٹھک میں گھنٹہ دو گھنٹے گانا سنا اور انہیں کچھ دے دلا کر رخصت کیا۔

اسی زمانے میں جادورہ کا بخشا قوال دلّی میں آیا تھا اور خواجہ حسن نظامی کے ایک مرید شیخ یعقوب ٹھیکیدار کے ہاں رہنے لگا تھا۔ بخشا بھرے بدن کا نازک سا نوجوان تھا۔ اچکن اور آڑے پاجامے میں بہت اچھا لگتا تھا۔ بڑی انوٹ سے بول بناتا تھا اور لے کی تراش خراش بھی کرتا تھا۔ اس کا گیتیا جھمن خاں بھی عین بین اسی کا مثنیٰ تھا۔ ڈھولک بجانے میں اسے کمال حاصل تھا۔ بخشا جب پہلی مرتبہ سترھویں میں خواجہ صاحب کی محفل خاص میں گایا تو ساری دلّی میں اس کی شہرت ہو گئی۔ مولانا بخشا پر فدا ہو گئے تھے اور اکثر بلا کر اس کی قوالی سنتے تھے۔ بخشا بھی بڑی عقیدت سے انہیں اپنا گانا سناتا تھا۔ جب اور جہاں یاد فرماتے فوراً حاضر ہو جاتا۔ افسوس کہ بخشا جوان ہی مر گیا۔ جھمن خاں اب بھی زندہ ہیں مگر بخشا کے بعد سے زندہ درگور

ایک محفلِ خاص میں مولانا نے عثمان خاں کو گانے بٹھا دیا اور ایک فارسی غزل کی فرمائش کر دی۔ مولانا اس سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ ایک صوفی نے کسی شعر کو غلط بتا دیا۔ مولانا کو تاؤ آ گیا۔ بولے "نہیں، صحیح گا رہا ہے۔" خواجہ حسن نظامی بھی موجود تھے۔ انہوں نے صوفی کی طرفداری کی۔ مولانا بھڑک اٹھے۔ بولے "شیخ، اگر کچھ سمجھتے ہو تو اس کی تشریح کر دو۔" سب خاموش رہے تو مولانا کا جوالا مکھی پھٹا اور دو گھنٹے تک عالمِ لاہوت اور ناسوت کا لاوا بہتا رہا۔

مولانا کی طلاقتِ لسانی اور خوش بیانی کا اندازہ اس سے لگائیے کہ ایک دفعہ روح کی ماہیت پر جو صبح سے بولنا شروع کیا تو سارا دن گزر گیا، رات بھی گزر گئی۔ صبح چار بجے تک لکچر جاری رہا، اور ناتمام رہا۔

مولانا کی آمدنی کے بارے میں عرض کیا جا چکا ہے کہ کوئی ذریعہ اس کا کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔ ان کے پاس حاجتمند بھی آتے تھے اور کبھی خالی ہاتھ نہ جاتے تھے۔ حاجت مند کے سوال کرنے سے پہلے ہی وہ اسے کچھ نہ کچھ دے دیتے تھے۔ ایک دفعہ چار آدمی اجمیر شریف کے عرس سے لوٹ رہے تھے کہ ان کا سارا روپیہ ختم ہو گیا۔ مولانا سے ملنے گئے تو مولانا نے اپنے ایک شاگرد کو آواز دی کہ "دیکھو، چھینکے پر کچھ نوٹ رکھے ہیں۔ وہ اتار لاؤ۔" دو سو کے نوٹ تھے جو انہوں نے ان حضرات کو پیش کر دیے۔

حیدرآباد دکن سے ایک نواب صاحب دلی آئے اور مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا نے پوچھا "کیسے آنا ہوا؟" نواب صاحب نے کہا "سرکار نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔" مولانا کو جلال آ گیا۔ فرمایا "کیوں بلایا ہے اس نے ہمیں؟ اگر وہ اپنے علم سے ہمیں مرعوب کرنا چاہتا ہے تو ہم اس کے رعب میں آنے والے نہیں۔ اور اگر وہ ہمیں اپنی دولت دینا چاہتا ہے تو ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ ارے عثمان! دیکھ وہ سامنے مچان پر جو بوری رکھی ہے اٹھا لا۔" عثمان جا کر بوری اٹھا لایا۔ مولانا نے فرمایا "اس میں جو کچھ ہے باہر نکال۔" عثمان نے بوری میں ہاتھ ڈال کر نکالا تو نوٹوں کی گڈی نکلی۔ عثمان نے وہ گڈی فرش پر رکھ دی۔ مولانا نے ڈپٹ کر کہا "اور نکال۔" عثمان نے پھر ہاتھ ڈالا اور ایک گڈی نکال کر رکھ دی۔ غرض یونہی سو سو اور ہزار ہزار کے نوٹوں کی گڈیاں نکالتا رہا اور گڈیوں کا ڈھیر لگ گیا۔ مولانا نے نواب صاحب سے کہا "اور دیکھنے کا؟" نواب صاحب تھرا گئے۔ گھگھیا کر بولے "حضور کے پاس کیا کمی ہے۔" مولانا نے فرمایا "جا، اپنے نظام سے کہہ دے ہم کسی کے پاس نہیں جایا کرتے۔" نواب صاحب ہاتھ جوڑتے اور سلام جھکاتے وہاں سے رخصت ہوئے۔ مولانا نے عثمان سے کہا "انہیں بوری میں بھر کے وہیں رکھ آ۔" عثمان نے نوٹوں کی گڈیاں سمیٹیں اور بوری پھر مچان پر رکھ دی۔ رمضان کے دل میں بدی آئی۔ عثمان سے کہا "ابے دو ایک گڈیاں تو پار کر دے۔" عثمان نے ہنس کر کہا "بوری میں کیا رکھا ہے؟ بوری تو خالی ہے۔" اُستاد رمضان خاں زندہ سلامت ہیں اور کراچی میں موجود ہیں۔ انہوں نے قسمیں کھا کھا کر اپنا یہ چشم دید واقعہ سنایا۔

مولانا کو ایک زمانے میں شعر و شاعری کا بھی شوق ہوا تھا۔ داغؔ کے شاگرد ہو گئے تھے۔ اُستاد سے اس قدر عقیدت تھی کہ جب کسی سے اُستاد کا شعر سُنتے تو "سبحان اللہ" کہہ کر فوراً سجدہ کر لیتے۔

سجدہ کرنے پر یاد آیا کہ مولانا کا عالمِ شباب تھا کہ دلی کے ایک معروف حکیم کی داشتہ دھنو پر مولانا عاشق ہو گئے۔ چڑھنے والوں میں پہلا کمرہ جنگلی طوائف کا تھا اور دوسرا دھنو کا۔ مولانا کا عشق دنیا زمانے سے نرالا تھا۔ روزانہ رات کو دھنو کے بالاخانے پر ایک مقررہ وقت پر جاتے، دروازہ تھپتھپاتے۔ دھنو دروازہ کھولتی تو اس کے ہاتھ میں سلگی ہوئی اگربتیوں کا مٹھا ہوتا۔ وہ دھونی دیتی، مولانا

آستانِ محبوب پر سجدے کرتے اور چلے جاتے۔ ان کا یہ معمول عرصۂ دراز تک رہا۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

مولانا ڈاڑھی مونچھ کا صفایا کرتے تھے۔ دلی کے ایک بہت نامور عالمِ دین گزرے ہیں مولوی کرامت اللہ۔ بڑے پابندِ شرع اور نیک بزرگ تھے۔ ان کے بے شمار مرید بھی تھے۔ ایک دفعہ اپنے وعظ میں انہوں نے ڈاڑھی کی فضیلت بیان کی اور ڈاڑھی نہ رکھنے کی فضیحت۔ مولانا کو اس کی خبر پہنچی تو بڑا مان گئے۔ ایک دن ساری رات قوالی سننے کے بعد صبح ہوتے گھر آ رہے تھے کہ راستے میں کرامت اللہ صاحب کا گھر پڑ گیا۔ مولانا مع اپنے حواریوں کے وہیں رک گئے۔ کنڈی بجائی، مولوی صاحب خود برآمد ہوئے۔ مولانا کو ناوقت دیکھ کر حیران ہوئے مگر فوراً تعظیماً مصافحہ کیا اور فرمایا "بسم اللہ، اندر تشریف لائیے۔" اپنے کمرے میں لے جا کر عزت سے بٹھایا۔ پوچھا "کیسے قدم رنجہ فرمایا؟" مولانا نے کہا "شیخ ہم نے سوچا آج تم سے ڈاڑھی پر گفتگو ہو ہی جائے۔" اور اس کے بعد مولانا کے علم کے سمندر میں جوار بھاٹا آ گیا۔ خدا جانے مولوی صاحب نے مولانا کو کیسے رام کیا کہ آخر میں ہنسی خوشی رخصت ہوئے۔

عجیب بات ہے کہ مولانا نے کسی کے پیچھے نماز نہیں پڑھی اور نہ کسی کو اپنے پیچھے پڑھنے دی۔ ایک دفعہ صابر صاحب کے ہاں حاضرین نے انہیں زبردستی کر کے تحفہ کے نماز پڑھانے کھڑا کر ہی دیا۔ خبر نہیں مولانا کے جی میں کیا آئی کہ رضامند ہو گئے۔ پہلی رکعت میں جب سجدے میں گئے تو سب کو چھوڑ کر چلتے بنے۔

مولانا لقدم تھے۔ ان کا کوئی عزیز اقارب کبھی نہ دیکھا نہ سنا۔ بس جو کچھ تھا نرواتیلی تھا، یا اس کے بچے۔ ترکمان دروازے تیلیوں کے ایک کے سامنے مولانا کا بالاخانہ تھا جس میں وہ اکیلے رہتے تھے۔ نرواتیلی کے بڑے بیٹے کے استاد تھے اور نرواتیلی کی لڑکی کو بیٹی بنا لیا تھا یہی لڑکی بیٹی کھانا پکا کر انہیں کمرے پر بھیجتی تھی۔ اس کی شادی مولانا نے خاصی دھوم دھام سے کی تھی۔ شادی کے تمام اخراجات خود اٹھائے تھے۔ تیل کا نسخہ بھی اس کے جہیز میں دے دیا تھا۔ اس تیل سے ان کے داماد نے خوب کمائی کی۔

مشہور یہ تھا کہ مولانا نے ساری عمر شادی نہیں کی مگر واقعہ یہ ہے کہ مولانا نے جوانی میں شادی کی تھی۔ اس سے اولاد نہیں ہوئی۔ مولانا قوالیوں کے چکر میں رہتے تھے۔ راتیں انہی میں کالی ہوتی تھیں مگر صبح ہونے سے پہلے گھر ضرور آ جایا کرتے۔ بیوی اکیلی پڑی تارے یا کڑیاں گنا کرتی تھی آخر تنگ آ کر اس نے روکنا ٹوکنا شروع کیا۔ مولانا ایک آزاد مزاج آدمی تھے، وہ بھلا پابندیوں کو کیسے گوارہ کر لیتے؟ ایک دن بیوی کو طلاق دے دی اور عدت پوری ہونے کے بعد نرواتیلی کے بیٹے عبدالحئی سے اس کا نکاح پڑھوا دیا۔

خواجہ حسن نظامی سے مولانا بڑی بے تکلفی سے ملتے تھے۔ خواجہ صاحب بھی ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ایک دن خواجہ صاحب نے مولانا سے فرمائش کی کہ آپ تصوف پر ایک کتاب لکھ دیجیے۔ مولانا کچھ موج میں تھے، رضامند ہو گئے۔ ورنہ مولانا زبان کے جتنے طرار تھے قلم کے اتنے ہی بھسنڈی تھے۔ ایک مہینے میں کتاب لکھ لی اور مسودہ لے کر خواجہ صاحب کے ہاں پہنچے۔ خواجہ صاحب نے کتاب کو ادھر ادھر سے دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔ بہت بہت شکریہ ادا کیا اور بولے "معاوضہ جو آپ فرمائیں پیش کر دیا جائے۔" مولانا نے کہا "معاوضہ کیسا؟ شیخ، ہم نے تو تمہاری فرمائش پر کتاب لکھی ہے۔" خواجہ صاحب بولے "بہت اچھا۔ مگر کتاب میرے نام سے چھپے گی۔" یہ سننا تھا کہ مولانا کا ناریل چٹخا۔ خواجہ صاحب کے ہاتھ سے کتاب لے کر اس کے چار ٹکڑے کر ڈالے اور کہا "خدا خوش رکھے، شیخ لاؤ چائے پلواؤ۔" خواجہ صاحب نے متاسف ہو کر کہا "یہ آپ نے کیا کیا؟" مولانا نے کہا "کچھ نہیں۔ شیخ تم چائے پلواؤ۔"

مولانا کی آنکھ پر میل نہیں تھا۔ چائے پی اور ہنسی خوشی رخصت ہو گئے۔ خواجہ صاحب سے پھر کبھی اس کا ذکر تک نہیں کیا۔

ایک بار مولانا سے ایک صاحب ملنے گئے جو اپنے آپ کو ادیب اور نہ جانے کیا کیا کچھ سمجھتے تھے۔ مولانا نے پوچھا "فارسی جا
ہو؟" انہوں نے جواب دیا "نہیں" ——— "عربی جانتے ہو؟" انہوں نے پھر وہی جواب دیا "نہیں" ——— "علم معقول و منقول؟" ظا
کہ اس کا جواب بھی نہیں ہی تھا۔ اس پر مولانا نے کہا "بھئی یہ کیوں نہیں کہتے کہ اُمّی ہوں۔" واقعی مولانا علم و فضل کے اس مقام پر تھے کہ
بھی چاہتے یہ فقرہ کہہ سکتے تھے۔

مولانا بڑے نڈر آدمی تھے۔ ۴۷ء میں جب دلی میں فسادات شروع ہوئے تو ہندو اکثریت کے محلوں میں سے مسلمان نکل کر مسلمانوں کے
میں آنے لگے تھے۔ مگر مولانا تن تنہا اپنے کمرے ہی پر ڈٹے رہے۔ لوگوں نے انہیں بہت سمجھایا مگر وہ نہ مانے۔ ان کی منہ بولی بیٹی اور داماد بھی پاکستان چلے
مگر مولانا ٹس سے مس نہ ہوئے۔ پاکستان جانے والوں سے مولانا بہت ناراض ہوتے تھے۔ چنانچہ بیٹی اور داماد سے بھی ناراض ہو گئے تھے۔ حالات
سے بدتر ہوتے گئے اور شرنارتھیوں کی کھیپ پر کھیپ دلی آنے لگی۔ یہ آنے والے دلی میں خالی گھر ڈھونڈتے پھرتے تھے اور ڈرا دھمکا کر بھی مسلما
سے گھر خالی کرا لیتے تھے۔ مقفل گھروں کے تالے توڑ کر گھس جاتے تھے۔ انہی میں سے کسی کو معلوم ہوا کہ اس بالاخانے پر ایک بڈھا مسلمان اکیلا رہتا
اس نے موقع کو غنیمت جانا اور تلوار لے کر زینے پر چڑھ گیا۔ دروازہ کھلا ہوا تھا، اندر سناٹا تھا، بے روک ٹوک صحن میں پہنچ گیا۔ مولانا نے جو اسے
تو ڈانٹ کر کہا "کون ہے تو؟" وہ کچھ ایسا سٹپٹایا کہ تلوار وہیں چھوڑ کر بھاگ گیا۔ مولانا نے تلوار اس کے پیچھے زینے میں پھینک دی۔

ایک دفعہ اور مولانا پر حملہ ہوا۔ اب کے چار سکھ اپنی کرپانیں لیے اوپر چڑھ آئے مگر مولانا کو دیکھ کر ان پر ہیبت چھا گئی۔ جہاں کھڑے تھے وہ
کے کھڑے رہ گئے۔ مولانا کی عمر اسّی سے متجاوز ہو چکی تھی کم سجھائی دینے لگا تھا۔ مگر وہ سمجھ گئے کہ یہ چاروں قتل کرنے آئے ہیں۔ بڑے اطمینان سے ان
جس قصد سے آئے ہیں اسے جلد پورا کیجیے۔" قاتلوں نے خبر نہیں کیا دیکھا کہ ان کی گھگھی بندھ گئی۔ ایک نے بڑی ہمت کر کے کہا "جی ہم تو آپ کے
کرنے آئے تھے۔" مولانا نے پھر کہا "نہیں نہیں آپ جس کام کے لیے آئے ہیں اسے جلد انجام دیجیے۔ اس میں دیر نہ کیجیے۔" انہوں نے کہا "جی
بڑی غلطی ہوئی ہے۔ آپ ہمیں معاف کر دیجیے۔" مولانا نے فرمایا "اچھا تو چلے جاؤ۔" اور وہ چاروں وہاں سے گدا گد گدا گد زینے پر سے
کر بھاگے۔ جیسے خود ان کی جان خطرے میں ہو۔ سچ ہے۔ "جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے؟"

مولانا آخر دم تک اپنے بالاخانے ہی پر رہے اور چند مہینے ہوئے کہ اپنی طبعی موت مرے۔

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ
افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

———

شکست جامِ حریفاں شدند و مُرد چراغ

منظور الٰہی

نہ خون نہ برادری نہ شہر کی ہمسائیگی کہاں دریائے سندھ کا وہ حصہ جہاں قدیم پنجاب اور صوبہ سرحد کی حدیں ملتی ہیں کہاں ستلج کا وہ مقام جہاں سے نہر سرہند نکلتی ہے، وہ کہاں کا رہنے والا اور میں کہاں کا وہ مجھے کہاں مل گیا تھا، آج میں نے زندگی کی گہرائیوں میں جھانک لیا ہے۔ آج معلوم ہوا عزیز ترین دوست کا چھن جانا اپنی ذات کے ایک حصے سے ہاتھ دھونا ہے۔

ستائیس برس کی مسلسل رفاقت، میں اس بوجھ تلے دب گیا ہوں۔ امتدادِ وقت سے کسک کم ہو جائے گی لیکن اب تو ایسے ہے جیسے کوئی نیند سے چونک پڑے اور دیر تک ایک خیال ذہن کے غرفے میں پھڑ پھڑائے، میں نے کہیں لکھا تھا کہ جب ہمیں کوئی صدمہ پہنچتا ہے تو یادوں کے چہرے ایک ایک کر کے ماضی کے دریچوں میں سے جھانک کر ہمیں پریشان کرتے ہیں، چاہے وہ ایک دوست کی موت ہو یا ایک جذبے کی۔۔ ۔۔ ۔۔

یاد آیدت آں مہر و وفا دارِ یہا   ودر حقِ من بلطف غمخوارِ یہا

اکنوں بتصورِ جناں یارِ یہا   مائیم و شب درازو بیدارِ یہا

وہ لمحے کتنے گریز پا تھے، وہ امان سے اوّلین ملاقات کے دن "ابتدائے شوق کی لمبی ملاقاتیں" ایک مستحکم دوستی کا پیش خیمہ تھیں جو تا دمِ واپسیں قائم رہی، ہم مری میں تھے کہ ستمبر میں دوسری جنگِ عظیم شروع ہوئی یوں بھی ۱۹۳۹ کا سیزن یادگار سیزن تھا۔ یہ انتہائی بے فکری اور غیر ذمہ داری کا زمانہ تھا، سات آٹھ احباب کی ٹولی "خوش وقتی" کی فکر میں رہتی، قہوہ خانوں میں یا کسی کی رہائش گاہ پہ مجلس آرائی ہوتی محض تفننِ طبع کے لیے کسی مصرع پہ طبع آزمائی، لطیفے، خوش گپیاں اردو فارسی اور انگریزی میں پیروڈی، فیض اور راشد کی نظمیں، قہوے کا دور اور مستقبل کے سنہرے خواب ہم اس بھول میں تھے کہ یہی زندگی ہے۔

مقامی مذاکرات میں حصہ لینے میں امان پیش پیش ہوتا اور احباب کو بھی آمادہ کر لیتا، اگر دوستوں کی کامیابی اس کی کوشش کی مرہونِ منت ہوتی تو وہ اسے اپنی کامیابی تصور کرتا اور ان کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھ کے خوش ہوتا، اس حد تک وہ دوسروں کا ہو کے رہ گیا تھا۔ شاید یہ انجانے طور پر اس کی شخصیت کی تکمیل تھی۔

مجھے خوب یاد ہے ۱۹۳۹ کے سیزن میں اس کی مسلسل کوشش تھی کہ مباحثہ میں نسیم پہلا انعام پا جائے، سیر کے دوران میں مشق کروا رہا ہے، اچھے الفاظ کا ذخیرہ بڑھانے میں مدد دے رہا ہے۔ اوّلین دور میں تقریر تک لکھ کے دینا اپنے ذمے لے لیا تھا اور جب نسیم نے پہلا انعام پا لیا تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے امان کو خزانہ مل گیا ہو، کردار کا یہ پہلو ساری عمر نمایاں رہا۔

جب ہم ۱۹۴۹ میں ٹریننگ کے لیے ڈھاکہ پہنچے تو نو بیاہتا دلہن اس کے ساتھ تھی۔ شادی شدہ جوڑوں کے لیے اوپر کی منزل میں کمرے مخصوص تھے، ان کا کھانا بھی وہیں بھیج دیا جاتا، باقی اصحاب میس میں کھانا کھاتے، میں ابھی ناکتخدا تھا۔ لیکن یاد نہیں پڑتا کہ ڈھاکہ کے تین ماہ کے قیام میں انہوں نے کوئی کھانا میری شمولیت کے بغیر کھایا ہو مجھے اصرار ہوتا کہ میں خلوت میں مخل ہو رہا ہوں لیکن اس کا فیصلہ اٹل تھا، اسے یہ گوارا نہ تھا کہ میں تنہا کھانا کھاؤں، یہ چھوٹی سی بات تھی یا بہت بڑی بات!

عجیب بات تھی کہ امان سے ہر ملاقات کے بعد محبت میں اضافہ ہوتا مگر ہر ملاقات کے بعد تشنگی رہ جاتی۔ ہر چھوٹے بڑے سے اخلاص، ہر کہہ و مہ سے الفت، اتنی محبت اس دل میں کیسے سما آئی تھی، افسوس محبت کا اتھاہ سمندر خشک ہو گیا۔

وہ کبھی بھی اتنا محتاط نہ تھا لیکن نہ جانے اس دفعہ دل میں کیا آئی کہ سال کے آخر میں رفیعہ کے ساتھ لاہور رخصت پہ آگیا اور سب احباب کو مل کے گیا، ہمارے ہاں دو اڑھائی گھنٹے نشست رہی ایک آدھ سنجیدہ بات پھر وہی ہنسی مذاق اور قہقہے دبی مسکراکر خدا حافظ اور گرمجوش معانقہ یہ کسے معلوم تھا کہ پلک جھپکنے میں وہ ہم سے بچھڑ جائے گا۔

یہ صبح عید تھی، یہ خوشیاں منانے کا دن تھا، لیکن اس دفعہ صبح عید امان اللہ نیازی کی جدائی کا داغ ساتھ لے کے آئی، اب کون مجھے آغوش میں لے کر بھینچ لے گا، اب وہ دمکتا ہوا گلنار چہرہ کہاں دیکھوں گا جس پہ کندن اور دودھیا رنگ کی آمیزش جھلکتی تھی۔

دوست کو وداع کرنے کے لیے بے خیالی میں رخت سفر باندھا، ہم ستائے بغیر منزل مقصود کی طرف بڑھ رہے تھے، باہر مناظر بدل رہے تھے، کبھی ٹنڈ منڈ درخت چٹیل میدان بے آب و گیاہ کبھی ہرے بھرے درخت اور نیشکر کی فصل لیکن دل ویران جذبات سے عاری تھا کبھی یاد کا جھونکا پچکا دے کے نکل جاتا، شیخوپورہ، چنیوٹ، سرگودھا، خوشاب، میانوالی یہ منزلیں ہم نے بڑی تیزی سے طے کی تھیں، یہ برق رفتاری اس طوفان کی غمازی کرتی تھی جو ہمارے سینوں میں بپا تھا یا اس یار مہربان کے اخلاص کی آخری کشش تھی؟

آشنایانہ کشند خار رہت دامن ما؟

سورج ڈوب رہا تھا جب ہم میانوالی سے روانہ ہوئے، اب درد کی منزل قریب تھی، شیشم اور کیکر کے درختوں کی گھنیری چھتری نے سڑک کو دونوں کناروں سے ہالے میں لیا تھا، پھر سنگلاخ پہاڑیوں کی اوٹ میں سورج غروب ہو گیا، پہاڑیوں کی ڈھلوان پہ سرمئی رنگ نے ڈیرے ڈال دیے، سنگ نالہ می زند زوداع دوست یاراں چوٹیوں کے اس پار جوئے خون بہہ نکلی تھی، تاحد نظر شفق کی لالی کا تسلط تھا، تمناؤں اور آرزوؤں کا خون جس کے لیے دریائے سندھ کا وسیع پاٹ آئینہ لیے تھا، دریا عبور کرنے پر شوال کا چاند اور ایک تارا ہمارا ساتھ دینے لگے جیسے ریگستان کو پیار بھری نظروں سے تک رہے ہوں اسے خوبرو تارے! میرے دوست کو کس کی نظر کھا گئی، زندگی کی تپتی ہوئی شاہراہ مستقل جدائی کے تب و تاب کی نشان دہی کرتی ہے، وہ سبیل کہاں ہے جہاں پیاسے مسافر تشنگی بجھاتے ہیں، آہ وہ کشیدہ قامت خوبرو آج نظر سے اوجھل ہو جائے گا اس سرو رواں کو خاک ڈھانپ لے گی، وہ زبان جو شیریں گفتاری کا جادو جگاتی تھی آج گنگ ہو گی۔

رفیعہ نے زندگی کی اٹھارہ بہاریں دیکھیں اب اسے خزاں نے آگھیرا ہے، امان کو اپنے چچا عصمت اللہ سے بڑی محبت تھی، اس گھر میں رشتہ طے پانے کی اسے بڑی خوشی تھی، دسمبر ۱۹۴۸ء میں جب ہم شادی میں شرکت کے لیے عیسیٰ خیل پہنچے تو امان سٹیشن پہ موجود تھا، آج ہم نے منزل پہ منزل طے کی سڑکیں بدل گئیں، سمتیں بدل گئیں، رات نے اپنی چادر پھیلا دی ہمیں منزل پالینے کی جلدی ہے لیکن آج وہ ہمارا منتظر نہیں ہو گا، آج وہ اپنے محبوب چچا شاکر اور ممتاز ایسے دوستوں سے جا ملا ہے، وہ دل جو آئینے کی طرح شفاف تھا آئینے کی طرح ریزہ ریزہ ہو گیا۔

افتاں و خیزاں چند احباب پہنچ پائے باقی نہ پہنچ سکے، عید کے روز خبر نہ ملی ہو گی لیکن میرا دوست تو دریا دل تھا وہ ایسی چھوٹی باتیں خاطر میں نہ لاتا تھا، اس نے کبھی گلہ نہ کیا تھا، اگر کبھی حرف شکایت لب تک آیا بھی تو برائے نام، آج بھی وہ تصویر وفا زبان حال سے کہہ رہی تھی ؎

یاں گرد کہ از ساغر وفا مستند

زما سلام رسانید ہر کجا ہستند

مان اللہ نیازی
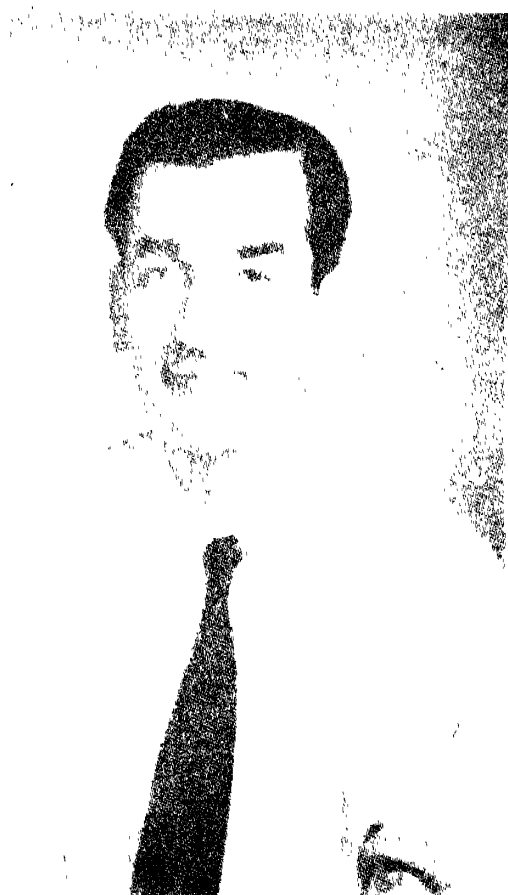
یہ افق تک پھیلاؤ یہ وسیع و عریض قبرستان، لاکھوں کروڑوں انسانوں کی آخری آرام گاہ جنہیں کبھی زندگی عطا ہوئی زمانے کا بے رحم سیل اپنے دامن میں خس و خاشاک لعل و گوہر سمیٹتا ہوا کہاں نکل گیا جانے صفدر اور نواز کہاں تڑپتے ہوں گے، نسیم پیرس میں کلیجہ مسوس کے رہ گیا ہو گا۔ امان نے فخر سے کہا تھا، پچیس تیس سال کی ریاضت کے بعد ہمیں یہ دوستی حاصل ہوئی ہے، اسے سنورتے میں اتنے سال لگے اب یہ انمول ہے ہمیں کہا کرتے ہمارا رشتہ ایسی بنا پر استوار ہے کہ چھوٹی چھوٹی باتیں اس میں مخل نہیں ہو سکتیں۔ یہ رشتہ اب بجائے خود قائم ہے اور لازوال ہے۔

ستائیس برس کا مسلسل ساتھ لبِ گور پہ ختم ہو گیا یہ مال و دولت دنیا یہ رشتہ و پیوند لبِ گور کے اس طرف ہی ہے یہ نشست جو اس کے اٹھ جانے سے برہم ہوئی پھر نہ جم سکے گی۔

شکست جام و حریفاں شدند و مُرد چراغ

اگلی صبح فاتحہ خوانی کے لیے بیٹھے تو کنارِ سندھ سے سرد ہوا کے جھونکے اوّلین دھوپ کی آسودگی میں گھُل کے ہمارے زخموں پہ مرہم رکھ رہے تھے۔

اے بادِ خوش کہ از چمنِ دوست می وزی؟

میرا دوست بھی تو قریب ابدی نیند سو رہا تھا جیسے اخیل سے منتشر ہوتے وقت عم زاد اور خالہ زاد بھائی امان کے دوستوں سے لپٹ لپٹ کے رونے لگے انہیں ہر دوست سے بوئے یار آتی تھی، فخر نے بچوں کی طرح بلک بلک کے روتے ہوئے کہا "اس کے احباب ہی کبھی مل کے یاد کر لیا کریں تو شاید یہ بوجھ کچھ ہلکا ہو" حافظ کا یہ شعر جو طالب علمی کے زمانے میں پڑھا تھا ؎

دو روزہ مہرِ گردوں افسانہ ایست و افسوں

نیکی بجائے یاراں فرصت شمار یارا!

اس کے معنی آج آشکار ہوئے، وہ نہ بھولنے والی کربناک رات اس رات محمدؐ علی خان نے کیا بات کہہ دی تھی "خدا کی خدائی میں لاکھوں کروڑوں لوگ بستے ہیں لیکن انسان کوئی کوئی ہوتا ہے"

زمانے کی یہی ریت ہے وقت ہماری عزیز متاع چھین کے آگے بڑھ جاتا ہے جو کل تک تھا آج نہیں جو آج ہے۔ جانے کل ہو یا نہ ہو۔

تو اے پیماں شکن امشب بما باش!

کہ ما باشیم فردا یا نہ باشیم!

سیاکشتی سے چشم بینا دونوں کناروں پہ بکھرے نظاروں کو وقتی طور پر آغوش میں لے لیتی ہے، وصل کی یہ لذت گزشتنی ہے وہ "جنتِ نگاہ" یا "فردوسِ گوش" ہی کیوں نہ ہو اس کی حقیقت ایک حسین یاد کے سوا کچھ نہیں۔

ہم شاید انجانے طور پہ ایک شخص کو پسند کرنے لگتے ہیں اور اس کے مداح ہو جاتے ہیں چونکہ ہم اس سے محبت کرتے ہیں ہمیں اس میں خوبیوں کی تلاش رہتی ہے، گو دونوں باتوں میں مماثلت ضرور ہے اور ان کے ڈانڈے کہیں ملتے ہیں اس کی خوبیاں ہی بالعموم ہمیں اس کا گرویدہ بناتی ہیں، جب ہم کسی دوست کا ذکر کرتے ہیں تو ہماری مراد ہمدم دیرینہ سے ہوتی ہے، نت نئے دوست بنانا ممکن نہیں ایک شخص کی قدر ہم اس کی موت کے بعد جانتے ہیں اس کی پرکھ اس کے جانے کے بعد ہوتی ہے۔ اس کی زندگی میں ہم ایسی گہری سوچ نہیں سوچتے۔

جو کچھ اسکے پاس تھا وقت تو ہی فراغت کے لمحات تھوڑا بہت روپیہ پیسہ اور تعلقات وہ عزیزوں اور دوستوں کے لیے وقف تھا دنیادار لوگ اِن چیزوں کو بڑی اہمیت دیتے ہیں اور انہیں اپنے خاندان تک ہی محدود رکھتے ہیں لیکن اسے دوسروں کو شریک کر کے دلی مسرت ہوتی۔

امان نے بتلایا تھا کہ نیویارک پہنچنے پر اسے یوں محسوس ہوا تھا جیسے فلک بوس عمارتیں سڑک کے دونوں کناروں سے اس پہ یلغار کرآئی ہوں وہ کاٹنے کو آتی تھیں، سارا ماحول اجنبی تھا صبح بیدار ہوا تو کوئی پرسانِ حال نہ تھا نہ کوئی دوست آشنا نہ ملازم، قریب ایک ریستوراں میں ناشتے کے لیے گیا تو دل بھر آیا، نوالہ حلق میں اٹک گیا۔ ایکاایکی ناشتہ چھوڑ بھاگ کھڑا ہوا، دیر تک بھی حیران تھا کہ اس نووارد کو کیا ہوا۔" شہر جتنا بڑا ہو اتنا ہی ظالم ہے۔ لیکن وہ شدید طور پہ جذباتی بھی تو تھا،

اس کے پاس روپیہ وافر نہ ہوتا لیکن جب ایک" نشئی" دوست نے پانچ ہزار روپے مانگ لیے تو اس کا یہی جواب تھا" میں جانتا ہوں یہ واپس نہ کرسکے گا، لیکن میں کیسے انکار کردوں ؟"

ایک ضرورتمند کسی دوست کا تعارفی خط لے کر گیا امان نے دیکھا کہ وہ راولپنڈی کی سردی میں ٹھٹھر رہا ہے تو اپنا اوور کوٹ اٹھالائے اور کہا کہ پہن لیجئے، رخصت ہوتے ہوئے وہ اوور کوٹ اتارنے لگا تو امان نے کہا " رہنے دیجئے دیکھئے کتنا بھلا معلوم ہورہا ہے ۔"

مردان ہو یا بنوں لاہور ہو یا راولپنڈی واقفوں دوستوں اور عزیزوں کا تانتا لگا رہتا، کوئی آرہا ہے کوئی جارہا ہے کوئی چند روز یا چند ہفتوں کے لیے ٹھہرا ہوا ہے ، ایسے دور دراز کے عزیز یا دوستوں کے جاننے والے بھی ٹھہر جاتے جنہیں امان ذاتی طور پہ نہ جانتا تھا۔ ان کی بھی برابر تواضع ہوتی مردان میں ایک صاحب کو الوداع کہنے کے لیے باہر نکلا تو علاقے کے دو تین زمینداروں نے بڑھ کے ملاقات کی، امان نے خیریت دریافت کرنے کے بعد پوچھا آپ کب آئے ، اردلی نے مسکرا کے کہا یہ تو دو روز سے آپ کے مہمان ہیں، بعض اوقات اتنے مہمان ہوتے کہ برآمدے میں چارپائیاں بچھانی پڑتیں لوگ ایسا ہجوم دیکھ کے پریشان ہوجاتے ہیں لیکن اس کے ماتھے پہ شکن تک نہ آتی۔ مہمان نوازی میں غریب امیر کی تمیز نہ تھی، ان میں متعدد حضرات ایسے ہوتے جن کا امان پہ کوئی حق نہ ہوتا، بعض دفعہ ظاہر ہوتا کہ چالاکی سے کام لے رہا ہے یا گزشتہ مرتبہ غلط بیانی سے کام لیا تھا لیکن وسیع القلبی کے باعث ایسی چیزوں کو درخورِ اعتنا نہ سمجھتا، جب ایک خیر خواہ نے امان کو آگاہ کیا کہ آپ نے فلاں کے ساتھ مروّت برتی اور برابر مدد کیے جارہے ہیں لیکن وہ اپنا اُلّو سیدھا کرنے کے لیے آپ کا نام لینے سے بھی نہیں چوکتا تو امان نے جواب دیا" اسے اپنا کام کرنے دو میں اپنا کام کیے جاؤنگا" وہ واقعی پارس تھا جو اس سے چُھو گیا سونا ہو گیا۔

دوستوں اور عزیزوں کے کام تو یک طرف ایسا بھی ہوا کہ کسی دوست کا عزیز چلا گیا تو اس کے ساتھ بھی شفقت سے پیش آیا، اس کی تکلیف کا ازالہ کیا اور کہہ بھی دیا" تم میرے دوست کے بھائی ہو تو میرے بھائی ہوئے نا"

مہمانوں کے چھوٹے بڑے کام انہماک سے کرتا باقی وقت گپ شپ لطیفے پھلجھڑیاں ریڈیو گرام پہ ریکارڈ، عزیز بھی ایسے گھل مل جاتے کہ ملاقاتیوں کے لیے صاحبِ خانہ کے فرائض انجام دیتے، خاندان کے کسی فرد پہ مصیبت آجاتی تو امان اس کا احساس بہت شدت سے کرتا، ایک ایسا وقت بھی آیا تھا کہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے جان پہ بن آئی ہو اس طوفان کا مقابلہ بھی اس نے پامردی سے کیا، بالعموم وہ زندگی کے نشیب و فراز سے نہیں گھبراتا تھا۔ نہ ہی تفکر کے آثار چہرے سے نمایاں ہوتے ۔

جب بڑے بھائی کو ایک عارضہ لاحق ہوگیا جو جان لیوا ہوسکتا تھا تو امان اس غم میں شمع سوزاں کی طرح گھلنے لگا، انتقال سے چند ہفتے بیشتر

اسے بھائی کے رو بصحت ہونے کی بڑی خوشی تھی، ایک ایک سے ذکر کرتا کہ دیکھیے وہ بالکل ٹھیک ہوگئے ہیں۔

احباب کے زمرے میں چھوٹے بڑے کی تمیز نہ تھی جسے پچیس تیس سال پہلے دوست کہہ دیا اس سے آخر دم تک نبھایا چاہے زندگی میں اس کا مقام کچھ ہی ہو، ایسا بھی ہوا کہ کسی بڑے آدمی نے کھانے پہ مدعو کیا تو امان نے یہ کہہ کے معذرت کرلی کہ کچھ ایسے احباب راولپنڈی آئے ہوئے ہیں کہ اس کا آنا ممکن نہ ہوگا۔

روبرو ہو یا ٹیلیفون پہ اس کے بیساختہ قہقہے دیر تک گونجتے رہتے۔ اسے چھوٹی چھوٹی باتوں میں مذاق کی تلاش رہتی اس کا مزاح بھی بیساختہ تھا کسی پہ چوٹ ہو بھی تو اتنی خفیف کہ اسے گراں نہ گزرے اور اپنی خفت مٹانے کی بجائے وہ بھی مذاق میں برابر کا شریک ہو، کسی کی دل شکنی اسے گوارا نہ تھی، بیحد حساس ہونے کے علاوہ وہ انتہائی زیرک اور ذہین تھا، ہر اہم مسئلے پہ اس کی رائے وقیع ہوتی ایسے مواقع پر وہ مردانہ کے روپ میں نظر آتا مردم شناس سخن شناس محفل کا دلدادہ اور خود شمعِ محفل، گرمجوشی اور خوش اخلاقی کہیے یا خندہ پیشانی سب کو ہنس کے ملنا اس کی عادت تھی۔ فطرتاً رحم دل بلکہ کسی حد تک رقیق القلب لیکن بیباکی کی حد تک صاف گو وہ بہت دھیما تھا لیکن زیادتی اور ظلم کے خلاف جرأتِ رندانہ کے ساتھ ڈٹ جاتا، نتائج و عواقب سے بے پرواحق کی بات کہہ دیتا لوگ جلبِ منفعت کے لیے یا مستقبل کی خاطر سو حیلے تراشتے ہیں عمائدین کی دہلیز پہ جبیں سائی کرتے ہیں لیکن وہ بندۂ اخلاص ریاکاری اور منافقت سے کوسوں دور تھا، تملق اور ابن الوقتی کے اس دور میں ایسی نظیر مشکل سے ملے گی۔ دنیاوی جاہ و حشم کی قدر اس کی نظر میں پرِ کاہ سے زیادہ نہ تھی، ہشیت کے سامنے ہماری خوشیاں، ہمارے غم، ہوس، حسد، زندگی کی دوڑ میں دوسروں کو روندتے ہوئے آگے بڑھنے کا جنون وہ اپنے تئیں ان کی حقیقت سمجھے ہوئے تھا تبھی تو وہ زندگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے مسکرا سکتا تھا

راہ زیں دیدہ دراں پرس کہ در گرم روی — جادہ چو نبضِ تپاں در تنِ صحرا بینند

دل نبندند بہ نیرنگِ دریں دیر و رنگ — ہر چہ بینند بعنوانِ تماشا بینند

مردم آزاری اس کی شریعت میں سب سے بڑا گناہ تھا، ایک دفعہ کہنے لگا کچھ بھی ہو ظلم نہیں کرنا چاہیئے۔ میرے فلاں جاننے والے نے کسی شخص کو سیاسی اختلاف کی بنا پر اور سفید فام حکمرانوں کی خوشنودی کے لیے اُبلتے تیل کی کڑھائی میں ڈلوا دیا تھا، چند ہفتے ہوئے حرکتِ قلب بند ہونے سے فوت ہوگیا، میں اس کے گاؤں فاتحہ خوانی کے لیے گیا تھا، زیادتی کرنے کا کیا فائدہ ہوا؟

خوش باش دمے کہ زندگانی ایں است اس کا نصب العین ہوگیا تھا، وہ ایک شمع کی مانند تھا جو تُندی اور تیزی کے ساتھ جلا کی' یہ جانتے ہوئے کہ شمع پگھل رہی ہے ہم اس سیلِ نور کا نظارہ کرتے رہے، اس کی ضَو سے انجمن کا گوشہ گوشہ مسکرا اٹھتا تھا۔

وہ ایک عالی ظرف علو ہمت انسان تھا۔ اس کے قرب سے "بادہ گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما" کی کیفیت ہوتی، وہ صحبتیں خواب ہوگئیں کیا عجب کہ "رنجِ خمار" باقی ہے اور احساسِ محرومی جیسے ایک بیحد عزیز شے کھو گئی ہو ——— دوستوں اور عزیزوں کا جھمگٹا ایسا ہوتا کہ تخلیہ قریبًا ناممکن ہوتا، ہم ایسے دوست سے زندگی کے ادق مسائل پہ گفتگو کی تمنا کرتے ہیں وہ خواہش تشنہ رہ جاتی جن دنوں وہ سٹاف کالج میں تھا میرے ایک آدھ بار شکوہ کرنے پر اس نے ہنس کے اتنا ضرور کہا تھا "ہاں کیوں نہیں تمہارے اور صفدر کے ساتھ مخصوص نشست جمائے مدت ہوگئی، اب کے ضرور ہونی چاہیئے" کراچی میں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی وہ شام جو اس کی یاد میں بسر ہوئی اس شام نواز نے ہچکیاں لیتے ہوئے بتلایا تھا کہ امان سے اس کی ملاقات اس واقعہ کے دوسرے روز ہوئی۔ وہ شش و پنج میں تھا اور کہہ رہا تھا منظور کو گلہ ہے کہ مجھے فرصت نہیں ہوتی لیکن میں ایسے

احباب کو کیا کروں جو ایک عمر سے مجھ سے منسلک ہیں اور برابر نبھا رہے ہیں، لیکن میں کبیدہ خاطر تو نہ ہوا تھا، وہ بھی ان جانے طور پہ اظہارِ محبت تھا، قرب کی خواہش بلا شرکتِ غیرے

ذوقِ حضور در جہاں رسمِ صنم گری نہاد
عشق فریب می دہد جانِ امیدوار را

میرے سامنے عید کارڈوں کا انبار ہے اتنے عید کارڈ پہلے کبھی نہ آئے تھے، انہیں کیا کروں؟ بچوں کو دے دوں جو ایسے کارڈ جمع کر کے خوش ہوتے ہیں، ان کے گھروندے بنا کر بگاڑتے رہتے ہیں۔ ہم بڑوں کی طرح جو ساری عمر ریت کے گھروندے بناتے ہیں اور یوں سراب کامرانی کو کامیابی سمجھتے ہیں،

ہمارا ندیم ہم سے روٹھ گیا۔ وہ بھرا میلہ چھوڑ گیا زندگی اپنے ڈگر پہ چلتی رہے گی۔
شب و روز و ماہ و سال کی ریگِ رواں شیشۂ ساعت سے پھسلتی رہے گی، اپنے آنسوؤں کے ہم آگے بڑھتے ہیں گے غالب پوچھتے ہیں

مژدہ ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کہیں ؟

"فوتِ فرصتِ ہستی کا غم" یوں تو کب مٹتا ہے اگر کم ہوتا ہے تو وہ ساعتیں یاد کر کے جو ایسے یارِ صادق الولا کی صحبت میں بسر ہوئیں بدلگی کے وہ لمحے جو اس کی صحبت میں گزرے گویا ماحصلِ زندگی تھے۔
شب و روز کا یہ چکر بیک وقت طویل بھی ہے اور مختصر بھی، دھندلا دھند کہر میں لپٹے ہوئے دن اجلے نکھرے دن پاکیزہ شامیں اور برستی راتیں گزرتی جا رہی ہیں دھیرے دھیرے سہم سہم کر جیسے آنے والی تقدیر سے خائف ہوں لیکن تقدیر کا لکھا کون مٹا سکا ہے۔ بعض دفعہ تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وقت کی رفتار تھم گئی ہو۔ وقت کے اس بوجھ کو میں نے کئی بار محسوس کیا ہے اور یہی سوال ذہن میں گونجتا ہے" اگر یہی صبحیں اور یہی شامیں بار بار لوٹ کے آئیں گی تو جلد جلد کیوں نہیں آچکتیں۔
میرے ترکش میں کوئی تیر باقی نہیں، اب کوئی آس نہیں، کوئی شکوہ نہیں، میں کتنی دور نکل آیا ہوں۔ اب تنہا تہی دامن جانے کس لمحے کا منتظر ہوں۔ جب پوپ جان کا آخری وقت قریب تھا تو اس نے کہا تھا" میرا رختِ سفر بندھ چکا ہے میں چلنے کے لیے تیار ہوں۔"

کبرنا موت الکبرا

بڑوں کی موت نے ہمیں بڑا بنا دیا لیکن جب طرزِ تپاکِ اہلِ دنیا" وہ جو جوبے جب پرانے بادہ کش اٹھ جائیں اور کوئی" حریف مے مرد افگنِ عشق" باقی نہ رہے تو اے ندیم میں خون کے آنسو کیوں نہ روؤں سے

گر دِ فنا شد ند حریفانِ بزمِ عشق
برخاک ریز جرعۂ مرد آزمائے ما

ایک اور گنجا فرشتہ — شاد عارفی

اکبر علی خان

"میں ایسی دُنیا پر، ایسے مہذب ملک پر، ایسے مہذب سماج پر ہزار لعنت
بھیجتا ہوں جہاں یہ اصول مروّج ہو کہ مرنے کے بعد ہر شخص کا کردار
اور تشخص لانڈری میں بھیج دیا جائے جہاں سے وہ دُھل دُھلا کر آئے
اور رحمۃ اللہ علیہ کی کھونٹی پر لٹکا دیا جائے۔" منٹو

سنہ تو ٹھیک سے یاد نہیں۔ نقوش نیا نیا جاری ہُوا تھا، احمد ندیم قاسمی اور ہاجرہ مسرور کرتا دھرتا تھے۔ اس میں شاد عارفی کے نام سے ایک شاعر کے چند قطعات شائع ہوئے کہنے کا ڈھنگ الگ تھلگ سا، نیا نیا سا۔ اور یہ نام دماغ میں محفوظ ہو گیا۔ قریب قریب ۸۰ سال ہونے کو آئے آج تک ایک مصرع یاد ہے۔ مسافت کوس بھر کی رہ گئی ہے۔ میری عمر ۱۲-۱۳ کی ہو گی شاد صاحب کی شاعری اور چھپنے چھپانے کی عمر اس وقت میری عمر کے دو گنے سے کیا کم ہو گی۔ مگر میرے لیے یہ نام نیا تھا۔ اسی سے میری بساط کا اندازہ ہو سکتا ہے، مگر میں شاید عمر کے تقاضے سے قابلِ معافی سمجھا جاؤں گا۔ تو اس زمانے میں شاعر بننے کا بڑا شوق تھا۔ ترقی پسندوں کی صورت بنانا، لمبے لمبے بال رکھنا، اور یہ مجلسوں کے آوارہ بے کار گیتے، ابھی چلتا ہوں، ذرا ہوش میں آلوں تو چلوں، اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں، اور دلّی سے آنے والے تبا، یہی وادی ہے وہ ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی اور بیتے ہوئے کچھ دن ایسے ہیں تنہائی جنھیں دُہراتی ہے، سُنا سُنا کر اپنے ہم عمروں پر رُعب جما سب کچھ معلوم ہوتا تھا۔ خود بھی اُلٹے سیدھے مصرعے کہنا آ گئے تھے، مگر کسی کی قلمی بیاض ہاتھ آ جاتی تو اس سے ایسے اشعار نقل کر لیے جاتے تھے جن کا مطلب سمجھ میں آ گیا ہو اور پھر انھیں موقع محل سے اپنے نام سے سُنا کر برتری جتائی جاتی تھی۔

اسکول میں ایک اُستاد تھے جو بنتے تو ترقی پسند تھے لیکن میرا خیال ہے کہ سی آئی ڈی میں تھے اس لیے کہ اُس زمانے میں جب سارے ہی کمیونسٹ معتوب ہوئے اور جیلیں کاٹیں اُن سے کسی نے یہ بھی نہیں پوچھا کہ آپ کے مُنہ میں کے دانت ہیں۔ ایک بار وہ مسعود اشعر صاحب سے جو آج کل روزنامہ امروز کے ملتان ایڈیشن کو ایڈٹ کرتے ہیں ایک نظم لکھوا لائے اور مجھ سے اسکول کے ایک جلسے میں پڑھوا دی نظم میں دُہی داغ داغ اُجالے اور سحر کی شب گزیدہ کیفیت کا رونا تھا۔ کچھ یہ رنگ تھا "بھگت سنگھ اب بھی چڑھائے جا رہے ہیں دار پر"۔ ہیڈ ماسٹر اُس وقت تو بے بس تھے سُنتے رہے لیکن بعد کو بہت برہم ہوئے انھیں کیا معلوم تھا کہ میں کیا پڑھنے والا ہوں۔ اُبا تک شکایت گئی۔ اگرچہ پڑھنے والا اُس وقت یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ بھگت سنگھ کون تھا مگر جب نظم پڑھ دی ہُوئی تو بڑا مزہ آیا۔ گردن اور اکڑ گئی اور معلوم ہُوا کہ ہم بھی کچھ اہمیت رکھتے

ہیں، سعنت بین ترقی پسندی کی ایسی جیتی جاگتی سند مل گئی۔ غرض اُس زمانے میں ترقی پسند چیزیں سمجھ میں تو کیا خاک آتی ہوں گی۔ مگر ہیں پڑھتا ضرور تھا۔ یہ معلوم تھا کہ نقوش ترقی پسندوں کا پرچہ ہے اور اس میں جو لوگ لکھتے ہیں وہ ترقی پسند ہوتے ہیں — تو پھر شاد عارفی بھی ترقی پسند تھے اس لیے اُن سے دلچسپی قدرتی بات تھی۔ اپنی برادری کے جو ٹھہرے۔ ایک لفظ کامریڈ بھی سیکھ لیا تھا گویا شاد صاحب اپنے کامریڈ تھے۔

اس کے بعد یہ نام اور دُوسرے رسالوں اور اخباروں میں بھی نظر سے گزرتا اور برابر میرے لیے پُرکشش بنا رہا مگر یہ بات عرصے تک معلوم نہیں ہُوئی کہ شاد صاحب رام پور ہی کے رہنے والے ہیں اور یہیں رہتے ہیں۔ اس زمانے میں کچھ ایسا تصوّر تھا کہ آبا کے علاوہ ہر وہ نام جو رسالے یا اخبار میں چھپتا ہے رام پور کے باہر کا ہوگا۔

رام پور کی سالانہ زراعتی نمائش کا کل ہند مشاعرہ خاصے اہتمام سے ہوتا تھا، جوشؔ، جگرؔ اور فراقؔ تو جیسے مستقل ہو کر رہ گئے تھے۔ اس کی یہ آن بان سنہ پچاس اکیاون تک قائم رہی۔ شاید انھیں دو سنوں میں سے کسی ایک سنہ کا مشاعرہ ہوگا، رات کا آخری وقت تھا، پانچ ساڑھے پانچ کے قریب — اُستادوں کے پڑھنے کا وقت۔ محشر عنایتی تعارف کرا رہے تھے اُنھوں نے پکارا "رام پور کے اُستاد شاعر شاد عارفی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" اور ایک منحنی سا حقیر سا شخص ڈائس پر اُٹھ کر مائک کی طرف آیا۔ ارے یہ ہیں شاد صاحب! انھیں تو میں پہلے سے جانتا تھا، یاد آیا میرا لڑکپن بھی نہیں بچپن تھا۔ چھ سات سال کی عمر ہوگی کہ میں نے انھیں صاحب کو "عوام کا کالج" کی رسم افتتاح پر ایک نظم پڑھتے سنا تھا۔ وہ دھندلا دھندلا منظر اُبھرنے لگا۔ سیدین صاحب، سرور صاحب، کھدر کے لباس میں جامعہ ملّیہ کے شفیق صاحب کتابوں کی نمائش، دف پر چار بنیّوں کی الاپ۔ اور یہی صاحب تو ہمارے محلّے میں ایک پڑوسی سے ملنے کبھی کبھی شام کو آیا کرتے تھے۔ اُن بیچارے کے یہاں بیٹھنے کا کوئی انتظام نہیں تھا، ٹوٹے ہوئے مونڈھے گھر میں سے نکال لاتے تھے، حقہ آجاتا اور گھنٹے پون گھنٹے ان صاحب سے گھُٹتی رہتی۔ ان کے ہاتھ میں بٹیر ہوتی جسے یہ مسلسل پان کی پیک سے رنگتے رہتے۔ اس حرکت سے بڑی گھِن آتی تھی مگر جی یہی چاہتا تھا کہ بٹیر ذرا دیر کو میرے ہاتھ میں بھی آجاتی ——— اور انھیں کو تو محلّے میں بازار میں لگنے والی کبوتروں کی پینٹھ میں ایک کا بک سے دُوسری کا بک کی طرف جاتے دیکھا کرتا تھا۔ کبھی ایک سے کبوتر لے رہے ہیں کبھی دُوسرے سے اور اُس کی گردن ناپ رہے ہیں، کبوتر بیچارہ ہاتھوں میں تلملا رہا ہے اور یہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں گڑوئے دیتے ہیں کبوتر کے حسب نسب معلوم کرنے کا یہ بھی ایک طریقہ ہے، یہ بات بہت عرصے بعد معلوم ہوئی۔ ہفتے کے ہفتے پینٹھ ہوتی تھی اور یہ اُس میں لازماً ہوتے تھے۔

مشاعرے میں انھیں دیکھا تو حیرت بھی ہوئی، خوشی بھی اور اپنی کم علمی پر غصہ بھی آیا۔ شاد عارفی ایسے نکل جائیں گے جیسے وہ نکل گئے ہیں سوچ بھی نہیں سکتا تھا، سوکھا، مریل سا جسم، پچکے گال، ٹوپی میں سے گنج نمایاں، بال خورے کا شکار، ڈاڑھی مونچھ کیا بھنوؤں تک غائب۔ پڑھنا شروع کیا تو اور بھی چوپٹ، لٹیا ہی ڈبو دی۔ پہلے دو تین قطع پڑھے پھر طویل بحر کی ایک غزل پڑھی، شعر اچھے بھلے ہوں گے مگر نہایت پھسپھسے اور بے تاثر لگے پڑھنے والا گھانس کاٹ رہا تھا۔ بڑے گھبرائے ہوئے

ہارے ہوئے، آواز بھنبھرائی ہوئی، حلق سے نکلنے کا نام ہی نہ لے۔ پہلو پہ پہلو بدلے جائیں مگر جب چل پڑے تو چل پڑے کچھ ہوش نہیں کہ سننے والے کس شعر پر داد دے رہے ہیں، کسے مکرر سننا چاہتے ہیں۔ اس شعر پر ہاتھ اٹھا کر شکریہ ادا کر دیا جس پر داد نہیں ملی تھی اور جس پر داد ملی تھی، اسے بغیر تکرار کیے آگے بڑھ گئے۔ معلوم ہوتا تھا کسی مصیبت میں پھنس گئے ہیں اور جیسے تیسے اپنا پنڈ چھڑانا چاہتے ہیں۔ جیسا حال علی گڑھ میں جونیروں کے انٹروڈکشن نائٹ کا ہوتا ہے ہو بہو وہی نقشہ۔ ایک خیالی پیکر رسالوں میں انھیں پڑھ پڑھ کر بنا تھا۔ ریت کی دیوار کی طرح بیٹھ گیا۔ لاحول ولا قوۃ یہ بھی کوئی بڑا شاعر ہوا جو ایک مجمع کا اور وہ بھی اپنے شہر کے سامنا نہ کر سکے۔ شخصیت ہی کچھ ہوتی تو صبر آجاتا۔ پڑھنا نہیں آتا تھا نہ سہی کچھ تو کس بل ہوتا۔ کسی بھی طرح شاد عارفی ماننے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ اور کیسے چاہتا ایک شخص اپنے بارے میں کہتا ہو کہ "غزل کے رام پور میں پٹھان ہیں تو آپ ہیں" وہ بجائے دبنگ اور قد آور ہونے کے ایسا جھاکا مارا جھینپو اور بزدل نکل جائے۔

ظاہر ہے کہ یہ تاثر بڑا ناپائیدار تھا اور ایک کچے ذہن کی پیداوار جو کچھ ہی دنوں میں زائل ہو گیا۔ ایک روز میں اپنے ایک دوست کو ساتھ لے کر پوچھتا پاچھتا اُن کے گھر جا پہنچا، ان دنوں چند ساتھیوں نے مل کر ادارہ ادبیات اُردو کے نام سے ایک اُردو مہر بنوالی تھی۔ ذہنی مفلسی اور کم مائیگی کا یہ عالم تھا کہ کوئی نیا نام بھی نہیں سوجھا۔ حیدر آباد کے اسی نام کے مشہور ادارے کا ذکر کہیں پڑھ لیا ہو گا وہی کام میں لے آئے۔ ہمیں تخلص تک تو نئے ملتے نہیں تھے اور دلی سے اقبال تک سارے اساتذہ کے تخلص تختۂ مشق بنے رہتے تھے۔ ایک ساتھی کو میر مہدی بیدار کا تخلص بھا گیا اور دوسرے شاکر میرٹھی کا تخلص لے اُڑے۔ خود میں نے اقبال پطرس اور پھر وقار عظیم سے وقار تخلص چرایا — تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ شاد صاحب کے پاس ہم دو دوست پہنچے اور دروازہ کھٹکھٹایا۔ کچھ دیر میں وہ باہر آئے ہم نے عرض مدعا کیا۔ "مشاعرہ کر رہے ہیں آپ بھی تشریف لائیں۔" ادھر سے بڑا رُوکھا سا جواب ملا۔ ہم انکار سننے کے لیے بالکل تیار نہیں تھے اس لیے بڑا ناگوار ہوا۔ "یہ آخر سمجھتے کیا ہیں اپنے آپ کو" کچھ اس قسم کا تاثر تھا گویا ہم لوگ شاد صاحب پر کوئی احسان کرنے گئے تھے۔ ہم لوگ کی عمریں ہی ابھی کیا تھیں، جیسی عمریں ویسی ہی اُڑانیں، دوستیوں کی بنیادیں عجیب عجیب انداز سے پڑتی تھیں۔ بیدار صاحب پہلی بار جب آئے تو میری زیارت کرنے آئے تھے۔ وقار عظیم صاحب ماہِ نو ایڈیٹ کیا کرتے تھے۔ میں نے انھیں غالب کی ایک مطبوعہ تصویر مکاتیبِ غالب سے کاٹ کر اور اس پر مختصر سا نوٹ لکھ کر فروری میں شائع ہونے والے غالب نمبر کے لیے بھیج دی جو انھیں تاخیر سے ملی۔ اس لیے شریک اشاعت نہ ہو سکی ہاں اُنھوں نے اپنے اداریے میں تصویر کے حوالے سے میرا ذکر کیا۔ بیدار صاحب یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ رام پور میں ایسی اہم شخصیت کونسی ہے جس کا تذکرہ "ماہ نو" جیسے رسالے کے اداریے میں کیا جائے۔ ایسے مرعوب ہوتے تھے ایک دُوسرے سے۔ پھر ان لونڈوں کو شاد صاحب کیا خاطر میں لاتے۔

لیکن شاد صاحب کا یہ ظاہر جو بڑا مایوس کن تھا اُن کے اس تاثر میں آڑے نہیں آیا جو بحیثیت شاعر وہ مجھ پر ڈال رہے تھے اس لیے جب باقاعدہ شاعری شروع کی اور شاعری کی روایات میں سے ایک روایت اُستاد کا سوال سامنے آیا تو شاد صاحب کے علاوہ اور کوئی نہیں جچا۔ معلوم ہوا آج کل دن بھر شاد صاحب حامد اسکول کے سامنے ایک اسٹوڈیو

پہ بیٹھے ملتے ہیں۔ اُن سے ایک عزیز اشفاق صاحب کو فوٹوگرافی کا بہت شوق تھا کلکٹریٹ میں نوکر تھے مگر یہ اسٹوڈیو بھی کھول لیا تھا۔ ان کے دفتر کے اوقات میں نگرانی کا کام شاد صاحب انجام دیتے تھے۔ ہمت نہیں پڑتی تھی کہ شاد صاحب کے پاس جاؤں، ان کا اکھل کھرا انداز سامنے آجاتا تھا خدا جانے کس طرح پیش آئیں۔ پھر بھی ایک دن دل پکا کرکے پہنچ گیا۔ اور اُن سے شاگردی کی درخواست کی۔ چھوٹتے ہی پوچھنے لگے "کچھ عشق وشق کیا ہے؟" یہ کسے توقع تھی کہ وہ ایسا بے تکلف سوال کرلیں گے۔ میں نے کہا نہیں تو، بولے پھر شاعری تمھارے بس کی نہیں۔ اُن کے اس سوال سے اتنا منزدر ہُوا کہ میں جو سہما سہما بیٹھا تھا اور مُنہ سے بات نہیں نکل رہی تھی۔ وہ کیفیت ختم ہوگئی اُنھوں نے بھی وہ قصے چھیڑ دیے جب آتش جوان تھا اور پہلی بار مجھے یہ معلوم ہُوا کہ وہ تو بڑے ہی دلچسپ آدمی ہیں۔

رخصت ہوتے ہوتے غزل اُن کے پاس چھوڑ آیا جسے اُنھوں نے دو ایک روز میں دیکھ کر واپس کر دیا۔ ایسی غزل جس پر شاد صاحب جیسا شاعر اصلاح کر چکا ہو، میرے پاس غیر مطبوعہ کیسے رکھی رہ سکتی تھی۔ میں نے اُسے نقل کرکے انگار کراچی کو بھیج دیا۔ دُوسرے تیسرے مہینے شائع ہوگئی۔ شاد صاحب کی نظر پڑی۔ انھیں میرا نام کھٹکا۔ مُلاقات ہوئی۔ کہنے لگے

یہ آپ نے اپنے تخلص کے ساتھ عارفی کیوں نہیں لگایا؟ میرے سارے شاگرد لکھتے ہیں۔

میں نے پوچھا "عارف کون تھے؟"

"میرے والد"

"مگر میں تو آپ کا شاگرد ہُوں اس رعایت سے "شادی" لکھتا لیکن یہ مجھے آپ کے ساتھ مذاق سا لگا" میں نے مسکرا کر کہا اور وہ بھی مسکرا دیے اور بات کسی اور طرف موڑ دی۔

اصلاحوں میں چونکہ وہ اپنا مخصوص مزاج برتتے تھے اس لیے میں اُن سے اس معاملے میں مطمئن نہیں ہُوا اور دو ایک تخلیقات انھیں دکھانے کے بعد سلسلہ ختم کر دیا۔ مگر ان کے پاس جب تب پانچویں آنا جاتا رہا۔

شاد صاحب ایک ایسے فرشتے تھے جس کا خمیر ناری تھا یعنی ذرا سی دیر میں بھڑک جاتے تھے اُن کا ایک مصرع ہے کہ

ترے مزاج سے پارہ بھی قول ہار گیا

یہاں ترے کی جگہ مرے زیادہ صحیح ہے۔ نحیف جثتے کے آدمی اس لیے بے حد کمزور اعصاب کے مالک ایسے لوگ قوّتِ برداشت سے گویا محروم ہوتے ہیں پھر شاد صاحب تو شاعر بھی تھے اس لیے حساس بھی۔ چھوٹی سی بات کو ضرب پر ضرب دیے چلے جاتے، خراش اُن کے لیے گھاؤ بن جایا کرتی تھی۔ اُنھوں نے کبھی اپنے کانوں کی طرف نہیں دیکھا۔ ہمیشہ کوّے کے پیچھے دوڑ پڑتے۔ اس مزاج سے بہت سے لوگ مزا لینے لگے تھے اور اُن کے سامنے آئے دن کوئی نہ کوئی ایسا شگوفہ چھوڑ دیتے جس پر وہ بارود کی طرح بھک سے اُڑ جائیں۔

خود میرے ساتھ دو تین بار بھی ہُوا۔ ایک صاحب نے اُن سے جا لگایا کہ اکبر آپ کے پاس رسالے ہتھیلنے آتا

شاد عارفی

ہے۔ اب جو میں ایک روز ملنے گیا تو مجھے دیکھ کر منہ پھلا لیا اور بڑبڑاتے ہو کر اس طرح بیٹھ گئے کہ مجھ سے آنکھیں چار نہ ہوں۔ سلام کا جواب نہیں دیا۔ اور کہنے لگے میں ایسے لوگوں سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتا جو مجھے بے وقوف بنانے آتے ہوں میں نے کہا آخر کچھ میں بھی تو سنوں، بڑی اکھیڑ پچھاڑ کے بعد ساری بات بتائی۔ میں نے کہا۔ شاد صاحب آپ کو معلوم ہے کہ وہ سارے رسالے جو آپ کے پاس آتے ہیں۔ میرے پاس بھی آتے ہیں۔ پھر آپ نے یہ بھی نہیں سوچا کہ میں اب تک آپ سے کوئی ایک پرزہ بھی پڑھنے کے لیے نہیں لے گیا۔ ایسی صورت میں یہ کیسے کہہ سکتا ہوں کہ میں شاد صاحب سے رسالے ہتھیانے کے لیے ملتا ہوں۔ بات کی معقولیت پر ذرا جھنجھلائے۔ اس لیے کہ اتنی جلدی وہ موڈ بدلنا نہیں چاہتے تھے۔ پھر بولے "ہاں ٹھیک ہے نہ معلوم مجھے لوگ کیوں اس طرح پریشان کرتے ہیں۔"

ایک اور کرم فرما نے خدا انھیں خوش رکھے بمبئی سے شاد صاحب کو لکھ بھیجا کہ یہاں کے ایک اخبار میں اکبر نے آپ کے خلاف خطوط شائع کرائے ہیں اور "بندہ عبداللہ" اپنا نام ظاہر کیا ہے (بندہ جیسے خط کے آخر میں احقر یا نیازمند لکھ دیتے ہیں) شاد صاحب کو یقین کرنے میں کبھی زحمت نہیں ہوئی۔ اطلاع دینے والے سے یہ بھی نہیں کہا کہ کم از کم اخبار کے تراشے ہی انھیں بھیج دے، بس ناراض ہو گئے۔ وہ کرم فرما بھی اتنے عقلمند تھے کہ قطعاً ہوائی اطلاع دے ڈالی۔ پہلے اپنے آپ ایک آدھ خط اس انداز کا عبداللہ کے نام سے ہی چھپوا دیتے۔ پھر انھیں لکھتے۔ معاملہ بس یوں ہی تھا۔ بمبئی کے کسی اخبار یا کسی رسالے میں شاد صاحب کے خلاف نہ فرضی نہ اصلی کوئی خط سرے سے شائع ہی نہیں ہوا تھا۔ مہینوں گزر گئے اور وہ مجھ سے ناراض رہے جن صاحب نے مجھ تک یہ خبر پہنچائی کہ شاد صاحب اس وجہ سے تم سے ناراض ہیں۔ میں نے انھیں جواب دیا کہ میں نے کسی نام سے ایسا کوئی خط لکھا ہی نہیں اور اگر کوئی خط میرے ہی نام سے چھپ جاتا تب بھی اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ میں نے لکھا ہے۔ شاد صاحب خبر رساں ایجنسی کی بدطینتی سے پہلے ہی واقف ہیں اس لیے انھیں دوسروں کے سامنے اظہار کرنے سے پیشتر مجھ سے معلوم تو کیا ہوتا۔

میں شاد صاحب کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھا اس لیے اس بار جان بوجھ کر اُن سے ملنے نہیں گیا۔ کچھ دنوں بعد میرے کسی خوش گمان نے آپ ہی اُن سے وکالت کی اور شاد صاحب کی غلط فہمی دُور ہو گئی۔

میرا اُن سے ملنا جلنا اُن کے بہت سے شاگردوں کو پسند نہیں تھا۔ روز روز کی لگائی بجھائی سے تنگ آ کر میں نے بھی عافیت اسی میں جانی کہ اُن کے پاس کم جاؤں۔ مگر یار لوگوں کو اس پر بھی چین نہیں آتا تھا اور شاد صاحب کو پڑھاتے تھے اکبر کو آپ کا کوئی خیال نہیں ورنہ وہ یوں ہفتوں کیوں غائب رہے۔

شاد صاحب کی ہٹیلی طبیعت انھیں معقول سے معقول بات ماننے سے روکتی تھی۔ جو کچھ اُن کے اپنے نظریے یا عقیدے یا بیان کے خلاف ہوتا اُسے تسلیم کر لینے میں شاد صاحب کو بڑا تامل اور پس و پیش ہوتا۔ شکر یہی ہے کہ وہ دیر سے سہی مگر حقیقت کو آخر کار مان لیا کرتے تھے۔ صبا حیدرآباد میں کسی اعتراض کا جواب دیتے ہوئے اُنھوں نے غالب کا یہ شعر مثال میں پیش کیا ؎

خامے نے پائی طبیعت سے مدد
بادباں کے اُٹھتے ہی لنگر کھلا

میں نے ایک خط ایڈیٹر 'صبا' کو لکھا جس میں صرف اتنی بات کہی گئی تھی کہ شاد صاحب نے شعر کا دُوسرا مصرع غلط لکھا ہے اور اس لیے شعر قطعاً مہمل ہو گیا ہے۔ شعر کی منقولہ صورت میں خامے کی مدد طبیعت نہیں کر سکتی۔ اس لیے کہ اگر ایک طرف بادبان اُٹھتا ہے تو دُوسری طرف لنگر کھلا ہے ان دونوں کے تقاضے علیحدہ علیحدہ ہیں یعنی لنگر کھلنے سے کشتی رُک جائے گی اور بادبان اُٹھنے سے اُن میں ہوا کا زور ہو گا جس سے کشتی میں تحریک پیدا ہو گی اس کشاکش میں کشتی الٹ تو سکتی ہے لیکن اُس کی روانی میں مدد نہیں کر سکتی۔ اس کے علاوہ موجودہ قرأت میں زبان کی غلطی بھی ہے۔ اس لیے کہ بادبان کے لیے اُٹھانا اور لنگر کے لیے کھولنا نہیں بولا جاتا بلکہ بادبان کے لیے کھولنا اور لنگر کے لیے ڈالنا استعمال کیا جاتا ہے۔ معنی اور بیان میں یہ مہملیت دراصل کاتبوں کی کرامت کا نتیجہ ہے جس کا پتہ غالب کی زندگی میں لکھے اور چھپے دیوان کے نسخوں سے چلتا ہے۔ ان سب میں مصرع کی یہ شکل ملتی ہے۔

بادباں بھی اُٹھتے ہی لنگر کھلا

اس کے معنی یہ ہوئے کہ غالب نے اس مصرع میں "کے" کی جگہ "بھی" لکھا تھا اور یہی با معنی بھی ہے اور درست بھی اس لیے کہ لنگر اٹھائے جائیں اور بادبان کھولے جائیں تو کشتی رواں ہو گی۔

میری یہ صراحت صبا میں شائع ہوئی تو شاد صاحب بہت بگڑے، ملاقات ہوئی تو کہنے لگے "اب تم میرے خلاف بھی لکھنے لگے"۔ میں نے کہا کہ یہ آپ کے خلاف کب ہوا میں نے تو صحیح قرأت لکھ بھیجی تھی۔ وہ دلیل میں دیوان غالب طبع جرمنی اور طبع نظامی بدایوں کا حوالہ دینے لگے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ کا فرمانا بجا یہ دونوں ایڈیشن اچھے ایڈیشن ہیں مگر حسن کے لحاظ سے، صحت کے لحاظ سے نہیں۔ معتبر وہی ہے جو غالب کی زندگی میں لکھا گیا۔

شاد صاحب مطمئن ہو گئے ہوں گے مگر اقرار نہیں کیا اور بڑبڑاتے ہوئے زنان خانے میں چلے گئے۔ مہینوں اسی بات پر خفا رہے۔ ایک بار میں یہ سوچ کر اُن سے ملنے گیا کہ غصہ ٹھنڈا ہو چکا ہو گا۔ بات چیت کے آغاز میں طنزیہ جملے استعمال کرتے رہے جن پر میں نے یوں ظاہر کیا کہ وہ جملے ضائع جا رہے ہیں اور میرے لیے بے ضرر ہیں۔ تھوڑی دیر میں شاد صاحب نارمل ہو گئے اور ایسے گویا کبھی خفا ہی نہیں تھے۔

شاد صاحب کا نام اُردو ادب کا معمولی سا ذوق رکھنے والا بھی جانتا تھا اس لیے کہ وہ ہندوستان پاکستان کے تمام اخبارات اور رسائل میں اپنا کلام چھپواتے تھے اور یہ اخبار اور رسالے ہر قسم کے ہوتے تھے معیاری بھی اور حد درجہ — گھٹیا بھی (یہ لفظ خدا بخشے شاد صاحب کو بہت پسند تھا اور کسی چیز یا شخص کو غیر معیاری بتانے کا بھرپور ذریعہ) وہ اپنی روشنائی سے چھپنے کا کوئی موقع ہاتھ سے دینا نہیں چاہتے تھے۔ بالکل وہی عالم جو کسی مبتدی کا ہوتا ہے۔ اپنی تخلیقات کو بلا مبالغہ پندرہ پندرہ بیس بیس جگہ چھپواتے تھے بلکہ یوں کہا جائے کہ چھپواتے ہی رہتے تھے۔ یعنی تیرہ چودہ سال اُدھر کی چھپی

پرانی تخلیقات بھی نقل کر کے کسی تازہ فرمائش کے حساب میں ٹانک دیتے تھے۔ اللہ کا کلام تو یاد نہیں رہتا یہ کیسے یاد رہتا کہ شاد صاحب اسی تخلیق کو برسوں پہلے بھی کہیں شائع کرا چکے ہیں اس لیے دوبارہ سہ بارہ اور نہ جانے "کتنی بارہ" ایک ایک تخلیق چھپتی تھی۔ کلام میں تازگی بلا کی تھی اس لیے اور بھی پتہ نہیں چلتا تھا کہ پرانا مال ہے۔ اسی طرح ایک طویل عرصے پر محیط اُن کا نام مائل پر چھایا رہا ——— اُن کے بہت سے ہم عصر گوشۂ گمنامی میں چلے گئے۔ شاد صاحب زندہ رہے اور انھیں زندہ بھی رہنا چاہیے تھا تیس پینتیس سال کے شاعروں میں کتنوں کو یہ حق پہنچتا ہے، بس دو چار کو ـــ اور شاد صاحب کو سب سے زیادہ۔

لیکن اس شہرت کے باوجود اُن کی نازک طبیعت اور بظاہر چڑچڑے مزاج نے انھیں رام پور میں جو اُن کا گھر تھا کی حد تک اجنبی رکھا۔ کئی سال کی بات ہے ایک صاحب ہمارے ہاں لائبریری میں تحقیقی کام کرنے آئے ہوئے تھے شاد صاحب کے شیدائی تھے اور اُن سے ملنے کے بے حد مشتاق۔ ان دنوں شاد صاحب ایک محلّے سے دُوسرے محلّے میں نئے نئے منتقل ہوئے تھے اور مجھے ابھی اُن کی نئی قیام گاہ کا محل وقوع معلوم نہیں تھا۔ اُن صاحب کو لے کر میں شاد صاحب کی تلاش میں گیا۔ محلّے میں اُن کا اتا پتا معلوم کرنا چاہا۔

"احمد علی خاں شاد عارفی کس مکان میں آکر رہے ہیں؟"

"کون احمد علی خاں! ـ شہر ناظم تھے؟"

"نہیں صاحب، شاد عارفی"

"معلوم نہیں"

کوئی اور ملا۔

"کیا آپ کو پتا ہے یہاں شاد صاحب کدھر رہتے ہیں؟"

"یہاں تو نہیں رہتے۔"

"ارے صاحب! یہاں احمد علی خاں شاد عارفی کہیں رہتے ہیں؟ آپ کو معلوم ہے؟"

"کون احمد علی خاں! ——— انچارج؟"

انچارج (بکسر را) رام پور کے عوامی لہجے میں اس سب انسپکٹر پولیس کو کہتے ہیں جو کسی تھانے کا انچارج ہو۔ غرض مشکل سے پتا چلا۔

اب سے شاد صاحب کا تذکرہ اکثر آتا رہتا تھا۔ لیکن کبھی ایسا ہوتا کہ میں کچھ عرصے تک اُن کا کوئی تذکرہ نہیں کرتا تو ابا سے پوچھتے: "کیا آج کل شاد صاحب سے کچھ ناراض ہو" اس جملے میں شاد صاحب کے لیے ہمدردی بھی ہے اور میرے لیے فہمائش بھی۔ یعنی نہ تو شاد صاحب کے حالات ایسے ہیں کہ اُن سے کوئی رُوٹھ کر بیٹھ جائے اور نہ یہ بات مجھے زیب دیتی ہے کہ چھوٹا ہوتے ہوئے شاد صاحب کی کسی بات پر قطع مراسم کر لوں۔

ایک بار اباّ نے مجھ سے شاد صاحب کے بارے میں کہا تھا کہ انھیں مریض اور خود کو معالج سمجھ کر ملو تو اُن سے نبھ سکتے ہو۔ مریض سے نہ کوئی لڑتا ہے نہ اُس کے چڑچڑے پن پر جھنجھلاتا ہے، مریض کی سُنتا ہے اور اُس کے دُکھ کی د[illegible] کرتا ہے۔

شاد صاحب اس معاملے میں خوش نصیب نہیں تھے اس لیے کہ اُن کے معدودے چند عقیدت مندوں کو چھوڑ[illegible] جو اُن سے نبھانے کی قسم کھا چکے تھے کسی نے اُن کی دلداری اور دلدہی نہ کی۔

شاد صاحب کا جتنا کلام اُن کے نام سے شائع ہوا اُس سے کم از کم دوگنا وہ ہے جو اُنھوں نے اپنے شاگردوں کے لیے لکھ کر دیا لیکن ان کے شاگردوں کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ وہ شاد صاحب کی بیماری کے زمانے میں یا جب مالی اعتبار سے زیادہ پریشان حال ہوتے (پریشان تو ہمیشہ ہی رہے) شاد صاحب سے دُور دُور رہتے تھے۔ اُنھوں ایک خط میں اپنے ایک مخلص وہمدرد کو لکھا تھا۔

"میرا کام خدا کے فضل سے چل رہا ہے اور ایسے لوگوں کے ذریعے چل رہا ہے جن سے توقع نہ تھی۔ شاگرد سب پیٹھ دکھا گئے۔ مرنے دو۔"

میرا معاملہ مختلف تھا میں چاہے عام حالت میں جاؤں یا نہ جاؤں لیکن اُن کی بیماری کے زمانے میں ضرور جایا کرتا تھا۔ شاید ۲[illegible] کا رمضان تھا کہ وہ شدید بیمار پڑے۔ میرا دن دن بھر اُن کے ساتھ گزرتا۔ وہ اشفاق صاحب کی بیٹھک میں رہتے تھے سخت گرمی کا زمانہ تھا۔ ایک چھوٹا سا پلنگ پڑا تھا۔ زمین پر ریت بچھی تھی جسے پانی سے خوب تر کر دیا جاتا تھا۔ لُو کے تھپیڑے جب پر سے گزرتے تو ٹھنڈے ہو جاتے، وہ بے چین پلنگ پر کروٹیں بدلتے۔ لمبی لمبی سانسیں لیتے اور ایسے باہر نکالتے جیسے پھونکیں مار رہے ہیں۔ اس بے چینی کے باوجود میں نے دیکھا وہ گفتگو بڑی دلچسپ کرتے، اپنے معاشقے سناتے داؤ پیچ بتا[illegible] اور یہ ظاہر نہ ہو پاتا کہ وہ کس اذیت سے گزر رہے ہیں۔ درمیان میں کبھی کبھی تلخی آتی تھی مگر ان شاگردوں ہی کے ذکر سے جو اُن[illegible] کنّی کاٹے ہوئے تھے اور شاد صاحب ان سے متوقع تھے کہ وہ بیماری کے عالم میں اُن کی خدمت کریں گے۔ یا پھر کبھی[illegible] اشفاق صاحب کی بیوی کے رویے کی شکایت کرتے۔ اگرچہ شاد صاحب اس معاملے میں حق بجانب نہیں تھے اس لیے کہ اس وقت بھی دماغی توازن نہیں رکھتی تھیں اور کچھ عرصے بعد تو بالکل ہی پاگل ہو گئیں۔

اس زمانے میں مجھے شاد صاحب کی طبیعت کا صحیح اندازہ ہوا۔ شاد صاحب کی تلخ مزاجی اور اکھل کھرا پن بڑی حد[illegible] اُن کی بناوٹ تھی وُہ یہ آزمانا چاہتے تھے کہ اُن سے ملنے والا انھیں سچ مچ اہمیت دیتا ہے یا اپنا مطلب نکالنا چاہتا ہے وہ اُن کی بدمزاجی کو جھیل گیا تو شاد صاحب نے سمجھ لیا کہ اس سے نبھ سکتی ہے۔ دُوسری صورت میں تو وہ خود ہی بھاگ جا[illegible] شاد صاحب فطرتاً خوش مزاج تھے، روز روز کی بیماری اچھے بھلے مزاج والے کو بدل دیتی ہے، یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ [illegible] صاحب پر وہ تکالیف جن کی اقسام تک نہیں گنائی جا سکتیں کوئی اثر ہی نہ کرتیں۔

شاد صاحب سے نبھانے کے لیے تھوڑی فنکاری درکار ہوتی تھی۔ وہ پہلے گیدڑ بھبکیوں سے کام لیتے تھے

نانے تھے اور کوئی بات سننے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے تھے لیکن اگر مدِ مقابل بھی اکڑ جاتا تو وہ صابن کے جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے تھے۔ اُن کے شاگرد جاوید کمال اپنی شادی کے کئی دنوں بعد ہنگاموں سے نپٹ کر اُن سے ملنے مٹھائی لے کر گئے۔ شاد صاحب نے مٹھائی لینے سے انکار کر دیا اور کہا یہ شادی کی مٹھائی نہیں ہے تم ابھی تازہ بازار سے خرید کر لائے ہو میں نہیں لوں گا۔ جاوید کمال نے کہا جی ہاں لایا تو بازار سے ہی ہوں آپ کے لیے باسی تباسی مٹھائی کیا لاتا۔ وہ جتنا مناتے جاتے شاد صاحب اُتنے ہی اینٹھتے چلے جاتے۔ جاوید نے آخر میں تنگ آکر کہا کہ اچھا نہیں لیتے تو مت لیجیے میں خود ہی کھائے لیتا ہوں اور یہ کہہ کر اُن کے سامنے بیٹھے بیٹھے ساری مٹھائی کھالی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شاد صاحب اتنی ہی دیر میں ٹھیک ہو گئے وہ سمجھ چکے تھے کہ اُن کا داؤں بے کار گیا۔ یقیناً جاوید کمال خوشامد میں لگے رہتے تو شاد صاحب کے پاس سے ناکام واپس آتے۔

علی گڑھ میں شاد صاحب جاوید کمال کے ساتھ ٹھہرا کرتے تھے۔ ہفتوں رہتے مگر اچانک گھبراہٹ طاری ہو جاتی اور اسٹیشن جانے کی تیاری کرنے لگتے۔ ایسے موقع پر اُن سے ایک آدھ بار رُکنے کے لیے کہا جاتا۔ وہ نہ مانتے تو جاوید اپنے چھوٹے بھائی سے کہتے کہ رکشا لے آؤ، اور رکشا منگانے کی نوبت نہ آتی، شاد صاحب پھر ہفتوں کے لیے رُک جاتے۔

شاد صاحب کی بدمزاجی کے مظاہرے دو قسم کے تھے۔ ایک تو اُن لوگوں سے جن سے اُن کا سامنا نہیں ہوتا تھا یعنی وہ رام پور سے باہر کے ہوتے تھے، دوسرے وہ جن سے بار بار واسطہ پڑتا رہتا، ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ پہلی قسم کے لوگوں سے اُن کی قلمی جنگ ہوتی تھی۔ اُن میں نیاز فتح پوری، مجروح سلطان پوری، لاہور کا مشہور ناشر چودھری محمد حنیف، مدیر نقوش، اور بے شمار رسالوں کے ایڈیٹر آتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی انھیں کبھی تحریر سے مطمئن نہیں کر سکا۔ اِلّا اس نے غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیے ہوں، دوسری قسم کے حضرات سے اُن کی چھیڑ چھاڑ قلم سے بھی ہوتی تھی اور زبانی بھی۔ مقامی اخبارات میں بحثیں چلتی تھیں، مختلف ملنے والوں کے سامنے وہ اپنے مخالف کو خوب خوب سناتے تھے اور ساری باتیں مخالف تک پہنچا کرتی تھیں۔ مہینوں اور سالوں دلوں میں رنجش رہتی تھی، ان مقامی لڑائیوں کا بند و بست اُن کے شاگرد کرتے تھے لیکن جب بھی مخالف اُن سے ملا وہ تھوڑی دیر تک کٹ حجتی کرتے رہے اور پھر معتدل ہو گئے۔ وہ عزت اُس وقت تک رہتے تھے جب تک اُن کی آنکھیں چار نہیں ہوتی تھیں، جہاں بات رُو در رُو ہوئی اور انھوں نے ہار ڈال دی۔ اس کے معنی یہ نہیں تھے کہ وہ ڈر جاتے تھے بلکہ اُن کی مروّت جو مشرقی معاشرے کی دین ہے انھیں زیادہ دیر تک جمنے نہیں دیتی تھی۔

شاد صاحب کے معاصرین میں راز یزدانی مرحوم شاعری اور نثر نگاری دونوں میں ممتاز تھے۔ وہ بے حد مرنجاں مرنج قسم کے آدمی تھے، شاد صاحب کے دل سے معترف تھے یہ اُن کی بلند حوصلگی تھی کہ شاد صاحب سے اکثر مخالفتوں کے باوجود انھوں نے میرے سامنے ہی نہیں بہت سے لوگوں کے سامنے شاد صاحب کی شاعرانہ عظمت کا از خود اظہار کیا۔ لگائی بجھائی کرنے والے کب مانتے ہیں۔ چنانچہ راز صاحب کے حوالے سے کوئی نہ کوئی اُلٹی سیدھی شاد صاحب کے

سامنے جڑ دیتے اور شاد صاحب بے قابو ہو جاتے۔

ایک روز راز صاحب جو ہمیشہ متبسّم رہا کرتے تھے خلافِ معمول اور خلافِ مزاج بڑے برہم میرے پاس لائبریری میں آئے اور ایک کارڈ میری طرف بڑھا کر بولے "دیکھیے اپنے اُستاد کی حرکت ملاحظہ کیجیے۔" میں نے دیکھا شاد صاحب کا خط تھا جس میں اُنھوں نے راز صاحب کو دھمکایا تھا کہ "میں نے بہت سے آستین پال رکھے ہیں انھیں تمھارے اُوپر چھوڑ دوں گا تم نے فلاں موقع پر میرے بارے میں فلاں بات کہی ہے۔" یہاں آستین سے شاد صاحب کی مراد اُن کے شاگرد تھے۔ اس دھمکی سے قطع نظر شاد صاحب کا یہ خطاب اپنے شاگردوں کی طرف سے ان کے دل کے غبار کو بھی ظاہر کرتا ہے اور اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ اپنے شاگردوں کو کس صف میں رکھتے تھے۔

خط پڑھ چکا تو میں نے راز صاحب کی طرف منہ اُٹھا کر دیکھا اُنھوں نے ایک اور کارڈ میرے ہاتھ میں تھما دیا اور کہنے لگے کہ اس میں میں نے لکھ دیا ہے کہ "میں بھی رام پور ہی کا ہوں ڈرتا نہیں، جو بگاڑ سکو بگاڑ لو۔" میں نہیں چاہتا تھا کہ بات طول کھینچے اور مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ ابّا تک بات پہنچے گی تو وہ راز صاحب کے غصّے کو ٹھنڈا کر دیں گے اس لیے میں نے راز صاحب سے کہا کہ آپ یہ دونوں خط ابّا کو بھی دکھا دیجیے۔ وہ ویسے ہی اُٹھ کر ابّا کے پاس چلے گئے تھوڑی دیر میں واپس آئے تو مسکراتے ہوئے اور کہنے لگے کہ اُنھوں نے تو میرا جواب پھاڑ کر ردّی میں پھینک دیا۔ میں نے کہا اب آپ ہی سوچیے کہ یہ عمریں آپ کی اس طرح لڑنے جھگڑنے کی ہیں۔

شاد صاحب کے شاگردوں کو بے پَر کی اُڑانے اور آپس میں لڑانے کی نئی نئی تدبیریں سوجھتی رہتی تھیں۔ ایک دن ایک شاگرد ملے اور باتوں باتوں میں کہنے لگے کہ آپ کو معلوم ہے کہ شاد صاحب نے راز صاحب کو بُری طرح ذلیل کر دیا۔ میں نے پوچھا خیر تو ہے اُنھوں نے بڑی معصومیت سے مجھے من گھڑت سُنانا شروع کیں کہ راز صاحب اپنی ایک غزل لے کر شاد صاحب کے پاس پہنچے تھے اور چاہتے تھے کہ شاد صاحب اپنی سفارش کے ساتھ کسی معیاری رسالے میں چھپنے کے لیے بھیج دیں۔ شاد صاحب نے راز صاحب سے کہا کہ میں سفارش تو کر دوں گا مگر پہلے غزل پر اصلاح دوں گا اس پر راز صاحب اُٹھ کر چلے آئے۔ میں نے اُن صاحب سے عرض کیا کہ جی بالکل بجا ارشاد ہوا، اس لیے کہ راز صاحب جو آج سے نہیں تیس پینتیس برس اُدھر سے ادبی دُنیا، ہمایوں، شاہکار، نگار اور آج کل میں چھپ رہے ہیں انھیں شاد صاحب کی سفارش کی ضرورت یقیناً پیش آئی ہوگی۔ کہنے والا یہ سُن کر سامنے تو چپ ہو گیا لیکن یہ بات راز صاحب تک بھی پہنچی اور اُنھوں نے مجھ سے تذکرہ کیا۔ میں نے انھیں بتایا کہ یہ فلاں صاحب کے خبثِ باطن کی اختراع ہے اور شاد صاحب ایسی احمقانہ اور ایسی ناقابلِ یقین بات نہیں کہہ سکتے۔ راز صاحب کو پہلے ہی شک تھا اس لیے بات آئی گئی ہو گئی۔

راز صاحب کے انتقال کے بعد میں نے نگار کا راز نمبر نکالنا چاہا تو شاد صاحب نے اُن کے بارے میں اپنے ا[illegible] تاثّرات کا اظہار کیا اور انھیں قلم بند کر کے مجھے دینے کا وعدہ بھی کیا۔ راز صاحب کی طبیعت کا اندازہ بھی اس بات سے ہو[illegible] اُنھوں نے ایک بار مجھ سے کہا تھا کہ شاد صاحب کے لیے سرکاری وظیفے کی تحریک کی جانا چاہیے تاکہ وہ اطمینان کا سا[illegible]

رہے سکیں۔

شاد صاحب نے اپنے معاصرین کے کلام پر بڑی سخت گرفت کی ہے۔ اُن کی اس انداز کی تنقید یں بے حد دلچسپ ہوتی تھیں اور وہ ان میں اکثر و بیشتر بات کو بے حد اُلجھا دیا کرتے تھے اس طرح کہ پڑھنے والے کا ذہن اصل اغراض سے ہٹ کر ادھر اُدھر بھٹکنے لگتا تھا پھر وہ صرف اپنی کہتے تھے دُوسرے کی نہیں سُنتے تھے۔ پے در پے اتنے جائز اور ناجائز اعتراضات کرتے کہ اُن کا شکار گھبرا جاتا اور یہ سب کچھ وہ حفظ ماتقدم کے طور پر اپنے بچاؤ میں کرتے تھے اس لیے کہ خود شاد صاحب کے کلام میں بھی غلطیاں ہوتی تھیں۔ اور بعض تو فاش قسم کی۔ شلاً یہ شعر دیکھیے:

۱ تغافلِ کمالِ فن مزاجِ رام پور ہے
تو مجھ سے بے رُخی ہیں بزم دوست بے قصور ہے

۲ باعث شدت جنون شوق
آپ کی وا عدہ خلافی ہے

۳ تاکجا پوشیدہ رکھ سکتا ہے دوعملی کا عیب
تیری گردن توڑ ڈالے گا کسی دن دستِ غیب

۴ اس دوعملی کی لاج شاید رہ جائے
گھر کا بھیدی جو ڈھا رہا ہے لنکا

پہلے شعر میں اُنھوں نے یہ کہنا چاہا ہے کہ کمالِ فن سے تغافل برتنا رام پور کا مزاج ہے۔ لیکن اُنھوں نے تغافلِ کمالِ فن میں اضافت در اضافت سے کام لیا ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ کمالِ فن تغافل برتنے والا ہوا نہ کہ رام پور۔ شاد صاحب کے مفہوم کو ظاہر کرنے کے لیے یہ مصرع یوں ہونا چاہیے تھا۔

تغافل از کمالِ فن مزاجِ رام پور ہے

دُوسرے شعر میں اُنھوں نے وعدہ کو وا عدہ نظم کیا ہے جو قطعی غلط ہے وا عدہ کوئی لفظ ہی نہیں۔

تیسرے اور چوتھے شعر میں دوعملی کی م ساکن نظم ہُوئی ہے جب کہ اسے متحرک ہونا چاہیے تھا۔

اس طرح ایک نظم میں اُنھوں نے یہ مصرع لکھا ہے۔

دکھاتے ہیں اگرچہ دبدبہ ابھی

اور مددسند قوافی استعمال کیے ہیں۔ مذکورہ غلطیاں بغیر کسی تلاش و کاوش کے میں نے نوٹ کر لی تھیں اس طرح کی بہت سی مثالیں شاد صاحب کے کلام میں مل جائیں گی۔

شاد صاحب نے تقریباً چالیس سال کی عمر میں شادی کی۔ لیکن بیوی ان کا زیادہ ساتھ نہ دے سکیں۔ اور ڈیڑھ سال ہی میں انتقال کر گئیں۔ تپ دق کا علاج اتنا مہنگا ہوتا ہے کہ شاد صاحب کی ناداری اس کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ مالی پریشانیوں کا اکثر

و بیشتر گھریلو زندگی پر بھی اثر پڑتا ہے۔ پھر شاد صاحب تو اپنے دو معاشقوں میں ناکام بھی رہ چکے تھے اس کا بھی کچھ نہ کچھ نفسیاتی اثر مرتب ہونا چاہیے اس لیے اُن کی گھریلو زندگی پُرسکون نہیں رہی۔ بیوی سے کوئی اولاد نہیں ہوئی ممکن ہے اس میں بھی زندگی کی تلخیوں کو دخل ہو۔ ورنہ شاد صاحب کے لیے بن ماں کے بچّے کی پرورش کچھ مزید آلام و مصائب کا باعث بنتی۔

اپنی ازدواجی، رومانی، معاشی ناکامیوں کو بُھلانے کے لیے اُنھوں نے بہت سے نسخے آزمائے۔ اُنھوں نے گھبرا کر شراب تو نہیں پی، مذہب آڑے آگیا ہوگا، ویسے پچیسی، شطرنج، پتنگ اور کبوتر وغیرہ سے اُنھوں نے اپنا دل بہلایا۔ حقّے کے بہت شوقین تھے اور سانس کی تکلیف کے باوجود اس کو اپنا رفیق بنائے رہے۔

شاد صاحب درمیانہ قد اور منحنی جسم کے آدمی تھے، چہرہ کتابی تھا، تن و توش کے تو وہ کبھی بھی نہیں رہے لیکن اتنے کمزور بھی نہیں تھے جتنے بے روزگاری اور بیماری کی شدّت سے ہوگئے تھے۔ پچکے گال سوکھی ہڈیاں جن پر کھال ہی کھال باقی رہ گئی تھی۔ جوانی میں آنکھوں پر سنہرے فریم کی عینک لگاتے تھے۔ اب عرصے سے گول شیشوں اور موٹے کالے فریم کی عینک استعمال کرتے تھے۔ وہ سیدھے سادے لباس پہنتے تھے۔ بہت ہی مخصوص موقعوں پر شیروانی۔ عام طور پر قمیص، پاجامہ، قمیص کے کالر پر ایک رومال لگا ہوا۔ گرمیوں میں جواہر کٹ، جاڑوں میں مرزئی اور گلے میں رومال کی جگہ اُونی مفلر سر پر رام پوری ٹوپی جو موسم کے لحاظ سے کبھی اُونی کپڑے کی ہوتی کبھی سوتی کپڑے کی۔ سُوٹ بُوٹ میں میں نے انھیں کبھی نہیں دیکھا مگر فوٹو کھنچواتے وقت کبھی کبھی قمیص پر ٹائی باندھ لیا کرتے تھے۔ بالوں کی بیماری کا احساس بہت تھا۔ میرے دوست طاہر ایم سید نے اُن کا Bust بنانا شروع کیا تو شاد صاحب نے سر کے بالوں اور بھوؤں کو گھنا بنوایا اور اُن سے بڑے خوبصورت انداز میں اپنے مدعا کا اظہار کرنے کے لیے کہا "سیّد صاحب! میرے یہ جو بال دیکھ رہے ہیں یہ بیماری سے خراب ہوگئے ہیں اس کا خیال رکھیے گا۔" شاد صاحب ان حالات میں نہیں تھے کہ کوئی ملنے آئے تو اس کی خاطر مدارات کھلانے پلانے سے کر سکیں۔ لیکن طاہر صاحب کی تواضع میں انھوں نے اہتمام کیا اور جتنے دن بھی وہ مجسمہ بناتے رہے۔ شاد صاحب چائے پان سگریٹ سے تواضع کرتے رہے۔

اپنے معاشقے بڑے اشتیاق اور پوری تفصیلات سے سُناتے تھے، میں نے دو عشق کیے ہیں کہتے ہوئے دو پر زور دیتے تھے۔ ان میں سے ایک لڑکی شاد صاحب کے خاندان کی تھی اور پڑوس میں رہتی تھی پڑوس بھی ایسا قریب کا کہ شاد صاحب کے لفظوں میں:

شام ہوتے ہی یہ سامانِ نظر میرے لیے　　چودھویں کا چاند ہے دیوار پر میرے لیے
رات کو آتی ہے تکیوں پر دلائی ڈال کر　　حسن اور اس درجہ بے خوف و خطر میرے لیے

ان کی موجودہ صحت کو دیکھتے ہوئے یقین نہیں آتا تھا کہ اُن سے ایک نہیں دو دو لڑکیوں نے عشق کیا ہوگا، مگر اُن کے عشقیہ اشعار کا مزاج سُنی سُنائی سے الگ ہے اور ان کی تجربہ کاری کا شاہد۔ متوسط گھرانوں میں چوری چھپے کا معصوم رومان ان کے بہت سے شعروں میں مل جاتا ہے مثلاً

سانولا رنگ کشیدہ قامت　　نہ پری ہے نہ کوئی حُور ہے وُہ

سُنا رہے ہیں ماجرائے دل ہم اس خیال سے　　اگر وہ سُن کے مسکرا دیے تو داستاں ہے

ہلکا سا تبسم ترے لب ہائے حسیں پر　　مجبور نہ کر مجھ کو محبت کے یقیں پر

مسکرا دیں گے مرا نام کوئی لے دیکھے
وہ کسی فکر میں بیٹھے ہوں کسی کام میں ہوں

بدلی ایسی زُلف کی لٹ میں شامل کر کے الجھن کوئی　　میری خاطر بال سکھانے ناپ رہا ہے آنگن کوئی
مستقبل میں رفتہ رفتہ گھُل مِل کر افسانے ہونگے　　اب تک چلتے پھرتے جلوے وہ بھی سما منا کوئی

میں پھر آغازِ اُلفت کا نتیجہ سوچنے بیٹھوں
مجھے تم گدگدا کر پھر نکل جاؤ برابر سے

چھُپائی ہیں جس نے میری آنکھیں میں اُنگلیاں اس کی جانتا ہوں
مگر غلط نام لے کر دانستہ لُطف اندوز ہو رہا ہوں

جو ہے وہ کہتا ہے اوس میں سو کے اپنی حالت خراب کر لی
کسی کو اس کی خبر نہیں ہے کہ رات بھر جاگتا رہا ہوں

راتیں گزر گئی ہیں مجھے جاگتے ہوئے　　تکیوں سے اب تو اُس کے پسینے کی بُو آئے

جذبۂ محبت کو تنبیہ بے خطا پایا
میں نے جب اُسے دیکھا دیکھتا ہوا پایا

میں اُس کو دیکھ رہا ہوں اس احتیاط کے ساتھ　　ابھی تو جیسے محبت کی ابتدا ہی نہیں

مرا قاصد تقاضے پر تقاضے کر رہا ہوگا
وہی لیکن جواب شوق لکھتے ڈر رہا ہوگا

خط غلط تقسیم ہو جاتے ہیں اکثر تم نے بھی　　کہہ دیا ہوتا "یہ کس کا خط مرے نام آگیا؟"

ہمارے خاندان کے بزرگ جب جوان تھے
تو کیا بزرگ اُن کے اُن سے یونہی بدگمان تھے

حق ہے کہ ستاؤ مگر اتنا نہ ستاؤ　　پڑ جائے مری آنکھ کسی اور حسیں پر

ایسے بھرپور ایک چھوڑ دو معاشقوں میں ناکامی کے ساتھ مالی پریشانیاں اور ناقدری فن کا احساس مستزاد شاد صاحب کے حصّے میں آیا۔ اور وہ اپنے ماحول اور اپنے حالات سے چڑ گئے۔ اُن کے قلم کا رُخ رومان کی رنگینیوں سے ہٹ کر حقائق کی تلخیوں کی طرف مُڑ گیا۔ ایسی تلخیوں کی طرف جنھوں نے اُن کا سُکھ چین لوٹ لیا تھا اور جن سے وہ اپنی موت تک دست و گریبان

رہے ایسے کہ پھر اُن کے ہاتھ جس کا گریبان آگیا اور اُردو شاعری کو غزل میں ایک پٹھان کی آواز سنائی دی منفرد اور گرجدار بھی ہیں۔

جو چاہتے ہیں ہمیں بے قرار فرمائیں
کہیں وہ خود نہ ستارے شمار فرمائیں

اُس نے جب سو تیر چلائے
میں نے ایک غزل چپکا دی

ان غم کی گھٹاؤں میں پپیہے کی صدا پر
محسوس یہ ہوتا ہے کہ جھک مار رہا ہے

وقت کیا شے ہے پتا آپ کو چل جائے گا ہاتھ پھولوں پہ بھی رکھو گے تو جل جائے گا

جلال کو بھی وقت نے سمو دیا ہے شعر میں
غزل کا مطمع نظر جمال ہی نہیں رہا

کہیں جھپٹ نہ پڑیں دن میں مشعلیں لے کر عوام کو نہ سمجھاؤ کہ روشنی کم ہے

یہاں چراغ تلے لوٹ ہے اندھیرا ہے
کہاں چراغ جلانے کی بات کرتا ہوں

وہ باغبان جو پودوں سے بیر رکھتا ہے یہ آپ ہی کے زمانے کی بات کرتا ہوں

جن مسائل میں وطن الجھا ہے
ہاتھ لگتا ہوں اگر سلجھا دو

ہے تو احمق چونکہ عالی نشان کاشانے میں ہے اس لیے جھک مارنا بھی اس کا فرمانے میں ہے

عمر بھر کی شرارتوں پر جو زاہد کو بزم سے اٹھادیں
بتائیے ان کی اس روش پر جو سر پیٹیں تو مسکرادیں

اگر ہمارا یقین نہیں ہے تو آئیے آپ کو گنا دیں
بہار میں جن کے آشیانے لٹے ہیں وہ اپنے ہاتھ اٹھادیں

بہ اعتبار لباس یہ شیخِ وقت ہے اور وہ برہمن
بہ اعتبار مزاج و طینت اسے اٹھا دیں اُسے بٹھا دیں

آپ کے تیور بتاتے ہیں بُرا مت مانیئے
آپ سے کوئی اصولی کام ہونے سے رہا

ہم کو وہ تلقین فرماتے ہیں ایسے مشورے
جیسے اندھے سے کہا جائے کہ بائیں ہاتھ کو

ہم خدا کے ہیں وطن سرکار کا — حکم چلتا ہے مگر زردار کا
خشک لب کھیتوں کو پانی چاہیئے — کیا کریں گے ابرِ گوہر بار کا

نفاقِ باہمی ہی آدمی پر اک دلیل ہے
ہم آدمی کہاں اگر نفاقِ باہمی نہیں

تمہاری فرزانگی سے کچھ کم نہیں ہے دیوانہ پن ہمارا — تمہیں مبارک تمہاری ہجرت ہمیں مبارک وطن ہمارا

ڈھنگناڈے کر چھوڑ دیا ہے — یوں بھی ملتی ہے آزادی
ہمسایوں کو ذہن میں رکھ کر — اپنے گھر میں آگ لگادی

وقت کے تیور سمجھ کر فیصلہ کرتے ہیں ہم
چین سے ڈرتے نہیں ہیں چین سے ڈرتے ہیں ہم

اب تک کوئی مثال ملی ہے نہ مل سکے — جتنا وطن کے کام مسلمان آگیا

شاد صاحب نے اپنی نئی آواز اور اپنی انفرادیت کا خود بھی جگہ جگہ تذکرہ کیا ہے۔

تائیدِ غزل کے بارے میں دو چار اشارے کیا کم ہیں
نو لمبی لمبی نظموں سے نو شعر ہمارے کیا کم ہیں

شراب و شاہد کے تذکرے اُن سے چھین لیجیے تو کیا رہے گا
شراب و شاہد کے تذکروں تک ہی جن کی جادو بیانیاں ہیں

شاد ہجر و وصل تک محدود تھی میری نظر، اک زمانہ تھا مگر
آج میری ہر غزل وابستۂ حالات ہے، سوچنے کی بات ہے

گیت، افسانہ، رُباعی، داستاں، نغمہ، غزل — سینکڑوں سانچوں میں ڈھالا ہے غمِ حالات کو

سخن سرایانِ عارض و لب کے مُنہ پہ اس وقت کیا رہے گا
کہیں جو اے شاد سننے والے کلام پڑھیے، غزل نہ کہیے

مخالفینِ تغزل بھی مانتے ہیں شاد
ادب میں سینکڑوں امکان ہیں غزل کے لیے

شاد صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں اتنے امکانات پیدا کر دیے تھے کہ وہ کتنی ہی ناگفتنی باتوں کو گفتنی کر کے دکھا گئے یہ اُن کی قدرتِ بیان کا کرشمہ ہے اپنی اسی قدرت کی طرف انھوں نے اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا ۔

شادؔ وہ لوگ بہر حال بڑے شاعر ہیں
جن کو قانون میں آتا ہے غزل خواں ہونا

مَیں نے عرض کیا تھا کہ شادؔ صاحب کی تخلیقات عرصۂ دراز تک ادب کے نمائندہ رسالوں پر چھائی رہیں لیکن اس کے باوجود اُن کی زندگی میں نہ تو اُن پر مضامین شائع ہوئے اور نہ اُن کے کلام کے مجموعے۔ ان پر لکھنے کی پہلی کوشش علی حماد عباسی نے کی تھی۔ جہاں تک مجھے یاد آتا ہے۔ عباسی صاحب کا مضمون ادبِ لطیف میں شائع ہوا تھا یا پھر شادؔ صاحب کی ایک عزیزہ طاہرہ اختر نے شخصیّت پر ایک مضمون نقوش میں لکھا تھا بڑے سرسری سے دو ایک مضمون ان کے مرنے سے پہلے اِدھر اُدھر اور آ گئے ہوں گے۔ مگر جس طرح آتے دن بہت سے چھٹ بھیّوں پر طومار باندھے جاتے ہیں۔ ہمارے دَور کے اس اہم ترین شاعر کو لکھنے والے نہ ملے۔ شخصیّت پر لکھنے والے تو اس لیے میسّر نہ آئے کہ شادؔ صاحب رام پُور کی دُنیا سے باہر نہیں نکلے اور شخصیّت ایسی چیز نہیں کہ سُنی سُنائی سے کام چلا لیا جائے۔ رہا فن تو چُونکہ مجموعے سامنے نہیں تھے اس لیے نقّاد لکھتے تو کاہے کو سامنے رکھ کر لکھتے۔ جگہ جگہ بکھری نظموں، غزلوں اور قطعوں سے نوٹس تیار کرنا آسان کام نہیں۔ ممکن ہے کسی نے سوچا بھی ہو مگر شادؔ صاحب کے ہاتھوں دُوسروں کی جو درگت بنتی رہتی تھی وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ ان پر لکھنے کے معنی پُلِ صراط پر چلنے کے تھے، یا بھِڑوں کے چھتّے کو چھیڑ دینے کے۔ اپنی جان جوکھم میں ڈالنے کو کون آمادہ ہوتا اس لیے بات چھینٹوں تک ہی رہی۔ جستہ جستہ مضامین میں اُن کا ذکر آتا رہا کسی صاحب نے سالانہ ادبی جائزہ لیا تو اُن کا نام سرسری طور پر لیتا ہُوا آگے بڑھ گیا۔ کہیں اور اہم شاعروں کا شمار کیا گیا تو شادؔ صاحب کا نام آ گیا مگر ان چھینٹوں سے شادؔ صاحب جیسے شاعر کا حق تھوڑا ہی ادا ہو جاتا۔

شادؔ صاحب یقیناً اس بات کو محسوس کرتے تھے اس لیے ان میں عجیب عجیب complexes پیدا ہوتے رہتے تھے۔ وہ فارسی کام چلانے کے لائق اور عربی برائے نام جانتے تھے۔ اُن کے معاشی حالات نے انھیں اتنا موقع ہی نہیں دیا کہ وہ تکمیل کر سکتے۔ چونکہ خلّاق ذہن کے مالک تھے اس لیے شاعری میں اپنا الگ رنگ ایجاد کر گئے اور یہی اُن کی بڑائی ہے مگر احساسِ کمتری میں ایسے مُبتلا رہے کہ عربی فارسی ادب پر عبور کا دعویٰ کرنا ضروری جانتے تھے۔ عربی دانی کا لوہا منوانے کے لیے ایسے ایسے الفاظ جو اُردو میں اجنبی اور انجانے ہیں جیسے حربیت، عاتق، اعطال وغیرہ استعمال کرتے تھے۔ سبعہ معلقہ اور امرأ القیس کے حوالے دیتے تھے۔ توتا (طوطا) اور حضرۃ (حضرت) لکھ کر فٹ نوٹ لگاتے تھے کہ ان کا لکھا ہُوا صحیح املا ہے۔ اور یہ سب وہ اپنے پڑھنے والوں کی توجّہ حاصل کرنے اور انھیں مرعوب کرنے کے لیے کیا کرتے تھے۔ قوسین کا بے حد و حساب استعمال کرنے میں بھی وہ اتنے سخی تھے کہ بعض جگہ واقعی یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ ان سے کیا کام لینا چاہتے ہیں۔

شادؔ صاحب کے پاس جو رسالے آتے تھے اُن پر وہ کئی کئی جگہ اپنا نام لکھتے تھے، اُردو میں بھی انگریزی میں بھی اور پھر مختلف انداز سے یعنی ایک جگہ احمد علی خاں شادؔ عارفی مع تاریخ دُوسری جگہ بھی انگریزی رسم الخط میں تیسری جگہ صرف

شادعارفی چوتھی جگہ A.A.K. Shad Arifi اور پانچویں جگہ Shaad Arifi علی ہذالقیاس۔ جی نہیں بھرتا تھا مرحوم کا اپنا نام لکھتے لکھتے دُوسروں کی کسر بھی اپنے ہی آپ پوری کر لیتے تھے، وہ اس بات کے متمنی اور بلا شبہ اس کے مستحق تھے کہ اُن پر مضامین لکھے جاتے اُن کے مقام کا تعین واضح طور پر کیا جاتا مگر اس معاملے میں اُن کی پیاس بجھانے والا کوئی نہ تھا یہی نفسیاتی وجہ ہے کہ اُنھوں نے خود اپنے نام کو اتنی بار اور اتنے مختلف انداز سے لکھا ہے کہ اپنی انفرادیت قائم کر گئے۔

کئی ناشروں نے شاد صاحب سے اُن کے مجموعے چھاپنے کی خواہش کی۔ شروع شروع میں تو انھوں نے خود ہی گھاس نہیں ڈالی اس کے بعد جب شاد صاحب کو معلوم ہُوا کہ تاجرانہ ذہنیت کیا ہوتی ہے تو وہ کچھ نرم پڑے لیکن تاجروں کی سودے بازی اور رقم کی ادائیگی میں لیت ولعل نے یہ موقع ہی نہ آنے دیا کہ شاد صاحب کی زندگی میں اُن کی آرزو پُوری ہوتی، مجموعہ ناشر کے پاس پہنچ جاتا تھا مگر رائلٹی اشاعت کے بعد تک کے لیے اُٹھا دی جاتی تھی۔ اور یہ وہ ناشر تھے جن کے لیے پانچ چھ سو روپے کی معمولی رقم پیشگی دے دینا کوئی دُشوار بات نہ تھی۔ شاد صاحب کا ایک مجموعہ سماج کے نام سے کوئی بیس برس ہوئے چھپا تھا مگر صرف چھپا تھا شائع نہیں ہُوا، کچھ کاپیاں چند دوستوں اور شاگردوں کو پہنچ گئیں باقی ردّی میں گیا، اور دیمک کی نذر ہو گیا۔ چھاپنے والے شاد صاحب کے ایک دوست اور شاگرد رشید احمد خاں مخمور تھے جنھیں کتاب کی فروخت کا تجربہ نہ تھا اس لیے مجموعے کی شہرت نہ ہو سکی اور شہرت کے بغیر کتاب نکل نہیں سکتی اس لیے اس مجموعے کے چھپنے سے شاد صاحب کی تسکین بھی نہیں ہوئی۔ ایک مختصر سا انتخاب خلیل الرحمان اعظمی اور حامد یدکمال کی کوششوں سے انجمن ترقی اُردو نے چھاپ دیا، لیکن افسوس یہ ہے کہ وہ بھی شاد صاحب کی نمائندگی نہیں کرتا۔ اس بار شاد صاحب خود کنجوسی دکھا گئے اور اس بات پر اُنھوں نے زور دیا کہ سماج میں جو کلام ہے اس کے علاوہ اور کچھ نہ شریک کیا جائے، بڑی مشکل سے چار پانچ تازہ تخلیقات دینے پر آمادہ ہوئے۔ شاد صاحب کا خیال تھا کہ اگر اُن کا تازہ کلام انتخاب میں آ جائے گا تو آئندہ مجموعوں کی ترتیب پر بُرا اثر پڑے گا۔ اور اس طرح یہ ایک موقع بھی اپنے آپ کو پہنوانے کا اُنھوں نے کھو دیا۔ تو پھر دُوسرا بھی کوئی کیا کرے جب ایک شخص خود ہی اس حد تک اپنا بے خبر اندیش ہو جائے۔

شاد صاحب کی مصیبتیں بڑی حد تک ان کی اپنی بلائی ہوئی ہوتی تھیں۔ اس میں ان کی غیر محتاط طبیعت کو دخل تھا۔ ان کی معاشی پریشانیاں ہوں یا اُن کی جسمانی بیماریاں وہ ان کو دعوت دیتے تھے۔ کتنی ہی جگہ نوکریاں کیں اور چھوڑ دیں۔ زمانہ ناقدر شناس سہی مگر قصور شاد صاحب کے ٹیڑھے ہونے کا بھی تھا اُن کے بڑا شاعر ہونے میں کلام نہیں مگر پہلی بات تو یہ کہ وہ بتدریج اس مقام پر پہنچے ہوں گے۔ دُوسرے ان کا تقرّر بحیثیت شاعر نہیں ہوتا تھا اس لیے یہ کیا ضرور تھا کہ دوران کار اُن کی شاعرانہ حیثیت کو محکمے کے افسران مدِ نظر رکھیں، تیسرے اچھے شاعر کے لیے یہ بالکل لازم نہیں آتا کہ وہ اپنے فرائض منصبی پر بھی اسی طرح حاوی ہو جس طرح شعر پر۔ مگر شاد صاحب نے یہ کبھی نہ بھُلایا کہ وہ شاعر ہیں اس لیے افسران کی وہ گرفت جو عام ملازم کے لیے معمولی ہوتی شاد صاحب کے لیے ہتک ہو جاتی تھی اور اس طرح اُن کی زندگی کے راستے پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتے گئے۔

یہ تو مالی مشکلات کی بات ہوئی۔ وہ کھانے پینے کے معاملے میں بھی بلا کے بد پرہیز تھے، برسوں سے سانس کے مریض تھے، پھیپھڑے کمزور، معدہ کمزور، جگر خراب، مگر جاڑوں میں رساول کھائے بغیر نہیں رہتے تھے، برسات میں آموں کا زور شور ہوتا تھا، بیمار پڑتے تھے۔ سانس بے قابو ہو جاتی تھی، پیٹ پھول جاتا تھا مگر وہ نہیں مانتے تھے اور ذائقے کی خاطر سال میں کم سے کم دو بار ضرور قبر میں پاؤں لٹکا دیتے تھے۔ ان کے خیر خواہ دوڑ بھاگ کرتے اور دوا دارو ہوتی، دو ڈھائی مہینے میں کہیں وہ قابو میں آتے۔ کتنے ہی برسوں سے یہ ہو رہا تھا۔

عصمت کے انداز میں اگر لکھا جائے تو گویا وہ ہر بار مرنے کے معاملے میں دھوکا دے جاتے تھے۔ اور اس لیے اُن کے مرض موت تک کو کم از کم میں نے یہ نہیں سمجھا کہ وہ چل ہی دیں گے۔ ممکن ہے چونکہ یہ جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ مرجائیں اس لیے خود فریبی نے یہ نہ سمجھنے دیا کہ الوداع کہہ رہے ہیں۔ شاد صاحب خود بھی مجموعۂ امراض و آلام ہونے کے باوجود جینے کے بڑے خواہشمند تھے۔ مرنے سے چند روز پہلے انھوں نے مجھ سے کہا کہ انھیں یقین ہے وہ ابھی نہیں مریں گے اور اب تو اُن کے جینے کا وقت آیا ہے۔ لیکن یہ کہتے کہتے ایک بار آخر چوٹ دے ہی گئے ممکن ہے خود چوٹ کھا گئے ہوں۔

شاد صاحب کی زندگی میں اُن کا جشن منایا گیا، اُن کے نام پر چندے اکٹھے کیے گئے، اُن کے کلام کی اشاعت کا اعلان کیا گیا۔ اس زمانے میں بھی وہ لب گور تھے، جگر جواب دے چکا تھا، ہاتھ پاؤں پر سوجن تھی، دمے نے بے حال کر رکھا تھا مگر کسی کو بھی یہ توفیق نہیں ہوئی کہ اس نام و نمود سے ہٹ کر دیکھتا اور یہ سوچتا کہ اس ہنگامہ آرائی سے شاد غریب کے حصے میں کیا آیا وہ اُسی طرح بستر پر ایڑیاں رگڑتا رہا، اسی طرح دوا کی ایک ایک خوراک کو ترستا رہا، ہاں اگر ہوا تو اتنا ہوا کہ اس بہانے کچھ اداکار اسٹیج پر اپنی اداکاری کے جوہر دکھا گئے، اپنی سماجی خدمتوں کا ڈھنڈورا پیٹ کر واہ واہ اپنے دامن میں سمیٹ لے گئے اور بس لیکن جب شاعر مر گیا تو اس کے یہی قدردان جنازے سے بھی مُنہ پھیر گئے اس لیے کہ مٹی کا ڈھیر ان خدائی خدمتگاروں کو کیا دے سکتا تھا۔

چندہ وصول کرنے کچھ لوگ ڈاکٹر ضمیر احمد صاحب کے پاس بھی پہنچے، باتوں میں شاد صاحب کی بیماری کا بھی ذکر آیا ضمیر صاحب صاحبِ ذوق آدمی ہیں پھر شاد صاحب کے اُستاد مشفق صاحب کے پوتے بھی ان دو رشتوں کی وجہ سے انھیں شاد صاحب سے ہمدردی پیدا ہو گئی اور وہ شاد صاحب کو دیکھنے پہنچے۔ دو ایک بار میں بھی انھیں پکڑ کر لے گیا۔ ضمیر صاحب نے بڑی توجہ سے علاج کیا، دواؤں کی قیمت میں بھی رعایت برتی، شاد صاحب کو افاقہ ہو گیا۔

شاد صاحب اس جشن سے بہت خوش ہوئے۔ اس جشن میں جو مزاج کارفرما تھا اُس تک اُن کی نظر نہیں گئی، اور یہ اچھا ہی ہوا ورنہ مرتے مرتے وہ ہمدردی کے رُوپ میں ایک اور داغ اپنے سینے پر لے جاتے۔ لیکن جب مستقبل کا مورخ لکھنے بیٹھے گا تو وہ ان ظاہرداروں کو نہیں بخشے گا جنھوں نے جشن برپا کیے لیکن جنازے پر نہ پھٹکے اور بجائے ندامت کے اُلٹی اس بات کی تشہیر کرنے بیٹھ گئے کہ ہائے شاد عارفی کو کاندھا دینے والے گنتی کے تھے اور وہ مورخ پوچھے گا کہ کیا شاد عارفی کے یہ ماتم گسار خود بھی جنازے پر موجود تھے تو اُسے کوئی جواب نہیں ملے گا اور وہ بغیر انتظار کیے اپنے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ کے

ساتھ نام کے آگے غیر حاضری درج کر چکا ہوگا ہائے! ہم بھی کہاں کہاں فریب دیتے ہیں۔

شاد صاحب نے اپنی آخری زندگی میں بڑی جرأت اور بے خوفی کا ثبوت دیا ہے مگر وہ موت سے بہت ڈرتے تھے۔ میں نے اُن کے مرض موت میں سول سرجن سے مشورہ کیا۔ اُنھوں نے ہر چوتھے روز لگائے جانے کے انجکشن تجویز کیے میں یہی نسخہ لے کر ڈاکٹر ضمیر صاحب سے ملا، اُنھوں نے بھی سول سرجن سے اتفاق کیا، میں نے انجکشن خریدے اور یہ طے ہوا کہ ڈاکٹر ضمیر رات کو اپنے مطب سے اٹھیں تو شاد صاحب کو دیکھ لیں اور انجکشن لگا دیں۔ لیکن جب ہم دونوں پہنچے تو شاد صاحب نے انجکشن لگوانے سے صاف انکار کر دیا، اور کہا کہ انھیں وہم آتا ہے وہ یہ انجکشن برداشت نہیں کر سکیں گے اور مر جائیں گے۔ ضمیر صاحب لاکھ سمجھاتے رہے کہ یہ انجکشن آپ کی سکت کو باقی رکھنے کے لیے بہت ضروری ہیں، نہیں لگے گا تو بھی آپ مر جائیں گے۔ مگر شاد صاحب کسی طرح نہ مانے اور پیچ پیچ چیخ پڑے کہ اُن پر یہ ظلم نہ کیا جائے، ہمیں ہتھیار ڈال دینے پڑے اور دُوسرے دن وہی انجکشن یہ کہہ کر لگایا گیا کہ یہ دمے کے سلسلے کا ہے۔

ان کی پُر اذیت زندگی پر میں بہت کُڑھا ہُوں لیکن آج جب کہ وہ سب کچھ جھیل کر گزر چکے ہیں۔ میں سوچتا ہُوں کیا آرام و آسائش کی زندگی گزار کر وہ طنز پر ایسی بے پناہ قدرت حاصل کر سکتے تھے جس نے انھیں اکبر الہ آبادی کے بعد اُردو ادب میں سب سے بڑا طنز گو شاعر بنا دیا۔ اگر وہ ہر ہر بات پر نہ بگڑتے، اپنا خُون نہ جلاتے چھوٹی چھوٹی باتوں کو ضرب دے کر نہ بڑھا لیا کرتے اور ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنے بیٹھ جاتے تو اُن کا قلم ہمارے ادب کو یہ لازوال شاہکار دے سکتا تھا؟

شاد صاحب کے طنز کا نشتر اپنے بیگانوں سب پر چلتا تھا۔ اُن کا تخلص خود اُن پر طنز تھا۔ اُن کی زد میں جو آ گیا اُنھوں نے لگے ہاتھوں اُسے نپٹا دیا۔ اُن کی طنزیہ نظموں کی بڑی تعداد ایسی ہے جن میں اُن کے آس پاس کے لوگوں پر چوٹیں ہیں مثلاً ایک نظم "یہ میرے زن مرید بھتیجے کی ساس ہے" اپنی بھتیجی بہو اور اُن کی ماں سے بدگمان ہو کر لکھی تھی۔ مقامی عزیزوں اور ملاقاتیوں میں صرف دو نام ایسے ہیں جن سے وہ نہ بدگمان ہوئے اور نہ ناراض ہوئے اور وہ ہیں طاہرہ اختر صاحبہ اور اُن کے شوہر تبسم شاہ خاں صاحب، غیر مقامی میں شاید مظفر حنفی کا استثنا ہے۔ مظفر کو شاد صاحب سے تعلق نہیں عشق تھا۔ شاد صاحب کے مرنے کو جتنا اُنھوں نے محسوس کیا بس اتنا ہی شاد صاحب کا کوئی قریب سے قریب رشتے والا محسوس کر سکتا تھا۔ مظفر صاحب نے بزدلی کے عنوان سے شاد صاحب کا مرثیہ کیا لکھا ہے ہمارے عہد کا مرثیہ لکھا ہے، حالی کے مرثیے کے بعد یہ دُوسرا مرثیہ ہے جس میں دل کو زبان مل گئی ہے۔ میں نے جب جب اُسے پڑھا مجھ پر رقت طاری ہو گئی۔ اس کا ایک کمال یہ بھی ہے کہ اس میں طنزیہ انداز بیان اختیار کرنے کے باوجود مرثیے کا تاثر موجود ہے۔

شاد صاحب مذہبی آدمی تھے اُن کا ایک شعر ہے۔

عقل کرنے جھانکنے لگتی ہے جن حالات میں
رُوح کو تسکین ملتی ہے خُدا کی ذات میں

وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ رہے لیکن الحاد کی طرف کبھی مائل نہیں ہوئے نہ اُنھوں نے اشتراکیت کو غیر اخلاقی نظامات

کے لیے پروانہ راہ داری بنایا، وُہ اسلام کے حقوق العباد کو اشتراکی برابری سے کہیں بڑھ چڑھ کر جانتے تھے اور اُن کی بہت سی تحریروں میں اس کا اظہار ہوا ہے، ترقی پسند ایک زمانے میں اپنے مصنّفین پر بے حد کڑا احتساب کرنے لگے تھے جس کی زد میں منٹو، عسکری، ممتاز شیریں اور بہت سے آئے اور رجعت پسند قرار دے کر برادری سے خارج کر دیے گئے مگر شاد صاحب برابر ترقی پسند رسائل اور انتخابات میں شریک کیے جاتے رہے۔

وہ نماز کے حتی الامکان پابند تھے، اور اُردو وظائف بھی جاری رہتے تھے "مولانا مودودی کی بصیرت کے معترف تھے۔ میں نے شاد صاحب کے زیرِ مطالعہ مولانا مودودی کی کئی مشہور تصانیف دیکھی ہیں جن میں تفہیم القرآن بھی ہے۔ راہی عارفی کو انھوں نے ایک خط میں لکھا تھا کہ جماعت اسلامی سے ڈرو مت اس میں کوئی بات قرآنی تعلیمات کے خلاف نہیں ہے اور مولانا مودودی کی کتاب سُود پڑھنے کا پرزور مشورہ دیا تھا، ایک زمانے میں وہ اسلام پسند ادیبوں کی نشستوں میں بھی شریک ہوتے تھے لیکن یہ سلسلہ دیر تک نہیں چل سکا۔ ممکن ہے کسی بات پر ناراض ہو گئے ہوں مگر یہ ناراضگی کسی فرد یا چند افراد سے ہوگی، مولانا مودودی کی بصیرت اور ان کی approach کے وہ ہمیشہ مداح رہے۔

ایک خط میں اُنھوں نے قیصر صاحب سے مالی امداد چاہی ہے اور بات کو یوں ختم کیا ہے۔

"تم جب تک منع نہیں کرو گے خدا کے بعد ہرگز کوئی اور دروازہ نہیں کھولے گا۔"

اس سے بڑھ کر اور کن لفظوں میں خدا کی شان رزاقی پر یقین کا ثبوت مل سکتا ہے۔

اُنہوں نے ایک صاحب کو جو کسی شاعر پر تحقیقی کام کر رہے تھے یہ مشورہ دیا تھا کہ

"آپ جس شخص پر کام کریں اُسے ہیرو نہ بنائیں نہ فن کے معاملے میں نہ شخصیت کے معاملے میں، فن اور شخصیت کی خُوبیاں اور خامیاں دونوں زیرِ بحث آنا چاہئیں اگر ایسا نہ ہُوا تو آپ کا کام غیر معتبر بھی ہوگا اور گمراہ کن بھی۔"

ابھی تک ہم لوگ اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہوئے ہیں کہ کوئی بھی فنکار آدم زاد پہلے ہوتا ہے کچھ اور بعد کو ہم اپنے فنکاروں سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں اُن کی زندگیاں اس کی سچی تصویر ہوں یہ ہمارا مزاج بن گیا ہے۔ آج سے تیرہ سو سال پہلے کی کھلی شہادت ہمارے سامنے ہے کہ شاعر جو کچھ کہتا ہے وہ کرتا نہیں مگر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ کسی کو ننگا بھوکا نہ دیکھ سکنے کا دعوے دار غالب اپنے محسن دوست آزردہ کی بیوہ کا وظیفہ مقرر ہوتے نہیں دیکھ سکتا، یا خودی کا مبلغ اقبال مہاراجہ کشن پرشاد کے وسیلے حیدر آباد سرکار سے آس لگاتا ہے تو ہمارے جذبات اور عقیدت کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ قصور دوسرے کا نہیں ہوتا ہماری خوش عقیدگی کا ہوتا ہے۔

ہمیں یہ سمجھنا چاہیے کہ شاعر جو کچھ کہہ رہا ہے یہ اُس کی تمنائیں ہیں، یہ بالکل ضروری نہیں ہے کہ جن برائیوں کے خلاف وہ آواز اُٹھا رہا ہے اُن سے خود بھی عاری ہو۔ اقبال نے ایسے ہی کسی موقعہ پر ازراہِ تفنّن کہا تھا کہ

"قوال کو حال نہیں آتا"

خود میں بھی اپنے معاشرے سے علیحدہ نہیں اور یہ سطریں لکھنے کے باوجود میرا جی بھی چاہتا ہے کہ ہمارے پسندیدہ فنکاروں کی ذات میں کسی کمزوری کو دخل نہ ہو اس لیے جب جب میں نے یہ محسوس کیا کہ شاد صاحب اپنی زندگی کے بارے میں اپنے سوانح نگار سے کچھ چھپا رہے ہیں یا اُن کے قول و فعل میں کوئی تضاد ہے تو مجھے دُکھ ہوا۔ میں شاد صاحب کے بڑے سے بڑے معترف سے زیادہ معترف ہوں لیکن میں اندھی محبت اور نری عقیدت کا قائل نہیں۔ اور سچی دوستی اس کو جانتا ہوں کہ شاد صاحب نے اگر دُوسروں کے بارے میں سچ بولا چاہے وہ کتنا ہی تلخ کیوں نہ تھا تو میں بھی اُن کے بارے میں سچ سے گریز نہ کروں' اس لیے کہ اُن کی عظمت سچ پر قائم ہے۔ اُن کے شیدائی میں بھی وہی جرأت اظہار ہونا چاہیے جس کی خاطر اُنھوں نے اپنی زندگی اجیرن کر لی۔

شاد صاحب کی زندگی میں ایسے کئی نشیب و فراز ہیں جو ہمارے عقیدوں پر ضرب لگائیں گے لیکن وہ شاد صاحب کی شاعرانہ عظمت کے لیے بے ضرر ہیں ہاں اُن کا ذکر ایک طرح ہماری آپ کی آزمائش ضرور ہے۔ کیا حرج ہے کہ اگر ہم شاد صاحب کے طفیل آج اپنا امتحان لیں اور دیکھیں کہ ہم اُن کے بارے میں کس حد تک جذبات سے علیحدہ ہو کر سوچ سکتے ہیں۔

شاد صاحب ہمارے ہی سماج کے فرد تھے وہ جن خامیوں پر گرفت کرتے تھے جس طرح وہ سب ان کے اندر موجود نہیں تھیں اُسی طرح وہ اُن سب سے مبرا بھی نہیں تھے۔ مجھے ایک بار شاد صاحب کے ایک ایسے ہمدرد اور مخلص نے جو اُن کی امداد اور دلدہی کو فریضے کی طرح انجام دیتے رہے اور جن کی انسانیت اور انسان دوستی کے شاد صاحب بے حد مداح تھے یہ لکھا:

"شاد صاحب اچھے بیٹے اور اچھے بھائی نہ تھے۔"

میں راوی کو معتبر جاننے کے باوجود اس منفی پہلو پر جھنجلایا انھیں باتوں کے ساتھ ساتھ میرے علم میں یہ بھی تھا کہ!

اُنھوں نے اپنی ناداری میں ہزار تکلیفیں جھیل کر اپنی بھتیجی اور بھتیجے کی پرورش کی' بھتیجے کی تعلیم کا معقول انتظام کیا' معلمی کی ٹریننگ دلائی۔ اس کو پاؤں پر کھڑا کیا اس کی شادی کی' اس کی بہن کی شادی کی لیکن جب وہ اس لائق ہوا کہ شاد صاحب کا سہارا بن سکے تو شاد صاحب سے علیحدگی اختیار کر لی' اور اس بھتیجی کی بیوگی کا ایک بار پھر سہارا بن گئے جس کی یتیمی کا سہارا کبھی بنے تھے۔

وہ اپنا احتساب کرنے کی بھی صلاحیت رکھتے تھے' اُنھوں نے اپنے ایک شاگرد کو لکھا تھا۔

"مجھے قبلہ مت لکھا کرو میں بہت گنہ گار قسم کا آدمی ہوں' مجھے تو حضرت بھی اچھا نہیں معلوم ہوتا"

ان کی جرأت رندانہ قاتل کی تلوار کا بوسہ لے سکتی تھی۔ کم از کم آزادی کے بعد اُنھوں نے بڑی بے جگری کا ثبوت دیا تھا. نڈر ہو کر فرقہ واریت کے دیو کے خلاف "ابھی جبل پور جل رہا ہے" جیسی نظم لکھی۔

انھوں نے مرنے سے پہلے اپنی نظموں کے معاوضے کی رقم تجہیز و تکفین کے لیے الگ مخصوص کر کے رکھ دی اور اپنے عزت مند لاشے کو کسی بھی اپنے پرائے کی رحم دلی کا احسان مند ہونے سے بچا لے گئے۔

شاید یہ آدم زاد فرشتہ اپنے نوشتے کو بے داغ رکھ کر اس بستی کے رہنے والوں کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتا تھا جن میں وہ آن بسا تھا۔

گنڈ

ممتاز مفتی

پگڈنڈی گھومتی ہوئی اس خشک ویران ٹیلے پر چڑھ رہی تھی ہر چند قدم کے بعد میں تھک کر سستانے کے لیے رک جاتا لیکن میرے ساتھی قاضی صاحب پتھر پھلانگتے ہوئے اُچھلتے کودتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ جوں جوں منزل قریب آتی جاتی تھی ان کا شوق بڑھتا جا رہا تھا۔ وہ اپنے پیر د مرشد روشن شاہ سے ملنے کے لیے بے تاب تھے اور راستے میں مسلسل سرکار قبلہ کا تذکرہ کیے جا رہے تھے۔

کسی بزرگ سے ملنے کا یہ میرا پہلا موقعہ تھا۔ قاضی صاحب نے اصرار کیا تھا کہ میں ان کے سرکار قبلہ سے ملوں۔ مجھے سکون کی تلاش تھی اور قاضی صاحب کا کہنا تھا کہ سکون کے متلاشی اوگی پہاڑی پر حضرت روشن شاہ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔

تھک کر میں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ مجھے دیکھ کر قاضی صاحب رک گئے۔ تھک گئے۔ علی بھائی وہ بولے۔

ہاں۔ پتہ نہیں آپ کیوں نہیں تھکتے۔

وہ مسکرائے۔ بڑے شوق کی شدت راستے کی دشواریاں ختم کر دیتی ہے مجھے سرکار قبلہ سے محبت ہے۔ میں انہیں دیکھے بنا رہ نہیں سکتا ہر اتوار کو آتا ہوں۔

سرکار قبلہ سے محبت، ایک سفید ریش بڈھے سے محبت۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے میں نے سوچا۔

معاً سامنے پتھر کی اوٹ سے بوڑھے پروفیسر نے سر نکالا۔ اس کے ہونٹ ہلے۔ "صاحبزادے کیا تم محبت کے مفہوم کو سمجھتے ہو؟" اس کے چہرے پر وہی پُراسرار مسکراہٹ تھی۔

وہی جملہ ــــ وہی جھریوں بھرا جانا پہچانا ــــــــــ اک زمانے سے میں محسوس کر رہا ہوں گویا میں ایک آسیب زدہ مکان ہوں۔ اور "صاحبزادے کیا تم محبت کے مفہوم کو سمجھتے ہو؟" اور وہ پُراسرار مسکراہٹ ــــ آسیب ہیں گذشتہ اٹھارہ سال سے میری زندگی کے ہر اہم دوراہے پر کہیں نہ کہیں سے بوڑھے پروفیسر کا چہرہ ابھرتا ہے اور اس کی پُراسرار آواز گونجتی ہے۔ "صاحبزادے کیا تم محبت کے مفہوم کو سمجھتے ہو؟" اور یہ جملہ میرے گرد و پیش کو نیا مفہوم بخش دیتا ہے ایک ایسا مبہم مفہوم جسے میں آج تک نہیں سمجھ سکا۔ ایک ایسا مبہم مفہوم جسے میں انگ انگ میں محسوس کرتا ہوں۔

ایک عام سا چہرہ جسے میں نے آج سے اٹھارہ سال پہلے سیکنڈ کلاس کے ایک ڈبے میں سرسری طور پر دیکھا تھا۔ اور ایک عام سا جملہ میری ساری زندگی پر مسلط و محیط ہو جائے کتنی عجیب بات ہے۔

مجھے وہ رات اب بھی یاد ہے جیسے کل ہی کی بات ہو۔ رات کو ہم ملتان سے میل میں سوار ہوئے تھے۔ میں اور میرا ہمراز دوست راز۔ ڈبے میں صرف ایک شخص اوپر کے برتھ پر سو رہا تھا۔ اس کا منہ چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ باقی ڈبہ خالی تھا جلد ہی ہم اس سوئے ہوئے شخص کے وجود سے بے نیاز ہو گئے۔ اور مرجینا کی بات چل نکلی۔ ان دنوں میں مرجینا کی محبت میں سرشار تھا۔

مرجینا ایم اے میں میری ہم جماعت تھی۔ وہ خوب صورت نہ تھی۔ لیکن اس میں ایک پراسرار جاذبیت تھی۔ ہم روز ایک دوسرے کو دیکھتے تھے۔ لیکن کبھی بات نہ کی تھی۔

ایک روز میں کالج کے برآمدے میں کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا کہ مرجینا آ رہی ہے اس وقت قرب و جوار میں کوئی نہ تھا۔ پتہ نہیں کیوں۔ میں نے سوچا کچھ کر دوں، محض شرارت، اور تو کوئی بات نہ سوجھی۔ جب مرجینا قریب آئی تو میں نے سنجیدہ اور دکھی صورت بنا کر اپنا ہاتھ اس کے سامنے پھیلا دیا۔ جیسے بھکاری ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ وہ رک گئی۔ متانت سے اس نے اپنا ہینڈ بیگ کھولا۔ ایک اکنی نکال کر میری ہتھیلی پر رکھ دی اور یوں آگے نکل گئی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ جیسے وہ انار کلی میں گھومتے پھرتے، بھکاری کو اکنی دے کر آگے نکل گئی ہو۔

اس کے بعد یہ میرا معمول بن گیا۔ جب بھی وہ اکیلی ملتی میں ہاتھ پھیلا دیتا وہ اکنی رکھ کر آگے نکل جاتی۔ اس چھوٹے سے واقعہ نے میرے دل میں اک طوفان سا پیدا کر دیا۔ بے مقصد طوفان۔

پھر مجھے یہ لگن لگ گئی کہ وہ مجھے اکیلے میں ملے۔ میں ایسے موقعے تلاش کرنے لگا۔

ایک روز کوئی موقعہ نہ ملا۔ میں ہم جماعتوں کے جھرمٹ میں کھڑا تھا۔ میں نے دیکھا مرجینا ہماری طرف آ رہی ہے۔ پتہ نہیں اس وقت مجھے کیا ہوا۔ بے اختیار میں نے ہاتھ پھیلا دیا۔ سب میری طرف دیکھنے لگے۔ مرجینا صرف ایک ساعت کے لیے ٹھٹکی۔ پھر آگے بڑھی۔ بڑے اطمینان اور اہتمام سے ہینڈ بیگ کھولا۔ اور اکنی میرے ہاتھ پر رکھ کر بڑے وقار سے آگے نکل گئی۔ میرے ہم جماعت پھٹی پھٹی آنکھوں سے میری طرف دیکھنے لگے۔ پھر ان کے شور نے ایک طوفان بپا کر دیا ——— اس روز دبے دبے طوفان میں شدت پیدا ہو گئی ——— اور مبہم سا مقصد بھی ——— پراسرار جاذبیت تو مرجینا میں پہلے ہی تھی۔ اس پر وقار جرأت نے اس کے خد و خال کو ایک سنہرے دھندلکے میں لپیٹ دیا۔ اس کے سر کے گرد سیمیں ہالہ بنا دیا ——— طوفان میں محبت کی مد و جزر شامل ہو گئی۔

پھر ——— جلد ہی وہ دن آ گیا۔ جب طوفان جنون کی شکل اختیار کر گیا۔ محبت عشق میں بدل گئی۔ مبہم مقصد نے وضاحت اختیار کر لی۔ اور وہ اس قدر پھیل گیا۔ اس قدر مسلط و محیط ہو گیا کہ ساری کائنات اس میں ڈوب گئی۔

اس روز نہ جانے میں کس خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔ کالج کے پارک کے ایک کونے میں درخت کی اوٹ میں اکیلا کھڑا تھا۔ آہٹ سن کر میں نے سر اٹھایا۔ میرے روبرو مرجینا کھڑی تھی۔ پیشتر اس کے کہ میں ہاتھ پھیلاتا۔ مرجینا نے بازو بڑھایا اور ہتھیلی میرے قریب تر کر دی۔ اس وقت اس کی نگاہیں مجھ پر نہیں بلکہ گلاب کے ایک پودے پر مرکوز تھیں۔

اس کا پھیلایا ہوا ہاتھ دیکھ کر میں بوکھلا گیا۔ ایک سنہرا دھندلکا چھا گیا۔ الجھنے میں میں نے اپنا ہاتھ کوٹ کے کالر میں ڈال دیا۔ اور جیسے اپنے پہلو سے دھڑکتا ہوا دل اکھاڑ کر مرجینا کی ہتھیلی پر رکھ دیا ہو۔ مرجینا نے بھی ایک نگاہ اپنے بیگ پر ڈالی۔ اطمینان سے بیگ کو پتھر کی سیٹ پر رکھ دیا اور وہ ہاتھ جس پر میں نے اپنا دل رکھا تھا۔ اپنی قمیض میں ڈال لیا۔ پھر کچھ کہے بغیر وہ چلی گئی۔

مرجینا سے عشق کی یہ ابتدا تھی۔ اندازہ لگائیے کہ انتہا کا عالم کیا ہوگا۔

ہاں مجھے وہ رات۔ سیکنڈ کلاس کا وہ ڈبہ۔ ملتان سے لاہور تک کا سفر۔ اب بھی یاد ہے۔ ایک ایک تفصیل یوں محفوظ ہے: جیسے میرے ذہن میں ریکارڈ ہو گئی ہو۔

مرجینا نے مجھے لاہور بلایا تھا۔ اس کے خط سے صاف ظاہر تھا کہ اس کے والدین ہماری شادی پر رضامند نہ تھے۔ ان کے انکار نے مرجینا کے جذبۂ محبت پر مہمیز کا کام کیا تھا۔ اس کی جرأت کو للکارا تھا۔ خط میں دکھ یا غصے کا عنصر نہ تھا۔ محفوظ قسم کی بے نیازی تھی۔ راز اور میں نے بار بار وہ خط پڑھا۔ راز کے دل میں ڈر اور خدشات جنم لے رہے تھے۔ اور سیکنڈ کلاس کے ڈبے میں بیٹھا میں راز کو تسلیاں دے رہا تھا اس کے خدشات کا مذاق اڑا رہا تھا۔ کتنی الٹی بات تھی۔ عاشق اپنے راز دار کو تسلیاں دے رہا تھا ——— پھر نہ جانے راز کی کس بات پر مجھے جوش آگیا۔

ہم دونوں بالغ ہیں۔ میں نے چلاّ کر کہا۔ دونوں ایک دوسرے سے والہانہ محبت کرتے ہیں۔ ہمارے درمیان حائل ہونے کا کسی کو حق نہیں۔" صاحبزادے" اوپر والی برتھ سے آواز آئی "کیا تم محبت کے مفہوم کو سمجھتے ہو؟"

ہم نے چونک کر اوپر دیکھا۔ چادر میں لپٹا ہوا ایک جھریدار چہرہ ہماری طرف گھور رہا تھا۔ چہرے کی سلوٹوں میں دکھ رینگ رہا تھا تمسخر اور طنز سے پاک۔ خالص دکھ۔ مسکراہٹ پُراسرار تھی۔

جو عشق کے طوفان کے تھپیڑوں میں ڈوب چکا ہو۔ اس سے محبت کے ابتدائی مفہوم کا مطلب سمجھنے کی بات کرنا ——— اس بڈھے کو کیا پتہ کہ والہانہ عشق کسے کہتے ہیں۔ بیچارہ!

میرا ابھرتا ہوا غصہ ترس میں بدل گیا۔

"کون ہیں آپ؟" میں نے پوچھا۔

"کوئی بھی سہی" وہ بولا۔

"کیا آپ محبت کے مفہوم کو سمجھتے ہیں" میں نے بڈھے پر دفیسر نے سوال کیا۔

اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ حسرت بھری آہ نے اس کی مسکراہٹ کو اور بھی پُراسرار بنا دیا "میری عمر اڑسٹھ سال ہے" وہ بولا "لیکن آج تک میں محبت کے مفہوم کو نہیں سمجھ سکا۔"

"آپ بھی نہیں سمجھتے۔ تو پھر ہم دونوں میں کیا فرق ہے" میں ہنسا "بہت فرق ہے صاحبزادے بہت فرق ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں محبت کے مفہوم کو نہیں سمجھتا۔ لیکن صاحبزادے تم نہیں جانتے" وہ رک گیا کچھ دیر تک چادر کو گھورتا رہا پھر آپ ہی آپ گنگنانے لگا۔

——— ہاں ——— اس نے ایک لمبی آہ بھری۔ صرف ایک مرتبہ محبت کے مفہوم کی ہلکی سی جھلک دیکھی تھی صرف ایک مرتبہ۔ مبہم سی جھلک۔ وہ خاموش ہو گیا ——— ہم دونوں متوقع نگاہوں سے اس کی طرف دیکھنے لگے ——— صرف ایک مرتبہ ——— وہ ہمیں مخاطب کیے بغیر دھیمی آواز میں بولا گویا اپنے آپ سے کہہ رہا ہو ——— صرف ایک مرتبہ جب مجھے کنڈ جانے کا اتفاق ہوا تھا۔

کنڈ- وہ کیا چیز ہے جناب ؟ راز نے پوچھا -

چپ شریف کی پہاڑیوں میں گھرا ہوا ایک نشیبی مقام ہے - ایک سبز پیالہ جس کے پیندے میں ایک نیلی جھیل ہے - جس کے عین بیچ میں مغلیہ طرز کا محل بنا ہوا ہے -

لیکن ایک مقام کو محبت کے جذبے سے کیا تعلق ؟ میں نے کہا -

پتہ نہیں کیوں پروفیسر نے کہا - لیکن کچھ مقامات ایسے ہیں جن کے ساتھ خصوصی تاثر وابستہ ہیں - دس بارہ ہزار کی بلندی پر ایسے مقامات ہیں جہاں جا کر انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ اللہ کی گود میں آ بیٹھا ہے - دنیا کے سب بندھن کٹ جاتے ہیں - ایسے مقامات میں جہاں مایوسی چاروں طرف سے گھیر لیتی ہے - خودکشی کرنے کو جی چاہتا ہے - کافرستان کے راستے میں مجھے ایک ایسے مقام پر ٹھہرنا پڑا جہاں غم دکھ اور درد کی دھار کا گھاؤ دکھانے کی لت پڑ جاتی ہے - وہاں کی روئی روئی عورتوں کو دیکھ کر متبسم چہروں سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے ——— کانگڑے کی پہاڑیوں میں ———

لیکن کنڈ کا کیا اثر ہے ؟ میں نے بات کاٹ کر پوچھا -

"کنڈ" اس کے چہرے کی جھریاں اور گہری ہو گئیں - کنڈ میں رہنے سے دبی ہوئی محبت ابھر آتی ہے - وہ پردے اتر جاتے ہیں جن میں ہم نے محبت کو ملفوف کر رکھا ہے - بہروپ اتر جاتا ہے - روپ ظاہر ہوتا ہے -

اس روز بوڑھے پروفیسر کی بات میرے لیے ایک سٹری کھوسٹ کے ہذیان کی حیثیت رکھتی تھی - جلد ہی لاہور پہنچ کر ہم مرجینا میں کھو گئے - اور بوڑھے پروفیسر کی بات اور اس کی شخصیت ہمارے ذہن سے اتر گئی -

مرجینا سے شادی ہونے کے چار سال بعد میں نے محسوس کیا کہ میرا ہم راز بے تکلف دوست راز روز بروز نامِ ہر مسئے بنا جا رہا ہے - روز بروز اس کے گرد راز کا پردہ دبیز تر ہوا جا رہا ہے اور وہ پردہ پھیل رہا ہے - پھیلتا جا رہا ہے اور مرجینا اس پردے کی اوٹ میں آئے جا رہی ہے - پتہ نہیں کیوں جب بھی میں مرجینا کے پاس ہوتا تو مجھے محسوس ہوتا کہ راز کہیں قریب ہی ہے - بہت قریب -

تخلیے میں یہ احساس بہت ہی بڑھ جاتا میں محسوس کرتا کہ راز پردے کے پیچھے سے ہماری طرف جھانک رہا ہے اس کی آنکھیں میرے سامنے معلّق ہو جاتیں اور مرجینا کی ہر جنبش سے معلوم ہوتا جیسے کہ وہ راز کی معلّق آنکھوں کے لیے کوئی کردار ادا کر رہی ہے - ایک روز مرجینا کی لاپرواہی اور بے حسی سے زچ ہو کر میں نے مرجینا سے کہا مرجینا تمہیں تو مجھ سے محبت تھی -

عین مرجینا کے بائیں شانے سے بوڑھے پروفیسر کا سلوٹوں بھرا چہرہ ابھرا - اس کے ہونٹ ہلے - صاحبزادے کیا تم محبت کے مفہوم کو سمجھتے ہو -

اس روز پہلی مرتبہ میں نے بوڑھے پروفیسر کے پیغام کو سنا -

اس کے بعد ہمارے گھر کا منظر ہی بدل گیا - گویا میں علی کی بجائے علی بابا بن گیا - یوں محسوس ہونے لگا جیسے مرجینا اور راز مل کر آہستہ آہستہ مجھے ایک مٹکے میں بند کر رہے ہیں - پھر مٹکے کے اندر سے میں نے دیکھا کہ مرجینا مٹکے میں انڈیلنے کے لیے تیل کی کڑاہی گرم کر رہی ہے - ٹپ ٹپ ٹپ ابلتے ہوئے تیل کی بوندیں گرنے لگیں -

اس کے دو سال بعد جب مرجینا کے پُر زور مطالبہ کے بعد میں اسے طلاق دے کر اپنے ویران گھر میں پہنچا اکیلے میں میری چیخیں نکل گئیں

——— یا اللہ میں چلّایا۔ کیا محبت کا یہی انجام ہے۔

برآمدے کے ستون سے بوڑھے پروفیسر نے سر نکالا۔ صاحبزادے وہ بولا۔ کیا تم محبت کے مفہوم کو سمجھتے ہو۔ اس روز پروفیسر کا یہ جملہ میرے دل کی گہرائیوں میں اُتر گیا۔ اس روز میں نے محسوس کیا کہ میں محبت کا مفہوم نہیں سمجھتا۔ پروفیسر نے سچ کہا تھا۔ بہت فرق پڑتا ہے۔ اگر آپ کو احساس ہو کہ آپ محبت کا مفہوم نہیں سمجھتے تو بہت فرق پڑ جاتا ہے ——— اس روز میرے دل میں زبردست خواہش پیدا ہوئی کہ میں اس مقام پر جاؤں جہاں پروفیسر نے محبت کے مفہوم کی ایک جھلک دیکھی تھی ——— لیکن مجھے اس مقام کا نام یاد نہ رہا تھا۔ میں نے بہت کوشش کی۔ ذہن پر زور دیا۔ بہت سر مارا۔ لیکن بے کار کئی ایک دن میں سوچتا رہا۔ سوچتا رہا۔ پھر خیال آیا کیوں نہ پروفیسر کو ڈھونڈ نکالوں۔ اس مختصر سے پتے کے مطابق جو پروفیسر نے مجھے دیا تھا میں اس کی تلاش میں نکل گیا۔ دو ماہ کے بعد جب میں پروفیسر کے مکان میں داخل ہوا تو مجھے پتہ چلا کہ وہ اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ میں مایوس ہو گیا لیکن اس عرصے میں اس مقام کی تلاش میرے نفس غیر شاعر میں جڑیں پکڑ چکی تھی ——— دو سال بیت گئے۔

ایک روز جب میں نشاط سینما کے برآمدے میں کھڑا آنے والی فلموں کے پوسٹر دیکھ رہا تھا تو یکایک میرے دل میں ہوائی سی چھوٹ گئی "کنج تنہائی" کنج۔ کنج۔ کنڈ۔ کنڈ ——— کنڈ۔ کنڈ چلاتا ہوا دیوانہ وار بھاگا۔ لوگ حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ اور میں یوں بھاگا جا رہا تھا جیسے کوئی کھل جا سم سم پالیا ہو۔ لیکن جلد ہی میری خوشی ختم ہو گئی۔

میں نے ہر جگہ پوچھ گچھ کی۔ ریلوے کے متعلقہ عملے سے ملا۔ پی ڈبلیو ڈی سے تحقیقات کی۔ ٹورسٹ بیورو سے ملا۔ جغرافیہ دانوں سے بات کی۔ جغرافیائی انسائیکلوپیڈیا دیکھے۔ سروے کے نقشے دیکھے۔ لیکن کنڈ کا پتہ نہ چلا۔

ٹورسٹ بیورو میں جب میں نے کنڈ کے متعلق تفصیلات بتائیں۔ تو وہ کہنے لگے۔ ایسا ایک مقام تو ہے جس کی ایک سڑک حال ہی میں بنائی گئی ہے۔ وہ ایک سبز پیالہ ہے جس کے درمیان میں نیلی جھیل ہے اور جھیل میں خصوصاً غیر ملکی سیاحوں کے لیے ہم نے ایک ماڈرن ہوٹل کھولا ہے لیکن اس مقام کا نام کنڈ نہیں جام ہے۔

جی نہیں میں نے جواب دیا خالی جام کو کیا کرنا ہے۔ پیالے اور جھیلیں کئی جگہ ہوں گی۔ میں تو کنڈ کو تلاش کر رہا ہوں۔

ایک سال تک میں نے کنڈ کی تلاش جاری رکھی پھر آہستہ آہستہ میں مایوسی میں ڈوب گیا۔ وقت گزرتا گیا۔ دنیاداری اور دستور کی رسومات اور فرائض کا ملبہ مجھ پر ڈھیر ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ میں ایک چلتا پھرتا مقبرہ بن کر رہ گیا اور کنڈ کی جستجو میرے دل سے اتر گئی۔

اتفاقاً ایک کاروباری سلسلے میں مجھے اوگی پہاڑ پہ آنا پڑا۔ وہاں قاضی صاحب سے ملاقات ہوئی۔ اور قاضی صاحب نے مجھے حضرت رنگی شاہ کی خدمت میں حاضر ہونے پر اکسایا۔

اس گھومتی ہوئی (LEAVE SPACE) مجز پہاڑ پہ رینگتی ہوئی پگڈنڈی پر قاضی صاحب کے محبت کے تذکرے پر پتھر کی اوٹ سے سالہا سال بعد بوڑھے پروفیسر نے سر نکالا۔ صاحبزادے کیا تم محبت کے مفہوم کو سمجھتے ہو۔ ایک بار پھر اس جانے پہچانے جملے نے مجھے جھنجھنا کر رکھ دیا۔ پرانی یادیں پھر سے تازہ ہو گئیں۔ ماضی کے سرخ چیونٹے پھر سے میرے دل و دماغ پر رینگنے لگے۔ کنڈ جانے کی دبی ہوئی آرزو پھر سے بیدار ہو گئی۔

روشن شاہ میری طرف دیکھ کر مسکرائے۔ میاں وہ بولے محبت کے مفہوم کو جانا جاسکتا ہے۔ لیکن نہ ہم جانتے ہیں میاں نہ تم جانتے ہو۔ نہ ہم جان سکتے ہیں میاں نہ تم جان سکتے ہو۔ اگر جان لیں تو ہم ہم نہیں رہتے۔ تم تم نہیں رہتے۔ لیکن شاہ صاحب مجھے جاننے کی تمنا ہے میں نے کہا۔ شاہ صاحب مسکرائے۔ ان کی مسکراہٹ میں پروفیسر کی سی تلخی نہ تھی۔ دکھ نہ تھا۔ بولے کس جھنجھٹ میں پڑ گئے میاں گلاب کو جاننے کا ایک ہی طریقہ ہے گلاب بن جاؤ ـــــ لیکن پھر جاننے والا نہ رہے گا۔

اگرچہ شاہ صاحب کی باتوں پر قاضی صاحب دیر تک سبحان اللہ سبحان اللہ کا ورد کرتے رہے۔ لیکن میری تسکین نہ ہوئی۔ بلکہ خلفشار اور بھی بڑھ گیا۔ شاہ صاحب کے گاؤں سے واپسی پر کچھ دیر پہلے جب قاضی صاحب مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے اور میں عام مہمان خانے میں بیٹھا بیتے دنوں کی یاد میں کھویا ہوا تھا تو دفعتہً کنڈ کا نام سن کر میں چونکا۔

قریب ہی چارپائی پر دو آدمی بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

اُونچا لمبا ادھیڑ عمر کا آدمی۔ دبلے پتلے بوڑھے سے کہہ رہا تھا مشکل سے ایک دن کے لیے آیا ہوں چاچا۔ شاہ صاحب کو سلام کرنے کے لیے کل ہر صورت مجھے واپس پہنچنا ہے۔

دیوانہ وار میں ان کی طرف جھپٹا۔ آپ کنڈ کی بات کر رہے تھے کیا ـــــ آپ نے ابھی کنڈ کا نام لیا تھا ـــــ آپ جانتے ہیں کنڈ کہاں واقع ہے۔ آپ ـــــ میں وہاں ـــــ غالباً وہ میری کیفیت دیکھ کر گھبرا گئے۔

میں ڈرائیور ہوں اونچا لمبا آدمی بولا۔ دیار سے کنڈ تک میرا روٹ ہے۔ کنڈ سے دو کوس دور میرا گاؤں ہے۔ کنارے کا رہنے والا ہوں۔

تو کیا کنڈ واقعی کوئی جگہ ہے۔ یہاں سے کتنی دور ہے۔ کہاں ہے۔ جانے کا راستہ ـــــ میں وہاں جانا چاہتا ہوں۔ ہاں میں۔ اونچے لمبے آدمی نے سامنے والی پہاڑی کی طرف اشارہ کیا۔

کنڈ اس پہاڑی کے پار ہے۔ پہاڑی کے پار دور اک وادی ہے۔ آگے جیپ شریف کی پہاڑیاں ہیں۔ بس ان میں کنڈ ہے۔ ادھر سے ڈنڈی جاتی ہے۔ سولہ میل ہے یہاں سے۔

مجھے ساتھ لے چلو بھائی میں نے کہا مجھے ساتھ لے چلو۔

اس نے غور سے میرا جائزہ لیا۔ پھر سر نفی میں ہلا دیا۔ اونہوں! وہ بولا۔ تم ادھر سے نہیں جاسکو گے بھائی۔ تم سڑک کے رستے سے جاؤ۔ اوگی سے بس ملے گی۔ دیار کی بس۔ دیار پہنچ کر میرا پوچھ لینا۔ محمد اکبر ڈرائیور۔ میں تمہیں کنڈ لے جاؤں گا۔ دیار سے کنڈ اسی میل دور ہے صرف اسی میل!

دو روز کے بعد۔ دیار پہنچ کر محمد اکبر کو تلاش کرنے میں چنداں دقت نہ ہوئی اور اگلے دن ہم اس کی جیپ میں بیٹھے کنڈ جا رہے تھے۔

جیپ میں ہم کل چھ افراد تھے۔ پانچ مرد اور ایک عورت۔ جیپ کا ڈرائیور محمد اکبر۔ ساٹھ پینسٹھ سال کا ایک بوڑھا ڈاکٹر۔ پچیس سال کا ایک نوجوان۔ تیس پینتیس سال کا ایک یورپین۔ پینتیس چالیس سال کی ایک خاتون اور میں۔ خاتون کے متعلق یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ مردانہ عورت ہے یا زنانہ مرد۔ اس کا قد اونچا لمبا تھا جسم گٹھا ہوا تھا۔ اعضا بڑے بڑے اور مضبوط تھے۔ چہرے سے تمکنت اور حکومت ظاہر ہوتی تھی نگاہ میں دبدبہ اور بے باکی تھی۔

دیر تک ہم سب چپ چاپ بیٹھے اس ویران۔ بنجر پتھریلے علاقے کو دیکھتے رہے جس پر کوئی درخت تھا نہ جھاڑی۔ چشمہ تھا نہ آبادی
ان ریتلی چٹانوں سے عجیب قسم کی سڑاند آرہی تھی۔ جہاں تک نظر جاتی تھی ویرانہ پھیلا ہوا تھا۔ مردار ویرانہ! یہ کیسا علاقہ ہے ڈاکٹر نوجوان چلایا!
گھاس کا ایک پتا تک دکھائی نہیں دیتا۔ نہ چرند نہ پرند ——— اور یہ بُو ——— دماغ پھٹا جا رہا ہے۔

ڈاکٹر نے قہقہہ لگایا۔ میاں وہ بولا ٹورازم والوں نے تو بڑی تعریف کی تھی۔ کہتے تھے دنیا کے چند حسین مقامات میں سے ایک
ہے۔ ٹورازم والوں کی بات چھوڑیے۔ ان کا بس چلے تو سانگلہ ہل کو بھی صحت افزا مقام بنا دیں۔ نوجوان بولا۔ پھر یورپین کی طرف دیکھ کر بولا۔
ہے ہاؤ یو۔

یورپین نے ناک سے رومال ہٹایا۔ ناک چڑھائی۔ کندھے جھٹکے (NASTY) نے سسی۔ وہ بولا۔ ہاؤ فار از اٹ۔

کتنی دور ہوگا ڈرائیور۔ نوجوان نے پوچھا۔

کنڈ ——— ؟ بالوچی ڈرائیور بولا۔

ارے رکو رکو نوجوان چلایا۔ تو ہمیں کہاں لے جا رہا ہے۔

ہمیں تو جام جانا ہے کنڈ نہیں۔

ایک ہی بات ہے صاحب۔ ڈرائیور نے کہا۔

کیا کہا کنڈ اور جام ——— ایک ہی بات ہے؟

ٹھیک کہتا ہے ڈاکٹر بولا جام کو کنڈ ہی کہتے ہیں۔ پہلے اس کا نام کنڈ تھا۔ پھر مغلوں کے زمانے میں جہانگیر نے اس مقام کو بہت پسند
کیا اور اس کا نام جام رکھا۔ میں نے جگہ جگہ سے اس مقام کے متعلق بہت معلومات حاصل کی ہیں۔

لیکن ڈاکٹر صاحب کوئی مقام نظر بھی آئے۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی ہے۔ بنجر اور مردار چٹانیں نظر آ رہی ہیں۔ اس کوڑے کے ڈھیر میں
کیا ہو سکتا ہے بھلا۔

لیکن کتابچے میں تو بڑی تعریف لکھی تھی۔ ڈاکٹر بولا۔

کتابچے تو گمراہ کرنے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ نوجوان نے مجھے کہنی ماری۔ کیوں صاحب ——— آپ کی تعریف۔

جی ——— مجھے علی کہتے ہیں میں نے جواب دیا۔

میرا نام عاصم ہے نوجوان بولا۔ میں تو سمجھتا ہوں یہ ڈرائیور ہمیں غیر علاقے میں لے جائے گا اور وہاں جا کر بیچ دے گا۔

ڈاکٹر قہقہہ مار کر ہنسا۔ میاں ہمیں کون خریدتا ہے۔

ہاؤ فار ——— یورپین نے اپنا سوال دہرایا۔

دی آر لاسٹ مین ——— لاسٹ ان دس گاڈ فارسیکن لینڈ عاصم نے منہ بنا کر کہا۔ یورپین نے دانت نکالے شانے جھٹکے اور منہ بنا کر
خاموش ہو گیا۔ دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ عاصم غور سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر کسی خیال میں کھویا ہوا تھا۔ یورپین ناک پر رومال رکھے ایک
ایک انگریزی مصور رسالہ دیکھنے میں محو تھا اور محترمہ مجھے یوں گھور رہی تھی۔ جیسے آنکھیں دکھا رہی ہو۔ اس کا چہرہ بالکل روکھا تھا۔ کڑوا۔ جیسے

ابھی ابھی کوئی کڑوی دوائی ہو۔

اس محترمہ سے کوئی پوچھے ——— ڈاکٹر نے کہا۔

محترمہ کہاں وہ تو خالص محرم دکھائی دیتی ہے۔ عاصم نے زیر لب کہا ——— ڈاکٹر ہنسنے لگا۔

ان فرنگیوں کو تو دور دراز مقامات پر جانے کا خبط ہے۔ عاصم بولا۔

وہ تو ہے لیکن عورتوں کا کنڈ جانا کچھ مناسب نہیں۔ ڈاکٹر بولا۔

کیوں؟ عاصم نے پوچھا۔

کہتے ہیں اس جگہ کی ایک خصوصی تاثیر ہے۔ جو بھی وہاں جائے اس کے دل میں دبی ہوئی محبت اُبھر آتی ہے۔ اپنے اصلی روپ میں اُبھر آتی ہے۔ دل کی گہرائیوں میں ایک ابال آ جاتا ہے۔ ایک طوفان چلتا ہے۔ پرانے زمانے میں وید شوقین مزاج بوڑھوں کو کنڈ آنے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔

اچھا ——— عاصم نے کہا کہیں آپ بھی اسی سلسلے میں تو نہیں جا رہے۔

ڈاکٹر ہنسا ——— میں تو تحقیق کے لیے جا رہا ہوں۔

مرض کی تحقیق یا کسی مریض کی۔ عاصم نے پوچھا۔

میں میڈیسن کا ڈاکٹر نہیں میاں۔ نفسیات کا پی ایچ ڈی ہوں۔

اوہ ——— عاصم نے ڈاکٹر کی طرف بغور دیکھا۔

اس بات کی تحقیق کرنا چاہتا ہوں کہ یہ سب درست ہے یا ———

کیا واقعی کنڈ محبت کا جذبہ بیدار کرتا ہے۔

یہ یورپین بھی کیا محبت کی ہولی کھیلنے آیا ہے۔ عاصم نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے قہقہہ لگایا یہ تو ہر جگہ محبت کی ہولی کھیلتے ہیں۔ ان مغربی لوگوں نے تو جگہ جگہ کنڈ بنا رکھا ہے۔ مسلسل کنڈ میں رہتے ہیں بلکہ اب تو کنڈ سے اکتا چکے ہیں۔

ڈاکٹر کی باتیں میں بڑے غور سے سُن رہا تھا۔ جی چاہتا تھا اس سے کچھ پوچھوں۔ دل میں کئی ایک سوال ابھر رہے تھے۔

"ڈاکٹر صاحب" میں نے پوچھا۔ کیا آپ محبت کا مفہوم جانتے ہیں۔ ڈاکٹر نے غور سے میری طرف دیکھا۔ اندھے اور ہاتھی والی بات ہے۔ میاں وہ بولا۔ کوئی سمجھتا ہے کہ رسے کی طرح ہے۔ کوئی سمجھتا ہے کہ ستون ہے۔ کسی کو چھاج معلوم پڑتی ہے۔ کسی کو سونڈ۔ انا اور جسم کے چشمے سے دیکھو تو۔ ذاتی بن جاتی ہے۔ ذاتی محبت کی پھلجھڑیاں رنگ رنگ میں جلتی ہیں۔ ایک ساعت کے لیے وہ خاموش ہو گیا پھر آپ ہی آپ گنگنانے لگا۔ میاں محبت دیوتا بھی ہے اور عفریت بھی۔ کبھی وہ دیوتا کو عفریت میں بدل دیتی ہے۔ کبھی عفریت کو دیوتا ———

خواہ مخواہ ——— عاصم نے ہنس کر کہا۔ روحانیت کی کلی ٹانک کر خواہ مخواہ بات کو الجھا دیا۔

جنہوں نے روحانیت کو الگ کر کے محبت کو جسم تک محدود کر دیا ہے۔ ان کا حشر دیکھ رہے ہو نا میاں۔ ڈاکٹر بولا۔

کن کی بات کر رہے ہیں آپ عاصم نے پوچھا۔
اہلِ مغرب کی۔ وہ بولا۔
کتنی عجیب بات ہے عاصم گنگنایا۔ جسم میں مقید لوگ آزادی کے خواب دیکھتے ہیں۔ خالی خولی خواب۔
کنڈ آ گیا صاحب ڈرائیور بولا۔
چھوڑو یار عاصم چلایا تم تو کب سے یہی کہہ رہے ہو۔
صرف ڈیڑھ میل ہے یہاں سے ڈرائیور نے کہا۔
عاصم نے چاروں طرف دیکھا۔ جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی۔ بنجر چٹانوں کا سلسلہ دکھائی دے رہا تھا۔
یہاں تو ویرانہ ہی ویرانہ ہے۔ وہ بولا کوئی مقام دکھائی بھی دے۔
جیپ رک گئی۔
گاڑی آگے نہیں جائے گی صاحب۔ ڈرائیور بولا۔
لیکن —— عاصم نے کہا —— کوئی مقام نظر تو نہیں آتا۔
یہ ڈنڈی جو ہے ڈرائیور نے کہا۔ صرف آدھ میل پیدل چلنا پڑے گا۔ یہ سامنے تو ہے۔ اس پتھر سے صاف نظر آئے گا۔
شاید نشیب میں ہے ڈاکٹر نے کہا۔
پتھر کے قریب پہنچ کر عاصم نے ایک چیخ سی ماری۔ ڈاکٹر ڈاکٹر —— پھر وہ خاموش ہو گیا اور یوں بے حس و حرکت کھڑا کا کھڑا رہ گیا جیسے پتھر کا بنا ہو۔

کنڈ کو دیکھ کر ہم سب مبہوت رہ گئے۔ نیچے ہمارے سامنے گویا ایک وسیع و عریض سبز کٹورہ دھرا تھا۔ دیواروں میں گولائی تھی جو سبز مخملی گھاس سے ڈھکی ہوئی تھیں جس میں سے گلابی اور نیلے پھول جھانک رہے تھے۔ دیواروں کے اوپر تین طرف اونچے لمبے دلدار کھڑے تھے۔ کٹورے کی تہہ میں جھیل میں نیلا پانی چمک رہا تھا اور جھیل کے عین وسط میں ایک سہ منزلہ عمارت یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے گڑیوں کا گھر ہو۔ جھیل کے کنارے چند ماچس کی ڈبیاں رکھی ہوئی تھیں۔ غالباً وہ مکانات اور دکانیں تھیں کٹورے کی دیواروں پر کوئی درخت تھا نہ پودا صرف گھاس کا پھولدار قالین بچھا تھا —— ان ویران اور مردار چٹانوں کی اک کھوہ میں ایسا سرسبز اور دلفریب مقام۔ دیر تک ہم سب اس حسین سبز کٹورے کو دیکھتے رہے۔ لیکن ہوٹل میں پہنچ کر جب ہم نے ٹیرس سے دیکھا تو منظر کا حسن دوبالا ہو گیا۔ نیلگوں پانی کے پھیلاؤ سے کٹورے کی دیواریں اور بھی مخملی نظر آنے لگیں۔ ان کی گولائی اور بھی واضح ہو گئی۔

شام کے وقت ٹیرس پر چائے پیتے ہوئے میں دل میں ایک عجیب سی فرحت محسوس کر رہا تھا۔ جیسے وہاں پہنچ کر دل سے سالہا سال کا بوجھ اتر گیا ہو۔ بیتے ہوئے دکھ گویا اپنی دھار کھو چکے تھے۔ ماضی کی تلخیاں دھندلی پڑتی جا رہی تھیں۔ میں محسوس کر رہا تھا جیسے عمر رفتہ ایک خواب ہو۔ محض دھندلا خواب۔ بے معنی خواب۔

دیر تک میں ٹیرس پر بیٹھا رہا۔ پھر سونے کے لیے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میرا خیال تھا کہ سفر کی تھکان کی وجہ سے جلد نیند آ جائے گی لیکن

دیر تک بستر پر پڑے رہنے کے باوجود نیند نہ آئی۔ سونے سے پہلے بیتے ہوئے واقعات پر سوچنے کی میری پرانی عادت اس رات گیا منسوخ ہو گئی تھی ماضی ایک بے معنی دھندلکا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے ان بیتے ہوتے واقعات سے میرا کوئی خاص تعلق نہ ہو جیسے وہ کسی اور سے متعلق ہوں۔ رہ رہ کر دھیان حال کی طرف منعطف ہو جاتا۔ جی چاہتا اٹھ کر کچھ کروں۔ کچھ دیکھوں۔ گھڑیال نے ایک بجایا۔ عین اس وقت باہر سے شور سنائی دیا۔ کون ہو تم۔ کون ہو تم۔

میں اٹھ بیٹھا۔ دروازہ کھول کر باہر نکلا۔

میں ہوں صاحب بیرا۔ برآمدے میں سٹول پر بیٹھا ہوا ایک آدمی بولا بیرا ——— تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو۔ عاصم نے پوچھا

میں ڈیوٹی پر ہوں صاحب۔

ڈیوٹی ——— اس وقت

جی صاحب یہاں ساری رات سروس چلتی ہے۔

کیا بات ہے عاصم صاحب میں نے نوجوان سے باآواز بلند پوچھا۔

اوہ آپ ہیں وہ بولا۔ کچھ نہیں۔ پھر دفعتہً بیرے سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ اس وقت کافی مل سکے گی کیا۔

جی صاحب ابھی لایا بیرا اٹھ کر چل پڑا۔

دو کافی ——— ہاٹ۔ عاصم چلایا۔ آپ پئیں گے نا وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ آیئے بیٹھے ——— مجھے نیند نہیں آ رہی ——— کروٹیں بدل بدل کر تھک گیا۔

ہم دونوں برآمدے میں لگی ہوئی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

ارے عاصم چلایا ——— اُدھر دیکھئے تو

چاند بدلی سے باہر نکل آیا تھا۔ سبز کوزہ زرد پیلی چاندنی سے منور ہو گیا تھا۔ ہلکی ہلکی خنک ہوا چل رہی تھی۔ دور کوئی آبشار گنگنا رہی تھی۔ اور نہ جانے کہاں سے ہلکی ہلکی موسیقی کی آواز سارے ٹیرس پر پھیلی ہوئی تھی۔

ارے صاحب یہ تو خوابوں کی بستی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہاں نیند کیوں نہیں آتی ——— عجیب سی بات ہے ——— اور میں سمجھتا تھا وہ ڈاکٹر محض کتابی باتیں کر رہا ہے۔ بھلا مقامات۔ جغرافیہ۔ آب و ہوا کا بھی اثر ہو سکتا ہے ——— لیکن یہاں میں عجیب سا محسوس کر رہا ہوں جیسے میں میں نہیں رہا۔

کافی سر، قریب ہی اندھیرے سے آواز سنائی دی جیسے کسی نے آہ بھری ہو۔

کون ہے عاصم تڑپ کر مڑا۔

میں ہوں سر۔

ادھر آؤ چاندنی میں وہ بولا۔

میں ہوٹل کی ہاسٹس ہوں سر۔

وہ درمیانہ قد اور ہلکے پھلکے جسم کی لڑکی تھی۔ معمولی سے کپڑے کی جوگیا ساڑھی میں ملبوس۔ چٹا گانگ کی پہاڑی لڑکیوں کی طرح سر پر ایک طرف بالوں کے جوڑے میں سفید پھول لگے ہوئے تھے۔ اس کے چہرے پر بچگانہ معصومیت تھی۔ آنکھیں ترچھی ڈوبتی ہوئی گمر روئی روئی ہونٹ پتلے جیسے ان میں آہ دبا رکھی ہو۔ چہرہ ستاہ ہوا۔ آواز مدھم اور لوچدار۔

وہ ہمارے روبرو یوں کھڑی تھی جیسے خوابوں کے دھندلکے سے بنی ہو۔ کافی سر۔ اس کی مدھم آواز سنائی دی۔

عاصم کی نگاہیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ عجیب نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ بیٹھ جاؤ بیٹھ جاؤ۔ کیا تم ہمارے ساتھ کافی پیوگی ——— لیکن میں نے تو صرف دو پیالے منگوائے تھے۔ بیرا بیرا وہ چلایا۔

پاٹ میں تین پیالے ہیں سر۔ وہ کافی بناتے ہوئے بولی۔

شکریہ ایک یادور۔

اوہ ——— ایک عاصم نے کہا۔ کیا نام ہے تمہارا۔

آنسہ سر وہ بولی۔

آنسہ۔ آنسہ، عاصم نے بڑے پیار سے کئی ایک بار اس کے نام کو دہرایا وہ میری موجودگی کو بھول چکا تھا۔

آنسہ وہ بولا۔ میں نے تمہیں کل شام کو نہیں دیکھا تھا۔

میں نائٹ ڈیوٹی پر ہوں۔ وہ بولی۔

اوہ ——— عاصم نے دونوں کہنیاں میز پر رکھ دیں اور جھک کر آنسہ کو دیکھنے لگا۔ آنسہ جھکی جھکی آنکھوں سے پیالے میں چمچہ چلا رہی تھی۔ اس کے ہونٹوں کے خم سے ظاہر تھا کہ اسے عاصم کی منڈلاتی ہوئی نگاہوں کا احساس ہے۔

تم روئی روئی ہو آنسہ تمہیں کوئی دکھ ہے کیا؟ عاصم نے کہا۔

کافی سر، آنسہ نے اوپر دیکھے بغیر پیالہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

عین اس وقت اوپر کی منزل سے کوئی چیخنے لگی۔ سٹاپ اٹ یو آر ہرٹنگ می ڈارلنگ۔ سٹاپ اٹ۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔

پھر وہ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔

یہ کون ہے عاصم چلایا۔

اوپر کی منزل بیرونی سیاحوں کے لیے مخصوص ہے وہ بولی۔

لیکن یہ شور شرابا۔

یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے سر وہ بولی۔

لیکن تم عاصم نے کہا۔ اس شور شرابے میں تم خاموشی کی ایک کرن ہو آنسہ۔ ایک پیالہ اور بنا دوں سر وہ بولی۔

میری بات کا جواب دو آنسہ۔

اس نے ایک موہوم آہ بھری - پتہ نہیں سردہ زیر لب گنگنائی -
ڈاکٹر، ڈاکٹر دور سے آواز آئی - ڈاکٹر میرا دل - میرا دل میرا دل - ہاتھ رکھ کر دیکھو یہاں یہاں ——— ہی ہی ہی ہی - قہقہے کی آواز گونجی ——— ڈر گئے - ڈر گئے - ہی ہی ہی ہی - مرد ہو کے ڈرتے ہو - ہی ہی ہی ہی - اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی جیسے نشہ میں دھت ہو - میرا دل ڈاکٹر میرا دل آواز مدھم پڑتی گئی -
پھر جیسے کوئی کھانس رہا ہو - ہچکیاں بھر رہا ہو -
کون ہے یہ ؟ عاصم چلایا کون تھا ؟
یہ بانو ہے سردہ بولی - یہاں مکمل آزادی ہے - سب اپنی اپنی زندگی بسر کرتے ہیں - کوئی دخل نہیں دیتا کہ کیوں ہے کیا ہے -
عین اس وقت ساتھ والا کمرہ کھلا - مینجر مینجر کوئی چلائی -
یہ کیسی آوازیں ہیں - کیسی آوازیں ہیں ——— مینجر -
یہ تو محترمہ ہیں عاصم بولا جو ہمارے ساتھ آئی تھیں -
ایک اونچا لمبا سایہ محترمہ کے پاس آکر رک گیا - یس میڈیم تم کون ہو - محترمہ بولی -
میں مینجر ہوں میڈم - خاقانی -
مینجر محترمہ نے چیخ کر کہا - مینجر یہ کیسا شور ہے - مجھے نیند نہیں آتی اور یہ موسیقی - اسے بند کرو مینجر اسے بند کرو - یہ مجھے کبھی سونے نہ دے گی بند کرو اسے مینجر -
آیئے محترمہ آپ یہاں برآمدے میں بیٹھئے میں ابھی آپ کو سلیپنگ پلز بھجوا تا ہوں - کیا آپ کافی پینا پسند کریں گی ؟
دفعتہً محترمہ کی نگاہ منظر پر پڑی - اُف یہ چاندنی وہ گنگنائی - اُف یہ چاندنی اور ہمارے قریب ہی ایک کرسی پر آکر بیٹھ گئی - محترمہ نیند نہیں آتی آپ کو عاصم نے برسبیل تذکرہ پوچھا -
وہ چونکی تم کون ہو وہ تحکمانہ لہجے میں بولی -
میں آپ کا ہمراہی ہوں عاصم نے کہا -
ہمراہی - محترمہ نے نفرت بھری نگاہ سے عاصم کی طرف دیکھا ——— اوہ تم دفعتہً اس کی آواز میں تبدیلی پیدا ہو گئی ——— ہاں تم وہ گنگنائی ——— لیکن تم ہمراہی نہیں ہو - کوئی ہمراہ نہیں ہے - میں تو اکیلی ہوں ——— اکیلی سر ہاتھوں میں تھامے وہ آپ ہی آپ گنگنا رہی تھی پھر اس نے سر اٹھایا - دفعتہً اس کی نگاہ آنسہ پر پڑی ——— تم ——— وہ چلائی ——— تم کون ہو - میں ہاسٹس ہوں آنسہ -
محترمہ پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی - اسے یہ قطعی احساس نہ رہا تھا کہ ہم پاس بیٹھے ہیں - وہ اٹھ بیٹھی اور آنسہ کے قریب تر ہو گئی - اس نے اپنے ہاتھ سے آنسہ کی ٹھوڑی کو اوپر اٹھایا اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی تم یہاں ہو - اور میں کب سے تمہیں ڈھونڈ رہی تھی - کب سے صدیاں بیت گئیں - آنسے میری طرف دیکھو آنسے -
لیکن میڈم ——— آنسے نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا -

تم میرا خواب ہو۔ میری طرف دیکھو آنسہ۔ آنسہ محترمہ کی آواز میں منت تھی۔

بیگم صاحبہ ـــ یہ نیند آور گولیاں۔ بیگم صاحبہ۔ بیرے نے آکر محترمہ سے کہا مینجر نے بھیجی ہیں۔

نہیں نہیں محترمہ چلائی مجھے نہیں چاہئیں مجھے نہیں چاہئیں۔ میں سونا نہیں چاہتی۔ میں جاگنا چاہتی ہوں جینا چاہتی ہوں ـــ اس نے مڑکر دیکھا ـــ آنسہ جا چکی تھی ـــ ہائیں چلی گئی ـــ محترمہ نے چیخ سی ماری ـــ چلی گئی ـــ اور پھر وہ آنسہ کے پیچھے بھاگی آنسہ آنسہ رک جاؤ آنسہ رک جاؤ۔

آنسہ عاصم نے زیر لب کہا۔ آنسہ ـــ آنسو ـــ ہاں وہ گنگنایا ـــ وہ آنسو ہے آنسو۔

عجیب لڑکی ہے میں نے کہا غیر معمولی!

عاصم نے حیرانی سے میری طرف دیکھا جیسے دفعتاً اسے میری موجودگی کا احساس ہوا ہو ـــ آپ وہ بولا۔ آپ یہاں ـــ آپ کب آئے ـــ اوہ اچھا ـــ آپ ـــ معاف کرنا علی صاحب اس نے کہا۔ سارا ذہن گڈمڈ ہو گیا ہے۔

ہی ہی ہی ہی قریب ہی سے ڈاکٹر کی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ سچ کہتے ہو میاں وہ قریب آکر بولا۔ واقعی ذہن گڈمڈ ہو گیا ہے۔ یہ فضا عجیب کیفیات کی حامل ہے۔ یہاں نیند نہیں آتی۔ سفر کی کوفت کے باوجود تھکاوٹ نہیں ہوتی۔ ایک عجیب سی فرحت محسوس ہو رہی ہے۔ کیوں علی صاحب وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔

فرحت تو بے شک ہے میں نے جواب دیا۔ لیکن ساتھ ہی ایک اضطراب سا طاری ہے ارے صاحب عاصم بولا۔ میرا تو جی چاہتا ہے کہ اٹھ کر ناچوں ڈاکٹر نے قہقہہ لگایا۔

لیکن ڈاکٹر عاصم نے کہا۔ وہ لڑکی آنسہ۔ آپ نے دیکھا ہے۔ اسے گویا وہ اس گلابی جام سے ڈھلکا ہوا۔ نیلگوں آنسو ہے۔ جیسے راگ میں بے بربت سر ہوتا ہے۔ جیسے نگانا منع ہوتا ہے مگر لگ جائے تو اور بھی دل کشی پیدا کر دیتا ہے۔ تم نے اُسے دیکھا ہے ڈاکٹر۔

ہاں میں نے آنسہ کو دیکھا ہے ڈاکٹر بولا۔

دور سے نسوانی قہقہے کی آواز آئی۔ شرابی خاتون بانو ہنسے جا رہی تھی میں ـــ میں جام کا تلخ گھونٹ ہوں وہ بہکی آواز میں چلائی ـــ تم مجھے نہیں جانتے کیا؟

اوپر کی منزل سے کوئی میم چلائی۔ کرش می ڈارلنگ کرش می۔ پھر مردانہ قہقہہ گونجا۔

آنسہ۔ ڈاکٹر بولا۔ وہ ان قہقہوں پر لرزتا ہوا ایک آنسو ہے۔ تم ٹھیک کہتے ہو۔ یہ قہقہے یہ رنگین تبسم اور یہ آنسو۔ زندگی کی قوس قزح کتنی رنگین ہے۔ یہاں کوئی تیرنے کی دعوت دیتی ہے کوئی ڈوب جانے کی۔

لیکن کیوں ـــ کیوں محترمہ کی اشک بار آواز سنائی دی۔

آپ نہیں سمجھتی بیگم صاحبہ۔ مینجر بولا۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔ آئیے میں آپ کو آپ کے کمرے تک پہنچا دوں۔

مینجر نے دروازہ کھولا۔ محترمہ روتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ اس کی ہچکیاں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

کیا میں آپ کی کوئی خدمت کر سکتا ہوں۔ مینجر ہمارے قریب آکر بولا۔

ادھر آیئے منیجر ڈاکٹر بولا۔ کیا قرب و جوار میں کوئی دیکھنے کی جگہ ہے یہاں۔
خاقانی اندھیرے سے نکل کر چاندنی میں آ کھڑا ہوا۔ جھیل کے پار ادھر مشرق میں ایک راہب خانہ ہے۔ وہ بولا۔ کہتے ہیں اشوک کے زمانے میں اس کی تعمیر ہوئی تھی۔ لیکن جلد ہی بودھ راہبوں نے محسوس کیا کہ کنڈ دھیان گیان کی جگہ نہیں۔ کہتے ہیں بہت سے راہب پاگل ہو گئے تھے۔ جب سے راہب خانہ ویران پڑا ہے۔
خاقانی کی طرف دیکھتے ہوئے دفعتاً میں نے محسوس کیا جیسے وہ ایک جانا پہچانا چہرا ہو۔ کون ہے یہ میں سوچنے لگا۔
راہب خانے کو جانے کا کوئی راستہ ہے کیا ڈاکٹر نے پوچھا۔
آپ کشتی سے جا سکتے ہیں خاقانی نے جواب دیا۔ جھیل میں سیر کرنے کے لیے ہم نے ایک کشتی بنوا رکھی ہے ——— پھر خاقانی نے عاصم کو مخاطب کر کے کہا۔ آپ نے بارہ دری نہیں دیکھی صاحب۔
بارہ دری۔ عاصم نے دہرایا۔
بارہ دری سے منظر بہت خوب صورت ہے۔ وہ اسی ٹیرس پر ہے لیکن ادھر مشرق جانب۔
چلیئے مجھے دکھایئے عاصم بولا۔
نہیں خاقانی بولا۔ اب پو پھٹنے کو ہے۔ بارہ دری کا نظارہ چاندنی رات میں بہار دکھاتا ہے۔ میں آنسہ سے کہہ دوں گا۔ کل رات وہ آپ کو بارہ دری میں لے جائے گی۔
آنسہ۔ آپ کی ملازمہ ہے کیا ڈاکٹر نے پوچھا۔
نہیں خاقانی بولا۔ وہ میری حصہ دار ہے۔ تقریباً ہاسٹس کا کام کرتی ہے اچھا۔ مجھے اجازت دیجئے شب بخیر۔
دفعتاً میرے منہ سے ایک چیخ سی نکل گئی۔ میرے سامنے خاقانی کے بھیس میں راز کھڑا تھا۔ وہی ——— میرا پرانا رازداں راز ———
کیا بات ہے میاں۔ ڈاکٹر نے کہا۔
خیریت تو ہے عاصم نے پوچھا ———
خاقانی جاتے جاتے رک گیا۔
کچھ نہیں کچھ نہیں میں چلایا اور اپنے کمرے کی طرف بھاگا۔
پھر کمرے میں لیٹے ہوئے۔ ماضی کی ایک ایک تفصیل میرے سامنے آ رہی تھی۔ راز اور مرجینا مجھے گھیر کر شکنجے میں بند کر رہے تھے۔ مرجینا لالٹرم کر رہی تھی۔ راز گرم تیل مٹکے میں انڈھیل رہا تھا۔ ٹپ ٹپ ٹپ ٹپ۔ بوندیں گر رہی تھیں۔
لیکن اس آپ بیتی کو دوبارہ بیتنے سے مجھے وہ اذیت نہیں ہو رہی تھی۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے میں اپنے آپ سے باہر نکل کر اپنا ہی تماشا دیکھ رہا ہوں۔ مجھے ساری بات پر ہنسی آ رہی تھی ——— کیا بوڑھے پروفیسر کا یہی مطلب تھا۔ کیا جنت کی یہی وہ جھلک تھی۔ جو اس نے کنڈ میں آ کر دیکھی تھی ——— اپنے آپ سے باہر نکل کر اپنی مصیبتوں پر ہنسنا۔ بیتتے ہوئے دکھوں پر مسکرانا ——— لیکن راز ——— وہ یہاں کیا کر رہا تھا۔ اس میں نمایاں تبدیلی آ گئی تھی۔ بھویں گھنی ہو گئی تھیں۔ آنکھیں روشن ہو گئی تھیں۔ چہرے پر گہری دکھی لکیریں ابھر آئی تھیں۔ دکھ کی ایک تہہ چڑھ گئی تھی ———

اور وہ اس کی حصہ دار —— معصوم آنسو —— کیا وہ اس کی رہبنا بھی میرے دل میں تحقیق کی خواہش ابھر رہی تھی غصہ۔ نفرت۔ عناد سے بے نیاز جذبۂ تحقیق۔

اگلے روز سارا دن ہم جھیل کے مشرقی کنارے پر راہب خانے کو دیکھتے رہے۔ ڈاکٹر ہمیں راہبوں کی زندگی اور بودھوں کا فلسفۂ عبادت سمجھاتا رہا۔ پھر وہ تبت کے قصے سنانے لگا۔ وہ تبت سے ہو آیا تھا۔ ان دنوں وہاں گیا تھا جب حملۂ تبتی چین کے متوقع حملے کی تیاری میں مصروف تھے۔ انہیں علم تھا کہ تبتی تہذیب ختم ہونے والی تھی۔ انہیں علم تھا کہ ان کا سربراہ آخری لامہ اپنے ملک کو چھوڑ کر چلا جائے گا۔ ڈاکٹر کی باتوں میں ایک عجیب سحر تھا۔

لیکن ڈاکٹر عاصم چلایا۔ یہ راہب خانہ ویران کیوں ہو گیا۔

یہ جگہ بڑی (DISTURBING) ہے میاں وہ بولا۔ راہب کا مقصد دنیا کو تیاگنا نہیں۔ اپنی انا کو تیاگنا ہے۔ اس سنہرے ہجرے سے باہر نکلنا ہے۔ جسے انا کہتے ہیں۔ بودھ راہبوں نے انا کو توڑنے کے لیے اندھیرا تنہائی اور خاموشی کو آلہ کار بنایا۔ حجرے میں داخل ہو کر وہ دروازے کو چنوا دیتے تھے اور سالہا سال اندر بیٹھے رہتے تھے۔

اور اندر کیا کرتے تھے۔ عاصم نے پوچھا۔

عبادت۔ دیان گیان۔ یہ بھی ایک قسم کی محبت ہی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ہنسا۔

بڑی کٹھن محبت ہے عاصم بولا۔

محبت کوئی بھی ہو خدا کی ہو بندوں کی ہو۔ مقصد پانا نہیں ہوتا۔ اپنے آپ کو کھونا ہوتا ہے۔ انا کی دیوار کو توڑ دو تو تم بنفسِ نفیس محبت بن جاتے ہو۔ ڈاکٹر نے کہا۔

راہب خانے کی دیوار سے روشن شاہ نے جھانکا۔ مسکرائے گلاب کو جاننے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ میاں وہ بولے خود گلاب بن جاؤ لیکن پھر جاننے والا کوئی نہ ہوگا۔ اس جاننے کے جھنجھٹ سے ہی نکل جاؤ گے۔

لیکن جاننے کے جھنجھٹ سے نکلنا کس قدر مشکل تھا۔ اسی جاننے کے جھنجھٹ کی وجہ سے میں کنڈ آیا تھا —— لیکن کنڈ پہنچ کر میں ایک اور جھنجھٹ میں پھنس گیا تھا۔ وہ جھنجھٹ راز تھا۔ میں اس کے متعلق جاننا چاہتا تھا۔ میں نے اس رات راز پر نظر رکھی۔ بارہ دری کے قریب جب میں ایک اندھیرے کونے میں چھپ کر کھڑا تھا تو حقہ نیم چھتی سے راز نے سر نکالا۔ آنسہ۔ آنسہ وہ چلایا۔ جاؤ اسے بارہ دری میں لے آؤ۔ آنسہ سمجھ گئی۔

کچھ دیر کے بعد آنسہ بارہ دری سے نکلی اور مغربی ٹیرس کی طرف چل پڑی۔ اس کے جانے کے بعد میں بارہ دری میں داخل ہو گیا۔ وہ ایک فراخ سا کمرہ تھا جس میں چاروں طرف دیواروں کے ساتھ شلف لگے تھے۔ جن میں کتابیں پڑی تھیں۔ میں نے ایک شلف کا جائزہ لیا۔ سب کی سب کتابیں ایک ہی موضوع پر تھیں۔ رومان۔ ملک ملک کے رومان۔

(GREAT LOVE STORIES) ایک محبت سو افسانے (VARIETIES OF LOVE) تائیں۔

بارہ دری سے ملحق ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جس میں صرف ایک کرسی رکھی ہوئی تھی۔ چھوٹی میز پر تصویروں کا البم تھا۔ جس میں برہنہ تصویریں

تھیں۔ دینس۔ کیوپڈ اینڈ سائیکی۔ بشاشتے۔ دی دنگا۔ اتفاقاً میری نگاہ دیوار پر پڑی۔ دیوار پر ایک چھوٹا سا جھروکا تھا لیکن وہ جھروکا معلوم نہیں دیتا تھا۔ جیسے خوب صورتی کے لیے ایک چھوٹا سا فریم لگا ہو۔ ضرور وہ جھروکا اس نیم چھتی میں کھلتا ہوگا۔ جس میں سے راز نے آنسہ کو آواز دی تھی میں نے سوچا۔

آنسے۔ قریب ہی سے عاصم کی آواز آئی۔ وہ لائبریری کی طرف آرہے تھے۔ میں ایک شلف کے پیچھے چھپ گیا۔ دراصل میں آنسہ اور عاصم کی باتیں سننا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں میں یہ محسوس کرنے لگا تھا۔ جیسے آنسہ ایک پلاسٹک کی گڑیا ہو جس کی ڈور راز کے ہاتھ میں ہو۔

یہاں سے منظر بڑا خوب صورت ہے سر۔ آنسہ بولی۔

بیک گراؤنڈ عاصم بولا۔ آنسے یہ کنڈ تو صرف ایک پس منظر ہے۔ پیش منظر تو صرف تم ہو آنسے۔

آئیے بھی ــــ آنسہ نے عاصم کا ہاتھ تھام لیا۔ یہ دیکھئے یہ لائبریری ہے وہ بارہ دری میں داخل ہو کر بولی۔ آپ کتابیں دیکھنا پسند کریں گے۔

کتابیں تو انسان اس وقت پڑھتا ہے۔ آنسے جب وہ بیت نہ رہا ہو میں تو بیت رہا ہوں۔ تمہیں بیت رہا ہوں آنسے ــــ مجھے تم سے محبت ہے آنسے۔

آئیے آپ کو دنیا کے عظیم عمل دکھادوں۔ گریٹ پینٹنگز۔ وہ عاصم کو تختہ کمرے میں لے گئی۔

کیا ان میں تمہاری تصویر بھی ہے وہ بولا۔

یہ دیکھیے محبت کی پہلی بیداری، عاصم تصویر دیکھنے لگا۔ آنسہ دروازے کے پاس جا کھڑی ہوئی ــــ کتنا خوب صورت دیو ہے۔ اس دروازے سے وہ بولی۔

ہاں ــــ بشرطیکہ تم پاس کھڑی ہو۔ عاصم نے کہا۔

کافی پئیں گے آپ وہ بولی۔ بیٹھئے۔ ابھی بناتی ہوں۔

ضرور ضرور عاصم نے کہا۔ لیکن اس کمرے میں تو صرف ایک کرسی ہے۔

دوسری کی جگہ ہی نہیں۔ وہ پرکولیٹر کے قریب کھڑی بننے لگی۔

میں میز پر بیٹھ جاتا ہوں وہ بولا۔

نہیں نہیں آنسہ چلائی پلیز۔ میں بیٹھے بیٹھے تھک گئی ہوں۔

ارے عاصم نے کہا۔ یہ دیوار پر کیا بنا ہے۔ جھروکہ ہے کیا۔

خالی فریم ہے وہ بولی۔ خوب صورتی کے لیے۔

دفعتاً موسیقی بدل گئی۔

ارے یہ موسیقی کس نے بدلی عاصم چلایا۔

پتہ نہیں وہ بولی۔ شاید آٹومیٹک لگا رکھا ہو ——— کافی بیجئے سر۔ وہ عاصم کی کرسی کے قریب آکھڑی ہوئی۔
خدا کے لیے آنسہ مجھے سر نہ کہو۔
جیسے آپ چاہیں۔ مجھے عادت پڑگئی ہے۔ کیا کروں۔ یہ دیکھئے۔ یہ عمر خیام کا البم ہے سر ——— معاف کیجئے ——— معاف کیجئے۔ میں بھول جاتی ہوں
آنسہ کی آواز یوں بدل گئی جیسے نشے میں ہو۔
بھول جاتی ہوں۔ مجھے چکر آتے ہیں۔ چکر ——— جیسے جیسے یہ جھیل یہ ہوٹل سب ایک جھولا ہو۔
آنسے آنسے عاصم چلایا۔ کیا ہے تمہیں۔
کچھ نہیں سر کچھ نہیں۔ تھک گئی ہوں۔ بہت تھک گئی ہوں دفعتہً وہ چکرا کر دھڑام سے عاصم کی گود میں گر گئی۔
آنسے عاصم چلایا۔ ہوش کرو آنسے۔
موسیقی پھر بدل گئی۔
آنسہ بے ہوشی میں گنگنا رہی تھی۔ مجھے تھام لو سر میں گری جا رہی ہوں۔ مجھے تھام لو سر۔
عاصم آنسہ کو محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ تم دیوی ہو آنسہ تمہیں منایا جا سکتا ہے سیس نوایا جا سکتا ہے۔ تھاما نہیں جا سکتا آنسے۔ تمہاری یہ آنکھیں یہ بال۔ یہ ستا ہوا چہرہ۔ مجھے تم سے محبت ہے آنسے مجھے تم سے محبت ہے۔ عاصم زیر لب بولا۔
ہوش میں آؤ آنسے ہوش میں آؤ ——— نہیں نہیں ہوش میں نہ آنا۔ ہوش میں نہ آنا میں تمہیں جی بھر کر دیکھنا چاہتا ہوں۔
دفعتاً لائبریری کے دروازے سے خاقانی داخل ہوا۔
معاف کیجئے گا صاحب وہ عاصم سے مخاطب ہو کر بولا ——— اوہ آنسہ کو کیا ہوا ——— پھر بے ہوش ہو گئی۔ دراصل اسے دورے پڑتے ہیں۔ معاف کیجئے آپ کو زحمت ہوئی۔
انہیں گفتگو میں مصروف دیکھ کر میں دبے پاؤں باہر نکل آیا۔
چاندنی اپنے جوبن پر تھی۔ سبزہ کٹہرا روپہلی چاندنی سے لبریز تھا۔ تیسری منزل سے قہقہوں کی آواز آ رہی تھی۔
بارہ دری کے مشرقی ٹیرس پر کوئی نہ تھا۔ میں ادھر چلا گیا اور ایک ستون کے سایہ میں بیٹھ کر جھیل کو دیکھنے میں کھو گیا۔ کچھ دیر کے بعد مجھے آوازیں سنائی دیں۔
قریب ہی شرابی خاتون بانو قہقہہ مار کر ہنسی۔ تم نووارد ہو وہ بولی۔
ہاں ہاں محترمہ عاصم نے جواب دیا۔
محترمہ۔ وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔ مجھے محترمہ کہتا ہے۔ میں ——— محترمہ۔ اس کی ہنسی بھیانک ہو گئی جیسے کراہ رہی ہو۔
غالباً تم نشے میں ہو عاصم نے کہا۔ تم نے زیادہ پی لی ہے۔
مجھے پینے کی کیا ضرورت ہے وہ بولی۔ میں تو آپ نشہ ہوں۔ جام کی تلچھٹ کا تلخ گھونٹ۔ وہ پھر ہنسنے لگی ——— دفعتاً اس کا انداز بدل

گیٔ تم بارہ دری سے آئے ہو۔ تمہارے کپڑوں سے اسی کی بو آرہی ہے۔ تم مداری کا تماشہ دیکھ کر آئے ہو! —— اس نے قہقہہ مار کر کہا —— یہاں جو نوجوان آتا ہے اسے تماشہ دکھایا جاتا ہے۔ دونوں ہی مداری ہیں۔ میاں بیوی مل کر تماشہ کرتے ہیں۔

مداری کا تماشہ وہ پھر ہنسنے لگی۔ مجھے چکر آرہے ہیں اس نے آنسہ کی نقل اتارتے ہوئے کہا مجھے چکر آرہے ہیں میں گری جا رہی ہوں تھک گئی ہوں مجھے تھام لو سر مجھے تھام لو وہ قہقہہ مار کر ہنسی میاں جھر دکے میں۔ بیوی گود میں۔ تماشہ ختم اس نے پھر قہقہہ لگایا۔

بانو —— دور سے خاقانی کی آواز آئی —— پھر وہ بڑی تیزی سے خاتون کی طرف بڑھا —— معاف کیجیۓ گا خاقانی نے عاصم سے کہا ان کی طبیعت اچھی نہیں۔ عاصم چلا گیا تو خاقانی بانو سے مخاطب ہوا۔ بانو تمہیں آرام کی ضرورت ہے آؤ ادھر آؤ۔

بانو نے قہقہہ لگایا۔ یہ تم کہہ رہے ہو۔ تم۔ میرا آرام لوٹ کر اب کہتے ہو تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔

بے وقوف نہ بنو بانو خاقانی نے زیر لب کہا۔

بے وقوف تم ہو بانو چلائی۔ آنسہ تمہاری بارہ دری کو آباد نہیں کر سکتی۔ تمہارے جھر دکے میں خوشی نہیں لا سکتی۔ تمہاری بارہ دری میرے دم سے آباد تھی۔ میرے دم سے وہاں قہقہے گونجتے تھے زندگی تھی —— لیکن تم مجھ سے اکتا گئے۔ تم نے مجھے پرانے کھلونے کی طرح پھینک دیا اور ایک نئی گڑیا لے آئے۔

آہستہ بولو بانو —— خدا کے لیے خاقانی نے زیر لب کہا۔

خدا کے لیے راتہ بانو نے منت سے کہا۔ مجھے پھر سے اپنی ہوسٹس بنالو

میں مجبور ہوں بانو وہ بولا۔

مجبور ہو وہ بولی —— لیکن کیا یہ ضروری ہے کہ محروم بھی رہو۔

بےکار ہے بانو خاقانی نے کہا۔

کیا کوئی صورت نہیں۔

صرف ایک صورت ہے خاقانی نے کہا تم کنڈ سے چلی جاؤ۔ تمہارا یہاں رہنا مناسب نہیں۔

نہیں جاؤں گی۔ میں نہیں جاؤں گی۔ میں یہاں سے کیسے جا سکتی ہوں بانو دیوانہ وار پیچھے ہٹی۔

بانو وہ چلایا۔ رک جاؤ۔ ادھر ٹیرس پر ریلنگ نہیں ہے بانو رک جاؤ۔

بانو قہقہہ مار کر ہنسی تم مجھے روکنے والے کون ہو۔

خطرے کا احساس کر کے میں خاتون کی طرف لپکا۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ لیا —— اس نے مڑ کر میری طرف دیکھا۔ معاً اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی —— تم وہ چلائی تم —— اس کا چہرہ بھیانک ہو گیا۔ مرجینا بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ میری گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ مرجینا دیوانہ وار جائی اور اس نے جھیل میں چھلانگ لگادی۔

ٹیرس پر کہرام مچ گیا۔

میرے نگاہوں تلے ایک دھندلکا چھا گیا اور میں اپنے کمرے کی طرف بھاگا۔

اگلے روز جب میں بیدار ہوا تو ڈاکٹر اور عاصم میرے سرہانے بیٹھے تھے ۔ عاصم چلا رہا تھا نہیں ڈاکٹر میں اسے چھوڑ کر نہیں جا سکتا لیکن وہ کسی اور کی ہے میاں ڈاکٹر نے کہا ۔

اس سے کیا فرق پڑتا ہے عاصم بولا ۔ آپ نے ہی تو کہا تھا محبت پانے کا نام نہیں اپنا آپ کھو دینے کا نام ہے ۔

اچھا میاں ڈاکٹر بولا جیسے تمہاری مرضی ۔ میں تو بہرحال جا رہا ہوں ۔ اوہ ——— ڈاکٹر نے میری طرف دیکھا اور یہ دیکھ کر کہ میں جاگ رہا ہوں پوچھا ۔ میاں کیسی طبیعت ہے اب ۔

"میں آپ کے ساتھ جاؤں گا ڈاکٹر" میں نے جواب دیا ۔

کیا تم سفر کر سکو گے میاں ۔

ہاں میں نے جواب دیا ۔ میں ٹھیک ہوں ۔

عین اس وقت کمرے کا دروازہ بجا میں اندر آ سکتی ہوں سر ۔ آنسہ کی آواز آئی ——— وہ کمرے میں داخل ہوئی ——— آپ جا رہے ہیں ڈاکٹر وہ بولی ۔

ہاں میں جا رہا ہوں ڈاکٹر نے کہا ۔

آپ ان کو بھی ساتھ لے جایئے ڈاکٹر ۔ آنسہ نے عاصم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ۔

نہیں میں نہیں جاؤں گا عاصم چلایا میں نہیں جاؤں گا ۔

پلیز وہ بولی ۔ ان کا روئے سخن ڈاکٹر کی طرف تھا ۔

اونہوں عاصم بولا ۔ ابھی نہیں ابھی نہیں ـــ ابھی تو

میری خاطر اس نے منت بھرے انداز میں عاصم کی طرف دیکھے بغیر کہا ۔

لیکن کیوں عاصم چلایا ۔ کیوں

جواب دو آنسہ کیا پوچھ رہا ہے یہ ڈاکٹر نے کہا ۔

کچھ دیر وہ چپ چاپ کھڑی رہی پھر اس نے آنکھیں جھکائیں ۔ اور مدھم آواز میں بولی ۔ اس لیے کہ ان کے سامنے میں اپنی تذلیل برداشت نہیں کر سکتی ۔ نہیں کر سکتی ۔ اس کے منہ سے ہچکی سی نکلی اور وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بھاگ گئی ۔

دیر تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی ۔ ڈاکٹر چھت کو گھور رہا تھا عاصم اضطراب میں ٹہل رہا تھا ۔ میں اپنی چیزیں سوٹ کیس میں بند کر رہا تھا ۔

چلو ڈاکٹر میں نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا ۔ چلو دیر ہو جائے گی ۔

ڈاکٹر چونکا ۔ ہاں ہاں وہ بولا ۔ چلو

ٹھہرو ڈاکٹر عاصم چلایا ۔ میں تمہارے ساتھ جاؤں گا ۔

جیپ میں ہم سب چپ چاپ بیٹھے تھے ڈاکٹر سڑک کو گھور رہا تھا ۔ عاصم دونوں ہاتھوں سے سر تھامے ہوئے بیٹھا تھا ۔ اور میرے

کانوں میں مرجینا کی آخری چیخ گونج رہی تھی ۔

نہ جانے ہم سب کتنی دیر خاموش رہے ۔

اکبر ڈاکٹر نے ڈرائیور کے شانے پر ہاتھ رکھا ۔ اکبر ۔

جی صاحب اکبر بولا ۔

یہاں کنڈ میں مقامی آبادی نہیں کیا ۔

ہے اکبر نے کہا ۔ پر وہ کنڈ میں نہیں رہتے اوپر کنارے میں رہتے ہیں ۔

لیکن کیوں ڈاکٹر نے پوچھا ۔

ہماری پرانی ریت ہے صاحب ۔ عورتوں اور بچوں کو کنڈ میں اترنے کی اجازت نہیں ۔ مرد دن بھر وہاں دوکانداری کرتے ہیں ۔ لیکن سورج چھپنے سے پہلے اپنے گاؤں کنارے میں آجاتے ہیں ۔ کنڈ میں رات گزارنا منع ہے ۔

کس نے منع کیا ہے ڈاکٹر نے پوچھا ۔

پتہ نہیں صاحب بڑے بوڑھے کہتے ہیں ——— کہتے ہیں پہلے کوئی آباد نہ تھا صرف جھیل میں کنڈ کی دیوی رہتی تھی ۔ پھر ایک یوگی آ گیا وہ ایک کھوہ میں دھیان کا آسن مار کر بیٹھ گیا ۔ ایک روز کنڈ کی دیوی کھوہ میں چلی گئی ۔ اس نے یوگی کا دھیان توڑ دیا ۔ یوگی نے سراپ دی ۔ بولا جا جو دیوی یہاں پاؤں دھرے گی اس کا بھرم کھل جائے گا ——— وہ ناری بن جائے گی ۔ اور اپنی ہی آگ میں جلے گی ۔ یوں کنڈ کا نشٹ ہو جائے گا ۔

ہوں ڈاکٹر گنگنایا ۔

کنڈ دیوی بھی کرودھ میں آ گئی ۔ بولی تو کنڈ کا نشٹ کرنے والا کون ہے ۔ اک دن ایسا آئے گا جب کنڈ ساری دھرتی پر چھا جائے گا ۔

ساری دھرتی پر ۔ اکبر کھوکھلی ہنسی ہنسنے لگا بڑے بوڑھوں کی باتیں ہیں وہ بولا ۔ کون جانے سچ ہیں یا جھوٹ ۔

کنڈ ساری دھرتی پر چھا جائے گا ؟ ڈاکٹر گنگنانے لگا ۔

ڈاکٹر کے شانے کی اوٹ سے بوڑھے پروفیسر نے سر نکالا ۔ اس کے چہرے کی سلوٹوں میں دکھ رینگ رہا تھا ۔ اس کی مسکراہٹ پراسرار تھی اس میں شیطانیت کی جھلک تھی ۔ اور اس کے ہونٹ یوں بند تھے جیسے سلے ہوئے ہوں وہ میری طرف گھور رہا تھا ۔

جیپ پہلے گیر میں ہونک رہی تھی ۔

عاصم بے حس و حرکت بیٹھا تھا جیسے پتھر کا بن چکا ہو ۔

ڈاکٹر گنگنائے جا رہا تھا ——— ساری دھرتی پر چھا جائے گا ؟

کچھوا

جوگندر پال

آسائش کے سبھی سامان میسر آ جائیں تو ماضی کا افلاس کسی خوبصورت تصویر کے پس منظر میں گندے جوہڑ کے دھندلے سے نقوش کے مانند بڑا پیارا لگتا ہے۔ دور دور سے ہی ایک جانی پہچانی غلاظت کے ماحول کا قرب محسوس کر کرکے، اس غلیظ ماحول کی خوشبو سونگھ سونگھ کر ذہن بڑے مزے سے آنکھیں موند لیتا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ حال مر جائے اور ماضی جی اٹھے۔

یہی وجہ ہے کہ چالیس سال کی عمر میں بھی بچوں کے مانند غوں غاں کرنے کے خیال سے مجھے بڑی راحت محسوس ہوتی۔

" ان دنوں کی بات نہ کرو میرے بھائی۔ کھوئے ہوئے بچے اپنے گھر سے دور دور بھٹک رہے ہوں تو جی ہی جی میں گھر کے اندر ہی اندر گھستے چلے جاتے ہیں۔ " اپنا دیش تھا، اپنے لوگ تھے، اپنی بولی بولتے تھے۔ "

میرا دوست اشوک کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ " تم انگریزی میں بھی بہت اچھی باتیں کر لیتے ہو راجن۔ "

" باتیں کہاں کرتا ہوں میرے یار، اپنی باتوں کا ترجمہ کرتا رہتا ہوں۔ لگاتار بول بول کر یہی معلوم ہوتا ہے کہ مجھے کہنا تو کچھ اور ہی تھا۔ "

" یہ تو اپنی بولی میں بھی ہوتا ہے راجن۔ ہر آدمی کو ہمیشہ کچھ اور ہی کہنا ہوتا ہے لیکن جو کچھ بھی وہ کہہ پاتا ہے بعض دفعہ وہی اسے بدھ اور عیسےٰ بنا دیتا ہے۔ ہم ہی نہیں۔ ہمارے پیغمبر بھی اپنی اپنی بولی کا محض ترجمہ ہی پیش کر پائے ہیں۔ "

" نہیں۔ " مجھے اپنے اس دوست سے ہمکلام ہو کر سدا یہی کوفت رہتی کہ چنگے بھلے موضوع کو موڑ توڑ کر مسخ کر دیتا۔ " تمہیں اپنے پڑوس میں بھی جانا ہو تو سپیس راکٹ میں سوار ہو جاتے ہو۔ میں تو صرف پنجابی اور انگریزی کی بات کر رہا تھا۔ "

" میں بھی وہی بات کر رہا ہوں بھئی۔ اگر تم اپنا ترجمہ پنجابی سے انگریزی میں نہیں کرو گے تو پنجابی سے پنجابی میں کرنے پر مجبور ہو گے ترجمہ تو بہر صورت ہو گا ہی —— " اور وہ میری جانب ذرا جھک کر سمجھانے لگا۔ " اور اگر ہمیں ترجمہ ہی کرنا ہے تو کیوں نہ انگریزی میں ہی کرتے رہیں جس سے بہتر اجرت وصول ہوتی ہے۔ "

" نہیں، مجھے اب اپنی من کی باتیں کرنا ہیں —— "

" تو آؤ ذرا شراب پی کے دو گھڑی بہک لیتے ہیں۔ پر میری تو عادت ہو گئی ہے کہ بہکتا بھی ہوں تو سالی انگریزی میں —— لو یہ سگار پیو۔ اپنے بیکر نے پانچ پیکٹ تحفتہً دیئے ہیں۔ "

ہم دونوں نے سگار سلگا لیے۔

" نہیں اشوک، میں اب اپنے گھر لوٹ جانا چاہتا ہوں —— کھ —— کھ —— کھ —— کھاؤں کھ —— بڑا تیز سگار ہے —— میں ہندوستان جانا چاہتا ہوں۔ "

"چھٹی پر جاؤ اور پانچ چھ ماہ گھوم گھام کے لوٹ آؤ۔"

"نہیں، تم نہیں سمجھ رہے۔" میں نے جھلا کر کہا۔" میری خواہش ہے کہ اب میں ہندوستان میں مستقل رہائش اختیار کروں ——"

"مستقل رہائش ؟ ! کل چار دن کی زندگی میں یہ مستقل رہائش کا خیال خوب ہے۔ ہاں بھئی، جاؤ، لیکن تم آدمی بُرے نہیں، اس لیے مرنے کے بعد پھر اسی جنت میں بھیج دیئے جاؤ گے، یہیں کینیا میں۔"

"میں تمہیں کیونکر سمجھاؤں ؟" مجھے اشوک پر غصہ آنے لگا۔" ہندوستان کی بھوک میں بھی ایک مزہ ہے۔"

"کیا بکواس ہے !" وہ مجھے ٹوک کر گویا ہوا۔" بھوک کوئی کھانے کی شئے ہے، جو بامزہ ہو۔ بھوک صرف بھوک ہے اور تم جو اس وقت بھوک کی لذت سے سرشار دکھائی دیتے ہو تو اس لیے کہ سیر ہو کر کھانا کھا چکے ہو۔ بہرحال تمہیں جانا ہے۔ بھوکا تمہیں رہنا ہے، رونا تمہیں ہے۔ میرا کیا ؟ بخوشی جاؤ۔"

"تم بک رہے ہو۔"

"اور تم غوں غاں کر رہے ہو میرے لاڈلے۔"

اور میں سوچنے لگا کہ اشوک ٹھیک کہتا ہے۔ میں واقعی غوں غاں کر رہا ہوں، پر یہ غوں غاں کتنی راحت آگیں ہے۔ عمر اگر بچپن پر سر ٹیکے رکھے تو سدا نو عمر اور پُر بہار رہے۔ کچے کچے ذہن سے ہی اس کے پکنے کی امید بندھتی ہے۔ اور جب یہ پک جائے تو اس کے انحطاط کا کھٹکا ہونے لگتا ہے۔ بس آدمی ساری عمر غوں غاں کرتا رہے، سود و زیاں سے بے خبر رہ کر جیتا رہے۔ جب جینے مرنے کا شعور اور اس شعور کا اظہار محض بھرم ہی ہے تو سمجھداری اسی میں ہے کہ انسان کی تربیّت غوں غاں تک ہی محدود رہے، وہ بچہ سا بنا رہے، ساری عمر اس پر شادماں ناسمجھی کی کیفیّت طاری رہے۔ جمہوریّت کا یہ بھی فیض ہے کہ ہر شخص سے بیربل بننے کی توقع نہیں کی جاتی، کمسنی اور ناسمجھی کی وجہ سے ہمارے سر قلم نہیں کیے جاتے۔ ہمیں اپنی خوشی کی خاطر بیوقوف بننے کا کلّی حق حاصل ہے۔

"بے وقوف نہ بنو بھیّا مورے۔" اشوک مجھ سے کہہ رہا تھا۔" اگر دقوف سے زندہ نہ رہا جائے تو زندگی موت کے گھاٹ اتار دیتی ہے۔"

"زندگی زندگی ہے، کوئی موت تو نہیں۔"

"موت بھی ہے احمق۔ تم سمجھتے کیوں ؟ تمہارے پوپلے منہ پر توتلی باتیں زیب نہیں دیتیں ——" اور پھر اچانک یاد آنے پر وہ پوچھنے لگا۔" لمپ سم کب مل رہا ہے ؟"

کاسٹ آف لونگ بڑھ جانے کے سبب سے گورنمنٹ ہمیں گذشتہ جنوری سے (لمپ سم) دے رہی تھی۔

"بہت اچھے !" وہ بڑا مسرور نظر آنے لگا۔" اب دیکھو، اس دیش میں کیا مزے ہیں ! پچاس شلنگ کاسٹ آف لونگ بڑھتا ہے تو سو شلنگ تنخواہ بڑھ جاتی ہے۔ لیکن مدر لینڈ میں ——"

"اپنے گھر کی آدھی بھی ——"

"شٹ اپ !" اس نے بے صبری سے کہا۔" ہماری نئی زندگی پر تمہارے پرانے محاوروں کا اطلاق نہیں ہوتا۔ تمہیں آدھی

یا پوری روٹی کی ضرورت نہیں راجن۔ ڈِنر جیکٹ کی ضرورت ہے، شراب، موٹر، بنگلے اور بچوں کی فسٹ ریٹ تعلیم کی ضرورت ہے۔ اور ان سب اشیاء کے لیے ڈھیر دولت چاہیئے جو تم ہندوستان میں نہیں کما سکو گے، کیونکہ ہندوستان میں صرف وہی لوگ کھلتے کماتے ہیں۔ جن کے باپ دادا اُن کے لیے دولت کے انبار چھوڑ جائیں، یا وہ جو مر مر کر پہلے کچھ پونجی جمع کریں اور پھر بلیک کر کر کے اپنی میلی کچیلی دھوتیوں میں بے شمار نوٹوں کی گٹھیوں کا بوجھ اٹھاتے پھریں۔ میری مانو اور جہاں پڑے ہو آرام سے پڑے رہو۔ دنیا میں ٹریفک کا اس قدر رش ہو رہا ہے کہ ایک دفعہ اپنی سیٹ چھن جانے پر ساری عمر کھڑے رہنا پڑتا ہے —— آؤ آج شام کو شراب پئیں گے۔ اگر کہو تو ایوننگ سرکل میں سیٹیں بُک کروا لوں۔ باربرا کاٹ۔ وِسٹ ہے —— ارے کچھ سنا؟ کل ہمارے سٹیٹ گورنر نے ہوٹل پارک میں ٹ۔ وِسٹ کیا تھا!" اشوک کی عادت تھی کہ ایک بات میں اچانک کسی اور کو لے اڑتا۔

"ہاں، میں اخبار میں فوٹو دیکھ چکا ہوں۔"

"کیا زندہ قوم ہے!" وہ کہنے لگا۔ "کم از کم پچپن کی عمر ہے اور پچیس کی چھوکری کا بازو تھام کر فلور پر اتر آیا اور پھر یہ ٹوِسٹ —— وہ ٹ۔ وِسٹ —— پورا نصف گھنٹہ اپنی گرل کے ساتھ لگاتار ٹ۔ وِسٹ کرتا رہا اور آخر جب لڑکی بیچاری بے دم ہو گئی تو اسے مسکرا مسکرا کر سہارا دے کر اپنی میز پر لوٹ آیا اور بڑے مزے سے بیئر پینے میں منہمک ہو گیا —— انگریز ہے نا! یہ لوگ غلط راہوں پر بھی کچھ اس اعتماد اور بیباکی سے چلتے ہیں کہ غلط راہیں بھی ٹھیک معلوم ہوتی ہیں مگر ہمارے رہنما بظاہر ایک سیدھی راہ پر چلتے ہوئے بھی یہی امپریشن دیتے ہیں کہ ان کے ڈیزائن آڑے ترچھے ہیں —— "وہ سگار کا کش لینے کے لیے ذرا رک گیا۔" انگریزی سگار ہے، بہت اچھا ہے —— میں کہتا ہوں راجن، انگریزی ہر شئے بہت اچھی ہے اور ہمارا صرف ماضی! کیا لطف کی زندگی گزارتے ہیں یہ لوگ! کیا کھلنڈری قوم ہے! میں کہتا ہوں، اگر غول غاں ہی کرنا ہے تو ان لوگوں کی طرح کرو۔ تمہیں تو غوں غاں کرنا بھی نہیں آتا۔ کہو، ایوننگ سرکل چلو گے؟ ——

"نہیں اشوک، آج شام مجھے ——"

"تو جاؤ ہندوستان"

"نہیں یہ بات نہیں اشوک، آج مجھے واقعی اپنی سی بکنگ کے لیے جانا ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ پورے چھ ماہ تک ہندوستان جانے والے سبھی جہاز فُلی بکڈ ہیں۔"

"تو کیا سچ مچ چھوڑ چھاڑ کر جا رہے ہو؟"

"اور کیا میں ... ..."

"دیکھو دوست، تم تین بچوں کے باپ ہو۔" وہ پھر مجھے نئے سرے سے سمجھانے لگا۔ "بچے بڑے ہوں گے تو ان بیچاروں کو باپ کے سہارے سے محروم کر دو گے۔ ذرا سوچو، ہندوستان میں تمہارے بچوں کے لیے یہ سب سہولتیں کیونکر فراہم ہوں گی؟"

لیکن میرے بچے بڑے خوش تھے۔

"ڈیڈی، دلی میں ہم اپنا نیا گھر بنائیں گے!"

"بنائیں گے۔"

"ہماری کار چار سال پرانی ہو چکی ہے ڈیڈی - وہاں جاتے ہی نئی کار لے لیں گے"

"لے لیں گے"

"ہندوستان میں اپنے نئے گھر کے سامنے میں اپنا نیا باغ لگاؤں گی ڈیڈی" میری بچی کھڑکی سے جھانک کر اپنا باغیچہ دیکھ رہی تھی جو اس نے نہایت محنت اور پیار سے سجا رکھا تھا - "میں اپنی پھولوں کی سب کیاریاں ساتھ لے جاؤں گی" دلّی جانے کی اُسے بھی بڑی خوشی تھی پر گویا اُسے اپنے ننھے سنے جیون میں پھولوں کا ساتھ چھُوٹ جانے کا کھٹکا بھی ہو -

"کیاریاں وہاں بھی ہوں گی بیٹی" میں نے اُسے بتایا - "دلّی کا راشٹرپتی گارڈن ہے نا؟ وہ بہت بڑا باغ ہے، بہت ——" لیکن دوسری بار (بڑا) کہنے سے پیشتر مجھے محسوس ہُوا کہ ہم برِ صغیرِ ہند کے حلق سے اُتر کر اس کے پیٹ میں جا گرے ہیں - یہاں انسانی گوشت کے بتے جُھتے تودوں کے نیچے پیٹ کی تہیں کہیں بھی نظر نہیں آتیں - دھرتی کا کوئی کنارہ کونہ ننگا نہیں جہاں کوئی پھول اُگا ہوا ہو، ہر جانب، اوپر نیچے انسان ہی انسان اُگے ہوئے ہیں ——— میرا سانس رک کر ذرا ٹوٹا اور پھر از خود بند ہو کر تیز تیز چلنے لگا - میرے ذہن میں اشوک کے قہقہے کی آواز گونجی -

"ہندوستان میں صرف انسان پیدا ہوتے ہیں - ہندوستان کی یہی ایک پیداوار ہے، اور یہی وجہ ہے کہ یہاں انسانوں کی خوراک انسان ہے، انسان انسان کو کھاتا ہے، نہ کھائے تو کیا کھائے؟ بھوکوں مرے؟ ———"

میں نے اپنی بیٹی کنول سے کہا - "ہاں بیٹی، اپنے گھر کے سامنے ہم تمہارے لیے بہت بڑا باغ بنوائیں گے"

اور وہ ہنس رہی تھی،

جیسے کنول، جس کی جڑ پانی میں ڈوبی ہوئی ہو -

میں نے بڑی گرمجوش آواز میں باغ کا بڑا خوبصورت نقشہ بیان کرنا چاہا، لیکن میرے مُنہ میں غوطہ بھر آیا ———

"میں بتاؤں تم ہندوستان کیوں جا رہے ہو؟"

اشوک ایک دن میرا ضمیر بن کر میرے سامنے تن کر کھڑا ہو گیا -

"کہانیاں لکھ لکھ کر تم اب چاہنے لگے ہو کہ تمہاری شخصیت ہی کو لوگ تمہاری شاہکار کہانی سمجھ لیں اور اسے پڑھ پڑھ کر سر دھنیں - تمہارے قاری برِ صغیرِ ہند میں ہیں اور تمہاری خواہش ہے کہ وہاں پہنچ کر کسی پوسٹر کے مانند اُن کی آنکھوں کے سامنے کہیں چپک جاؤ، بتاؤ کیا یہ سچ نہیں؟"

"نہیں!" مگر میں نے سوچا کہ شیطان کتنا حق گو ہے - اپنی (غلط سچائی) کے اظہار میں قطعاً جھجک محسوس نہیں کرتا - "تم بک رہے ہو" مجھے لگ رہا تھا کہ اپنے ضمیر سے انجان بن کر میں مضحکہ خیز سی بے شخصیت کے مرض کا شکار ہو رہا ہوں -

"راجن، تم نے اپنے فن پر حقیقت نگاری کی مہر ثبت کر رکھی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ تم نے محض کہانی کو اصل زندگی کا جواز سمجھ رکھا ہے ———"

میں نے اسے ٹوکنا چاہا لیکن اس نے بے چینی سے ہاتھ جھٹک کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا -

" اگر ایسا نہیں تو تم خدا کی اس بنی بنائی کائنات سے کیوں منہ موڑ رہے ہو؟ — اسی لیے تاکہ زندگی کو تصنیف میں منتقل کر دو؟ محض تحریروں کے صفحات سے چپک کر رہ جاؤ؟ — خدا کے بندے، خدا کی دین یعنی اپنی زبان سے بول بول کر زندہ رہو۔ زندگی تصنیف میں نہیں، خود اپنے اندر بولتی ہے، اپنا احاطہ خود آپ ہی کرتی ہے۔ میری مانو اور لکھنے لکھانے کے چکر سے نکل کر صرف زندہ رہنا سیکھو، لکھنے کی بجائے بولنا سیکھو۔"

" لیکن تم مجھے بولنے دو تو بولوں۔"

" نہیں تمہارے پاس بولنے کو کچھ ہے ہی نہیں۔ تمہاری مشکل یہ ہے کہ تم لکھ لکھ کر بولتے ہو، اس لیے لکھتے ہو نہ بولتے ہو، صرف بور کرتے ہو — میرے یار۔ جی بھر کے ہمیں بور کرتے رہو لیکن یہاں سے جاؤ نہیں۔" وہ ہنس کے گویا اپنی نظروں میں پانی کا چھوٹا سا قطرہ چھپانے کی کوشش کرنے لگا۔

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

" نہیں، میں یہاں سے جا کے بھی ہمیشہ تمہارے قریب ہی رہوں گا۔"

" پھر وہی قصہ نویسی۔" اس کی آواز میں خنداں سی جھلاہٹ تھی۔ " تم خدا نہیں جو یہاں بھی رہوگے اور وہاں بھی۔ جو چلا گیا سو چلا گیا۔ میں تو تمہاری روانگی کی شام کو ہی وہسکی کے چند ٹاٹ پی کے تمہیں بھول جاؤں گا، لیکن میں چاہتا ہوں تم نہ جاؤ ، ہم ساتھ ساتھ رہیں۔ کیوں بھلی چنگی، رُکی تھمی زندگی کی پُرامن سطح پر پتھر پھینک رہے ہو؟ انسان اور خیالات دریا ہوتے ہیں، جو ٹھہر جائیں۔ تم بھی اس بھاگا بھاگ کا خیال ترک کر دو اور ٹھہر جاؤ —"

لیکن میں تو اس لیے کینیا سے گھر لوٹ آنا چاہتا تھا کہ زندگی کسی صورت قیام پذیر ہو جائے۔ کینیا میں اتنے سال قیام رہا لیکن دل و دماغ ہمیشہ دوڑ بھاگ کے عالم میں رہے، گویا ہم کسی ایئر پورٹ کے ویٹنگ روم میں پڑے ہوں کہ ابھی ہوائی جہاز آئے گا اور اڑا کر گھر لے جائے گا، ابھی آئے گا، ابھی آئے گا، اور اتنے سال ہوا ہو گئے، اور اب کہیں جا کے ہوائی جہاز کے پہنچنے کا ٹائم آیا ہے۔ کیا میں اب گھر لوٹنے کا خیال ترک کر دوں؟ تاحیات غریب الوطن رہوں؟

" تم خود ہی کہا کرتے تھے اشوک۔" میں نے اس سے کہا۔ " کہ ساری زندگی یہاں رہ کر بھی تمہاری یہی خواہش ہوگی کہ مرو ہندوستان میں ہی۔"

" ہاں بھئی، اب یہی کہتا ہوں نا۔ جب تک زندہ رہو، یہیں رہو اور مرنے کے دن آئیں تو ہندوستان جا پہنچو۔ وہاں پہنچ کر تو بہرحال مرنا ہی ہے۔"

" نہیں، میری بات مذاق میں نہ اڑاؤ۔ مٹی اپنی مٹی سے مل کر ہی دوام پاتی ہے —"

" دوام؟ —" وہ ہنسنے لگا۔ " پھر وہی شاعرانہ خوابناکی! زندگی تم لوگوں کو اتفاق سے کبھی کسی خوب صورت موڑ پر لے آئے تو دو گھڑی اطمینان سے حسین نظاروں سے لطف اندوز ہونے کی بجائے تم آنکھیں میٹ لیتے ہو اور کہیں اپنے خیالی دوام کی ٹوہ میں جا غرق ہوتے ہو۔" حسب عادت اس نے اپنے بیان کو طوالت دینے کا انداز اختیار کر لیا۔ " تمہارے ان ہندوستانی سادھوؤں، رشیوں،

کوتیوں اور سپیروں نے محض اپنے دوام باطل کی خاطر ملک کا ستیاناس کر رکھا ہے۔ آنکھیں کھول کر اپنے آس پاس کا جائزہ نہیں لیتے بلکہ دم کھینچے، دھونی رمائے، آنکھیں میچے اپنی اندھیری دنیا میں پڑے رہتے ہیں۔ حال کی خبر نہیں اور عاقبت سنوارنے کا بھوت سوار ہے۔ سول سروِنٹس کی طرح پچیس کی عمر سے ہی حساب کتاب کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ ساٹھ تک پہنچیں گے تو کیا مزے ہوں گے، پنشن ملے گی، اسے کاش، اس پچیسویں سال کے بعد ہی ہم فوراً ساٹھ سال کے بڈھے ہو جائیں! ہیہہ ہا ہیہہ — ہیہہ —— بھلا سوچو، یہ کیا زندگی ہے۔ روحانیت اور ابدیت کا تصور یہی ہے کیا؟ سارا ملک ایک ٹانگ پر کھڑا کسی بڑے گہرے روحانی مسئلے پر غور و فکر کر رہا ہے اور اس کا جسم سوکھ سوکھ کر تنکا ہو رہا ہے—— ! جاؤ تم بھی وہیں پہنچ جاؤ قبیلے کے بھائیوں میں ایک کا اضافہ ہو جائے گا۔ تم لوگوں کی لغات میں فنا اور دوام میں کوئی تمیز نہیں۔ جاؤ، شوق سے جاؤ۔" وہ مجھے جھڑک جھڑک کر سمجھا رہا تھا۔" ہندوستان کی یہ بدقسمتی ہے کہ تم جیسے خوابناک لوگ ہی وہاں لوٹنے کی سوچتے ہیں۔ کوئی سائنسدان یا صنعت کار اُدھر کا رُخ نہیں کرتا۔ جاؤ بھئی، لے لو سنیاس اور گنگا کے کنارے جا بیٹھو اور جب تم پر کسی تاریک روشنی کا نزول ہو تو اپنا مبہم پیغام اپنی ماں کی سیدھی سادی زبان کے دو چار الفاظ میں مجھے بھی لکھ بھیجنا، شاید میں تمہارا چیلا بن جاؤں —— جاؤ! "

——— (۲) ———

جب کینیا سے میری روانگی میں چند ہی روز رہ گئے تو مجھے یہ کالی دھرتی پیاری لگنے لگی۔ میں ہر روز شام کے وقت فیملی کو ڈرائیو کے لیے باہر لے جانے لگا۔ اپنے گھر سے ہم سیدھے الزبتھ ہائی وے سے ہو کر ایرو ڈروم آجاتے۔

"تھوڑے دنوں میں ہم جہاز میں سوار ہونے کے لیے یہاں آئیں گے۔"

"ہاں۔"

"اور پھر چند ہی گھنٹوں میں ہندوستان پہنچ جائیں گے۔"

"ہاں۔"

(بمبئی میں کرشن چندر رہتا ہے، راجندر سنگھ بیدی، اور قرۃ العین حیدر بھی، اور وہاں کی چوپاٹی کی چاٹ کتنی لذیذ ہوتی ہے! —— اور ——)

اور جب شام ہو جاتی اور میں کار کو ہوائی اڈے سے گھر کی جانب موڑ لیتا تو مجھے خوشی محسوس ہوتی کہ ہم ابھی وہیں نیروبی میں ہیں، میں چاہنے لگتا کہ ہم ابھی وہیں رہیں، روانگی کے دن ابھی نہ آئیں مجھے اس امر کا احساس ہوا کہ فراق کی خلش سے رفاقت کا تصور زندہ ہو اٹھتا ہے ہرانا ہو تو گلے ملنے کی خواہش نہ ہو۔ انسان شاید اس لیے دنیا میں اپنی مدتِ اقامت کو بڑھا لینا چاہتا ہے کہ اس کی روانگی ناگزیر ہے۔ جہاں ہم ہر وقت رہیں، جہاں سے کبھی وداع ہونے کا خیال نہ ہو۔ وہاں ہم ہر جگہ سے، ہر چہرے سے اس قدر مانوس ہو جاتے ہیں کہ وہ جگہ وہ چہرہ ہوتے ہوتے ہماری ہی شکل اختیار کر لیتا ہے، اُس چہرے اور مقام کی اپنی کوئی مخصوص پہچان نہیں رہتی۔ ہر شے میں اکیلے ہم ہی ہم نظر آنے لگتے ہیں، تن تنہا، رفاقت سے محروم، اجنبی! —— اسی لیے جب تک میں وہاں مستقل رہائش کے خیال سے رہا تو اکیلا رہا، لیکن روانگی کے وقت میرے ذہن میں رفقاء کا ہجوم امنڈ آیا۔ مجھے معلوم ہوا کہ یہاں تو میرے کئی پیارے دوست ہیں، ان کی بڑی بھلی صورتیں ہیں، ان کی اپنی صورتیں، من موہنی، اور میں نے کسی دم توڑتے ہوئے شخص کی طرح چاہا کہ میں ابھی زندہ رہوں، میری مدتِ اقامت بڑھ جائے، مجھے اپنے

ان احباب کی رفاقت نصیب رہے۔

لیکن ستاروں کے مانند انسانوں کی گردش کا انحصار بھی اُن کی اپنی اپنی مرضی پر نہیں ہوتا۔ سب کے اپنے اپنے فطری رول ہیں اور ان کے مطابق جسے جسے جہاں جہاں پہنچنا ہوتا ہے وہ عین وقت پر وہاں پہنچ جاتا ہے۔ کہ اسے وہاں بہر صورت پہنچنا ہی ہے۔ ہمارا آنا، جانا، جینا مرنا نظامِ فطرت کا جزو ہے، ہمارا مقدر ہے۔

"آپ یہاں سے کیوں جا رہے ہیں؟" کینیا ٹیلی ویژن کے ایک انگریز پروڈیوسر نے اپنے ٹیلی ویژن انٹرویو کا آغاز کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"میں یہاں سے جا نہیں رہا، بلکہ کینیا اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں"

مگر حقیقت یہ تھی کہ میں جا رہا تھا۔

جب میں نے جانے کی خواہش کی تھی تو میں بخوشی جانا چاہتا تھا۔ لیکن اب مجھے جاتے ہوئے جھجک سی محسوس ہو رہی تھی اور میں سوچنے لگا تھا کہ کسی بہانے وہیں رکا رہوں، پر بہتا ہوا پانی ڈھلوان کے قریب آکر اپنے آپ کو کیا روکے گا؟ بے چارہ اوندھے منہ آ گرے گا اور دور کھڑے تماشائی بے اختیار پکار اٹھیں گے، کیا خوبصورت آبشار ہے!

خوبصورت آبشار! یہ پانی بڑے مزے سے برفانی چوٹیوں پر جم کر بیٹھا تھا، لیکن گھر لوٹنے کی خواہش سے بے تاب ہو ہو کر، پگھل پگھل کر پستیوں کی جانب امنڈ آیا، مزید پستیوں میں لڑھک گیا۔ اب شاید سوچ رہا تھا کہ چنگا بھلا بلندیوں پر جما بیٹھا تھا، وہاں سے کیوں ہلا؟ کن کن مصائب کے بعد وہ مقام نصیب ہوا تھا، اس مقام سے کیوں ہٹا؟ ——لیکن اب یہ بدستور بہتا چلا جائے گا، بے چین ہو ہو کر اپنا سفر طے کرتا رہے گا اور آخر سمندر میں بہہ کر، گھر پہنچ کر اسے چین آ جائے گا۔ اب اسے معلوم ہوگا کہ پہاڑوں کی وہ چوٹیاں بلند تو تھیں۔ پر کتنی تنگ کتنی کم ظرف تھیں۔ جب تک ٹھنڈے ہو کر وہاں جم نہ جائیں ٹک نہیں پاتے لیکن یہ ساگر بے پایاں ہے۔ یہ گہرائیاں کتنی گہری ہیں، گھر میں داخل ہو کر اندر ہی اندر چلتے جاؤ۔ اپنے گھر کی کائنات کتنی وسیع، بے کراں اور گہری ہوتی ہے۔

"تمہارا ہندوستان بہت بڑا ہے۔"

"ہاں، بہت ہی بڑا!"

"تم وہاں جا کے کہاں رہو گے؟"

"کہیں بھی۔ اپنے گھر پہنچ کر آدمی اِس کمرے میں جا بیٹھے یا اُس میں، اپنے گھر میں ہی ہوتا ہے——"

اگرچہ کینیا سے رخصت ہونے کے خیال سے میرے باطن کو اب کچھ خوف، کچھ ملال محسوس ہونے لگا تھا۔ تاہم ہندوستان پہنچنے، وہاں آباد ہونے کے تصور سے بھی میں بہت خوش تھا۔

"آباد تصور میں نہیں ہوتے" میرے دوست میرے خوف کی صدائے بازگشت بن جاتے۔ "زمین پر ہوتے ہیں۔ زمین پر ہی مکان بنتے ہیں، پھول کھلتے ہیں، گیہوں اگتا ہے۔ محض تصور کی دنیا میں تو گھاس پر بھی منہ مارو تو اپنے ہی گوشت کا ذائقہ آتا ہے——"

"نہیں" میں اپنے آپ کو سمجھاتا۔ "محض تصوّر سے ہی انسانی زندگی کی معراج کا تصوّر قائم ہے۔ اگر انسان سے اُس کا تصوّر چھن جائے تو وہ اپنے عمل برتر کی خواہش بھی کھو بیٹھے۔ بڑا کام بذاتِ خود ایک ویژن ہے۔ بڑا کام انجام دیتے ہوئے بڑا آدمی دراصل اپنی خیالی دنیا میں ہی گھوم پھر رہا ہوتا ہے۔ اگر ہم اُسے اپنی اس خیالی دنیا سے باہر کھینچ لائیں تو اس کی قوتِ عمل جواب دے جائے گی۔"

مجھے اپنی منسٹری کی چٹھی موصول ہوئی کہ ہندوستان جانے کے لیے ہمارے ٹکٹ بُک ہو گئے ہیں اور کہ ہمارا ہوائی جہاز پندرہ دن میں امباکاسی ایروڈروم سے پرواز کرے گا۔

یہ پندرہ روز!

گویا جنگل میں کسی جھاڑی تلے فکرمند ہرنوں کا ایک کنبہ بیٹھا ہوا صلاح مشورہ کر رہا ہو کہ اس تالاب میں تو پینے کا پانی خشک ہو رہا ہے، اب ـــــ ؟

"آخر آپ کا آب و دانہ اُٹھ ہی گیا یہاں سے۔"

مجھے معلوم ہوا کہ نیروبی مرگئی ہے، یا میں چل بسا ہوں اور اپنی موت کے بعد نیروبی کی دھڑکن کو محسوس کر رہا ہوں، یا ـــ بہرحال کوئی مراحضر در ہے۔

"جی ہاں، جو مرضی اُس اوپر والے کی۔"

نیروبی فی الحقیقت بدستور زندہ تھی۔ خوشیاں کبھی نہیں مرتیں، خوشیاں منانے والے ہی مرتے ہیں۔ میرا چل چلاؤ تھا۔ ان پندرہ روز میں نیروبی کسی سٹرپ ٹیزر کی طرح ناچ ناچ کر اپنے کئی جاندار پہلوؤں سے کپڑے اتارتی رہی اور میری گرسنہ نظریں اس کی برہنگی سے لطف اندوز ہوتی رہیں۔

انہی دنوں براڈ کاسٹانگ سروس کا ایک برٹش نیوز ریڈر جو، اور وہیں کی ایک افریقی آرٹسٹ وانجیکو مجھے ڈنر کے لیے ایک رسینگ کالج میں ایک یورپی کنٹری اِن "گیم لینڈ" میں لے گئے۔

ہم نے وسکی کی ایک بوتل اور چند سوڈے گاڑی میں اپنے ساتھ رکھ لیے تھے۔ کنٹری اِن نیروبی سے کافی دور تھی، کوئی چالیس پچاس میل دور۔ ہم شراب پی رہے تھے، ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے اور سڑک ہماری گاڑی کے آگے آگے سیدھ میں سرپٹ دوڑ رہی تھی جیسے اُڑ گئی ہو، ہم جو چاہیں کریں وہ ہمارے آگے آگے ہی رہے گی۔

"اور تیز چلو" وانجیکو نے جو سے کہا۔

"ہاں" میں نے وانجیکو کی تائید میں کہا "اپنے آگے بھاگتی ہوئی سڑک سے بھی آگے نکل جاؤ۔"

"نہیں۔" جو نے جواب دیا۔ "جو اپنی راہ سے آگے نکل جائے وہ کھو جاتا ہے۔"

"جیسے میں" مجھے واقعی یہی لگا کہ میرا راستہ مجھ سے پیچھے رہ گیا ہے، اور میری کوئی راہ نہیں، اور میں جہاں ہوں وہاں نہیں، کھو گیا ہوں۔

سڑک کا پکّا راستہ چند میل پر اچانک ختم ہو گیا، اور جو نے گاڑی کو کچے راستے پر اتار لیا۔

"راجن" وہ مجھ سے گویا ہوا۔ "تم بڑے خوش قسمت ہو جو ہوم لینڈ جا رہے ہو۔"

"ہوم لینڈ نہیں۔" رنجیکو نے مداخلت کی۔ "گیم لینڈ۔ اس وقت ہم گیم لینڈ جا رہے ہیں۔ اس لیے گیم لینڈ کی بات کرو۔ میرا کینیا دنیا کا بہترین گیم لینڈ ہے۔"

"ہاں۔" جو نے کہا۔ "اسی لیے میں یہاں شیرنیوں کی دھاڑ سننے چلا آیا۔ لیکن میرا انگلینڈ دنیا کی بہترین مین میڈ پلے گراؤنڈ ہے۔" راستہ کچا ہونے کے باوجود اس نے ریسنگ کار کے تھراٹل کو اور دبا دیا۔ "آج چرچل کا برتھ ڈے ہے اور میرا بھی۔ ریڈیو نیوز میں آج چرچل کی برتھ ڈے آئٹم پڑھی تو میں اپنی ماں کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ ہم سب بھائیوں بہنوں کو ہر سال ہر ایک کے برتھ ڈے پر اپنے بوسوں کی تعداد میں ایک کا اضافہ کرکے سینے سے لگا لیتی اور اس کے سینے سے لگے ہمیں معلوم ہوتا کہ ہم پورے سال میں آہستہ آہستہ بڑے نہیں ہوئے بلکہ ان دو چار لمحوں میں ہی ہمارا قد اونچا نکل آیا ہے ــــــــ گڈ می، اپن اور ناٹ، ڈیئر۔"

"نو! اپنی ممی کی گود سے باہر نکلو تو وہسکی ملے گی۔" وہ اُس سے خالی گلاس لے کر وہسکی کی بوتل کھولنے لگی۔ "بچہ لوگوں کو صرف آئس کریم ملتی ہے۔"

"آج دنیا کا ہر انسان اپنے اپنے گھر لوٹ رہا ہے۔" کچے راستے پر گاڑی کے جھٹکے تیز تیز محسوس ہونے لگے۔ "یہی درس تاریخ ہے، یہی قانون فطرت ہے، یہی۔"

"دھیان سے گاڑی چلاؤ۔" رنجیکو نے اسے ٹوک کر متنبہ کیا۔ "ورنہ سیدھے خدا کے گھر جا پہنچو گے۔" پھر وہ کچھ سوچ کر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ "کل میں سنڈے سروس پر چرچ جا نکلی۔ وکی ہمارا جو میرے عشق میں مایوس ہو کر اب فادر وکٹر موانگی بن بیٹھا ہے۔ اپنے وعظ میں نہایت متین لہجے میں ہم سب کو سمجھانے لگا کہ انسان کا اصل گھر خدا کا گھر ہے، وہاں آسمان میں، وہیں سے انسان آتا ہے اور آخر ش لسے وہیں جانا ہے۔" وہ اپنی شراب کا گھونٹ بھرنے کے لیے ذرا رک گئی۔ مجھے اپنا راجن یاد آنے لگا جو شاید اس لیے ہندوستان لوٹ جانا چاہتا ہے کہ وہیں سے آیا ہے۔ "میں فادر موانگی اور راجن کو یہ سمجھانا چاہتی ہوں کہ ہم خدا کے گھر سے آتے ضرور ہیں۔ لیکن زندگی بھر ہمارا وہاں لوٹنا نہیں ہوتا۔ یہی قانون فطرت ہے، یہی زندگی کا تقاضا ہے۔ جہاں آؤ آخری دم تک وہیں رہ جاؤ۔ پہلے لوٹ جانا چاہو گے تو خودکشی کے مرتکب ہو گے راجن، اپنا گلاس جلدی جلدی خالی کرو۔ میں تمہیں اور وہسکی دینا چاہتی ہوں۔"

جب ہم گیم لینڈ پہنچے تو شام کا اندھیرا کافی گہرا ہو چکا تھا۔ سٹیوارڈ نے ہمیں بالائی منزل پر لاکر باہر بالکونی میں لا بٹھایا۔ گیم لینڈ کی عمارت ایک وسیع وادی کے عین وسط میں خاموش کھڑی تھی۔ بالکونی کے سامنے کھلی زمین پر سے ایک گھنے جنگل کی لکیر کھنچی ہوئی تھی اور گیم لینڈ کے مالکان نے کھلی زمین پر کچھ اس طرح برقی روشنی کا انتظام کر رکھا تھا کہ چاندنی کا سماں معلوم ہوتا تھا۔

"بیوٹی فل!" رنجیکو نے کہا۔ "ہمارے کینیا کے سوا ایسے مناظر اور کہاں ہیں؟"

"میرے ذہن میں!" جو نے کہا میرے ذہن میں ایسے ایسے مناظر آباد ہیں جو میں نے ابھی تک کہیں نہیں دیکھے، مگر مجھے لگتا ہے کہ اُن مناظر سے میری کئی زندگیاں وابستہ ہیں، کئی بھولی ہوئی کہانیاں، ماضی بعید کی خبریں جو شاید میری موجودہ زندگی سے غیر متعلق ہیں، لیکن میں انہیں اپنے ذہن میں اٹھا کر جگہ جگہ لیے پھرتا ہوں۔"

"پُوئر ڈیئر ہو!" دنجیکو نے کہا۔ "میری مانو اور اپنے دماغ کا چیر پھاڑ کروا کے ماضی کی ان سب تصویروں کو باہر نکلوا دو اور قطعاً خالی الذہن ہو جاؤ۔"

مجھے معلوم ہوا کہ دنجیکو کا مشورہ میرے لیے بہت اہم ہے۔ ہر متمدن انسان کے لیے اہم ہے۔ ہم اپنی پیدائش پر بھی خالی الذہن نہیں ہوتے، کچھ اس طرح نئی زندگی میں وارد ہوتے ہیں۔ گویا ابھی ابھی گزشتہ زندگی کے مسائل سے تنگ آ کر خودکشی کر کے آئے ہیں اور اب بھی انہی مسائل پر غور و فکر کر رہے ہیں۔

"ہمارے بچے جب پیدا ہوتے ہیں" دنجیکو ہمیں بتا رہی تھی تو شیروں، چیتوں کی اولاد کے مانند خالی الذہن ہوتے ہیں، اور آتے ہی اپنے نئے جیون میں رچ بس جاتے ہیں، اسی لیے وہ خون سے لبالب بھرے ہوتے ہیں، ان کی ہڈیاں چوڑی چوڑی ہوتی ہیں، اور حواس تند، اور زندگی بھرپور، وہ پورے انسان ہوتے ———"

تم کہنا کیا چاہتی ہو؟"

"یہی کہ تم بھی ہماری دھرتی کے بچوں کی طرح خالی الذہن ہو جاؤ۔ اپنے آپ کو بلاوجہ مت تھکاؤ ——"

دنجیکو ٹھیک کہہ رہی تھی۔

ہمارے تمدن کا نیا بیٹا اصل میں نیا نہیں، اپنی پیدائش سے ہی پرانا اور بوڑھا ہے، جنم جنم کا ماضی اس کا آبسیشن بن چکا ہے۔ نتیجہ کہ ہم سو سنگھار کریں اسے ایک جوان سال شگفتگی نہیں دے سکتے۔ اس لیے جینا ہے تو مزے سے خالی الذہن ہو کر حیاتِ نو کی آغوش میں جیو، ہر لمحہ نئی زندگی، زندگی کا شگفتہ چہرہ، نت نیا تقاضہ، یہی جینا ہے، اسی سے بڑھاپے میں بھی زندگی کی ہنسی اپنی جگہ پر مین سیٹ رہتی ہے۔ جینے کا ذائقہ بنا رہتا ہے۔ مگر میں تو —— میں تو چند روز میں ہندوستان میں اپنی پرانی زندگی کے مقبروں کے کتبے پڑھ رہا ہوں گا۔ حال سے بھٹک کر از سرِ نو اپنے ماضی میں گھوم پھر رہا ہوں گا۔ کیا بر استہ ماضی بھی مستقبل کی راہیں نکل آتی ہیں یا ماضی میں داخل ہو کر آدمی ماضی کے اور اندر جا نکلتا ہے؟ وہیں مقید ہو کر رہ جاتا ہے؟

کیا ماضی کا آدمی اپنے مستقبل سے ہمیشہ بچھڑا رہتا ہے؟

"ویٹر کھانے کا آرڈر لینے کے لیے کھڑا ہے راجن۔ بتاؤ کیا کھاؤ گے؟"

"بکرے کی زبان!" میں نے خالی الذہن ہو کر، میاں کر گویا باتیں کرنے کی خواہش کا اظہار کیا۔

——— (۲) ———

آج مجھے امباکاسی ایروڈروم سے بمبئی روانہ ہونا تھا۔ لیکن کئی احباب سے ابھی ملنا باقی تھا۔ کئیوں کو تو یہ خبر بھی نہ تھی کہ میں جا رہا ہوں۔

لیکن وداع سے پہلے مِلاپ ضروری ہوتا تو فطرت مرگِ ناگہانی کے اصول کو کیونکر قبول کرتی۔

ایروڈروم پر میرے دوستوں اور رشتہ داروں کا جمگھٹا لگا ہوا تھا۔

"ہیلو!"

"ہیلو!"

اور بس!

"تو آپ نے جانے کا فیصلہ کر ہی لیا؟"

"شیام، آج رات کونسا فلم دیکھ رہے ہو؟"

"راجن صاحب، آپ بہت دانشمندی سے کام لے رہے ہیں۔"

"آپ بہت بے وقوف ہیں۔"

"ہاں، اپنا گھر پھر اپنا ہے۔"

دلی میں سیراکرائے کا فلیٹ جانے کیسا ہوگا۔

"دلی میں بچوں کے اسکول میں داخلے کا بندوبست ہوگیا ہے نا؟ ——— ہاں، یہ میری بیٹی نیٹو ہے، یہاں چرچ سکول میں پڑھتی ہے۔ انکل کو نمستے کہو بیٹی۔"

"دلی پہنچتے ہی پہلا کام یہ کیجئے کہ اپنا مکان بنوا لیجئے۔"

"ہاں، اپنا مکان نہ ہو تو گھر نہیں بنتا۔"

"اور گھر نہ ہو تو —— ؟"

"تو گھر کے لوگوں پر یہی گمان ہوتا ہے کہ باہر کے ہیں۔"

"آپ کا سامان سمندری راستے سے جا رہا ہے؟ —— آج کل سفر کتنا آسان ہوگیا ہے!"

"ابھی کیا آگے آگے دیکھئے! سائنسدان تو یہ کوشش کر رہے ہیں کہ سفر میں آپ کو اپنا وجود اٹھانے کی بھی زحمت نہ ہو یہاں اپنا وجود سونپ دیجئے اور ہزاروں میل کی منزل پر پہنچ جائیے اور اپنے لباس کی طرح وجود کو پہن کر کھڑے ہو جائیے اور بس!"

"واہ! اگر ایسا ہو جائے تو موت کی اہمیت واقعی ایک سفر کی سی ہو کر رہ جائے۔"

"لیکن مر کر آدمی واپس نہیں آسکتا۔"

"تو ہمارا راجن بھی کہاں واپس آرہا ہے —— آئی ایم ساری! میرا مطلب یہ نہیں، میں تو —— میں تو ——"

"آپ کبھی ضرور واپس آئیے مسٹر راجن۔"

"ہمیں بھول تو نہیں جائیں گے مسٹر راجن۔" (جہاز کی روانگی میں ابھی پورا نصف گھنٹہ باقی ہے، اور مجھے پورے پونے سات بجے بشیر احمد ٹھیکیدار سے ملنا ہے۔)

"ہیلو بے بی، وہ دیکھو تمہارا ہوائی جہاز!"

"اچھا مسٹر راجن، گڈ بائی! ڈاکٹر نارمن سے میری اپوائنٹمنٹ ہے۔"

"گڈ بائی!"

"گڈبائی، مسٹر راجن !"

"گڈ بائی !———"

(اس آدمی کا کیا نام ہے ؟——— روانگی سے پیشتر ہی ان نیم جانے پہچانے لوگوں کے نام ذہن سے محو ہو رہے ہیں۔ کیا نام ہے۔ مسٹر ——مسٹر——) "گڈبائی !" میں ان لوگوں سے "گڈبائی" نہیں کہہ رہا تھا، بلکہ میرا باطن افریقہ سے مخاطب تھا۔ تعجب کا مقام تھا کہ اتنے سال افریقہ میں افریقہ سے میری ملاقات نہ ہو پائی اور آج اچانک ——— !

میں نے دیکھا کہ افریقہ کی کالی کومل روح میرے سامنے کھڑی ہے ۔ میں نے اس کے حیات آفرین، ثمر آور وجود پر آنکھیں گاڑ لیں۔

"گڈبائی !"

یہ نام میں کبھی نہ بھولوں گا، اُس وقت بھی، جب میرا نام بھی نہ رہے گا ۔

"گڈبائی، افریکہ !"

موت کے عالم میں اپنی دنیا سے چھٹتے ہوئے رشتے کتنے پیارے معلوم ہوتے ہیں !

——— (۴) ———

ہمارا جہاز آسمان میں بادلوں سے اُوپر پرواز کر رہا تھا، اپنے سامنے ایک سیدھ میں، اور منزل کو پا لینے کا یہی طریقہ ہے کہ بساط بھر بلندی پر پہنچ کر ہم اُس سطح پر کوئی سمت اختیار کر لیں، ورنہ اوپر ہی اوپر اُڑتے چلے جانے سے ہم کہیں نہ پہنچیں گے، خلا میں جا ڈوبیں گے، جہاں کوئی سمت نہیں، کوئی نشان نہیں، کوئی کچھ نہیں، کوئی نام نہیں، نام رکھنے کی کوئی شے ہی نہیں۔ زمین سے اوپر اٹھنا بلندیوں کی طرف جانے کی جہد ہے ۔ لیکن بلندیوں سے بھی اوپر اُٹھنے کی جہد ہمیں مزید بلندیوں میں لے جانے کی بجائے بلندیوں سے باہر لے آتی ہے ۔

ہمارا جہاز اس بلندی پر ایک لمبی سیدھ میں اڑ رہا تھا، ہندوستان کی جانب، اور ہم سب اپنی آرام کرسیوں پر بیٹھے تھے، گویا نیروبی میں اپنے گھر میں ہی ۔ جہاز سفر کر رہا تھا اور ہم قیام پذیر تھے، وہیں، جہاں سے ہم روانہ ہوئے، وہیں، جہاں ہمیں جانا ہے۔ مقام بدل بھی جائیں تو ہمارا مقام وہی رہتا ہے، کیونکہ ہم خود آپ ہمیشہ وہیں ہوتے ہیں، خود اپنے اندر سکونت پذیر۔ بظاہر ہم ہزاروں میل کا سفر کر رہے ہوں، لیکن اپنے گھر سے، اپنے اندر سے باہر قدم نہیں دھرتے ۔

میرے بیوی بچے اور دوسرے سب مسافر آنکھیں موندے سو رہے تھے، گویا اپنے اپنے گھر کے کواڑ بند کئے بڑے مزے سے ۔ نہیں، ان کے باطن چھوٹے چھوٹے گھر نہیں بلکہ دنیا کے ہر ذی روح کے چھوٹے بڑے قالب کے اندر ایک بے کراں جہان آباد ہے، اتنا بڑا جہان، کہ جاندار بھی اس جہان کے ایک ننھے سے رقبے ہی سے آشنا ہوتا ہے، اُسے خود آپ اپنے باطن کے کئی مقامات میں اجنبیت کا احساس ہوتا ہے۔

ہمارے گرد و پیش کی یہ دنیا، اس دنیا کے یہ ان گنت انسان، ان انسانوں میں سے ہر ایک کے اندر ایک اور جہان کی بیکرانی ——— تو پھر اُس کا گاؤں، اس کا وطن کہاں ہے ؟ کوئی اس کے وطن کا حدود اربعہ بیان کرے، اُس ہندوستان، پاکستان یا انگلستان کا

حدودِ اربعہ حواس کے باطن کے کرہ پر آباد ہے۔

ہمارا ہوائی جہاز رات کے اندھیرے میں ایک اندھی اندھی بلندی کی سطح پر ہندوستان کی جانب پرواز کر رہا تھا، میں نے کھڑکی سے باہر جھانکا تو مجھے کچھ بھی نظر نہ آیا۔

اندھیرے میں بھی مناظر کا ہجوم ہوتا ہے، وہ ہجوم ہمیں نظر کیوں نہیں آتا؟ جلوے کا باعث ہماری نظر ہے یا خود نظارہ؟ —— ہندوستان کہاں ہے؟ چند گھنٹوں کی تاریک مسافت کے بعد ہم ہندوستان پہنچ جائیں گے۔ میں چل نہیں رہا، دوڑ نہیں رہا، اڑ نہیں رہا، میں یہاں بیٹھے بیٹھے ہندوستان پہنچ جاؤں گا۔ میں چل نہیں رہا سفر بیٹھے بیٹھے ہی طے ہو جاتا ہے۔

بابا نانک آنکھیں کھولتا ہے تو مردانہ پوچھتا ہے۔ "بابا، کہاں گئے تھے؟"

بابا مسکرا کر جواب دیتا ہے۔ "کروڑوں میل دور، سچ کھنڈ میں"

مردانہ کو تعجب ہونے لگتا ہے کہ عجیب جادو ہے، میرے ساتھ یہاں بیٹھے بیٹھے بابا نے پل بھر میں یہ ساری مسافت طے کر لی لیکن اُسے بابا کے بیان کی صداقت پر قطعاً شک نہیں، بابا کا جادو سچا ہے۔ بابا کے نزدیک جادو اور روزمرہ کی حقیقت میں کوئی تمیز نہیں، یا ہے تو یہ کہ جادو زیادہ سچا ہے، زیادہ عمومی ہے۔ جسے ہم معجزہ کہتے ہیں اُس میں زیادہ عمومیت، زیادہ سچائی ہوتی ہے۔

ہم یہاں اپنی اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہندوستان پہنچ جائیں گے۔ یہ جادو نہیں، عام سی سچائی ہے۔

لیکن مجھے ایک اور سچائی کا بھی احساس ہونے لگا۔ میرا جہاز ہندوستان کی جانب پرواز کر رہا تھا اور میرا من، کینیا کی جانب۔ مجھے ہندوستان اڑائے لیے جا رہا تھا، اور میں واپس افریقہ کی طرف اُڑ رہا تھا اور میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جوانب کس جانب ہیں، کدھر ہے، افریقہ کہاں ہے، میں کدھر جا رہا ہوں، میں کہاں ہوں؟ ——

ہوائی جہاز کی ہوسٹس میرے عقب میں جا رہی تھی کہ مجھے بیدار پا کر یونہی ٹھہر گئی

"آپ کو نیند نہیں آ رہی؟"

"سو جائیے"

وہ میرے قریب ہی ایک خالی نشست پر بیٹھ گئی

"اگر آپ سونا چاہتے ہوں تو میں چلی جاؤں؟"

"نہیں، مجھے نیند نہیں آ رہی"

"جب نیند نہ آئے تو نیند کو یکسر بھول جانا چاہیئے۔" ہوسٹس نے اپنا کوئی رٹا ہوا مقولہ دہرانے کے انداز سے کہا۔ "نیند پھر لپٹ جاتی ہے"

"لیکن جسے دانستہ بھولنے کی کوشش کی جائے اُسے بھولنے کے لیے بار بار یاد کرنا پڑتا ہے"

"آپ بہت دلچسپ ہیں" ہوسٹس نے اپنی مخصوص پیشہ ورانہ خوش اخلاقی سے کہا۔

"گھر جا رہے ہیں؟"

("نہیں، گھر چھوڑ کر آ رہا ہوں") "ہاں۔"

'کہاں ؟'

' دلّی ۔'

' دلّی ؟' میں نے اپنے آپ سے پوچھا۔ 'کہاں ؟ میرا گھر اس اُڑتے ہوئے بوئنگ سیون او سیون میں ہے۔ آج کا انسان اُڑن کھٹولے میں رہ رہا ہے۔ اُس کا گھر ہوا میں ہے۔'

' میں آپ کے لیے تھوڑی برانڈی لاؤں ؟'

میں نے نہ جانے ہوسٹس کو کیا جواب دیا۔

' آج کے انسان کے گھر کی کوئی بنیادیں نہیں۔ پچھلے دور میں آدمی ساری ساری عمر گھر سے باہر نہیں نکلتا تھا، مگر کبھی سفر پر نکلتا تو گھر کی چوکھٹ تک جا کر پلٹ آتا۔

' پلٹ آئے ؟'

' ہاں، اپنا گھر چھوڑ کر اب جنت تک کون سفر کرے ؟ یہیں پڑا رہوں گا۔ میرا باپ، دادا، پردادا سب یہیں پڑے ہوئے ہیں۔ میں بھی انہی روحوں کے ساتھ رہوں گا۔ یہی گھر میری جنت ہے !'

ہاں، اگلے وقتوں میں آدمی کا گھر اس کے آباؤ اجداد کی روحوں کا مسکن بھی تھا، لیکن اب جبکہ زندہ لوگوں کے لیے مکان نہیں تو مُردوں کی رہائش کا انتظام کیونکر ممکن ہے ؟

' میں تمہارے باپ کے باپ کے باپ کا باپ ہوں۔ خدا کے لیے مجھے یہاں سے نہ نکالو۔'

' نہیں بابا، بہت ہو لیا۔ اب اپنے خدا کے پاس ڈیرے جا بساؤ۔'

' میں تمہارا پردادا ہوں۔'

' میں دادا ہوں۔'

' میں تمہارا باپ ہوں، تم مجھے یہاں سے نہیں نکال سکتے۔'

' نکال کیسے نہیں سکتا ؟ سرکاری رجسٹر میں اب یہ گھر میری ملکیت ہے، اور میں اسے ڈھا کر یہاں ہوٹل بنانا چاہتا ہوں۔ ہوٹل ری پبلکن ——— ' چلو نکلو یہاں سے !'

' لیجئے۔ میں آپ کے لیے برانڈی لائی ہوں۔ پی کر سو جائیے۔'

' تمہارا گھر کہاں ہے ؟' میں نے برانڈی لے کر ہوسٹس سے پوچھا۔

' یہ ہوائی جہاز ہی میرا گھر ہے۔' وہ بولی۔ ' اڑا اڑ کر مجھے تو اب یوں محسوس ہونے لگا ہے کہ ابھی میرے پہلوؤں میں پَر نکل آئیں گے ——— گڈ نائٹ !'

وہ چلی گئی اور میں برانڈی پینے لگا اور پیتے پیتے جانے کیوں کر میں اپنے کرہ ذہن پر ہمالیہ کے سلسلہ میں جا پہنچا۔ اگر پینا ہو۔ بہکنا ہو تو یہاں ہمالیہ کی چوٹیوں پر آ کے پینا چاہیے۔ عظمتیں ہمیشہ تنہا چوٹیوں پر پہنچ کر بہکتی ہیں اور بہک بہک کر اپنی اپنی ذات سے نکل نکل کر اپنے

آپ سے بھی برتر، عظیم تر ہو جاتی ہیں، اس قدر عظیم کہ اپنی ذات اور کل جہان ——— سب کچھ انہیں حقیر معلوم ہونے لگتا ہے اور شوجی کے مانند نشے سے لہرا لہرا کر تانڈو نرتیہ کرنے کے لیے اُن کا انگ انگ بے تاب ہو ہو اٹھتا ہے تاکہ ہمہ گیر انہدام وقوع پذیر ہو جائے -

مجھے معلوم ہُوا کہ ہوائی جہاز اپنی سطح پرواز پر سیدھی سمت چھوڑ کر اوپر اڑنے لگا ہے، اوپر ہی اوپر، خدا کی جانب، تاکہ سوائے ذات خدا کے کچھ اور باقی نہ رہے، صرف عظمت عظیم ہے، صرف وہی غیر فانی ہے، باقی سب کچھ زوال پذیر ہے - آخر گل سڑ جاتا ہے -

میں شاید سو رہا تھا -

شوجی تانڈو نرتیہ کر رہا تھا - دھرتی ڈول رہی تھی، پہاڑوں کی جڑیں پاتال تک ہلنے لگی تھیں - سب جامد و متمکن عظمتیں پل بھر کا کھیل نظر آ رہی تھیں -

پاربتی فکرمند ہو کر آگے بڑھی -

"ٹھہریے بھگوان، کیوں اس مہاتما کا ناش کر رہے ہیں؟"

"یہ مہاتما نہیں - ہٹ جاؤ میرے راستے سے -" شوجی نے بدستور ناچ ناچ کر کہا -

"نہیں، میں آپ کو ایسا نہیں کرنے دوں گی"

"یہ مہاتما نہیں پاربتی، مہاتما کا بھرم ہے -" شوجی ذرا ٹھہر گیا - "یہ پربت اتنے پھیلے ہوئے ہیں، اتنے لمبے، اونچے اور چوڑے ہیں لیکن اندر ہی اندر لاوا بن کر پکتے رہتے ہیں - میں چاہتا ہوں یہ پھٹ جائیں، ان کی عظمتیں کوتاہ ہیں، اپنے آپ سے باہر نکلنے سے ڈرتی ہیں، پر ہوتا یہ ہے کہ ان کی بچاؤ کی تدبیر ہی ان کی تباہی کا موجب بن جاتی ہے ———" شوجی کی نگاہ اچانک ایک ننھی منی ٹہنی پر جا کے رک گئی -

"دیکھو پاربتی، وہ پھول - یہ ٹہنی اپنی جڑ سے نکل کر اپنے آپ سے باہر نکل آئی ہے -" شوجی تخریب کو بھول کر اب مسکرا رہا تھا - "پھول بن کر نکل آئی ہے - یہی تخلیق کا راز ہے، اپنی جڑوں سے باہر نکل آؤ، پھول بن کر چاروں طرف خوشبو بکھیر دو، یہی مہاتما ہے -" شوجی بھگوان نے اس (مہاتما) کی طرف احتراماً اپنے ہاتھ باندھ لیے -

پھول مسکرا مسکرا کر بھگوان کو آشیرواد دینے لگا، دھرتی پرسکون ہو گئی، خوشبو پھیلتی رہی - میں سویا رہا -

اور جب صبح دم میری آنکھ کھلی تو مائیک پر اعلان ہو رہا تھا کہ پیٹیاں کس لیجئے، اب ہم نیچے جا رہے ہیں -

ہم بدستور جہاز میں بیٹھے تھے اور بمبئی آ گیا تھا!

——— (۵) ———

سردی سے میری ناک بند تھی مگر جہاز سے اُتر کر زمین پر پیر دھرتے ہی گویا میرے نتھنوں کے پٹ از خود کھُل گئے اور وطن کی مٹی کی خوشبو اندر آتے ہی میرے ذہن سے لپٹ گئی -

"گھر آ گیا!"

میرا سب سے چھوٹا بچہ شوکی اس طرح چھلانگ لگا کر سب سے آگے دوڑا جیسے نیروبی میں کسی سفر کے بعد گھر لوٹنے پر وہ کار سے نکل کر، دوڑ کر سب سے پہلے بند دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوتا تھا -

"گھر!"

میں نے اوپر نظر اٹھائی تو افریقہ کی نسبت آسمان بہت جھکا جھکا، قریب سا لگا، مانو گھر پہنچ کر جنت کا قرب نصیب ہو گیا۔

"آؤ! —— آؤ!" میں نے اپنی بیوی کو آواز دی اور ہم سب کسٹمز آفس کی جانب چل دیے۔

"کچھ بھی کہو رانی" کچھ میں تھا بھی خوش، اور کچھ اپنی خوشی کے بلند بانگ اظہار سے مجھے اور زیادہ خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ "اپنے دیش کی کوئی ریس نہیں۔"

"ہاں، اپنے گھر کی کیا ریس ہے۔"

برسوں کے سپنے دل و دماغ سے نکل کر سچ مچ آنکھوں کے سامنے آجائیں تو حقیقت کی پہلی جھلک خواب ہی معلوم ہوتی ہے۔ ہم ابھی سپنے کی دنیا میں ہی گھوم رہے تھے۔ گویا اڑن کھٹولے سے نکل کر اپنی من کی نگری میں آن پہنچے ہوں اور اس طرف بڑے پیار سے دیکھ دیکھ کر اپنی پلکوں سے اس میں سنہری رنگ بھر رہے ہوں، گہرا سنہری رنگ، اور گہرا —— اور گہرا —— اس قدر گہرا کہ ——

"کہ کوئی سیاہ، بھدا دھبہ نظر نہ آئے۔" میں نے اپنے آپ کو بتایا۔

گویا میں ڈر ڈر کر اپنے شبہوں میں سنہری، چمکیلے رنگ بھر رہا تھا کہ وہ اوجھل ہو جائیں۔ میرے ذہن میں پرائمری اسکول کے بچوں کی ایک قطار کھڑی ہو گئی۔ میں بھی اُن میں ہاتھ باندھے کھڑا تھا، وہ، اُس بائیں کونے میں۔ اور ہم سب زور زور سے گا رہے تھے۔

"سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا"

میں نے نیروبی کے نیشنل پارک میں شیروں کا ایک جھنڈ دیکھ کر فوراً اپنی گاڑی روک لی۔ "وہ دیکھو کنول!

"سارے جہاں سے اچھا ——"

ماؤنٹ کینیا کی چوٹی کی طرف دیکھتے ہوئے مجھے یوں لگتا ہے راجن —— یوں لگتا ہے کہ میں دنیا کی چوٹی پر آکھڑی ہوئی ہوں اور ——

"سارے جہاں سے ——"

"پاسپورٹ پلیز؟" امی گریشن آفیسر مجھ سے مخاطب تھا۔

"سارے ج ——"

"آپ غیر ملکی ہیں۔" امی گریشن آفیسر نے میرا برٹش پاسپورٹ دیکھ کر کہا۔ "اُس ٹیبل پر جلیے۔"

"غیر ملکی!"

افریقہ میں مَیں اس لیے غیر ملکی تھا کہ میں ہندوستانی تھا اور ہندوستان میں اس لیے، کہ میرا پاسپورٹ ہندوستانی نہیں۔

"تو آخر تم نے گھر جانے کا فیصلہ کر ہی لیا۔"

"ہاں، میں گھر جا رہا ہوں، گھر لوٹ رہا ہوں۔"

میں اپنے گھر لوٹ آیا تھا اور غیر ملکیوں کی قطار میں کھڑا تھا!

امی گریشن اور کسٹم سے فارغ ہو کر جب ہم ایئر پورٹ کی بلڈنگ سے نکلے تو باہر گویا بمبئے تیز تیز چلتے ہوئے ذرا سا رکا۔" آگئے ؟۔
آؤ !" اور ہمیں کوئی خاص توجہ دیئے بغیر ہمارے آگے آگے ہولیا۔
'کہاں ٹھہرو گے ؟ ہوٹل میں ؟ —— ہاں، ہوٹل ٹھیک رہے گا۔' بمبئے نے ایک بار بھی منہ گھما کر ہماری طرف نہ دیکھا۔ 'ہاں' یہی راستہ ہے ——"
بمبئے ہمارے آگے آگے چلتا رہا اور اُس کے پیچھے پیچھے ہماری ٹیکسی، کبھی تیز، کبھی آہستہ۔
" ابھی آپ نے دیکھا ہی کیا ہے۔" ٹیکسی ڈرائیور ہمیں بتا رہا تھا۔" میں دس سال سے یہاں ٹیکسی چلا رہا ہوں، لیکن ابھی تک پورے بمبئے کا خیال دماغ میں نہیں بند ھتا۔"
' بمبئے کتنا بڑا ہے پپا !' کنول نے کہا۔
' ہاں، بہت بڑا، بیٹی۔"
' بڑا تو بہت ہے صاحب۔" ٹیکسی ڈرائیور سڑک کی پٹڑی پر بسے ہوئے غریب کنبوں کی طرف دیکھ کر کہنے لگا۔" پر دل کا بہت چھوٹا ہے۔ لوگ اپنے گھر بار چھوڑ چھوڑ کر اس کے پاس آتے ہیں، پر یہاں انہیں گھر نہیں ملتا۔"
' یہ لوگ کیا سڑکوں پر ہی رہتے ہیں ؟ " کنول نے حیران ہو کر پوچھا۔ " کیا ہم بھی ——— ؟"
' ہاں، بیٹی۔' ٹیکسی ڈرائیور اُسے سمجھانے لگا۔" بمبئی بمبئی کا نام نہیں، بمبئی نام ہے بمبئی کی سڑکوں کا۔ یہاں کوئی گلی کوچے نہیں' جہاں غریب لوگوں کے اپنے کچے پکے گھر ہوں۔ یہاں صرف سڑکیں ہی سڑکیں ہیں' اور سب لوگ باگ یہیں کہیں پڑے رہتے ہیں ——'

میں سوچنے لگا کہ ہندوستان کی وہ پرانی بستیاں کیا ہوئیں جن میں بے شمار گھر آباد تھے، انسانوں کے گھر، اور اُن گھروں کے اندر ہی انسانوں کے پالتو جانوروں کے گھر۔ اس دھرتی کے نیچے کئی قدیم موہنجو دارو دفن ہیں، اُن بستیوں میں گھر ہی گھر ہیں۔ انسان اور حیوان کی مُشترکہ رہائش گاہیں۔ دور دور تک کوئی سڑک نہیں ملتی۔ اگلے وقتوں میں غالباً لوگوں کی تہذیب میں سڑک کا قطعاً کوئی دخل نہ تھا۔ مگر ہماری نئی تہذیب ہے ہی سڑک کی تہذیب، ہم گویا سڑکوں پر چلتے چلتے گھر کا راستہ بھول گئے، ایک عرصہ تو گھر کا راستہ کھوجنے کے لیے چلتے رہے، پھر راستہ کھوجنا بھی بھول گئے، اور ہمیں معلوم ہونے لگا کہ ہم ہمیشہ یہیں تھے، باہر سڑکوں پر۔ یہیں ہم عشق کرتے ہیں، یہیں ہماری شادی ہوتی ہے' یہیں بچے جنتے ہیں۔ یہیں ہم بوڑھے ہوتے ہیں اور یہیں مرتے ہیں، باہر سڑکوں پر۔ ہم نئے لوگ سڑک کی تہذیب کے نمائندے ہیں، باہر کے لوگ ہیں، بازار کے لوگ، جو گھونگٹ نہیں اوڑھتے، شرمانا بھول گئے ہیں لیکن کبھی غیر شعوری طور پر شرما جائیں تو ہمیں بڑا مزہ آتا ہے۔ اور ہم دوڑ کے اپنے دل کے مقفل دروازے پر چلے آتے ہیں اور قفل توڑ کر اندر آجاتے ہیں، اس گھپ اندھیرے میں، گویا اسے برسوں سے استعمال نہ کیا گیا ہو، ہم دیا جلا کے، خوب جھاڑ پھونک کرکے وہاں اطمینان سے بیٹھنا چاہتے ہیں۔ لیکن دفعتہً وہاں کسی کونے میں سانپ کی پھنکار سُن کر بدحواسی میں باہر دوڑ جاتے ہیں۔ ہم باہر کے لوگ ہیں، اس لیے ہمارے دل و دماغ خالی خالی اور غیر آباد ہیں اور موہنجو دارو کی عمارات کی طرح کھنڈر ہو ہو کر زمین کی تہہ میں دھنسے جا رہے ہیں۔
' یہیئے صاحب، آپ کا ہوٹل آگیا۔"

مین روڈ کے پہلو میں ہوٹل کے گیٹ کے اندر ایک اور سڑک تھی جو ہمیں پورچ تک لے آئی۔

"چالیس روپے یومیہ" میرے پوچھنے پر ہوٹل کے ریسپشنسٹ نے مجھے بتایا۔" ڈبل روم، پانچ بیڈ، نوڈ علیحدہ آرڈر پر"

میں ہوٹل کے رجسٹر میں اپنی شخصی تفصیلات کا اندراج کرنے لگا اور مستقل پتے کے خانے پر پہنچ کر رک گیا کہ کیا لکھوں، فی الوقت اس ہوٹل کے پتے کے سوا میرا کوئی اور پتہ — مستقل یا عارضی — تھا ہی نہیں، ہندوستان بھر میں، دنیا بھر میں۔ اس سے پیشتر اپنا جو افریقہ کا پتہ تھا، وہ اب چھوٹ چکا تھا، اور اسے چھوڑ کر اپنے وطن اپنے گھر پہنچ کر میں لاپتہ ہو چکا تھا۔ ہمیں اس ہوٹل میں کوئی حادثہ پیش آجاتا اور ہم سب مر جاتے تو ہمارے کنبے کو لاوارث قرار دے کر جلا پھونک دیا جاتا اور ہماری موت پر ہماری اپنی ہی بے گھر روحوں کے سوا اور کوئی نہ روتا۔

اپنی بے بسی پر میرا جی بھر آیا۔

———(۶)———

جب ہم بمبئی سے دلی آنے کے لیے ٹرین میں بیٹھ گئے تو ننھا راجو اپنی سیٹ پر چپ چاپ بیٹھا۔ پہلے تو نہ جانے کیا سوچتا رہا، اور پھر اپنے ننھے منھے پیروں سے چل کر میرے پاس آگیا۔

"ہم گھل کب جائیں گے پپا؟"

"گھل؟ کونسے گھل بیٹا؟"

"اپنے گھل، مٹیلے کے گھل!"

مٹیلے نیروبی میں ہمارا نوکر تھا اور راجو سے اس کا بڑا پیار تھا۔

میری بیٹی کنول نے راجو کو گود میں لے لیا۔" وہ دیکھو راجو۔"

راجو کھڑکی سے باہر آسمان کی جانب دیکھنے لگا۔

"وہ!" جیسے خود کنول کی سمجھ میں بھی نہ آرہا ہو کہ وہ راجو کو کیا دکھانا چاہتی ہے۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا اور مجھے لگا کہ اس کی آنکھوں کے سامنے آکاش کے اس کونے میں نیروبی بسا ہوا ہے —— وہ ہمارا گھر ہے، وہ —— اس درخت کی پشت پر وہ دروازہ نظر آرہا ہے جہاں سے بائیں طرف مڑ کر میں اپنی اسٹڈی میں جا نکلتا تھا اور وہاں بڑے مزے سے صوفے میں دھنس کر آنکھوں کو نیم وا کیے ہندوستان کے سپنے دیکھا کرتا تھا، اور اب اپنے سپنوں کی نگری میں آن پہنچا ہوں تو خواب حقیقت میں سمٹ سکڑ گئے ہیں اور حقیقت خوابوں کی وسعت میں کھو گئی ہے، نیروبی کے آگے آسمانی دھندیں پھیل گئی ہیں۔

"گھل چلونا پپا!"

"ہم اپنے نئے گھل جا رہے ہیں بیٹا، دلی کے گھل۔"

گاڑی جھٹکا کھا کر چلنے لگی تو مجھے معلوم ہوا کہ میں سر جھٹک کر چل پڑا ہوں۔ ہرچہ بادا باد ——!

میں نے اپنے آس پاس دوسرے مسافروں کا جائزہ لیا۔

"یہ لوگ ہنستے ہوئے کیوں نہیں نظر آتے ؟" میں نے افریقی زبان میں اپنی بیوی سے پوچھا۔ "مجھے لگتا ہے کہ ان میں ہر ایک اپنی آمدنی اور خرچ کا حساب لگا رہا ہے" در اصل میں بھی جی بی جی میں بمبئی میں اپنے چار روز کے اخراجات کی میزان کر رہا تھا۔ "باپ رے ساڑھے پانچ سو روپے !"

"تو اور کیا کریں بیچارے ؟" میری بیوی کہنے لگی۔ "کل مہینے کی آمدنی صرف سو دو سو ہو تو چلتے پھرتے بھی آدمی کسی گہرے کنوئیں میں بیٹھ کر اپنے اخراجات کا حساب ہی جوڑتا ہے۔ آپ کو اب چند روز میں پتہ چل جائے گا"

"نہیں، یہ بات نہیں شوبھا" میں اپنی بیوی کو سمجھانے لگا "اب ہمارے افریقی بھی عزیب لوگ تھے" ہمارے! "مگر اب کالمہ ان کا اپنا تھا اور سالگلا، اس کا، جسے وہ اپنا بھگوان مانتے تھے"

"یہ باتیں آپ کی کہانیوں میں ہی بھلی معلوم ہوتی ہیں، میں تو یہ جانتی ہوں کہ اگلے لمحے کی روٹیوں کے دام جیب میں نہ ہوں تو آدمی بھگوان کی ضمانت کو بھی شک کی نظروں سے دیکھتا ہے"

"پر میں تو افریقی لوگوں کی بات کر رہا ہوں" "کل شام کے وہ پیسے تو گنے ہی نہیں جب بچوں کو چوپاٹی لے گیا تھا۔ پانچ سو اسی !ـــــ"

"تو افریقی کیا آدمی نہیں ہوتے ؟"

"ان دو چار دن میں ہمارا بہت خرچ ہو گیا ہے شوبھا"

"وہ تو ہونا ہی تھا"

"ہونا ہی تھا نہیں، ہو گیا ہے بھئی۔ پانچ سو اسی روپے !"

میری بیوی حیرت سے میرا چہرہ دیکھنے لگی اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

"نیروبی میں مجھے اکثر شک ہوتا تھا کہ آپ سو تک گنتی نہیں کر سکتے۔ مگر اب تو آپ نے کاغذ قلم کے بغیر ہی جھٹ سارا حساب جوڑ لیا ہے" اس کا منہ ذرا ڈھیلا پڑ گیا "مگر اب کیا فائدہ ؟ جب پیسے ہی نہ رہیں تو حساب آنے سے کیا ہوتا ہے ؟"

"حساب آتا ہی اس وقت ہے ڈارلنگ" میں نے ہنس کر اسے بتایا "جب پیسے نہ رہیں۔ شائد یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی طلبا کا صرف حساب کا معیار ہی قابل ذکر ہے"

میں جی بی جی میں ہندوستانی نصاب کے حساب کے سوال کی یہ عبارت مرتب کرنے لگا "اگر راجن کے پاس پچاس ہزار روپے ہوتے ـــــ" میں نے پہلی بار افریقہ پہنچ کر اپنی بیوی سے کہا تھا کہ جب ہمارے پاس پچاس ہزار ـــــ نہیں، تیس ہی کافی ہیں ـــ تیس ہزار جمع ہو جائیں گے تو ہم ہندوستان لوٹ جائیں گے۔ ـــــ اگر راجن کے پاس تیس ہزار روپے ہوتے اور وہ اس رقم سے صرف اکیس سو روپے ہمیں دے دیتا ـــــ

"صرف اکیس سو روپے" میرے ذہن میں اپنے چچیرے بھائی پریم کی چٹھی کی عبارت اپنے آپ کو پڑھنے لگی۔ "بھیا، اگر تم صرف اکیس سو روپے کی مدد کر دو تو میں زندگی میں ایک بار پھر اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاؤں۔ مجھے صرف اکیس سو روپے چاہئیں" میں نے جواباً

پریم کو صرف یہی لکھا تھا کہ میں ہندوستان آرہا ہوں، تمہیں یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ ———

"تم ——— میں ——— اگر تمہارے پاس اپنے بھائی کی مدد کے لیے پیسے نہ تھے تو تم یہاں کیوں آئے؟ وہیں پڑے رہتے، ہمارا تمہارا واسطہ؟ تم ہمارے کون ہوتے ہو؟ جاؤ جہاں سے آئے ہو وہیں لوٹ جاؤ، اپنے افریقی بھائیوں کے پاس لوٹ جاؤ، وہی تمہارے بھائی ہیں، وہی تمہارا وطن ہے، وہی تمہارا گھر ہے ———"

"پپا، گھل چلو!"

"——— شٹ اپ! شی ——— !"

"ارے جھڑکتے کیوں ہیں بے چارے کو۔"

میں نے شرمندہ ہو کر اپنی بیوی کی طرف سے مُنہ موڑ لیا اور اپنے سامنے ایک اجنبی کی جانب دیکھتے ہوئے مسکرانے لگا۔

"آپ بدیش کے لوگ معلوم ہوتے ہیں؟" وہ اجنبی پوچھنے لگا۔

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

"ابھی آپس میں آپ کس زبان میں بات چیت کر رہے تھے؟"

"سہیلی میں۔" میں نے وضاحت کے لیے دہرایا۔" افریقی زبان میں۔"

"یہی آپ کی مادری زبان ہے؟"

"نہیں، مادری زبان پنجابی ہے۔"

"یعنی آپ پنجابی بول سکتے ہیں"

اس کا سوال بڑا معنی خیز تھا، لیکن میری ذہنی کیفیت کا آئینہ دار۔

"ہاں، کیا میں پنجابی بول سکتا ہوں؟ کیا میرے بچے پنجابی بول سکتے ہیں؟ اگر ہم پنجابی ہیں، پنجابی بول سکتے ہیں ———" (پنجابی میں پنجابی کی بجائے کوئی غیر زبان بھی تو بولی جا سکتی ہے۔) "تو اب پنجاب کی طرف جاتے ہوئے مجھے خوف کیوں محسوس ہو رہا ہے؟"

"میں وی پنجابی آں، تسی وی پنجابی وچ گل کرو۔"

کیا یہ شخص میری مادری زبان میں بات کر رہا ہے؟

"ویر پنجاب دی آں ہُن او گلاں نیئں ریاں۔ ایس فصل تو پہلوں سانوں امریکہ دی کنک کھانی پے گئی ——— جان دسے او کس پا؟"

کیا ہم دونوں ہم زبان ہیں؟ میں اناج کا بھاؤ دریافت کرنے افریقہ سے یہاں آیا ہوں؟ میں اس اجنبی سے کہوں کہ میرا پیٹ رجھا ہوا تھا لیکن روح بھوکی تھی تو حیرت سے یہ شخص اپنی آنکھیں گول گول سی کرے گا، جیسے کسی نقلی گھی کے اُس اشتہار میں ایک آدمی کی آنکھیں تھیں۔ روح کی بھوک؟! ——— روح؟ ——— ہاں۔ ٹھیک ہی تو ہے۔ انسان کے جسم میں اس کی روح آخر ہے کہاں! انسانی پنجر ——— یہ مشین ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے تو انسان کی رُوح کہاں ہوتی ہے؟ کیا ہوتی ہے؟ ہم سدا کے لیے اپنی تسلی کیوں نہیں

کر لیتے کہ روح ہے بھی یا نہیں، ہے تو کہاں ؟ یا نہیں ہے تو یہ نقطہ ہمیشہ کے لیے بھول جائیں اور یکسو ہو کر صرف پیٹ کی بھوک کی فکر کریں۔

"رات کو کھانا چاہیئے ساب؟" ریلوے ڈائننگ کار کا بیرا پوچھ رہا تھا۔

"ہاں، پانچ کھانے۔"

"تین ہی منگوا لیں۔" بیوی نے مشورہ دیا۔ "تین ہی ہم پانچوں کے لیے کافی ہوں گے۔"

مجھے وہ کسی ایشیائی وزیرِ خوراک کی طرح کفایت شعار معلوم ہونے لگی جو صرف ایک چوتھائی قومی خوراک سے چار چوتھائی قوم کو بہ آسانی بھگت لیتا ہے۔

میں کھڑکی سے باہر جھانکنے لگا اور چلتی گاڑی میں بیٹھے بیٹھے زمین کو تیز تیز گھومتا پا کر مجھے یونہی خیال آیا کہ ہم ہمیشہ گلوب کے ایک مقام پر بیٹھے ہوتے ہیں اور ہمارا یہ گلوب گھوم گھوم کر ہمیں یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں لے آتا ہے اور یہاں آ کر ہم وہاں سے متعلق سوچتے ہیں اور وہاں جا کر، یہاں سے متعلق۔ یہاں آتے ہیں تو وہاں جا پہنچتے ہیں اور وہاں جا کر دراصل یہاں آ جاتے ہیں۔ تو پھر ہم فی الواقع ہوتے کہاں ہیں؟ یہاں؟ وہاں؟ کہاں؟ ہماری جڑیں کہاں ہیں؟ ہماری جڑیں ہیں بھی؟

باہر سامنے سے ایک بہت بڑا پیپل کا درخت گزر گیا۔ جو ریلوے لائن کے پہلو میں ہی اُگا ہوا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا دوبارہ دیکھا۔ میری عادت سی تھی کہ چلتے چلتے کہیں پیپل کا درخت نظر آ جاتا تو ہمیشہ مڑ کر اسے دوبارہ تکتا۔ اتنا بڑا، ہمیشہ اپنے پیدائشی مقام پر جامد، جیسے اس کے پاؤں دھرتی میں دھنس دھنس کر پاتال تک اتر گئے ہوں۔

میں نے سوچا کہ جب انسان کے اندر پہلے پہل حب الوطنی کے جذبے نے جنم لیا ہوگا تو آس پاس ضرور کوئی پیپل کے درخت کی روح گا رہی ہوگی، اور اس کے گیت پر کان دھر کر انسان نے محسوس کیا ہوگا کہ اس کی جڑیں بھی اپنے وطن کی زمین میں اتر رہی ہیں۔ وہ بھی پیپل کا درخت ہے۔!

"بابا۔" میں نے بچپن میں اپنے گاؤں کے پجاری سے پوچھا تھا۔ "ہم پیپل کی پوجا کیوں کرتے ہیں؟"

"اس لیے بیٹا، کہ پیپل بھگوان ہے۔ پیپل سے ہمیں اپنے گھر کا پتہ چلتا ہے۔ جب ہم اپنی راہ سے بھٹک جائیں تو پیپل دیوتا اپنا سر سب سے اوپر اٹھا کر ہمیں اپنے استھان کی ٹوہ دیتا ہے۔"

"اور یہ اتنا اونچا کیوں ہوتا ہے بابا؟"

"کیونکہ اس کی جڑیں دھرتی کی تہہ تک نیچے اتری ہوتی ہیں۔ ہر جہاتما اپنی جڑ کی گہرائی کے انوسار ہی بڑھتی پھیلتی ہے۔"

ہر مہاتما دھرتی میں دھنس کر وہاں اُگی ہوتی ہے۔ انسان کی عظمت کا مدار بھی اپنی جڑوں سے اُگ کر وہیں کھڑا رہنے پر ہے۔ آج جو اس کے وجود کی سمتیں پھیلنے کی بجائے سوکھ سکڑ رہی ہیں تو اس لیے کہ وہ اپنے مقام پر ایستادہ نہیں۔

"دھک دھک ——— دھک دھک ——— دھ ———"

ریلوے ٹرین کی رفتار، اُس کے شور میں ایک آہنگ تھی، اور اس کی بدولت میرے خیالات میں بھی جو یونہی بکھرنے کی نیت سے اٹھ

ے تھے۔ دم جھم ہونے لگی تھی، میری فکر میں ایک تال سا پیدا ہونے لگا تھا۔

"حرکت سے بھی تو قیام کی صورت ہوجاتی ہے"

اب میں سوچنے لگا تھا کہ ریل کے ڈبے اگر بے حد تیزی سے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگنے لگیں، یوں جیسے سینما کی تصویروں کی بے تحاشا رفتار سے اسکرین پر ایک ہی تصویر کھڑی ہوجاتی ہے ——— ' تو یہ سب ڈبے اپنی رفتار کے باوجود کھڑے کھڑے نظر آنے لگیں۔ ابتدائی حرکت پر انتشار کا گمان ہوتا ہے۔ لیکن حرکت کی معراج سے حرکت پذیر نقوش میں جامعیت آجاتی ہے۔ نئے آدمی کی معراج کا تاثر بھی فطری اصولوں کے عین مطابق ہی ہوگا۔ خواہ وہ ہوا میں اڑ رہا ہے، خواہ پانی یا زمین پر دوڑ رہا ہے۔ جب اس کی تیزی اس قدر تیز ہوجاتی ہے، جیسے اپنا پیچھا خود آپ کررہی ہو تو اس کی حرکت اپنے آپ ایک قیام پذیر، صریح اور جامع تصویر اختیار کرلے گی۔

"دھک دھک ——— دھک دھ ———!"

اور اب جب کہ انسان اپنی رفتار پکڑ رہا ہے، اور تیز ہو رہا ہے، اس حالت میں اس کے یکلخت ٹھہر جانے سے اس کا سب کچھ الٹ پلٹ جائے گا، بہتر یہی ہے کہ وہ اور تیز ہوجائے اور تیز، تیز ترین، اس سے بھی تیز، دنیا بھر کے کروڑوں، اربوں لوگ اپنی چھوٹی چھوٹی وحدت چھوڑ کر ایک عظیم تر وحدت کی تخلیق کریں، ریل کے ڈبوں کے مانند ایک ہی قطار میں ایک دوسرے سے جڑ کر ایک ہی سمت اختیار کرلیں، اور اس طرح اپنی نہایت سرگرم حرکت سے کل متحرک انسانیت کا ایک ہی ایستادہ، غیر واضح عکس پیش کریں۔

"دھک دھک ——— دھک دھک ——— دھ ———!"

یہ ٹرین کھڑی ہے، زمین کھڑی ہے، انسان کھڑا ہے۔ یہ میں کھڑا ہوں، پیپل کا درخت بن کر، خوب پاؤں دبا کر کھڑا ہوں، میری جڑیں پاتال تک نیچے گئی ہوئی ہیں، اور میں اونچا ہو ہو کر آسمان پر آپہنچا ہوں، کئی لوگ مجھے کاٹنے گرانے کا جتن کر رہے ہیں اور میں ہنس ہنس کر آسمان سے کہہ رہا ہوں کہ میں کٹ کر گر بھی گیا تو کوئی بات نہیں۔ میری بیخ کنی نہیں کی جاسکتی، میری کسی نہ کسی جڑ سے میرے وجود کی سالمیت ابھر رہے گی، میں از سرِ نو اسی طرح کھڑا ہوجاؤں گا۔

میں گر رہا ہوں — گر ——— دھڑام — م — م —!!

میں دراصل ذرا سو گیا تھا اور میری بیوی مجھے جھنجوڑ رہی تھی۔

"کیا ہوا؟ کیا ہوا آپ کو؟"

"کچھ بھی تو نہیں"

"نہیں، یوں لگ رہا تھا جیسے آپ سوتے سوتے ڈر گئے ہیں"

میں مسکرانے لگا۔

"دھک دھک ——— دھک دھک! ———!"

گیتی کی دھڑکن بدستور اپنے تال پر چل رہی تھی، مانو ایک مدت کے بعد ایک اور تازہ دم زندگی وجود میں آگئی ہو۔

"لیجئے، کھانا آگیا، اٹھئے!"

میں نے اپنے آپ کو بتایا کہ جب تک دنیا میں کھانے کے وسائل ختم نہ ہوں گے، اُس وقت تک گیتی کی دھڑکن بدستور اپنے تال پر چلتی رہے گی، غمزدہ روحیں از سرِ نو اپنے گمشدہ، شادماں گیتوں کا سراغ پالیں گی، بس کھانا ختم نہ ہو، باقی سب کچھ اپنے آپ ٹھیک ہو جائے گا۔

"دھک دھک ——— ! ———"

"اچھئے ! ———"

میں اٹھ کر واش بیسن کے پاس آگیا اور ہاتھ دھو کر اطمینان سے کھانے کی تھالیوں کی جانب دیکھنے لگا۔

اور پہلا نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے میں نے ریلوے انجن کی چیخ سُنی تو مجھے اس پر قہقہے کا گمان ہوا۔

ننھا راجو خوشی سے تالی بجانے لگا۔

"دھک دھک ———!"

———— (۷) ————

دوسرے دن بھی ہماری گاڑی بدستور دلّی کی طرف مُنہ کیے سرپٹ دوڑ رہی تھی۔ انجن کا گویا سانس پھول چکا تھا، مگر وہ آہنی عزم سے اپنی ساری کائنات کو کھینچتا ہوا آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا۔

مجھے خیال آیا کہ جب انسان کہیں پہنچنے پر تُل جاتا ہے تو اس کا ارادہ آہنی انجن بن کر، ایک لائن پر دوڑ دوڑ کر اپنی منزل پر پہنچ ہی جاتا ہے۔ دلّی ابھی بہت دور تھی، لیکن گاڑی کے آگے آگے صرف ایک ہی راستہ تھا، صرف دلّی کا راستہ، اُسے بہر صورت اِسی راستے پر چلنا ہے، بہر صورت دلّی پہنچنا ہے۔

میں بھی دلّی پہنچنے کے ارادے سے نکلا تھا۔ کیا میں دلّی پہنچ جاؤں گا۔

دلّی چلو!

جب میرے لڑکپن میں پہلے پہل ہندوستانی اکابر نے یہ نعرہ بلند کیا تھا تو ان کی بات میری سمجھ میں نہ آئی تھی۔ آخر ہم دلّی کیوں چلیں؟

اور ہمارے ٹیچر نے ہمیں بتایا تھا، اپنی آزادی کے تقاضے کے لیے!

دلّی چلو!

اور گھٹے گھٹے ماحول سے باہر آکے بھرپور، نڈر آواز میں اپنی آزادی کا مطالبہ کرو، اور اگر آزادی نہ ملے تو ہنستے ہنستے پھانسی چڑھ جاؤ۔

اگر تیز تیز، ہنستے ہنستے اس راستے پر چلنے کی جرأت نہ ہو تو بھی اس راہ پر ہو لو، بے شک جھجک جھجک کر قدم اٹھاؤ، لیکن اپنی اس راہِ شوق پر چلتے رہو۔ ڈرو تو ڈر ڈر کے بھی چلتے رہو۔

دلّی چلو!

یہ نعرہ ایک تحریک بن کر اٹھا اور بلند ہو ہو کر آسمانی ہواؤں میں چھا گیا اور ایک تاریخ ساز، ہمہ گیر سمبل کی صورت اختیار کر گیا۔

دلّی چلو!

ہر شخص کبھی نہ کبھی مجبور ہو جاتا ہے کہ دلّی کا رُخ اختیار کرے، اپنے دل کی آواز کے پیچھے پیچھے ہولے۔ جس طرف دل کی آواز لے چلے۔ یہی دلّی کا راستہ ہے، یہی آزادی کا راستہ ہے۔ اگر آدمی میں ہمت ہو تو وہ مستانہ وار اس آواز پر لبیک کہتا ہے۔ لیکن بزدل ایک عرصہ تک جان بوجھ کر بہرہ بنا رہتا ہے، اس کے دل کی آواز گردوپیش کے سکوت میں گہری ہوتی جاتی ہے لیکن وہ ٹال مٹول کرتا رہتا ہے، مگر تا بہ کے؟ دل کی آواز بڑی ضدی، بڑی ہٹ کھٹ ہے، بالآخر وہ ہر آدمی کو اپنی راہ پر لے آتی ہے، بالآخر وہ لمحہ آجاتا ہے جب آدمی اس راہ پر، اپنے دل کی راہ پر، دلّی کی راہ پر ہو نکلنے کا ارادہ کر لیتا ہے، ڈرتے ڈرتے شہید ہونے کا فیصلہ کر لیتا ہے۔ شہید صرف وہی نہیں ہوتا جو فوراً اپنی شہادت کی سوچ لے، شہید وہ بھی ہوتا ہے جو رک رک کر، خوفزدہ ہو ہو کر سُولی کی سیڑھیوں پر چڑھے۔ کیونکہ موت سے ذرا پہلے دونوں کی آنکھوں میں ڈوبے ڈوبے خوف کی وہی ایک سی لاش اُبھرتی ہے۔ دنیا کا ہر آدمی شہید ہے، ہر آدمی زندگی کے پیالے سے آہستہ آہستہ اپنی شہادت کا جام پی رہا ہے کیونکہ ہر آدمی کو آخر اپنے دل کی آواز کے پیچھے پیچھے چلنا ہے، ہر آدمی کو دلّی جانا ہے۔

میں نے اپنی خواہش سے دلّی جانے کا فیصلہ کیا تھا لیکن جب اس سفر پر نکلا تو خواہش دم توڑ چکی تھی۔ خواہش کا ہونا نہ اس وقت اہم تھا، جب میں نے اس سفر کی ٹھانی اور نہ اس کا نہ ہونا اس وقت، جب میں اس سفر پر نکل پڑا۔ اہم بات صرف سفر ہے۔ مجھے بہر صورت یہ سفر طے کرنا تھا، مجھے بہر صورت دلّی پہنچنا تھا، وہاں، جہاں میرا جانا پہچانا پیپل کا درخت تھا، اس کی چوٹی مجھے نیروبی سے بھی نظر آتی تھی۔ گویا کھوئے کھوئے کو اس کے گھر کا راستہ دکھانے کے لیے، اور کئی سال کی ٹال مٹول کے بعد آخر ایک دن میں اس راستے پر چل ہی نکلا۔

لیکن اب تو نیروبی کے پیپل کے درخت سے بھی میری زندگی کی ایک پہچان وابستہ ہو چکی تھی، یہاں پہنچ کر میں اس پہچان سے منکر ہو جاؤں گا؟

میرے بچوں کی دلّی تو نیروبی ہی ہے، اُسی پیپل کی چھاؤں میں وہ پیدا ہوئے، وہیں پلے بھولے۔ جب یہاں سے انہیں اس پیپل کی چوٹی دکھائی دے گی تو کیا وہ بھی کئی سال کی ٹال مٹول کے بعد آخر ایک دن اپنے سفر پر چڑھ نکلیں گے؟ اور پھر ان بچوں کے بچے — ؟ کیا۔؟

میں نے اپنے سامنے راجو کی طرف دیکھا جو اپنے گلے میں باہیں ڈالے سو رہا تھا۔ شاید اس اجنبی ماحول میں اپنا کوئی ننھا سا دوست نہ پا کر آپ ہی اپنا دوست بن گیا ہو اور اس وقت سپنے میں اپنے آپ سے میٹھی میٹھی باتیں کر رہا ہو، اپنے گلے میں اپنی ہی باہیں ڈال لی ہیں، یا شاید اس وقت اپنی باہوں کو کسی بچھڑے ہوئے یار کی باہیں سمجھے ہوئے ہو جو اس سے چار ہزار میل دور اپنے گھر میں سویا سویا ہڑ بڑا کر جاگ پڑا ہو اور آنکھیں مَل مَل کر رونے لگا ہو۔ "راجو — راجو — را —!"

راجو اچانک سوتے سوتے ہنس پڑا۔ ماؤنینڈ میں اپنے کسی دوست کو چپت مار کے بھاگ کھڑا ہوا ہو اور دور جا کے ہنس پڑا ہو، میرے گلے میں پھانسی کا پھندا کسنے لگا، اور میں نے اپنا منہ دوسری طرف موڑ لیا۔

' باپ کی تدبیر اس کے کم سن بیٹے کا مقدر ہوتی ہے راجو بیٹا۔ اپنا یہ مقدر تمہیں بھگتنا ہی پڑے گا۔ میرے ننھے پودے اس نئی مٹی میں دھنس جاؤ۔ اب تمہیں اس وقت تک اس مٹی میں دفن ہو کر سانس بھرنا ہے جب تک تم از سر نو یہاں سے اُگ نہیں آؤ گے۔

"اور پھر جب تم یہاں سے الگ آؤ گے تو اسی مٹی سے تمہارے وجود کو تقویت پہنچے گی۔ کیونکہ اسی زمین سے تمہاری زندگی اور موت کا رشتہ جڑا ہوا ہوگا، یہ نئی دنیا ہوتے ہوتے تمہاری ہو ہی جائے گی راجو۔"

"لیکن بیٹا، اس سے پہلے تمہیں یہاں اس مٹی سے اُگنا ہوگا، اسی جنم میں ایک اور جنم ہوگا اور پھر — پھر کنہیا کے اس دیش کی نئی خوشیاں خوب صورت گوپیوں کا روپ دھار کر تمہارے ارد گرد گھیرا ڈال لیں گی —"

"دھک دھک —!"

گاڑی دلّی جا رہی تھی۔

اور مجھے بہر حال دلّی پہنچنا تھا،

کیونکہ میرے آگے ایک ہی راستہ تھا، صرف دلّی کا راستہ!

(۸)

گاڑی بدستور چل رہی تھی۔

یہ گاڑی اس وقت ہر لحظہ عین اسی جگہ پر ہوتی ہے، اپنی منزل سے دور یہیں چلتی رہتی ہے، کبھی اپنی منزل پر نہیں پہنچتی اور جو منزل پر جا پہنچتی ہے وہ اصل اُس گاڑی کی دلی کیفیت کا ایک عکس پیش کرتی ہے۔ یعنی جب یہ گاڑی جی بی جی میں وہاں پہنچ رہی ہوتی ہے گاڑی محض اس کے باطن کی عکاسی کے لیے وہاں پہنچتی ہوئی نظر آتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ گاڑی سدا یہیں ہوتی ہے اور وہ گویا اس کی خو پیکر بن کے اس کی منزل پر پہنچ جاتی ہے۔

اور یہ اچھا ہی ہے کیونکہ سفر اپنے اختتام پر چلا آئے تو باقی رہ ہی کیا جاتا ہے؟ سفر بہر کیف جاری ہی رہنا چاہیے، یہی زندگی ہے سفر کی کیفیت نہ رہے تو زندگی کا بھرا پُرا کینوس آناً فاناً خالی ہو جائے۔

لیکن اس کینوس میں گہما گہمی رہے گی، ہم سدا سفر کرتے رہیں گے۔ جسے ہم منزل کہتے ہیں وہ محض ہماری حدِ نظر ہے اور جوں جوں بڑھتے جاتے ہیں، ہماری حدِ نظر بھی آگے بڑھتی جاتی ہے۔ زندگی کا کوئی کنارہ نہیں اس لیے اس کی کوئی منزل نہیں، تو موت؟ — موت زندگی کو توانائی ملتی ہے تاکہ وہ اپنا سفر جاری رکھ سکے۔ یہ سفر ہمیشہ جاری رہتا ہے۔ دلّی کبھی نہیں آئے گی۔ دلّی آ گئی تو زندگی کی گاڑی رک جائے گی۔

سردی محسوس کر کے میں اپنے وجود کو کمبل سے ڈھانپ رہا تھا کہ ہمارے ڈبے میں ایک مُسن آدمی داخل ہُوا۔

"آیئے!" میں نے اپنی جگہ سے ذرا سرک کر اس کے لیے جگہ بنائی۔

"شکریہ!" وہ اطمینان سے بیٹھ گیا۔

"کہاں جا رہے ہیں؟"

"دلّی۔"

رجائیت! یہ بڈھا کبھی دلّی نہ پہنچے گا لیکن اِسے یقین ہے کہ پہنچ جائے گا۔ دلّی پہنچنا اتنا اہم نہیں جتنا دلّی پہنچنے کی خواہش

پہنچنے کا ارادہ۔

"بس چند ہی گھنٹوں کا سفر ہے" گویا بڑھے کی جھریوں کا استحکام گویا ہوا۔

اور میرے لہجے میں شگفتگی آگئی اور میں کھڑکی سے جھانک کر مغرب کی سرخی کا نظارہ کرنے لگا۔

"جانتی ہو" میں نے اپنی بیوی کو پوچھا" کہ ڈوبتے وقت سورج کا رنگ پیلا کیوں نہیں پڑتا؟"

"کیوں نہیں؟"

"کیونکہ اُسے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ڈوبتے ہی اس کا طلوع دوسری نصف دنیا میں ہو جائیگا"

———— (۹) ————

نصف شب سے کچھ اوپر وقت ہو گیا تھا، گاڑی کی دھندلی اور لرزاں روشنی میں اخبار پڑھتے پڑھتے مجھے اپنا سر کچھ بوجھل معلوم ہونے لگا تو میں نے اخبار ایک طرف ڈال دیا اور سونے کی تیاری کرنے لگا۔

"سون دی تیاری کر رہے او؟" ہمارے پنجابی ہمسفر نے پوچھا۔

"جی ہاں"

"تے سوں جاؤ" اس نے بھی آنکھیں میٹنے سے پہلے اپنے بدن پر کمبل درست کر لیا۔

اور میری بند آنکھوں کے سامنے اخبار کی ایک سرخی آکھڑی ہوئی، جو میں نے ابھی ابھی دیکھی تھی:

"ہندوستان میں بیکار لوگوں کی تعداد میں خطرناک اضافہ"

"اگر —— اگر مجھے کام نہ ملا — تو —" میں نے گھبرا کر آنکھیں کھول لیں — "تو ——"

میں نے اپنی بھیٹی بھیٹی نگاہ گاڑی کی چھت پر جمالی اور میری بینائی گویا وہاں زرد روشنی میں کسی بھوت کی طرح الٹی لٹک گئی ہو اور میں کسی سہمے ہوئے بچے کی طرح وہاں سے نظر ہٹانے کی خواہش کے باوجود بھی اس بھوت کی طرف تکتا جا رہا ہوں۔

اور میں نے اس بھوت کو پہچان لیا، بالکل وہی ٹیڑھے میڑھے خدوخال کا سایہ، بھوکا، بیکار، جیسے کوئی بیکار نوجوان اپنے احساس کمتری میں بھوک سے پریشان ہو کر خود ہی اپنے آپ کو کھا گیا ہو اور اب محض اپنا سایہ بن کے نظر آ رہا ہو۔ یہ میں تھا، اپنی نوجوانی کا "میں" نوجوانی؟ —— نہیں، میرا خیال ہے کہ میں کبھی جوان ہوا ہی نہ تھا، بس چودہ پندرہ برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے ہی بوڑھا ہو گیا تھا۔ افلاس نے مجھے جی بھر کے، کھل کے بہت کم ہنسنے کا موقع دیا تھا، کبھی ہنستا تو یہی ڈر لاحق رہتا ہے کہ ہنستے ہنستے رو دوں گا (میری ماں کی بھی عادت تھی کہ ہر دو منٹ بعد اپنی خشک آنکھوں کو پلو سے اس انداز سے پونچھتی گویا اسے کھٹکا ہو کہ وہاں آنسو بہہ رہے ہیں) میں نے کبھی کسی لڑکی سے عشق کا اظہار نہیں کیا۔ بس جو لڑکی ذرا اچھی لگی اسے دبی گھٹی آنکھوں سے تاکا کیا۔ وہ لڑکی نظروں سے اوجھل بھی ہو جاتی تو میں بدستور اس کی پشت پر خیالی خیالی ہوائی قوسوں کو دلیسی ہی چور نظروں سے دیکھتا رہتا۔ کبھی کوئی لڑکی مجھ سے ہنس کر بات کرتی —— شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا —— تو میں مضحکہ خیز حد تک سنجیدہ نظر آنے لگتا۔ میں بڑا غریب تھا، بڑا حساس، بڑا بزدل، رو رو کر پڑھا اور پڑھائی کے بعد مسلسل بیکاری نے مجھے اپنا بھوت سا بنا دیا، اور یہ بھوت میرے سامنے سدا الٹا لٹکا رہتا۔

اسی بھوت کو میں اب اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔ میرے بدن میں جھرجھری سی آگئی۔ کہیں — کہیں میرے ماضی کی یہ بدروح میرے مستقبل پر اپنا سایہ ڈالنے تو نہیں آئی؟

میں نے منہ کمبل سے لپیٹ لیا اور آنکھیں بند کرکے سونے کی کوشش کرنے لگا۔ باہر اندھیرا تھا۔ کمبل کے اندر اندھیرا تھا اور میری آنکھیں بند تھیں لیکن وہ بدروح مجھے صاف دکھائی دے رہی تھی۔ سونے کے لیے خالی الذہن ہونے کی کوشش میں میں لمبے لمبے سانس لینے لگا، رومن لیٹر (A) کے اندر کی مثلث پر اپنی تمام توجہ مرکوز کرلینا چاہی مگر وہ کم بخت بھوت وہاں مثلث کے بالائی زاویے میں بھی لٹکتا ہوا دکھائی دینے لگا۔

"آؤ، آؤ! آگے بڑھ کر مجھے گلے لگالو"

میری آنکھیں بند تھیں اور بھوت مجھ سے گویا تھا۔

"میں — میں ہی ہوں، کوئی اور نہیں — میں تمہارے ماضی کا افلاس ہوں۔ تم مجھے چھوڑ کے چلے گئے مگر مجھے یقین تھا کہ تم ضرور لوٹو گے۔ بھلا کوئی اپنے ماضی سے منکر ہو سکتا ہے؟ — ٹھک — ٹھک ٹھک — ہو سکتا ہے؟ — ٹھک — ہو — س — ک — ؟ — ٹھک — ہو — ؟ — ٹھ!"

میری آنکھوں میں نیند داخل ہورہی تھی۔ بھوت میرے قریب آرہا تھا — قریب تر۔

"تم کافی موٹے ہوگئے ہو یار۔ اپنا تھوڑا گوشت مجھے دے دو نا۔ ہر غریب امیر ہوکر اپنا کچھ گوشت اپنے ماضی کے بھوت کی نذر کرتا ہے، جیسے کئی بار سوکھی جڑوں سے سرسبز ٹہنیاں نکل آتی ہیں اور پھر اس لیے سرسبز نہیں رہتیں کہ اپنی توانائی اپنی جڑوں کی نذر کر دیتی ہیں —"

میں اونگھنے لگا اور اونگھتے اونگھتے اپنی باہیں بھوت کے گلے میں ڈال دیں — "دیکھو میں از سر نو جی رہا ہوں، تمہارا ماضی جی رہا ہے راجن، تمہارا مردہ افلاس لوٹ آیا ہے"

کئی سال پہلے جب میرا افلاس مجھ سے وداع ہوا تھا تو میں نے اطمینان کا سانس لیا تھا، لیکن سچائی یہ تھی کہ اس طویل عرصے میں کئی بار مجھے اپنے اس غریب ساتھی کی یاد آئی۔ اپنی موجودگی میں یہ مجھے جتنا برا لگتا تھا، اتنا ہی غیر موجودگی میں بھلا معلوم ہوا۔ جانے ماضی کی برائیاں حال میں خوب صورت نظموں کے عنوان بن بن کر کیوں نظر آتی ہیں۔

"آپ شاعر زیادہ ہیں اور آدمی کم" مجھے اپنی بیوی کی شکایت کا خیال آرہا تھا۔

"کیا شاعر آدمی نہیں ہوتا؟"

"ہوتا ہے، لیکن وہ جینے سے زیادہ شاعری کرتا ہے، اس لیے آدمی کم ہوتا ہے اور شاعر زیادہ — اور جو آدمی شاعر کم اور آدمی زیادہ ہوتا ہے وہ بڑا خوش رہتا ہے۔ جھوٹ موٹ کی شاعری کرو اور سچ مچ کی زندگی بسر کرو اور بس —" میری بیوی کے الفاظ از خود ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ رہے تھے۔ "چھوٹے موٹے جھوٹ کے ساتھ سچائی زیادہ سچی معلوم ہوتی ہے لیکن بڑے بڑے جھوٹ پر سچائی کا گمان نہیں ہوتا"

میں نے شاید ہندوستان لوٹ کر بڑا جھوٹ بولا تھا: یہ میرا گھر ہے۔ یہاں میرے اپنے لوگ بستے ہیں، میری زبان بولتے ہیں، اور اسے بول بول کر نہیں بولتے بلکہ یہ اپنے آپ اُن کے ہونٹوں پر بولتی ہے، ان کے دلوں میں بولتی ہے، لیکن کیا بولتی ہے؟ ——— کیا یہ سچ بولتی ہے؟ مادری زبان کا محاورہ ہمیں اتنا آسان لگتا ہے کہ خواہ مخواہ جھوٹ بولنے کو جی چاہتا ہے، مگر کسی غیر ملکی زبان میں سچ بولے بغیر چارہ نہیں، اسی لیے ہندوستان کی قانون کی بہترین کتابیں انگریزی میں لکھی گئیں اور انگلستان کی، لاطینی میں۔

میرا جی چاہا کہ میں انگریزی میں اپنے آپ سے کہوں کہ میں بزدل ہوں اور اپنی چنگی بھلی، لمبی لمبائی خوشگوار حقیقت سے بھاگ کر یہاں آ گیا ہوں۔ اپنی المناک کہانیوں کی کائنات میں۔

"تمہاری کہانیوں میں ایک طرح کی شاعرانہ فکرمندی ضرور ہے" افریقہ میں ایک دوست نے مجھ سے کہا تھا۔ "مگر نہ جانے وہ سچی کیوں نہیں لگتیں ——— شاید اس لیے" اس نے خود ہی کچھ توقف کے بعد یہ شک ظاہر کیا تھا۔ "کہ تم اس ہندوستان کی کہانیاں لکھتے ہو جس نے آج سے پندرہ برس پہلے دم توڑ دیا تھا، اس وقت، جب تمہارا جہاز بمبئی سے افریقہ کو روانہ ہوا۔ تم افریقی کہانیاں کیوں نہیں لکھتے۔ افریقہ تمہارے سامنے کھڑا ہے۔ مگر تم اپنے اُسی افسانوی، ذہنی ہندوستان پر نگاہ جمائے ہوئے ہو۔ تم آنکھیں بند کر کے لکھتے ہو یار، ورنہ وہ دیکھو، وہ دیکھو وہ کالی کلوٹی، صحت مند افریقی حسینہ، کتنی پیاری لگ رہی ہے! ——— ذرا آنکھیں کھولو اور دیکھو! ———"

میں نے ریل کے ڈبے میں اپنی آنکھیں کھول کر آس پاس دیکھا اور مجھے وہ کالی کلوٹی مدھری جوانی کہیں نظر نہ آئی اور میں نے لمبا سانس بھر کر اپنی آنکھیں پھر میٹ لیں، اور میرے ذہن میں افریقی نشیب ابھرتے رہے اور میرا دل ان نشیبوں میں پھسلتا رہا اور میں بدستور آنکھیں بند کیے کالے جادو سے مسحور سا، نیم بے ہوش سا پڑا رہا، میرا ماضی کا افلاس کسی معصوم بچے کے مانند میرے کندھے پر سر ٹیکے اب گہری نیند سو رہا تھا، مطمئن کہ اپنی نگرانی کا اب وہ خود ذمہ دار نہیں ——— حال کے آہنی پہیے تیز تیز دوڑ رہے تھے، دِلّی کی جانب، میری منزل کی جانب، گھر کی جانب اور مجھے معلوم ہو رہا تھا کہ ہم افریقہ میں ہیں اور ممباسہ میں چھٹی کے چند دن گزار کر نیروبی جا رہے ہیں، گھر لوٹ رہے ہیں جو پارک لینڈ پولیس اسٹیشن کے عقب میں واقع ہے اور ہم جہاں بھی، جب بھی کہیں جائیں، ہمارا گھر عین اپنی جگہ پر ہمیشہ ہمارے لوٹنے کا انتظار کرتا رہتا ہے۔

"یہ کیا بات ہے راجن؟" افریقہ میں اہلووالیہ نے مجھ سے پوچھا تھا۔ "ہم یہاں کسی کو اپنا پتہ دیتے ہیں تو اپنا پوسٹ بکس نمبر لکھواتے ہیں یا ٹیلیفون نمبر۔ یہاں ہمیں ایک دوسرے کے گھروں کا اتہ پتہ نہیں ہوتا ———"

اس لیے کہ یہاں ہمارے گھر ہیں ہی نہیں، ہمارے گھر ہندوستان میں ہیں، بڑی بڑی سڑکوں کے پیچھے چھوٹی چھوٹی سڑکیں، اور ان چھوٹی چھوٹی سڑکوں کے پیچھے بڑی بڑی گلیاں اور ان بڑی بڑی گلیوں کے پیچھے چھوٹی چھوٹی گلیاں، جہاں ہمارے کچے مکان ہیں، کچے گھر ہیں، کچے گھر ——— میرا اپنا گھر کہاں ہے؟ ہندوستان میں ——— نہیں، پاکستان میں، سیالکوٹ میں، جہاں میں پیدا ہوا تھا۔ محلہ چاؤ دنا کے اس دو کمروں کے چھوٹے سے مکان میں، جہاں میری بہنیں ہر سال سسرال سے آ کر دو دو مہینے رہا کرتی تھیں ——— ایک بار میں اپنے گھر کے سامنے گلی کی نالی میں پیشاب کر رہا تھا کہ میری بہن امرو تلی کے آگے آگے چل کر اچانک چھم چھم میرے سر پر آ کھڑی ہوئی۔ اس نے خوشی سے رو رو کر میرے سر کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور اس کی سونے کی چوڑیاں میری کھوپڑی میں چبھنے لگیں اور میں اپنا ازار بند باندھتے ہوئے ہنسنے لگا اور میری ماں، میرا باپ، چھوٹی بہن درشناں، اڑوسی پڑوسی سب گھر سے نکل آئے، گویا گھر کے، گھر کے آس پاس کے سبھی بازو ہوا میں لہرانے لگے کہ امرو کو

کھینچ کھینچ کر گلے لگالیں۔ یہاں ہمارا گھر تھا ——— چند سال بعد ہمارا یہ گھر بک گیا تو مجھے محسوس ہوا کہ میرا گھر میرا نہیں، میرا محلہ میرا نہیں، شہر میرا نہیں، وطن میرا نہیں ———

ملک کی تقسیم کے بعد ہم ہندوستان چلے آئے، ہم سب مہاجرین کی گاڑی ڈیرہ بابا نانک کے پُل پہ آکر ٹھہر گئی۔ بابا کے پل پر سینکڑوں لاشیں گل سڑ رہی تھیں، ہندوؤں اور مسلمانوں کی لاشیں، جن کے چہرے مسخ ہو چکے تھے لیکن وہ مر کر بھی صاف ہندو اور مسلمان نظر آ رہے تھے، اپنی اپنی ضد پر اڑے ہوئے، اپنے اپنے تمدن کی لاشیں ——— اللہ اکبر! ——— نہیں، ——— ہر ہر مہادیو! ہم جو زندہ رہ گئے اُنہیں خدا کے ہر نام سے خوف محسوس ہو رہا تھا، اور خوف زدہ آدمی گھر کی طرف بھاگتا ہے لیکن ہمارے گھر کہاں تھے؟ ——— میں نے اپنے گرد و پیش لاشوں کی جانب دیکھا، یہ لوگ مرنے سے پہلے سہم سہم گئے ہوں گے اور پھر اس افراتفری کے عالم میں یہ اس خیال سے پاگل ہو اٹھے ہوں گے کہ ان کے ٹھکانے ان سے چھن چکے ہیں اور یہ اپنے اپنے جسم بھی چھوڑ کر آسمان کی جانب بھاگ نکلے ہوں گے کہ وہاں جنت میں ——— سورگ پوری میں ان کے لیے نئے نئے گھروں کی قطاریں تیار کھڑی ہیں، جو پہلے آئے گا، اسے پہلے گھر ملے گا ———

بمبئی سے ہمارا بحری جہاز افریقہ کو روانہ ہوا تو مجھے یہی لگا کہ میں مر گیا ہوں، میرا جسم یہیں پیچھے رہ گیا ہے، اور میں اپنے گھر کی کھوج میں سمندر پار جا رہا ہوں۔

"ارے بے وقوف" سوئی تو تم نے یہاں کھوئی ہے اور اسے پانے کے لیے مُنہ اُدھر کیے ہوئے ہو ——— ؟

لیکن ہم سب انجانے میں یہی حماقت دہراتے ہیں۔ جہاں کچھ کھو جانے وہاں اور کھونے کا ڈر رہتا ہے۔ بابے کے پل پر میری لاش یہاں پڑی تھی ——— ہر ہر مہادیو! میں آسمانوں میں دوڑ رہا تھا۔

یہیں کہیں میرا گھر ہے۔ یہاں ——— بحرِ ہند کی آبی دھندوں کے اس پار، افریقی ساحل سے تین سو میل دور، نیروبی میں! (موت کے بعد بھی گھر کے بغیر نہیں بسا جا سکتا۔)

میں یہاں بس گیا ہوں اور میری روح کی آمد کی تقریب پر یہاں ایک ہوٹل میں کئی مقامی روحیں جمع ہیں اور میری روح اُن سے مخاطب ہو کر جھوٹ بول رہی ہے۔

"میں اپنوں کو چھوڑ کے یہاں چلا آیا مگر اب مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ میرے اپنے لوگ چہرے بدل کر مجھ سے پہلے ہی یہاں آ پہنچے اور اب تک میرا انتظار کرتے رہے ———"

مجھے اپنی روح کی آواز بڑی غیر مانوس لگ رہی ہے۔ میری روح واقعی جھوٹ بول رہی ہے۔ نہیں، روحیں جھوٹ بھی بول رہی ہوں تو جھوٹ نہیں بولتیں۔

نئے چہروں کو اپناتے اپناتے ایک عمر صرف ہو جاتی ہے اور انھیں اپنا کر آدمی کی موت واقع ہو جاتی ہے اور پھر وہ کہیں اور پیدا ہوتا ہے، ننھا اور نیا، اور نئے چہروں کو دیکھ دیکھ کر اسے پُرانے چہروں کا خیال آتا ہے، اپنائیت کے عمل کی وہی محبت آمیز لے جیسی پچھلے جنم میں بھی ایسے ہی لوگ تھے، یا شاید یہی لوگ تھے، نہیں، شاید نہیں، تھے ہی وہ یہی لوگ، ان کے جذبات کی یہی لَو تھی۔ ایک جنم میں یا جنم جنم میں ہم سدا انہی لوگوں سے ملتے ہیں، مل مل کر انہی سے بچھڑتے ہیں اور پھر اُنہی سے آ ملتے ہیں۔

روحوں کے جھوٹ میں واقعی جھوٹ کا نام نہیں ہوتا، دیکھنے میں جھوٹ ہی جھوٹ، پر سچائی کو یوں چھپا کر کلیجے میں سموئے رکھتا ہے، جیسے خالی خولی ہوا اپنے نادیدہ وجود سے بھری پڑی ہو۔

میں اپنی نئی نویلی دلہن کی طرف دیکھ رہا ہوں جو ہوٹل کے اس لونج میں ہجوم کے درمیان میرے پہلو میں ڈائننگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی بار بار پیار بھری آنکھوں سے میری طرف دیکھ رہی ہے۔

"شوبھا، تمہارا دولہا بڑا میٹھا ہے"

اُس کی سہیلی نے اس کے کان میں کہا ہے اور وہ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑی ہیں۔

(اس ہنستی ہوئی خوبصورت جوانی سے میری ازل سے دوستی ہے۔)

"تمہارا دولہا ———"

دولہا! یہ میری دلہن ہے، میری جیون ساتھی۔ آج سے چھ ماہ پہلے یہ کہاں تھی؟ میں کہاں تھا؟ اور ہم دو اجنبیوں نے عہد کیا ہے کہ ہم ایک دوسرے کو کل جہان کے نفوس ——— جانے پہچانے یا انجانے ——— پر ترجیح دیں گے ——— ہمارے اس عہد پہ شک کی گنجائش نہیں کیونکہ ازدواج کی صدیوں پرانی اور معتبر روایت نے اس عہد کی صداقت پر اپنی شہادت دی ہے۔ ابھی ابھی ہم ایک دوسرے کے وجود سے بے خبر تھے۔ لیکن اب ہم دونوں کے وجود ہی ہمارے لیے زندگی کا منبع ہیں۔ ہم دو نہ ہوں تو کسی تیسرے کی تخلیق کا تصور بھی ممکن نہیں، چونکہ ہم دونوں ہیں اس لیے کوئی تیسرا بھی ہے، اور بھی ہیں، سب ہیں، لیکن یہ سب اس لیے ہیں کہ ہم دونوں یکجا ہیں۔ ہم سے پہلے بھی ہم ہی تھے جو یکجا تھے اور ہمارے بعد بھی جو دو نفوس یکجا ہوں گے وہ ہم ہی ہوں گے، کیونکہ شادی کی روایت میں صرف ایک عہد کا جذبہ کارفرما نہیں بلکہ ہمہ وقت انسانی فطرت کارفرما ہے، یونہی بے خبری میں کسی اجنبی کی خبر مل گویا اپنے آپ کی خبر مل گئی اور اپنا آپ کھو کر اچانک پا لیا۔

میرا سالا کسی سے میرا تعارف کروا رہا ہے۔

"میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے" میں نے اس قدر گرمجوشی سے اپنے ملنے والے سے ہاتھ ملایا ہے کہ وہ تعجب سے میری طرف دیکھنے لگا ہے۔ "شاید جالندھر میں"

"جالندھر میں آپ نے میرے ماں باپ کو دیکھا ہوگا۔ میں تو یہیں پیدا ہوا، یہیں بڑا ہوا"

اس نے جواب دیا ہے۔

"کیا یہ ضروری ہے" ایک فلسفی نما شخص نے اسے ٹوک دیا ہے۔ "کہ تمہیں ملنے کے لیے صرف تم ہی سے ملا جائے، تمہیں ملنے کے لیے تمہارے باپ سے ملا جا سکتا ہے، یا تمہارے باپ کو بھی چھوڑ دو، میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ کسی ایک سے ملنا ہو تو کسی بھی اور سے ملا جا سکتا ہے۔ بنیادی طور پر ———"

"یہ ہمارے فلاسفر دوست چوپڑہ صاحب ہیں"

"فلاسفر ولاسفر کو گولی مارو۔" چوپڑہ مجھ سے جلدی جلدی ہاتھ ملا کر گویا ہوا ہے۔ "میں دراصل یہ کہنا چاہ رہا تھا مسٹر راجن، کہ آدمی صرف اپنے آپ سے ہی مل کر کل جہان سے مل لیتا ہے"

سب ہنسنے لگے ہیں ۔
" کیا تم کبھی اپنے آپ سے ملے ہو مسٹر راجن ؟ "
" ارے چوپڑہ بھئی، کچھ اگلی ملاقات کے لیے بھی رہنے دو " وِنود نے اس سے کہا ہے ۔
" اپنے آپ سے بھی مل لیں گے، ابھی انہیں ہماری بہن سے تو اچھی طرح مل لینے دیجئے "
" کوئی تمہاری بہن سے ملے یا ان کی ۔" چوپڑہ نے میرے سالے کی طرف اشارہ کیا ہے ۔
" مقصد یہی ہوتا ہے کہ ذرا اپنے آپ سے گلے مل لے "
میرا سالا ہنس ہنس کر اُسے پرے لے گیا ہے ۔
" پاگل ہے " ونود نے اپنی دائیں کنپٹی پر پیچ کسنے کے انداز میں اپنا ہاتھ ہلا کر کہا ہے ۔
چوپڑہ چند قدم پر میرے سالے کا ہاتھ چھڑا کر پلٹ آیا ہے ۔
" مسٹر راجن، میں دراصل یہ کہنا چاہ رہا تھا کہ آدمی کسی ماحول میں اُسی وقت اجنبیت محسوس کرتا ہے جب اسے اپنی ذات سے دلچسپی نہ رہے ۔ میں دراصل یہ کہنا ـــــــ"
" ارے مسٹر چوپڑہ، دراصل تم کچھ بھی نہیں کہنا چاہ رہے "
اب کے میرا سالا مجھے وہاں سے کھینچ کر پرے لے گیا ہے ۔
کھٹ ـــ ٹھک ـــ ٹھک ـــــ !

میں سوتے سوتے جاگ رہا تھا، یا جاگتے جاگتے سو رہا تھا، یا شاید سو رہا تھا نہ جاگ رہا تھا، اور گاڑی سرپٹ آگے دوڑ رہی تھی اور میں کھڑکی کے قریب بیٹھا باہر دیکھ دیکھ یہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ پیچھے کی جانب جا رہی ہے، یا شاید گاڑی نہیں دوڑ رہی، بلکہ زمین اپنے آپ تیز تیز پیچھے کی طرف دوڑ رہی ہے ۔

میں اپنے پیچھے جا رہا ہوں، گویا ایک بار پھر پہلی بار کے مانند افریقہ پہنچا ہوں اور ہم جہاز سے اُتر کر ریل گاڑی میں بیٹھے ممباسا پورٹ سے نیروبی جا رہے ہیں ۔

" نیروبی اسٹیشن پر میرے بڑے بھاپا جی، بھاپا لعل، اوی، ویدی ـــ سب آئے ہوں گے "
میری بیوی اپنے بھائیوں کا ذکر کر رہی ہے " اور بھی کئی لوگ ہوں گے، بڑی رونق ہو گی ــــــ ہماری دو کاریں ہیں ۔ اسٹیشن پر اُتر کر ہم اپنی کار میں بیٹھے سیدھے گھر جائیں گے "

گھر : میں گاڑی میں اپنے کیبن کی کھڑکی سے جھانک کر افریقی جنگلوں کا نظارہ کیا ہے اور کسی نئی نویلی دلہن کے مانند پل بھر کے لیے بابل کے گھر کا خیال کر کے میری آنکھیں بھر آئی ہیں ۔ میری بیوی دولہے کے سے لب ولہجے میں گویا و دلہن، کی ڈھارس بندھا رہی ہو ۔
" ہمارا شہر آ رہا ہے، بڑا خوبصورت شہر ہے، بڑا پیارا موسم ہے، بڑی اچھی خوراک ملتی ہے، بڑے عمدہ مکان ہیں، بڑا ـ
ٹھک ـــ کسٹ ـــ ٹ ـــ ٹھ ـــ !

"اگلا اسٹیشن آتھی ریور ہے!"

"ہاتھی؟ ——"

"ہاں، ہاتھی نہیں، آتھی۔" میری بیوی ہنس دی ہے۔

مجھے لگ رہا ہے کہ وہ بلا وجہ ہنس رہی ہے۔

نہیں، بلاوجہ نہیں! وہ گھر لوٹ رہی ہے۔ یہاں اسے اپنے بچپن کے نشانات کی ٹوہ مل رہی ہے اور یہ ٹوہ پا پا کر اس کا بچوں طرح ہنسنا عین مناسب ہے۔

میں نے اپنی نظریں کھڑکی سے باہر ویران زمین کی جانب موڑلی ہیں اور اس ویرانی کا نظارہ کر کر کے مجھے محسوس ہوا ہے کہ میں بنوں سے ہی نہیں بلکہ اپنے آپ سے بھی بچھڑ گیا ہوں، مگر ان اجڑے اجڑے، غیر مانوس ارضی مناظر کے اوپر آسمان وہی ہے جو ہندوستان میں۔ زمین کو راستے میں سمندر نے کاٹ دیا ہے، لیکن آسمان بدستور میرے ساتھ ساتھ آ رہا ہے اور اس لیے آسمانی دھندلاہٹوں میں مجھے اپنے ہندوستانی گھر کا گیٹ صاف نظر آ رہا ہے۔

لیکن آسمان کتنی دور ہے! جسے ہم آسمان کہتے ہیں اس جگہ پہنچ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہاں سے آسمان ابھی اتنا ہی دور ہے جتنا پہلے تھا۔ آسمان سے گر کر آدمی پھر آسمان پر نہیں پہنچ سکتا۔ آدم جب آسمانوں سے لڑھک لڑھک کر زمین پر آ گرا تو اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اپنی جنت اب یہیں بنائے گا، لیکن اس کی نسلوں کی جنت آج لاکھوں کروڑوں سال بعد بھی وہیں آسمانوں میں ہے۔ آدمی آج بھی اپنا پہلا گھر نہیں بھول پایا۔

میں نے گویا پانی سے بھرے ہوئے کٹوروں کو ڈھانپنے کے لیے اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں اور مجھے اپنی بیوی کی خنداں آواز سنائی دے رہی ہے۔

"دیکھو راجن، آنکھیں کھولو، یہ آتھی ریور ریلوے اسٹیشن ہے۔" میں نے اکثر دیکھا ہے کہ شوبھا اپنی انتہائی خوشی مجھے آپ کہہ کر بلانا بھول جاتی ہے۔

"تم مجھے ہمیشہ 'تم' ہی بلایا کرو۔"

"چھوڑو جی۔ شریف گھرانے کی لڑکی شوہر کو 'آپ' ہی کہتی ہے۔"

شریف زادی خوشی سے پھول پھول کر مجھ سے مخاطب تھی۔

"شاید تم ٹھیک کہتے ہو راجن۔ ہو سکتا ہے آتھی ہاتھی ہی کا بگڑا ہوا نام ہو کیونکہ میرے بھائیا جی مجھے بتایا کرتے تھے کہ ایک زمانے میں یہاں ریلوے اسٹیشن پر ہاتھیوں کے جھنڈ کے جھنڈ آیا کرتے تھے۔ وہ دیکھو، وہاں دریا کا کنارہ تھا۔ بھوک کے پیاسے ہاتھی دور دور سے ادھر آ نکلتے ——"

"جیسے میں" میں نے اپنے آپ کو بتایا ہے اور اپنی بیوی کے بھائیا جی کے الفاظ میرے کانوں میں گونجنے لگے ہیں جو انہوں نے ہماری شادی کے بعد اپنی افریقہ کے لیے روانگی سے پہلے کہے تھے۔ "جلدی آ جائیو بیٹیا۔ بس یہ سمجھ لو کہ اب تم وہاں پہنچے اور اب

ہی تمہاری نوکری پکّی!———"

میں نے آمتی ریور کے ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم کی جانب دیکھا ہے جہاں دو چار حبشی اِدھر اُدھر دوڑ رہے ہیں اور اسٹیشن ماسٹر کے دروازے کے سامنے ایک خالصہ ریلوے کی وردی پہنے کھڑے کھڑے بڑی بے چینی سے اپنی دائیں ٹانگ ہلا رہا ہے۔

"کالے لوگ سکھوں کو کالے سنگھے کہتے ہیں۔"

"کالے سنگھے؟!"

"کالے نہیں بھئی۔ کالے، جسے پنجابی میں بے چین کے معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ بھاپا جی نے بتایا تھا کہ ایک سردار نے ایک افریقی سے کہا، ہم دونوں کالے ہیں، لیکن تو سیاہ ہے اور میں بے چین۔ بے چارہ اپنے بچوں کو ہندوستان چھوڑ چھاڑ کے نیا نیا ہی یہاں آیا تھا———"

میری بیوی کو شاید اس کالے سنگھے کی بیچارگی کا خیال کر کے مجھ پر بھی ترس آنے لگا ہے اور وہ کیبن کے شٹر نیچے کھینچ کر مجھ سے پیار کرنے لگی ہے۔

رکی ہوئی گاڑی پھر چلنے لگی ہے۔

"اب ہم کوئی سوا یا ڈیڑھ گھنٹے میں نیروبی پہنچ جائیں گے۔"

میری گود سے نکل کر گویا وہ پھر اپنی ماں کی گود میں آ بیٹھی ہو۔

"بھاپا جی سے آپ ملیں تو ان سے انگریزی میں بات چیت کیجیے۔"

"انگریزی میں؟"

"ہاں، انگریزی میں۔ ان کی بڑی خواہش ہے کہ ان کا بہنوئی فرفر انگریزی بولنے والا ہو۔ وہ بہت خوش ہوں گے۔"

اس کی خوشی محسوس کر کر کے مجھے معلوم ہو رہا ہے کہ وہ باتیں نہیں کر رہی بلکہ گا رہی ہے۔ بس خوش ہو ہو کر جو دھن من میں آ جائے وُہی———

"اب ہمارا نیروبی دس پندرہ میل پر ہوگا۔ وہ دیکھیے، وہ بڑ کا درخت۔ بھاپا جی اور ہم سب اکثر یہاں پکنک پر آیا کرتے تھے۔ جب ہم پچھلی بار یہاں آئے تو ادی اور موہن میں خوب خوب لڑائی ہوئی——— موہن میرے بھاپا جی کے بڑے لڑکے کا نام ہے۔ بڑا انٹیلی جینٹ ہے، پر ہر وقت کڑھتا رہتا ہے اور پتلا سا ہے، میرا چھوٹا بھائی ادی اُسے بہت چھیڑتا ہے اور وہ پھر دونوں آپس میں خوب جھگڑتے ہیں———"

میں سوچ رہا ہوں کہ میں بھی اپنی چھوٹی بہن درشی سے خوب جھگڑتا تھا۔ اس سے میرا بڑا پیار تھا۔ اگر میں دن میں ایک بار اس سے جھگڑ نہ لیتا تو مجھے روٹی ہضم نہ ہوتی۔ اس سے جھگڑا کر کے مجھے بڑا مزہ آتا اور اس کی روٹھی چڑی ہوئی شکل دیکھ کر میرا جی چاہتا کہ بڑھ کر اس کا منہ چوم لوں۔

"نہیں بیٹا، چھوٹی بہن کو تنگ نہ کیا کرو۔" میرا مرحوم باپ نصیحت کرتا۔ "لڑکیاں پرایا دھن ہوتی ہیں———"

پرایا دھن! ہمیں افریقہ آئے ابھی پورا سال بھی نہ ہوا تھا کہ خبر آئی کہ وہ سدا کے لیے پرائی ہو گئی ہے، اس جہان سے

چل بسی ہے۔
ہمارے افریقہ آنے سے دو ماہ پہلے درشنی کا بیاہ ہوا۔ ابھی بمشکل ہم نے یہ پرایا دھن پرائے گھر میں ڈھویا ہی تھا کہ میں بھی پرایا دھن بنے چپ چاپ جہاز کے عرشے پر آ بیٹھا۔
"میری بڑی بہن اور جیجا جی بھی اسٹیشن پر آئے ہوں گے۔ آجکل انہیں اپنے اسکول سے چھٹیاں ہوں گی ——— جیجا جی نے ہی مجھے سینئر کیمبرج کے امتحان کے لیے انگلش لٹریچر پڑھایا تھا ——— باپ رے! وہ بہت بڑے سکالر ہیں۔ آپ تو صرف بی 'اے' ہیں مگر وہ بی اے 'ایل ایل' بی ہیں۔ اتنے موٹے موٹے لفظ بولتے تھے کہ میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آتا تھا۔ بھاپا جی کہتے ہیں کہ وہ سکالر تو ہیں پر اٹک اٹک کر انگریزی بولتے ہیں۔ تم اسٹیشن سے اتر کر سب سے انگریزی میں ہی باتیں کرو۔ بھاپا جی بہت خوش ہوں گے۔ تمہاری انگریزی بہت اچھی ہے ——— بھاپا جی ———"
نیروبی آ رہی ہے۔ میری بیوی کیبن سے نکل کر باہر کھڑکی کے قریب جا کھڑی ہوئی ہے۔
"ادھر آؤ راجن ——— ادے آؤ نا!"
گاڑی کی رفتار آہستہ ہو رہی ہے۔
"اب دو چار منٹ میں ہی ہم اسٹیشن پر پہنچ جائیں گے ——— یہ کال ٹیکس ہے۔ وہ، وہ پیچھے رہ گیا ہے۔ ابھی بر اشیل آئے گا، پھر سیمنٹ کی فیکٹری کے بعد ——— ارے راجن، تم اپنی ٹائی کی ناٹ ٹھیک کر دنا۔ بھاپا لعل کہے گا کہ تمہیں ٹائی باندھنا بھی نہیں آتا۔ لاؤ میں باندھ دوں۔ بھاپے لعل سے مل کر تم بہت خوش ہو گے۔ یوں تو وہ ریلوے میں ملازم ہے لیکن سینٹ جان کا ڈاکٹر ہے اور ریزرو پولیس میں بھی کام کرتا ہے۔ ہر روز نئی نئی وردیاں پہنتا ہے، کبھی سینٹ جان کی وردی، کبھی پولیس کی ——— ارے وہ دیکھو بر اشیل بھی گزر گیا۔ اب سیمنٹ کی فیکٹری آئے گی اور پھر نیروبی اسٹیشن اور پھر ———"
گاڑی کی رفتار مزید سست پڑ گئی ہے اور مجھے ان لوگوں کی یاد آ رہی ہے جو ہندوستان میں انبالہ اسٹیشن پر مجھے وداع کرنے آئے تھے۔ راستے میں سہارنپور کے پلیٹ فارم پر درشنی بھی اپنے شوہر، سسر اور ساس کے ساتھ آئی ہوئی تھی۔ صرف دس منٹ کے لیے گاڑی وہاں رکی، اور ان دس منٹ میں میں اور میری بہن نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اپنے سارے ماضی کی ساری باتیں کر لیں۔ ہم نے اپنے منہ سے بھی ایک دوسرے سے باتیں کرنے کی کوشش کی لیکن ہونٹ کچھ پھڑکنے لگتے کہ صاف بات نہ ہو پاتی۔
"میں ہر سال آیا کروں گا درشنی، ہر سال۔"
لیکن منزل انجانی ہو اور سمندر پار، اتنی دور، اور مسافر بھولا اور غریب، تو اسے پتہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور جب اسے یہ بھی معلوم نہ ہو کہ وہ کہاں جا رہا ہے تو اسے یہ کیونکر معلوم ہو گا کہ وہ کب لوٹے گا، سرے سے لوٹے گا بھی یا نہیں۔
درشنی کی شربتی آنکھوں کا کاجل گیلا ہو کر کیچڑ ہو گیا ہے۔
"وہ دیکھو، نیر — د — ب ——— !"
(موت کا لمبا سفر بھی آخر طے ہو جاتا ہو گا!)

ٹرین پلیٹ فارم میں داخل ہو رہی ہے۔ پلیٹ فارم پر ایک ہجوم کی جانب میری بیوی ہنس ہنس کر روتی ہوئی زور زور سے اپنا رومال ہلا رہی ہے اور میں اُس کے پہلو میں کھڑا رو رو کر ہنس رہا ہوں۔

گاڑی ایک دھکے سے رک گئی ہے۔

ہم گاڑی سے نیچے اترے ہیں تو ایک چھوٹا سا ہجوم ہماری طرف بڑھا ہے، پھر ان لوگوں کے پیچھے ایک اور ہجوم، رنگ برنگی ساڑیاں میں لپٹی ہوئی جوان اور بوڑھی عورتیں، بڑے سمارٹ لڑکے اور لڑکیاں اور بچے اور ان کے پیچھے بڑے بڑے خوش پوش مرد۔ اپنے آپ کو اُن کے گھیرے میں پاکر مجھے لگا کہ ان اجنبیوں کے درمیان میں تنہا ہوں۔ میں اپنے جسم کے اندر بند ہوں۔ اس لیے آس پاس اتنا بڑا ہجوم ہونے کے باوجود اکیلا ہوں اور یہ لوگ میرے ساتھ نہیں، میرے سوا میرے ساتھ کوئی نہیں!

(۱۰)

ہماری گاڑی در اصل دہلی ریلوے اسٹیشن پر آ پہنچی تھی۔ پلیٹ فارم پر یخ بستہ اندھیرے سے گھری ہوئی روشنیاں سفید پوش بھوتوں کی طرح حواس باختہ اجنبی مسافروں کے سروں پر لرز لرز کر چاروں طرف دوڑ رہی تھیں، میری بیوی، بچے اور میں گاڑی سے نیچے اترے تو اس بے ہنگم ویرانی میں چند نیم واقف رشتہ داروں نے ہمیں گھیر لیا۔

"دیکھو راجن، دلّی جوں کی توں وہیں ہے جہاں تم اسے چھوڑ گئے تھے۔" رشتے کے ایک چچا نے مجھ سے کہا۔

"نہیں" میں محسوس کر رہا تھا۔ "یہ دلّی وہ نہیں۔ وہ دلّی تو میں افریقہ جاتے ہوئے اپنے ساتھ لے گیا۔ تعجب کا مقام ہے کہ اتنے سال میں دلّی کو دلّی میں ڈھونڈتا رہا۔ وہ دلّی تو میرے دل میں تھی لیکن اب میں اسے نیروبی بھول آیا ہوں۔ میرا دل وہیں رہ گیا ہے۔ موت کی ایک اور طویل مسافت طے کر کے یہاں پہنچا ہوں اور منزل پر پہنچ کر معلوم ہوا ہے کہ منزل تو وہیں تھی جہاں سے سفر شروع ہوا تھا۔"

"پپا، نیروبی آگئی؟" "سنا ہے بچے مستقبل کے سپنے دیکھتے ہیں لیکن میرا راجو کسی بوڑھے کی طرح حال میں اونگھ اونگھ کر ماضی میں پہنچا ہوا تھا۔

"جاگو بیٹا، دلّی آگئی!"

ہاں، راجو، اٹھو! اب تمہیں دلّی میں رہنا ہے۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ جس طرح میں نیروبی چھوڑ کر آخر دلّی چلا آیا، تم بھی کئی برس بعد ایک دن دلّی چھوڑ کر نیروبی چلے جاؤ گے، پر اتنے سال بعد تمہیں نیروبی کہاں ملے گی؟ ——— اور پھر تم کہاں جاؤ گے؟!

کیا تم بھی میری طرح ساری عمر اپنے ذہن کو پیٹھ میں داب کر گزار دو گے؟

———

گھسیا

احسن فاروقی

ان صاحب سے کچھ ہی ربط بڑھنے کے بعد مجھے روہیل کھنڈی زبان کا یہ لفظ یاد آیا جو معنوی اور صوتی دونوں لحاظ سے ان کے کردار کی پوری ترجمانی کرتا تھا۔ یہ لفظ روہیلکھنڈ ہی میں یعنی بریلی۔ مرادآباد۔ بجنور کے اضلاع ہی میں اس کیڑے کے لیے استعمال ہوتا تھا، جسے لکھنؤ میں اور مستند اردو میں کینچوا کہا جاتا تھا۔ اور جس کا سب سے اہم استعمال مچھلی پکڑنے والے کانٹے میں لگا کر ہوتا تھا۔ بریلی میں رام گنگا کے کنارے میں نے سب میں پہلے اس لفظ کو سُنا اور یہ محسوس کیا کہ کینچوے کے گھس گھس کر چلنے کا تاثر یہ بڑی خوبی سے ادا کرتا تھا۔ یہی تاثر انسانی کردار سے میرے سامنے ان صاحب سے ربط پیدا ہو جانے پر اُبھرا اور اب میں ان کو گھسیے کے تصوّر سے الگ نہیں کر سکتا۔ اگر ان کو کینچوا کہوں تو وہ بات نہیں سامنے آتی جو ان کے کردار کی انفرادی صفت ہے۔

وہ صاحب جب میرے سامنے آئے تو ایک ایسی سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہو چکے تھے جس میں ان کا تیس برس تک یہ کام رہا کہ ہر روز وقت پر جا کر ایک کرسی پر بیٹھ جائیں اور فائلیں دیکھتے رہیں اور کلرک کو احکام دیتے رہیں۔ زیادہ تر یہ ہوتا کہ اپنی غرض سے لوگ ان سے ملنے آ جاتے اور وہ ان لوگوں سے باتوں میں اور ساتھ ہی ساتھ چاء پینے میں سارا وقت ختم کر دیتے۔ بیشتر یہ ہوتا کہ صبح سے سامنے رکھی ہوئی فائل شام تک رکھی ہی رہ جاتی اور چلتے وقت وہ کلرک سے کہتے "اچھا اب کل دیکھوں گا" اگر فائل میں ایک کاغذ بھی ہوتا اور اس پر محض دستخط کر دینے کے سوا اور کوئی کام نہ ہوتا تو بھی وہ اسے کل ہی پر چھوڑتے۔ جو لوگ ان کے پاس کام کے لیے آتے ان کو بھی وہ ہفتوں بلاتے رہتے۔ وہ خود بھی اپنے کو اور ان سے اُونچے افسران کو "بڑا محتاط" گنا کرتے۔ دفتری گھس گھس کا ان کے سلسلے میں کمال بتایا جاتا ہے اور اس کا نتیجہ دفتری درجہ پر یہ ہوا کہ وہ ہمیشہ ترقی کرتے گئے اور اعلیٰ ترین عہدہ تک پہنچ کر ریٹائر ہوئے۔ مجھ سے پہلی ملاقات میں ہی انہوں نے قریب قریب ہر بات کو "جب میں اس عہدہ پر تھا۔۔۔" سے شروع کیا اور میری بات کو بالکل فراموش کر کے اپنی ملازمت کے قصّے ایسے سپاٹ انداز اور لہجے میں کئی گھنٹے سناتے رہے کہ میں بور ہو گیا۔ اس پر طرہ یہ تھا کہ جب میں اٹھنے کی کوشش کرتا تو وہ مجھے بٹھا لیتے اور کہتے "ہاں آپ کا کام" اور میرے بیٹھتے ہی کام کو بھول کر اپنی گھس گھس کے قصّے شروع کر دیتے۔ مجھ سے نہ ٹھہرتے بن پڑتی تھی نہ جاتے کیوں کہ آخر میرا کام ان سے ہی نکل سکتا تھا اور وہ کسی طرح کام کی بات کرنے کے لیے تیار ہی نہیں نظر آتے تھے۔ ایک دن کے تجربے کے بعد ان کے پاس پھر جانے کی مجھ میں ہمت نہ تھی مگر وہ بھلا میرے دو منٹ کے کام کو ایک دن ہی میں کیسے نبٹا دیتے جبکہ وہ ہر کام کو مہینوں کھینچنے کے سلسلے میں معروف ہو چکے تھے اور اس کا معقول معاوضہ بھی پا چکے تھے۔ بہر حال جبراً اور قہراً مجھے ان سے ملنا ہی نہیں بلکہ ملتے رہنا پڑا۔ میرا کام تو چولہے بھاڑ میں گیا اور ہوا بھی نہیں مگر ان سے ملتے رہنے کا حاصل یہ ہُوا کہ مجھے انسان کی ایک ایسی عجیب صورت نظر آئی جیسی میں ممکن ہی نہ تصور کر سکتا تھا

اور لوگ خیال کرتے ہیں کہ انسان کام کرنے کے لیے بنایا گیا ہے اور چاہے کام کرنے کی نوعیت فرد فرد کی مختلف ہو مگر ہر شخص کوئی نہ کوئی کام کرتا رہتا ہے۔ ہمارے گھسیے صاحب کا یہ عقیدہ ہے کہ انسان کام ٹالنے کے لیے بنایا گیا ہے اور وہ کام ٹالنے کے لیے فطری طور پر مناسب بنائے گئے

تھے یا یوں کہیے کہ کام ٹلانے کی تیس برس کی عادت نے اس امر کو ان کے اندر فطرت ثانیہ نہیں بلکہ فطرت اولیٰ بنا دیا تھا۔ وہ بڑے با اخلاق اور بڑے محبت پہلی ہی ملاقات میں نظر آتے۔ اور یہ محسوس ہوا کہ اخلاق و محبت دونوں کس طرح پر کام ٹالنے کے بہترین ذریعے ہو سکتے ہیں۔ دو دن ملنے کے بعد ہی وہ بڑے تپاک سے پیش آنے لگے۔ میں نے اپنا سارا معاملہ بتایا۔ اس میں ان باتوں پر جن سے مجھے تکلیف ہوئی تھی وہ ہا ہا اور ہائے ہائے کرتے رہے اور اس طرح اپنے دردمند ہونے کا ثبوت دیتے رہے اور یہ کہتے رہے "نہیں آپ کا کام ضرور کر دوں گا" اور پھر ہر بات کے متوازی کوئی اپنی بات بھی نہایت طوالت کے ساتھ اور ایسے ڈل انداز میں بیان کرتے کہ میرا دھیان ہی نہ لگتا اور اب مجھے ان بے شمار باتوں میں سے کوئی یاد نہیں ہے۔ ایک صاحب نے ان ہی باتوں کی بناء پر ان کی تعریف میں انگریزی لفظ (LOUSY) استعمال کیا۔ ایک اور صاحب نے انہیں (SHILLY SHALLY) کہا اور یہ سب الفاظ ان کی گھیسے پن کی ترجمانی کرتے تھے۔ اول الذکر لفظ میں ایک شائبہ کاہلی کا ہے جس کو ان سے منسوب کرنے میں مجھے عذر ہوتا ہے کیونکہ وہ کاہل بالکل نہ تھے۔ ہر وقت کام میں یا باتیں بنانے میں لگے ہی رہتے۔ جیسے کہ گھیسا ہر سانس کے ساتھ سکڑتا اور بڑھتا رہتا ہے اور کچھ نہ کچھ فاصلہ ضرور طے کر لیتا ہے ویسے وہ بھی مخصوص کام کو چھوڑ کر کسی ضمنی کام کی طرف نہایت مسلسل سست رفتاری کے ساتھ بڑھتے ہی رہتے۔ دوسرے لفظ میں ڈھلملانے سے مناسبت نکلتی ہے اور مجھے شک ہے کہ انہیں ڈھلمل کہنا بجا بھی ہے کیونکہ وہ مخصوص کام کو ڈھلملاہٹ کی وجہ سے نہیں چھوڑ جاتے تھے بلکہ اپنے امور پر استقلال سے جمے ہونے کی وجہ سے دوسروں کے امور کی طرف سے ان کا دھیان ہٹ جاتا تھا۔ اپنی باتیں۔ اپنے قصے۔ اپنی رائیں سب سے زیادہ اپنا پن) ان کے ہر وقت پیش نظر رہتا اور اسی میں مستغرق ہونے کی وجہ سے وہ ہر شخص کے کام کو گھس گھس میں ڈال دیتے۔ بالکل گھیسے کی طرح وہ ہر لمحہ کھسکتے ضرور رہتے اور ایک مخصوص سمت کی طرف جو ان کی اپنی ہی تھی۔ رینگتے نظر آتے ۔

ان کی زندگی پورے طور پر اصولی تھی اور وہ اپنے اصولوں کے سختی سے پابند بھی تھے مگر تمام اصولوں کی پابندی میں یا ان پر عمل میں گھیسے پن کی نوعیت ضرور نمایاں ہوتی۔ مثلاً شام کے وقت وہ ٹہلنے کے پابند تھے اور میل دو میل نکل جایا کرتے تھے مگر جو ان کو چلتا ہوا دیکھتا وہ یہ کہتا کہ زمین کو گھس رہے ہیں۔ ان کے پیروں کے تلوے زمین سے اٹھتے ہی نہ نظر آتے بلکہ اس سے لگے ہوئے گھیسے کے انداز میں آگے بڑھتے دکھائی دیتے۔ جو شخص ان کا ساتھی ہو جاتا اسے محسوس ہوتا کہ اس کے ساتھ رہنے کے لیے پیروں کو بالکل بے دم کر کے چلنا ضروری ہے اور یہ عمل جلد ہی تھکا دیتا۔ مگر راستے میں جو کوئی بھی اس کے ساتھ ہو جاتا اس کو وہ چھوڑتے نہیں۔ اس کو اپنی رفتار سے "گھسیٹتے" ہوئے چلے جاتے بلکہ اور بھی زیادہ دور تک جاتے اور واپسی پر کہتے "ایک چکر اور سہی" ان کے ساتھی کو کوئی ضروری کام کا بہانہ بنا کر چل دینے سے اس کی گھس گھس والی ٹہل سے نجات ملتی اور پیروں کے ساتھ ان کی زبان بھی اسی رفتار سے چلتی رہتی۔ ایک ہی بات کو وہ طرح طرح کھینچتے اور سکیڑتے جاتے۔ وہ عموماً کسی ایسے شخص کی برائی کرتے جس سے انہیں نقصان کا اندیشہ ہوتا۔ کوئی ایک بات پکڑ لیتے اور اسے کھینچ کھینچ کر دہراتے ۔" دیکھیے تو وہ ایسا حرامزادہ ہے۔ ہاں حرامزدہ۔ حرام۔ زا۔ دہ۔ وہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ خود دیکھا۔ ان آنکھوں سے دیکھا۔ اب کیا کہوں کیا دیکھا۔ حرامزدگی دیکھی۔ اس حرامزادے کی حرکت دیکھی۔ میں اس کے گھر گیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وہ حرامزدگی پر تلا ہوا ہے۔ کیا اسے پکڑا نہیں جا سکتا کیا ایسا بھی کوئی کرتا ہے ۔۔ ۔۔" یوں ہی کہتے ہوئے وہ میلوں چلے جاتے یا گھنٹے گزار دیتے اور سننے والے کو یہ نہ معلوم ہوتا کہ حرامزدگی کیا تھی۔ کہیں کہیں پر اپنے حساب فقرے بھی چھوڑتے اور ہنستے بھی مگر ان کے فقروں کا مزاح یا طنز کسی کے کبھی پلے نہ پڑا۔ وہ سمجھاتے بھی مگر اسی طوالت کے ساتھ کہ سمجھنے والے کی توجہ کبھی بھی نہ لگ پاتی۔ میرے اوپر تو ان کی باتوں کا یہ اثر ہوتا کہ ادھر انہوں نے بات شروع کی اور ادھر میرا دھیان کہیں اور چلا گیا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد میکانکی طریقہ پر میں ہاں ہوں کر دیتا اور وہ سمجھتے

کہ میں ان کی بات پر دھیان دے رہا ہوں مگر اصل میں مجھے بالکل یاد نہیں کہ انہوں نے کب کون سی بات چھیڑی اور کب تک اسے کس کس طرح پر گھستے رہے۔ میرے ذہن پر جو تاثر ہے وہ یہی کہ وہ برابر گھستے رہے، گھستے ہوئے چلے گئے۔

لوگ کہتے ہیں کہ گھسیسے کے دماغ نہیں ہوتا۔ مجھے بھی شک ہے کہ ہمارے گھسیسے صاحب کے بھی دماغ تھا یا نہیں۔ یہ مثل کہ جہاں دماغ بٹ رہا تھا وہاں وہ تھے ہی نہیں، ان پر صادق آتی ہے کیونکہ جتنی باتیں عقل و فہم سے تعلق رکھتی ہیں ان سب سے وہ بالاتر تھے۔ صحیح اور غلط، نیک اور بد کا ان کے یہاں بس اس حد تک سوال تھا کہ جو کچھ اوپر کے حکام کر دیں وہ صحیح بھی اور نیکی بھی اور جو غیر متعلق لوگ کہیں وہ غلط اور بدی بھی۔ "سرکاری حکم اس سلسلے میں یوں ہے۔ اسے کرنا ہی ہے۔" یہ جملہ وہ بہت دہراتے حالانکہ انہوں نے کبھی کچھ کیا نہیں۔ ایک دفعہ میں نے بات شروع کی "اس سلسلے میں سچی بات تو یہ ہے ۔۔ " انہوں نے فوراً میری بات کاٹتے ہوئے کہا "سچی بات کبھی نہ کہنا چاہیئے۔ ملازمت کرنا ہے۔ کون اپنے سر مصیبت مول لے۔ خاموش رہیئے۔ اور اگر یہ ممکن نہیں تو ہاں میں ہاں ملاتے رہیئے۔ یہی زندگی ہے۔" ان سے باتوں میں مجھے احساس ہوا کہ ان کے لیے سب سے بڑی قدر روپیہ تھی۔ اللہ کو بھی اس لیے مانتے کہ وہ روپیہ دے۔ "نہیں تو اللہ کی کوئی ضرورت نہیں۔" ریٹائر ہو جانے پر روپیہ کی فکر اور بھی بڑھ گئی تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ میرا کام اس لیے نہیں ہوا کہ میں نے ان کو روپیہ نہیں نذر کیا۔ یہ صحیح ہو یا غلط۔ یہ امر مسلّم ہے کہ وہ زیادہ تر باتیں ایسے لوگوں کی کرتے تھے جنہوں نے بہت روپیہ کمایا۔ ادب میں بھی ان کی دلچسپی اسی بنا پر تھی۔ ادب کا ذکر آتے ہی کہتے "اسکاٹ نے ڈکنس نے ناول نگاری سے کتنا کمایا اور برنارڈ شا۔ تو سب سے آگے نکل گیا۔ کہتے ہیں کہ اس کی کمائی دس پونڈ فی لفظ آ کر بیٹھتی ہے۔" یہ کہنے کے بعد وہ کچھ دیر خاموش رہتے۔ پھر کہتے "میں بھی ایسا ضرور لکھ سکتا ہوں۔ اب وقت آیا ہے لکھنے کا۔ سروس کے زمانے میں کہاں وقت ملتا تھا۔ اب وقت ہی وقت ہے اگر ایک افسانہ روز لکھ لیا تو پچاس روپیہ روز کی آمدنی تو ہو ہی جائے گی اور ایک مہینے میں تیس باب کا ایک ناول لکھ لیا تو ڈیڑھ ہزار کی آمدنی ہو گی۔" یہ کہنے کے بعد وہ کچھ دیر انتظار کرتے اور کہتے "یہی کروں گا"۔ کئی دن تک ان کا اشتیاق ردم درست ہوتا رہتا۔ کئی دن مناسب کاغذ اور قلم وغیرہ آتے رہتے۔ ممکن ہے کہ کسی وقت وہ لکھنے بھی بیٹھ جاتے ہوں مگر اب تک کوئی سطر ان کے نام سے چھپی ہوئی تو کہیں نظر نہ آئی۔ وہ یہ ضرور سمجھتے تھے کہ ہر وہ چیز جو وہ لکھ دیں گے شاہکار ہو گی خوب بکے گی اور تصنیف کی وقعت ان کے لیے اسی بات میں تھی کہ وہ کتنی بکی۔ ممکن ہے کہ ان کا قلم گھسیسے کی طرح کسی کاغذ پر چل رہا ہو اور قیامت آنے سے پہلے وہ کوئی ناول یا افسانہ ہی تکمیل کو پہنچا دیں یا یہ ممکن ہے کہ جب قیامت کا صور پھنکے تو وہ اسرافیل سے کہیں "ٹھہر جاؤ۔ ابھی جلدی کیا ہے۔ مجھے اپنا افسانہ تو مکمل کر لینے دو۔" اس سلسلے میں ایک پُرلطف بات اور تھی وہ یہ کہ حالانکہ انہوں نے اب تک ایک جملہ بھی نہیں لکھا تھا مگر خواب یہ دیکھا کرتے تھے "آتھرز کو پبلک پرس پریزنٹ کیا کرتی ہے اور سرکار بھی پنشن مقرر کر دیتی ہے۔" مگر ان سب امیدوں کو بھی وہ اپنے خوابوں میں گھسیٹتے ہی رہے اور ممکن ہے کہ بالکل گھسیسے کی رفتار سے اب کچھ کر رہے ہوں جو ان کے ان خوابوں کو شرمندہ تعبیر کر دے۔

کچھ عرصے کے بعد مجھے کئی اور لوگ ان کے سے ملے اور مجھے محسوس ہوا کہ وہ فرد نہیں بلکہ ٹائپ تھے۔ سب کامیاب سرکاری ملازم رہے تھے اس لیے مجھے خیال ہوا کہ شاید سرکاری ملازمت ایسا کردار بنا دیتی ہو مگر یہ دیکھ کر کہ وہ اکثر ایک خطے سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ مجھے محسوس ہوا کہ جغرافیائی حالات اس قسم کا نفس اور ایسے اونچے کردار بناتے ہوں۔ لمبا قد موٹا جسم اور ہر چیز بہم پہنچنے کی آسانیاں خوراک بڑھا دیتی ہیں اور دماغ کی تیزی کو کم کر دیتی ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اس زعم میں مبتلا کر دیتی ہیں کہ وہ ہی انسانیت کی تکمیل ہے۔ بزدلی اور غصہ کو بڑے اوصاف بنا دیتی ہیں اور ہر معاملے کو ایک مخصوص غلط فہمی سے سمجھ کر اس پر سر دھنتے رہنے میں مصروف کر دیتی ہیں۔ عہدہ پرستی۔ اقتدار پرستی۔ پسپائی اور خواہ مخواہ کا خوف اور ذمہ داری کا

منفی احساس یعنی یہ سمجھنا کہ کسی کام میں ہاتھ ڈالا اور پھنسے اس لیے اسے ٹالتے ہی جانا ایک مخصوص ذہنیت کی صورت میں نمایاں ہوتے ہیں۔ اکثر ڈاکخانوں کے کلرک اس ذہنیت کے نظر آئے جنہوں نے ایک رجسٹری کا خط لینے میں پچیس مین میخیں نکالیں اور بار بار دوڑایا۔ یہاں تک کہ غصہ میں آکر میری ان سے جھپٹ بھی ہوگئی۔ اکثر وکیل ایسے دکھائی دیے جنہوں نے مقدمہ کی پیروی کے سلسلے میں خوب خوب دوڑایا ہر کاغذ کے بعد کوئی اور کاغذ حاصل کرنے کی کوشش میں لگایا اور مقدمے کے مصارف بڑھاتے ہی گئے یہاں تک کہ مقدمہ کو ان سے لے کر دوسرے کو دیتے ہی بنی۔ اکثر مبلغ دین ایسے ملے، جنہوں نے وظائف اور عوامل کی طویل گھس گھس میں لگایا اور نہایت بیباکی اور بکمال خوف کے ساتھ اندھے عقیدے میں لگے رہنے کی دعوت دی۔ ان سب کے ذہن کو ایک مخصوص کج فہمی سے معمور پایا جو ہر چیز کو نہ معلوم کیا کا کیا سمجھتی تھی اور ہر کام کے سلسلے میں نہایت حماقت زدہ بہانے تراشتی تھی۔ ہر بات پہ شبہ کرکے عجیب خوف کے عالم میں آجانا اور پھر اس پر اس قدر سر دھننے لگنا کہ تمام دنیا اور مافیہا فراموش ہوجائے۔ ایسے لوگوں کے کردار کی مخصوص صفت معلوم ہوئی۔ ایسے لوگ خاص معاملوں کے سلسلے میں خوف کے عالم میں کہتے نظر آئے " وہ توجج ہے اور فلاں شخص اس کی خوشامد میں دن رات لگا رہتا ہے۔ اس سے ڈرتے رہنا چاہیئے کیا معلوم کیا لگا دے اور پھر کیا آفت آجائے۔ فلاں کے پاس اتنا روپیہ ہے وہ اس کے ذریعہ جو چاہے کرلے۔ اس کی ہر بات کو مان لینا چاہیئے" معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندگی میں کسی قسم کی قدروں کا وجود ہی نہیں مانتے۔ صرف خود کو محفوظ رکھنے والی جبلت ہی اس کے سارے کردار کی بنیاد ہے۔ وہ انسان کے درجہ پر آئے ہی نہیں اور یزداں اور شیطان دونوں سے بے نیاز ہیں۔ ان کے اندرونی نفسیات کا مطالعہ کرنے کے بعد گھیسے کے لیے انگریزی لفظ (EARTH WORM) ان کے لیے بھی نہایت درجہ موزوں نظر آیا۔ زمین کے کیڑے لاتعداد ہیں۔ گھیسے کو مخصوص طور پر زمین کا کیڑا کہنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ مٹی کی تمام پسپا اور پست صفات میں اگر جان پڑجائے تو جو کیڑا بنے گا وہ گھیسے کے سوا اور کوئی نہ ہوگا۔ گھیسے قسم کے لوگ بھی انسان کا وہ درجہ نہیں جن میں سرزمین کے تمام اثرات نے ایک جان اور انسانی صورت حاصل کرلی ہے۔ جان ہونے کی وجہ سے اپنا تحفظ کرنے کی جبلیت ان کے اندر آگئی ہے۔ انسانی صورت ہونے کی وجہ سے ذہن اور کردار بھی وجود میں آگیا ہے۔ مگر زمین کی سفلی صفات سے اوپر نہیں گیا ہے اور ذہن سے چمٹا ہوا اسی پر پڑا جسم۔ دماغ۔ کردار گھستا ہوا مسلسل سست رفتاری کے ساتھ گرم خرام ہے اس کی خودی بالکل مادی تمام خود غرضی ہے اور اس میں گم وہ گھستا ہوا چلا جارہا ہے۔ انسان سماجی جانور ہے۔ انسان کا انسان سے کام نکلتا ہے اگر ایسے شخص کو انسان سمجھ کر اس کے پاس اپنا کام لے جاؤ تو کام چولہے بھاڑ میں جاتا ہے اور اس کے ساتھ گھیسا ہوجانے کے سوا اور کچھ نہیں رہ جاتا۔

قدرت نے کوئی چیز بیکار نہیں بنائی اور گھیسے سے سب سے بڑا فائدہ جو بتایا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ زمین کو اندر ہی اندر زرخیز بناتا رہتا ہے۔ میں نے اکثر صبح کے وقت کھیتوں میں جاکر دیکھا کہ گھیسوں کے لاتعداد چھید ایک ایک انچ کی دوری پر نظر آرہے ہیں۔ ان چھیدوں کے چاروں طرف زمین سے ابھرا ہوا ایک چھوت ہوتا تھا جو گھیسے کی صورت کی مٹی کی بٹوں کے بڑے پیچیدہ پھیروں سے بنا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ ان چھوتوں کی مٹی نہایت صاف اور نہایت ملائم نظر آتی تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ گھیسا زمین میں اس طرح گھستا ہے کہ مٹی اس کے منہ میں جاکر اس کے جسم سے گزر کر پیچھے سے بٹوں کی صورت میں نکلتی رہتی ہے جن کا چھوت سطح زمین پر یہ صورت اختیار کرتا ہوا ابھر آتا ہے۔ ان چھوتوں کی مٹی اناج کے دانوں کی پرورش اور اس کے اُگنے میں مدد دیتی ہے۔ گنگا جمنا کی وادی کو زرخیز بنانے میں ان گھیسوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ جدید نظام میں یہ گھیسا صفت لوگ بھی کچھ ایسا ہی کام کر رہے ہیں۔ جدید دنیا دفاتر کی ہے جس کا نمائندہ ترین فرد کلرک ہوتا ہے اور کلرکی کے کام کے لیے ایسے لوگ فطرتاً موزوں ہوتے ہیں اسی لیے کلرکی میں کامیابی کے اعلیٰ ترین مدارج تک پہنچ جاتے ہیں۔ ہمارے نظام کامل نہیں ہیں اور ہمارے زیادہ تر کلرک گھیسے نہیں ہیں۔

اس لیے اپنے کام میں کچھ زیادہ کامیاب نہیں ہوتے اور کوئی خاص ترقی نہیں کرتے۔ مگر یہ امر مسلم ہے کہ کلرکی کے لیے انسان جس قدر زیادہ گھِسا ہوگا اتنا ہی اچھا ہے۔ جن صاحب کا میں یہاں ذکر کر رہا ہوں وہ گھِسے پن کے اس عینی نقطہ پر ہیں جس کے آگے جانا ممکن نہیں۔ انہوں نے ہمارے نظامِ حکومت کی سرزمین کو عینی حد تک زرخیز بنایا اس لیے ان کا شمار خادمانِ قوم میں ہونا چاہیے اور حکومت کو انہیں ایک خاص منہ مانگی پنشن دینا چاہیے تاکہ وہ خوشی سے زندگی بسر کریں اور ان کے سے دوسرے لوگوں کی حوصلہ افزائی ہو۔ دفتری زبان میں جسے (MEDIOCRE) کہا جاتا ہے ان میں بدرجہ اتم موجود ہے اور اسی قسم کے لوگوں کو زمانہ پکار پکار کر طلب کر رہا ہے۔ ہر فرد کو کامیاب ہونے کے لیے ان کی طرف توجہ دینا چاہیئے اور اپنے کو ان کی طرح بنانا چاہیئے۔

دانتے نے جہنم کے دروازے پر ایک بھیڑ دکھائی ہے۔ ایسے آدمیوں کی جن کو جنت میں داخلہ نہ ملا کیونکہ وہ جنت کے حسن کو خراب کر دیتے اور جہنم میں انہیں گھسنے نہیں دیا گیا۔ کیونکہ بدکار لوگ ان سے زیادہ شان دار ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ نیکوں اور بدوں کے علاوہ ایک قسم کے لوگ ہیں جو بالکل مٹی ہیں اور ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ یہ گھِسے قسم کے لوگ اسی دائرے میں آتے ہیں۔ آج کل جمہوریت کے زور نے ان میں سے کثیر تعداد میں لوگوں کو تعلیم یافتہ بنا دیا ہے اور عہدوں تک پہنچا دیا ہے۔ تمام نظام ان ہی کا بنایا ہوا ہے اور ان ہی کے لیے بنا ہے یہی اس میں کامیاب ہیں چاہے وہ کوئی بھی پیشہ اختیار کریں۔ ان ہی کا دور ہے جس میں مستقل نیک اور مستقل بد آدمی کا کوئی مقام نہیں۔ اکثریت کے خیالات اور مذہبی عقائد شدت سے ان ہی لوگوں کو فروغ دے رہے ہیں۔ ہیومن (HUMAN) یا انسان کا تصور ان ہی پر پورا اترتا ہے اور اسی معیار سے پرانے زمانے کے لوگوں کو بھی جانچا جاتا ہے۔ جمہوریت اپنے کمال پر جب ہی پہنچے گی اور یہ تمام ادارے جو جمہوریت کے نمائندہ ہیں اس وقت ہی کمال کارکردگی دکھائیں گے جب کہ ہر فرد بشر اسی طرح ہو جائے گا۔ اس لیے جن صاحب کا میں نے گھِسے کی تشبیہ کے ساتھ ذکر کیا ان کو ماڈل بنانا چاہیئے۔ آدمیت۔ انسانیت۔ کارپردازی۔ کارکردگی کا جدید دور کے لیے سب اچھا ماڈل!

کہانی وُہی ہے

کرتار سنگھ دُگل

گاڑی آنے میں ابھی آدھا گھنٹہ تھا۔ مالتی کو اپنے آپ پر غصّہ آنے لگا۔ وہ پھر وقت سے اتنا پہلے اسٹیشن پر پہنچ گئی تھی۔ جب اسے کہیں جانا ہوتا، گھر میں وہ ایڑی نہ ٹکنے دیتی۔ ہمیشہ آدھ پون گھنٹہ پہلے ہی اسٹیشن پر پہنچ جاتی۔ اور یوں جب وہ بور ہونے لگتی، ہمیشہ دل ہی دل میں فیصلہ کرتی کہ اگلی بار وہ وقت پر ہی آئے گی۔ زیادہ سے زیادہ پانچ دس منٹ پہلے۔ لیکن پھر جب سفر کرنا ہوتا، اسٹیشن پہنچ کر اسے پتہ چلتا کہ وہ تو پون گھنٹہ پہلے پہنچ گئی ہے۔

آج تو ستم ظریفی یہ تھی کہ گاڑی پر جانا اس کے گھر والے کو تھا۔ وہ دفتر سے ابھی پہنچا نہیں تھا۔ یہ گھر سے اس کا سامان لے کر پہلے آ گئی تھی جسے گاڑی پر چڑھنا تھا، وہ تو کہیں دور دور تک نہیں تھا اور پہنچانے والی پہلے ہی آن موجود ہوئی تھی۔

یونہی کھڑے کھڑے تھک رہی مالتی کو یوں لگا جیسے پلیٹ فارم کی بھیڑ میں کوئی آنکھیں اس کی پہچانی پہچانی سی ہوں۔ نہیں، اس شہر میں اس کی پہچان کا کوئی نہیں ہے۔ اور مالتی تلی کے بازو پر بندھے اس کے منبر کو پڑھنے لگی۔ لیکن نہیں یہ تو کوئی اس کا شناسا ہی لگتا تھا۔ بار بار اس کی طرف جھانک رہا تھا

شناسا ہوگا! کوئی ہوگا جس کے دل کے کسی تار کو اس نے چھیڑا ہوگا۔ اور مالتی نے اپنے ریشمی بالوں پر ہاتھ پھیر کر دیکھا، اس کے کندھوں پر جیسے ناچ رہے ہوں۔ تین بچوں کی ماں ہوگئی تھی۔ تو پھر کیا! اب بھی جہاں وہ بیٹھ جاتی، جدھر سے وہ گزر جاتی، اس کی کہانیاں شروع ہو جاتیں۔

لیکن ایک حسرت تھی۔ ایک کسک اس کے دل کے کسی کونے میں چھپی پڑی تھی۔ اس نے اس کے ساتھ چھل کیا تھا —— پہلی محبت کا درد کیسا ہوتا ہے۔ ابھی تک یہ ٹیس اس نے سنبھال رکھی تھی۔ ۔ ۔ لیکن یہ کن خیالوں میں وہ بہے جا رہی تھی۔

اس کا خاوند ہے، خوب صورت سجیلا۔ لاکھوں کا بیوپار ہے۔ تین بچے ہیں۔ دو بیٹے اور ایک لاڈلی سی بیٹی۔ سب چاند سے پیارے۔ خوش خوش، ہنستا بستا سا ان کا گھر ہے۔ اور آج یہ کون اسے یاد آ رہا ہے، کون؟

شاید وہی ہے۔ ٹک ٹک اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ کھمبے کے ساتھ ٹک کر کھڑا ہے۔ پلیٹ فارم پر بھیڑ کتنی بڑھ گئی ہے۔ جس کسی کو بمبئی جانا ہوتا ہے، فرنٹیئر میل کی ہی سوچتا ہے۔ اس لیے کہ یہ گاڑی وقت کم لیتی ہے۔ سفر میں دو گھنٹے بچائیں گے اور بمبئی پہنچ کر ٹیکسی کے لیے کیو queue میں چاہے تین گھنٹے کھڑے رہیں۔ مالتی سوچتے سوچتے مسکرانے لگی۔ اس کا چہرہ کھل سا گیا چمپئی رنگ۔

پھر اس کی نظریں ملیں۔ کوئی جانا پہچانا سا تھا۔ اس شہر میں کون ہو سکتا ہے؟ اس شہر میں آئے ان کو کچھ مہینے ہی ہوئے تھے۔ ٹھیکے داری کے جھمیلے، اس کے میاں کو ابھی فرصت ہی نہیں ملی تھی کہ کلب کے وہ ممبر بن سکیں۔ ہر چوتھے روز تو اسے باہر مال لینے جانا ہوتا ہے۔ اس شہر میں ان کی پہچان کا کوئی نہیں ہو سکتا۔

۔ ۔ ۔ کیسے اس نے اسے چھوڑا تھا اور پھر مالتی کی سہیلی کے لیے۔ اپنی محبوبہ کی سہیلی سے محبت کرنے لگ گیا تھا۔ ایک نظر اس نے

اسے دیکھا اور اس کا دل بھر آگیا۔ مالتی نے اپنی آنکھوں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں تو اسے دھوکہ نہیں دے سکتی تھیں۔ توبہ، توبہ! اتنی بدتمیزی! اتنی بے وفائی!

وہی ہے شاید۔ بڑی بڑی کالی آنکھوں میں ایک امٹ بھوک۔ ایک ٹک اس کی طرف دیکھے جا رہا ہے۔ جیسے نظروں ہی نظروں سے کوئی کسی کو باندھ رہا ہو۔ مالتی پسینہ پسینہ ہو گئی۔ اسے ڈر سا محسوس ہوا۔ اس نے پلکیں اٹھائیں تو ان کی نظریں آپس میں ٹکرا جائیں گی۔ یہ کیسا اسے محسوس ہو رہا ہے۔ اسے لگا جیسے اس نے تو اس کی کل محبت کہیں سنبھال رکھی ہے۔ دیوانی عورت! مالتی کا انگ انگ جیسے مہک اٹھا۔

نہیں، وہ نہیں۔ اب اس کی مالتی کی جانب پیٹھ تھی۔ ریلوے کے کسی کارندے سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ اور مالتی نے اس کی طرف دھیان سے دیکھا۔ وہ نہیں ہو سکتا۔ وہ تو ہمیشہ کوٹ پتلون پہنتا تھا۔ یہ آدمی تو شیروانی اور پائجامے میں ہے۔ وہ نہیں ہو سکتا۔ اس آدمی کا قد ذرا لمبا ہے۔ لیکن ہاتھ اس جیسے ہیں۔ نرم، ملائم، نازک، لانبی لانبی، کومل انگلیاں۔ کسی کاغذ کے ٹکڑے پر کچھ لکھ رہا ہے۔ نہیں وہ نہیں ہو سکتا، اس کے ہاتھ میں تو ہندی کا اخبار ہے۔ اسے ہندی نہیں آتی تھی۔ اس نے تو اردو پڑھی تھی۔

اور ایک دم مالتی کی نظریں فرش پر گر گئیں۔ ریلوے ملازم سے فارغ ہو کر اب وہ پھر اسی کو گھور رہا تھا۔ للچائی للچائی سی نظریں، مالتی کو لگا جیسے کوئی اس کے انگ انگ کو سہلا رہا ہو۔ اس کا روم روم سرشار ہوتا جا رہا تھا۔ ایک جھنجھلاہٹ جیسے اس کی پور پور میں چھڑ گئی ہو۔ یہ کیسی ٹھنڈی، میٹھی ہلچل سی مچ اٹھی تھی۔ مالتی کے بالوں کی ایک لٹ بار بار اس کے منہ پر آ پڑتی۔

اور مالتی کو یاد آیا، کیسے ایک شام یونہی اس کے بالوں کی ایک لٹ اس کے منہ پر پڑ رہی تھی، اور اس نے پہلی بار بالوں سمیت اس کے ہونٹوں کو چوم لیا تھا۔ بالوں کا دیوانہ! کیسے اس کے منہ کو بالوں سے ڈھک کر اسے پیار کرنے لگتا۔ توبہ، توبہ! کیسے دن تھے۔ دیوانگی کے دن۔

اور پھر اس کی ملاقات اس کی سہیلی عینی سے ہوئی ایک نظر میں اس کا دیوانہ ہو گیا۔ میمنے کی طرح اس کے پیچھے پیچھے پھرنے لگا۔ گنوار آدمی کی کوئی غیرت بھی ہوتی ہے۔ آنکھ کی کوئی شرم بھی ہوتی ہے۔ شاید عینی کے بال ہی اسے پسند آئے تھے۔ کتنا بھاری جوڑا اس کا بنتا تھا۔ یوں اس کا رنگ تو سانولا تھا۔

اور اب کیسے اسے گھور رہا ہے۔ گوری چٹی مالتی کی باہیں بے بلاؤز پہن کر مالتی کو لگتا جیسے وہ ننگی ننگی ہو۔ ایک تو یہ فیشن گھوم نہیں لینے دیتے۔ آگا ڈھکتی تو پیچھا خالی چھوڑ دیتی پیچھا ڈھکتی تو آگا ان ڈھکا ہوتا۔ یہ آج کل کی لڑکیاں! کیوں، آج کل کی تو مالتی بھی ہے۔ اس کا کیا بگڑا ہے! مالتی سوچتی۔ اب بھی کوئی اس کے لیے نہر کھود سکتا ہے، کوئی کان چھدوا سکتا ہے۔ عورت کا کبھی کچھ نہیں بگڑتا، اگر وہ خود ہار نہ مان لے زندگی سے۔

لیکن اگر وہ ہے، وہی ہے تو آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ کیوں نہیں پکڑ لیتا۔ جیسے وہ کبھی کیا کرتا تھا۔ گھنٹوں اس کی انگلیوں کے ساتھ کھیلتا رہتا جتنی دیر ان کے یہاں رہتا، مالتی کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں رہتا۔ مالتی کھیج اٹھتی۔ اگر وہی ہے تو آگے بڑھ کر کیوں نہیں کہتا۔ "ہیلو مالتی! میری جان!" مالتی کے کانوں میں، کئی برس پہلے سنے اس کے بول گونج رہے تھے۔ اور پھر مالتی بے چین ہونے لگی۔ اگر وہی ہے تو آگے کیوں نہیں بڑھتا۔؟ اس کے میاں کے آنے کا وقت ہو رہا تھا۔ کسی لمحے بھی وہ آ سکتا ہے اور پھر مالتی سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ کہیں یہ نہ سوچ رہا ہو کہ گاڑی میں سفر کرتے وقت ملاقات ہوئی۔ گاڑی سے تو اس کا میاں جا رہا تھا۔ وہ تو اسے گاڑی پر بس چڑھانے آئی تھی۔

کتنی مہین ساڑھی آج شام اس نے پہن رکھی تھی لیکن اتنا بھی کیا! جتنا وہ اپنے آپ کو لپیٹ لپیٹ کر رکھتی، اتنا ہی اسے محسوس ہوتا جیسے

وہ ان ڈھکی ان ڈھکی ہو۔ اور مالتی نے دیکھا، آج اس نے پیازی رنگ کی ساڑھی پہن رکھی ہے پیازی رنگ اس کا پسندیدہ رنگ تھا، اور پھر مالتی کا دل کہتا، وہ نہیں ہو سکتا۔ وہ ہوتا تو کبھی کا اس کے پاس آگیا ہوتا۔ پیازی رنگ تو اس پر جادو کا اثر رکھتا تھا۔ وہ نہیں ہو سکتا۔

جوں جوں گاڑی کے آنے کا وقت ہو رہا تھا، پلیٹ فارم پر گہما گہمی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ لوگ ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے۔ اور مالتی نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ اب اس کی، اس کی جانب پیٹھ تھی۔ اور مالتی دیکھتی رہ گئی۔ وہ بنچ کے پاس کوئی کھڑی تھی۔ موٹا، بھاری جوڑا، رنگ اتنا صاف نہیں۔ اور وہ ایک ٹک اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ دو منٹ، چار منٹ، دس منٹ! کیسے وہ بنا پلک جھپکے اس کی طرف دیکھے جا رہا تھا مانو کو جیسے بھول ہی گیا ہو۔ ایک بار بھی تو اس نے اسے پلٹ کر نہیں دیکھا۔۔ ۔۔ وہی ہے، مالتی کو یقین ہو چلا۔۔ ۔۔ وہی ہے۔

اور پھر مالتی کا خاوند آگیا۔ گاڑی کے آنے میں ابھی پانچ منٹ باقی تھے۔ مالتی کے خاوند کے ساتھ ان کا منشی تھا۔ مالتی کا جی چاہا کہ منشی جی کو بھیج کر دریافت کرائے کہ اس کا نام مدھوسورن ہے؟ مدھوسورن ——— راولپنڈی والا

لیکن پھر مالتی کے دل نے کہا —— کاہے کو؟ اسے یقین تھا کہ وہی ہے۔ مالتی کی جانب پیٹھ کیے وہ بنچ کے پاس کھڑی، اب وہ نئی آئی سواری کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا —— وہی ہے! وہی ہے!! مرد ذات !!!

سیندور کی ڈبیا

شکیلہ اختر

آج بے اختیار مجھے ڈولی یاد آرہی ہے، ہنستی مسکراتی قہقہے بکھیرتی، چھوٹے سے قد والی سانولی سلونی سی ڈولی، جو سینی ٹوریم کے سارے وارڈوں، سُرخ نرم بجری بچھی ہوئی والے راستوں، اور احاطے بھر میں ایک تتلی کی طرح دوڑتی پھرتی تھی، اُس کی بھولی بھالی صورت میں کوئی چیز بھی علیحدہ کرکے خوبصورت نہیں کہی جاسکتی تھی۔ میں نے جب پہلی بار اُس کو دیکھا تو اس کی چمکیلی آنکھیں اور مسکراتے ہوئے لب مجھے بہت اچھے لگے، میں ابھی اُسے اچھی طرح دیکھنے بھی نہ پائی تھی کہ وہ خود میرے قریب آگئی اور میری اُنگلیوں کو اپنے دُبلے پتلے ہاتھوں میں لے کر بڑے پیار سے مسکراتی ہوئی بولی۔

"اُوہ — جی چاہتا ہے کہ ان ہاتھوں کو سدا کے لیے اپنے کلیجے سے لگالوں۔" اور پھر اُس نے بے اختیار میری ان انگلیوں کو چوم لیا تھا۔ میں حیرت زدہ سی، اس لڑکی کو تکتی رہ گئی، جو اس طرح اچانک، میرے ہاتھ کو چوم کر جلدی سے واپس جارہی تھی۔ میں نے اس چھوٹی سی نرس کا اس وقت تک نام بھی نہ سُنا تھا، سینی ٹوریم کے اس وارڈ میں آئے ہوئے ابھی چند ہی گھنٹے تو ہوئے تھے، اور بس اتنی سی دیر میں وارڈ کے اس لمبے کمرے میں سفید بستروں والے بیڈ ہی گن سکتی تھی جو تعداد میں صرف آٹھ تھے، اور جو برابر برابر بچھے ہوئے تھے اور جن پر ٹی بی کی مریض عورتیں کچھ لیٹی ہوئی کھانس رہی تھیں۔ اور کچھ سُوکھی مُرجھائی سی بیٹھی اور کچھ چل پھر رہی تھیں، اِن بیمار صورتوں کو دیکھ کر میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔ مجھ کو سب سے کنارے کا بیڈ ملا تھا، اسی پر پاؤں لٹکائے بیٹھی، میں اپنے غموں اور حسرتوں کو چھپائے یہ سوچ رہی تھی کہ میں کہاں آگئی ہوں؟" یہاں آتے ہی مریض عورتوں کی ہمدرد نگاہیں میرے دل پر نشتر لگانے لگی تھیں۔ جن سے میرے زخمِ جگر کے سارے ٹانکے ٹوٹتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے اور جی چاہ رہا تھا کہ پھوٹ پھوٹ کر روؤں۔ میرے ہاتھوں میں لگی مہندی کی لالی نے میرے دل کے رِستے ہوئے زخموں پر سے پردا اُٹھا دیا تھا۔

کچھ مریض عورتیں میرے پاس آکر بولیں۔ "نئی دُلہن بچاری، پُورے پُور مہندی ابھی دمک ہی رہی تھی کہ پھولوں بھری سیج چھوڑ کر اس بیاباں میں آنا پڑا۔" میں نے بڑی بے بس نگاہوں سے انھیں دیکھا اور میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ اور میرے کانوں میں کہیں دُور سے ڈھول کی دھمکتی ہوئی گونج سنائی دینے لگیں۔

ابھی تو ہم نے ایک دُوسرے کو جی بھر کے دیکھا بھی نہیں تھا، کہ ڈاکٹروں نے ہفتے بھر کے بخار سے اکتا کر مجھے یہاں بھیج دینے کا مشورہ دیا، انھیں ایکسرے میں میرے داہنے پھیپھڑے میں ٹی بی کا شک ہوا تھا، اور جلدی سے جلدی سینی ٹوریم بھیج کر مجھے بچا لینے کی کوشش کی جانے لگی تھی۔ قیصی کو میری اس بیماری کی خبر سُن کر اتنا افسوس ہوا تھا۔ کہ وہ پاگلوں کی طرح

میری انہی اُنگلیوں کو اپنے گال سے لگا کر سسکتا رہا تھا۔ ہم نے ایک دُوسرے کو تڑپ تڑپ کر پایا تھا، مگر نجانے کس کی نظر کھا گئی تھی جو ہم دو مہینے بھی ساتھ نہ رہ سکے تھے کہ اتنی جلدی جُدا ہو گئے۔

ڈاکٹروں نے یقین دلایا تھا کہ اگر میں صرف چند مہینوں کے لیے سینی ٹوریم چلی گئی تو پھر جو ایک ہلکا سا بھی ٹی بی کا شک ہے وہ بھی ہمیشہ کے لیے مٹ جائے گا اور ہماری زندگی پھر بڑی مطمئن ہو جائے گی؛ ان ساری باتوں کو سن کر بھی قیسی نے بڑی مضبوطی سے میرا ہاتھ تھام لیا اور صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ وہ مجھ سے الگ نہیں رہ سکتا ہے، چاہے جو بھی ہو۔"

قیسی کی اِس ضد کو دیکھتے ہوئے اس کے گھر والوں کے ساتھ اِس کے فیملی ڈاکٹر نے چپکے سے مجھے یہ بتایا کہ اگر میں اپنے علاج کے لیے جلد سے جلد سینی ٹوریم نہیں چلی گئی تو میرے ساتھ قیسی کو بھی یہ خطرناک بیماری لگ سکتی ہے، اور اس طرح ہم دونوں پھر ہمیشہ کے لیے جُدا ہو جائیں گے۔ میں نے جب یہ ساری باتیں سُنیں تو پھر قیسی کی زندگی اور صحت کے لیے آخر بڑی مشکلوں سے رو دھو، اور منتیں کر کے اُسے راضی کر لیا اور اُس کے فیملی ڈاکٹر کے ساتھ یہاں چلی آئی۔

راستہ بھر آنسوؤں کا سیلاب تھا کہ امنڈا چلا آتا تھا۔

آنے کے وقت نقلی مسکراہٹوں کے ساتھ اپنا ہاتھ بڑھا کر قیسی کو ... خدا حافظ کہنا چاہا تو اُس نے بے اختیار میرے ہاتھ کو اپنے گالوں سے لگایا۔ اُسے چُوما اور پھر تیزی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس وقت میری آنکھوں میں اتنے آنسو بھر آئے تھے کہ میں اس کو جی بھر کے دیکھ بھی نہ سکی تھی، اور اب میں سینی ٹوریم کے بیڈ پر پاؤں لٹکائے غمگین بیٹھی تھی کہ نرس ڈولی نے میری اُنگلیوں کو چُوم کر میرے دل کے رِستے ہُوئے زخموں کے سارے ٹانکے اچانک توڑ دیے تھے۔

بڑی صبر آزما گھڑیاں گزار کر جب میں سینی ٹوریم کے حدود سے ہوتی اس وارڈ میں پہونچی تو جیسے میرے ضبط کی ساری طاقتیں یک بیک ختم ہونے لگی تھیں اور میرا جی چاہتا تھا کہ ان آٹھ بستروں والے کمرے کے در و دیوار سے لپٹ لپٹ کر میں خوب روؤں ——— اپنی منزل پر پہونچ کر میری ہمت ٹوٹنے لگی تھی۔ ہر طرف کھانسی اور بخار میں جلتی ہُوئی مریض عورتوں کو دیکھ کر میں اپنی صحت اور اپنی زندگی سے مایوس ہو گئی تھی، ——— یہاں کوئی علیحدہ کمرہ بھی ایسا نہیں تھا جہاں گھڑی بھر کے لیے دُوسروں کے غم سے نجات مل جاتی ——— میں نے جب اپنی بے بس نگاہوں سے اپنی منزل اور اپنی دُنیا کو دیکھا، تو بے اختیار مجھے اپنے آپ پر رحم آنے لگا۔ ابھی ابھی تو قیسی کے پیار بھرے بانہوں میں میری آنکھ ہی لگی تھی کہ موت کا ٹھنڈا ہاتھ مجھے میری جنّت سے چھین کر کہاں لے آیا تھا؟

نرس ڈولی جب اچانک میری اُنگلیوں کو اس طرح سے چُوم کر چلی گئی، تو مجھ کو ایسا لگا جیسے میں یہاں تنہا نہیں ہُوں، اور چند لمحوں کے لیے میرا سارا درد مٹ گیا۔ زندگی کی کوئی کرن نظر تو آئی۔ اس روز رات تک مجھے اس چھوٹے سے قد والی ہنستی مسکراتی سانولی نرس کا بڑا انتظار رہا، مگر وہ نہ آئی۔ رات کے نو بجے ایک دُوسری نرس آ کر چیپل کی گھنٹی زور زور سے بجانے لگی، پہلی گھنٹی، پھر دُوسری گھنٹی اور پھر تھوڑے سے وقفے کے بعد تیسری اور آخری گھنٹی ذرا دیر تک بجتی رہی تھی

گھنٹی بجتی رہی، اور کوری ڈور کے سوا پورے وارڈ کی ایک ایک کر کے ساری بتیاں بجھتی چلی گئیں، مریض عورتیں اپنے اپنے بستروں پر لیٹ گئیں، ہر طرف اچانک ایک ہولناک سناٹا چھا کر رہ گیا تھا، میں نے بڑی حسرت سے اپنے پلنگ کو دیکھا۔ ہلکی تاریکی میں جس کا سفید بستر کسی کفن کی طرح ڈراؤنا لگ رہا تھا، اپنے بیڈ پر لیٹ کر میں نے جب اپنے شانوں تک کمبل کھینچ لیا تو بے اختیار ایک بڑی ٹھنڈی اور گہری آہ چپکے سے میرے لبوں پر آئی ——"آج میں تم سے کتنی دور ہوں فیسی پیارے" اور پھر میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

صبح کا ہلکا دھندلکا رات کی تاریکیوں کے نقاب سے ابھی جھلک رہا تھا کہ میری نیند ٹوٹ گئی، ایک لمحے کے لیے میرا جی دھک سے رہ گیا، نیند کی مدہوشی نے مجھے کیسا سکون بخشا تھا؛ جیسے میں کسی قیامت سے بھی گزری ہی نہیں تھی، مگر جب آنکھ کھلی تو حقیقت نے تڑپا کر رکھ دیا۔ وارڈ کے اندر دودھیا بلب کی ہلکی روشنی میں کچھ مریض عورتیں کھانسی سے بدحال ہوئی جاتی تھیں، کوئی کراہ رہی تھی اور ایک لمبی سوکھی سی نرس جو سیاہ کنارے کی سفید ساری پہنے ہوئے تھی باری باری سب کا ٹمپریچر لے رہی تھی۔ وارڈ کے سارے دروازے کھلے ہوئے تھے باہر احاطے کی طرف سے پھولی ہوئی نوار اور رانتی کی خوشبوؤں سے لدی سرد اور بوجھل ہوائیں چلی آ رہی تھیں۔ چڑیوں کی چہکار، نکھرتی ہوئی صبح کو بے حد حسین بنا رہی تھی، سکھوا اور ساگوان کے خوبصورت گھنے جنگلوں میں سے سنہرا اُفق بڑے دھوم دھام سے چمکنے والا تھا؛ میرے اداس جی کو کسی چیز نے متاثر نہ کیا، میں افسردہ سی اپنے بیڈ پر بیٹھی ہوئی اپنی مہندی لگی اُنگلیوں کو دیکھنے لگی جہاں مہندی کی لالی اب ہلکی ہو کر پیلی پڑ چکی تھی۔ مگر نوکیلے ناخن پر کنارے سے اُبھرے ہوئے سفید ہلالی حاشیے کے ساتھ مہندی کی لالی ابھی تک دمک رہی تھی، سنتی آئی تھی کہ جادوگر انگوٹھے کے ناخن پر آنے والی باتوں کی جھلکیاں دکھا دیتے تھے، لیکن میں اپنی مہندی لگی اُنگلیوں میں اپنی بیتی ہوئی مسرت کی دُنیا دیکھ رہی تھی۔

پھر سارا دن ڈاکٹروں کا چکر چلتا رہا، زندگی کی ناؤ ڈوب ڈوب کر اُبھرتی، تھپیڑے چلتے اور کمزور دل کے اندر زندگی کے ساحل پر پہونچنے کی تڑپ شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی۔ اور میں اس لمبے وارڈ کے اندر ٹی بی کی مریض عورتوں کے درمیان خود کو تندرست محسوس کر رہی تھی، یہاں آنے سے پہلے میں نے اپنے مرض کو اتنا بھیانک نہیں سمجھا تھا، مگر یہاں آتے ہی جب مجھے اِن بیڈ کر دیا گیا اور زیادہ بولنے پر بھی پابندی لگا دی گئی، تب سے میرا جی ڈوبا ڈوبا سا رہنے لگا تھا، اب تک میں اسی خوشگوار خیال کے ساتھ یہاں تک پہونچی تھی کہ اس صحت گاہ میں آ کر حیات کا کوئی ستون چھو کر میں اپنی رنگین دُنیا میں جلد ہی لوٹ جاؤں گی۔

میرے قریب ہی ایک خوبصورت عورت کا بیڈ تھا، وہ صحت یاب ہو چکی تھی۔ روزانہ ایک میل واکنگ کی اُسے اجازت مل چکی تھی، اور یہی ایک میل کی لمبی سیر سینی ٹوریم میں اچھی اور نارمل صحت کی نشانی سمجھی جاتی تھی، اس کے گورے چٹے رنگ پر چہرے کی تراش بہت پیاری تھی، مسکرائے بغیر اُس سے کوئی بات کہی نہ جاتی تھی، وہ بڑا گہرا رنگ پہننے کی عادی تھی، ہاتھوں میں کھنکاتی ہوئی چوڑیاں پہنے رہنے کا اُسے بڑا شوق تھا، اس کے لبوں پر پان کی لالی دمکتی رہتی اور اس کی آنکھیں کاجل کے کھینچے

ہوئے ڈمبالے سے ہر گھڑی سنوری ہوئی رہتی تھیں، میں نے اس وارڈ میں آتے ہی سمجھ لیا تھا کہ اس جگہ چھائی ہوئی موت کے گھور اندھیرے میں اک بس وہی زندگی کی چلتی ہوئی نبض تھی، جس کو دیکھ کر ابوس دلوں میں بھی اُمید و آس کی کوئی لہر کبھی دوڑ جاتی ہے۔

اس بلیے وارڈ میں بڑی یگانگت نظر آتی تھی، ایک ہی طرح کے بیڈ تھے، سرہانے ڈولیاں دھری تھیں اور مریضوں کے بیڈ کی پائنتی میں لٹکے ہوئے چارٹ میں بہت حد تک بخاروں کے اونچے نیچے گول گول دائرے آڑی ترچھی لکیروں کے ساتھ دور ہی سے نمایاں نظر آتے تھے۔ یہاں دلوں کی دھڑکنیں بھی ایک ہی سی تھیں اور تمنائیں بھی، خوف ودہشت میں رینگتے ہوئے سایوں میں زندگی کی تھرتھراہٹیں بھی ایک ہی طرح کی تھیں۔ سہمی ہوئی کمزور حیات موت سے پناہ لینے کو اس ویرانے میں آگئی تھی لیکن موت یہاں بھی اُن کا پیچھا کرتی چلی آتی تھی۔

میں دُوسرے دن بھی اس سانولی ہنستی ہوئی چھوٹے قد والی نرس کا انتظار کرتی رہی تھی مگر وہ نہ آئی، دُوسری نرس میرے پاس آکر بڑے پیار سے بولی۔

"آپ کو نرس ڈولی سے کوئی تکلیف تو نہیں پہونچی؟ وہ پگلی لڑکی کبھی کبھی اپنے آپ پر قابو پانا نہیں جانتی، بھلا آپ نے اُسے کیا سمجھا ہوگا؟" یہ کہتے کہتے وہ ہنس پڑی۔ اس کے صندلی رنگ کے چہرے پر جگمگاتی ہنسی نجانے کیوں مجھ کو بہت اچھی لگی، اور اسی وقت میں نے سمجھا کہ یہاں کی نرسیں اپنے مریضوں کو بہت پیار سے رکھتی ہیں۔

پھر وہ نرس میرے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر دیکھتی ہوئی بولی۔

"آپ کے ہاتھ سچ مچ بڑے پیارے ہیں۔ کل رات سے نرس ڈولی کا موڈ بڑا آوف ہے، آپ کے اس بیڈ سے اس کو بڑا گہرا لگاؤ رہا ہے۔ آپ کو دیکھ کر اسے بالکل یاد نہ رہا کہ آپ ایک نئی پیشنٹ ہیں۔ پھر اب اُسے بڑی شرمندگی محسوس ہو رہی ہے۔"

نرس کی ان باتوں کو سُن کر میں اُداس ہوگئی۔ دم بھر کے لیے اس ویرانے میں نرس ڈولی کے پیار سے جو سکون ملا تھا وہ اچانک ختم ہوگیا۔ میں کل رات سے اس کا اس شدت سے انتظار کر رہی تھی جیسے یہاں وہی تو میری اک اپنی تھی مگر آج وہ سہارا بھی ٹوٹ کر رہ گیا۔

جب وہ نرس چلی گئی تب میں نے اپنے بیڈ کو گہری نظر سے دیکھا مگر وہاں کچھ بھی تو نہیں تھا۔ صرف اپنے سفید بستر پر میں اکیلی پڑی تھی۔ لیکن میرے ذہن میں کسی لڑکی کے پیارے پیارے ہاتھ اُبھرتے رہے جس کے دھوکے میں نرس ڈولی نے میری اُنگلیوں کو بے اختیار چوم لیا تھا، اسی بیڈ پر وہ خوبصورت ہاتھوں والی لڑکی میری ہی طرح لیٹی رہا کرتی ہوگی۔ کیا اس کے دل کی دھڑکنوں میں بھی کسی کی یاد تڑپتی ہوگی؟ ——— بہت دیر تک میں اس لڑکی کا نقشہ اپنے تصور میں بناتی رہی۔

اس کی بیمار سی کمزور آنکھیں، اس کے تھرتھراتے بخار میں جلتے ہوئے لب اور مرجھایا ہوا زرد، نازک سا چہرہ،۔

کیا پتہ؟ پھر اس لڑکی کا انجام کیا ہوا ہو ؟ ——— کتنی آس لگا کر وہ اسی بیڈ پر آنے والے اچھے دنوں کا انتظار کرتی رہی ہوگی! میرا دل اداس ہو گیا۔ اُس نرس نے خواہ مخواہ میرے دل کے شکستہ تاروں کو چھیڑ دیا تھا۔

ساری رات میں جاگتی رہی ——— اگر وہ لڑکی اسی بیڈ پر مر چکی ہے تو اُس کے خوبصورت ہاتھ اب کہاں نظر آئیں گے؟

"اللہ۔ میں کس مصیبت میں پھنس گئی تھی، سینی ٹوریم کے اندر تاریک رات کے سناٹوں کو کاٹنا کسی قیامت سے کم نہ تھا۔ آنے والی صبح گرچہ ہر روز کی طرح ہم مریضوں کے لیے کوئی خوشی کا پیغام نہیں لایا کرتی تھی پھر بھی طلوعِ سحر کا ہمیں کتنا انتظار رہتا تھا ——— تاریکیاں چھٹتی جاتی تھیں اور سنہرا دن نکھر آتا تھا۔ شاید اسی طرح ہم بھی کبھی اپنی مسرتوں کی صبح کو پالیں گے ——"

میرے پاس ہی مسز علی کا بیڈ صبح بہت سویرے ہی خالی ہو جاتا تھا۔ انھیں لمبی واک کی اجازت مل گئی تھی اور دھوپ پھیلنے سے پہلے اُن کو واپس آجانا ہوتا تھا۔ مسز علی کے مسکراتے لب یہاں مایوس مریضوں کے لیے نویدِ حیات تھے۔ کھوکھلی نگاہیں اور اُبھری ہڈیوں والے چہرے کبھی کبھی اُن کی طرف بڑی حسرت سے تکا کرتے تھے۔ مگر انسان کتنا بے بس تھا کس قدر مجبور ——!

سامنے آم کے باغوں میں سے جب کسی کوئل کی کوئی پکار سنائی دیتی تھی اس آواز کو سن کر ایسا لگتا جیسے بیتی ہوئی زندگی ہمیں ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ مگر ہم کہاں تھے؟ اور پھر جیسے کوئی سرگوشیوں میں ہم سے پوچھتا تم کہاں آگئیں ——؟ تمہارے وہ سنہرے دن، وہ رُوپہلے اور رنگین خواب اچانک کیوں چھین لیے گئے؟

صبح ڈاکٹروں کا راؤنڈ جب ختم ہو چکا تھا اور میں بیٹی بیٹی قیسی کو خط لکھ رہی تھی۔ تو اچانک بلا انتظار کیسے ڈولی اپنے ہاتھ میں پھولوں کا ایک گلدستہ لیے ذرا شرماتی ہوئی سی میرے پاس آگئی ——— اس نے کچھ کہے سنے بغیر میرے گلاس میں پھولوں کو سجا دیا اور پھر مجھ پر ذرا جھکتی ہوئی بولی۔

"آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

میں ہنس پڑی۔ "آج آپ نے میرے ہاتھوں کو پیار نہ کیا۔؟" اُس کے دُبلے اور سانولے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی ہی تھی کہ اُس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

"——— اُس روز؟ اُس روز نہ جانے کیوں اچانک بھولے سے میں نے آپ کو پونم سمجھ لیا تھا۔"

"پونم ——— تو پونم کے بیڈ پر جب میں آگئی ہوں، تو آپ مجھے پھر اپنی پونم بنا لیں، میں کوشش کروں گی کہ آپ کے لیے آپ کی پونم بن سکوں۔" نجانے کیسے جذباتی طور پر میری آواز بھرا گئی۔ ایسی وحشت ناک تنہائی میں شاید مجھ کو کسی دوست کی ضرورت تھی۔ اور ڈولی نے جس بے ساختہ پن سے میری انگلیوں کو چوم لیا تھا اور جب اُس کے کپکپاتے ہوئے گرم لبوں کی جنبش نے ذہنی طور پر اس کو مجھ سے قریب کر دیا تھا تو اب میں یہ چاہتی تھی کہ ڈولی اپنا سارا خلوص مجھے دے دے۔

ایسے ویرانے میں اُس کی محبت کے سوا مجھ کو اور کوئی سہارا بھی تو نظر نہ آتا تھا۔

میں نے جب اس کی طرف دیکھا تو اس کے آنسو ٹپک رہے تھے، میں نے ڈولی کا ہاتھ پکڑ کر اس کو اپنے بستر پر بٹھا لیا۔ اس وقت میں یہ بھول چکی تھی کہ ٹی۔ بی کے مریض اتنے خطرناک ہوتے ہیں کہ وہ اپنے پاس کسی کو پیار سے دم بھر کے لیے بیٹھا بھی نہیں سکتے۔

ڈولی میرا ہاتھ تھام کر سسکنے لگی۔ "مجھ کو آپ کے ان ہاتھوں سے بہت پیار ہے۔ مہندی لگی یہ لمبی لمبی نازک سی اُنگلیاں۔ بالکل جیسے میری پونم کے ہاتھ ہوں۔" پھر وہ گھبرا کر اُٹھ کھڑی ہوئی، اگر سسٹر مجھے اس طرح آپ کے ساتھ بیٹھے دیکھ لے گی تو مجھ پر بڑی ڈانٹ پڑے گی۔"

پھر وہ بڑی معصومیت سے ہنس پڑی۔ "اچھا۔ تو پھر ہم دوست ہیں نہ؟" اور وہ اپنی سفید ساری کا پلو تھامے مجھ کو پلٹ پلٹ کر دیکھتی اور ہاتھ ہلا ہلا کر ٹاٹا کرتی وارڈ سے نکل گئی۔

مسز علی سوئٹر کی سلائیاں تیزی سے چلاتی ہوئی مسکرا کر بولیں "تو آخر اُس نے آپ کو پونم بنا ہی دیا۔" ـــــــ شاید بہت دیر سے وہ ہمارا تماشہ دیکھ رہی تھیں۔

"آپ نے یہاں کی دُنیا تو دیکھ لی نہ؟ ـ ہمارا یہ وارڈ بڑا اچھا وارڈ ہے، ایک ساتھ مل کر جب ہم اپنا غم مناتے ہیں تو اُس وقت صرف اپنی ہی بے چارگی پر ترس نہیں آتا۔ دُکھوں سے بوجھل کئی آنکھیں۔۔ ۔۔ ایک ساتھ اُونچے آسمان سے شکوہ کرتی نظر آتی ہیں۔ مسز علی نے اپنے وارڈ کا جیسے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ اُن کے چہرے پر گرچہ صحت کی سُرخی دوڑ رہی تھی۔ مگر اُن کی آنکھوں میں گہری اُداسی کے سائے تیر رہے تھے، مسکراہٹ اس وقت بھی اُن کے لبوں پر موجود تھی مگر غم کی پرچھائیں نجانے کہاں سے اُن پر چھا گئی تھیں ـــ

ایک بجے ریسٹ پریڈ کی گھنٹی سُنتے ہی ہر طرف ہُو کا عالم چھا جاتا تھا، جیسے زندگی یہاں پر کبھی رواں دواں تھی ہی نہیں۔ بس کبھی کبھی ہلکی چاپ سے کوئی نرس اپنے کاموں میں لگی سامنے سے گزر جاتی تھی۔ ایسے چھائے ہوئے سناٹے میں نرس کے قدموں کے نیچے پھسلتے ہوئے مرمر کی مدھم سی گونج بھی دُور تک سنائی دیتی تھی۔

اس روز دوپہر بھر مجھے ذرا بھی چین نہ ملا۔ گھڑی گھڑی پونم کی خیالی صورت نگاہوں میں پھرتی رہی۔ اب تک مجھ کو کسی نے یہ نہیں بتایا تھا کہ پونم کا انجام کیا ہوا؟ اور میں کسی سے چھیڑ کر یہ پوچھنا بھی نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ جس بیڈ پر میں پڑی تھی یہی بیڈ تو پونم کا تھا۔ اور ـــــ اور اگر پونم اب زندہ نہیں ہے تو پھر کیا پتہ کہ میرا بھی۔۔ حشر کیا ہونے والا ہے۔ دل زور زور سے دھڑکنے لگا ـــــ تو کیا پھر ـــــ پھر میں اپنی خوشیوں کی دُنیا میں کبھی لوٹ سکوں گی؟

نرس کیتھرائن نے مالتی کے سُرخ پھولوں سے بھری ایک مہکتی ہوئی ڈالی میری بند آنکھوں پر دھیرے سے ماری اور میں ڈر کر چونک پڑی۔

"ارے ـــــ اتنا تو نہ سوئیے مسز ـــــ" وہ بڑے ناز سے اٹھلاتی ہوئی بولی۔ اتنے دنوں میں نئی دُلہن کے اس

دُکھ نے نرسوں اور مریضوں کے دلوں میں میرے لیے بڑی ہمدردی پیدا کر دی تھی۔

کیتھرائن کی نزاکت اور چہرے کی تیکھی سارے سینی ٹوریم میں مشہور تھی وہ اپنے آپ کو اس اُونچے آسمان تلے سب سے بلند و بالا سمجھتی آ رہی تھی۔ ڈولی سے اس کی ذرا نہ بنتی' دونوں کی فطرت میں زمین و آسمان کا فرق تھا، ڈولی ٹوٹ کر محبت کرتی ہوئی نثار ہو جانے والی لڑکی تھی مگر کیتھرائن شمع کی طرح خاموشی سے جلتی ہوئی اپنے پروانوں کو قربان ہوتے دیکھنا چاہتی تھی ——— میں نے جب پھولوں بھری ڈالی کیتھرائن کے ہاتھوں سے لینی چاہی تو وہ مسکراتی ہوئی جھکی اور سرگوشیوں میں بولی۔ "ڈولی سے بچی رہنا ——— ہاں! پونم کو ڈس چکی ہے۔"

اور اتنا کہہ کر کیتھرائن پھر اٹھلاتی ہوئی وارڈ سے نکل گئی' ——— پونم کی کہانی کا کوئی سرا سمجھ میں نہ آتا تھا۔ ڈولی پونم پر جان چھڑکتی تھی اور کیتھرائن اسی کو ناگن بنا کر چلی گئی ——— میں نے گھبرا کر پونم اور ڈولی دونوں کا خیال ترک کر دینا چاہا ——— اپنا ہی غم کون سا کم تھا جو دوسروں کی آگ میں سلگتی رہتی۔

مسز علی جاگ رہی تھیں' کیتھرائن کے جانے کے بعد کروٹ بدل کر آہستہ سے بولیں۔

"یہ کیتھرائن کیا کہہ رہی تھی جھک کر ——— ؟"

"کہہ رہی تھی کہ ڈولی سے بچی رہنا' پونم کو اسی نے ڈس لیا تھا۔" میں نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

"ہُوں ———" مسز علی نے بڑی لمبی سانس لی۔

"بچاری ڈولی ——— وہ تو اپنی جان دے کر بھی پونم کو بچانا چاہتی تھی۔ اُس کو ڈسنے والی کون ناگن تھی۔ میں تمھیں کبھی یہ بتا دوں گی۔" دم بھر کے لیے ان کے سُرخ لبوں پر مسکراہٹ مدھم پڑ گئی تھی۔

اتنے ہی دنوں میں' میں سینی ٹوریم کے اندر رچی ہوئی زندگی کی عادی بن چکی تھی۔ اپریل کی خوشبوؤں سے بوجھل ہوائیں جب بچھڑی ہوئی پیار بھری گھڑیوں کی یاد دلا جاتیں تو دل میں ہوک سی اٹھ جاتی تھی' اور آنکھیں خود بخود بھیگ جایا کرتیں۔

وارڈ کے اندر صبح بہت سویرے ہو جاتی تھی' صفائی کا بڑا اہتمام ہوتا' جگہ جگہ تازہ پھولوں کے گلدان سجائے جاتے اور دُھلے ہوئے پردے لٹکائے جاتے اور بستروں کی چادریں بدلی جاتیں۔ گیمکسین پوڈر اور فنائل سے فرش اتنا چمکایا جاتا تھا کہ اس پر لوٹ پوٹ کرنے کو جی چاہتا تھا۔ برآمدے میں بڑے بڑے سُرخ رنگ کے گملوں میں پام کے ہریالے بڑے بڑے پتّوں کو دھو کر چمکا دیا جاتا تھا ——— ہر طرف تازگی اور زندگی کی لہر دوڑ جاتی تھی ——— کبھی کبھی ہمیں یہ احساس بھی نہ ہوتا تھا کہ اس جگہ ہم موت کے سائے میں رہ کر زندگی کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ سامنے دُور تک خوبصورت سجل کٹی ہوئی دو رویہ ہریالی باڑوں کے بیچ سے مُرم کی سُرخ بل بہ بل کھاتی ہوئی سڑکیں گزرتی چلی گئی تھیں' جگہ جگہ پارک بنے ہوئے تھے جن میں رنگ برنگے پھول مہک رہے تھے' ہر طرف اُونچے ٹیلوں کے اُوپر اور نیچے پہاڑوں کے دامن میں سکھوا اور ساگوان کا ہرا بھرا جنگل پھیلا ہوا تھا۔ کہیں پر جنگلی آموں اور کٹھ جامن کے خودرو درختوں کے جنگل پھیلتے چلے گئے تھے۔

وارڈ کے اندر صبح سویرے کا وقت بڑا اچھا لگتا تھا' مریض تھوڑی دیر کے لیے اپنا غم بھول جاتے تھے' دُھلا دھلایا

تازہ سویرا ہماری زندگی میں جب طلوع ہوتا تو ہمارے افسردہ دل بھی امیدوں سے بھر جاتے تھے اور بار بار یہی خیال آتا تھا کہ ایک تاریک پہاڑ سی رات کاٹ کر آخر ہم نے صبح کا اُجالا پا ہی لیا ہے ——— اور شاید اسی طرح کبھی اپنی زندگی اور مسرتوں کی منزلیں بھی ہمیں نصیب ہو جائیں گی۔

نرسیں بڑے پیار سے مریضوں کو دیکھتیں، ان کے بستروں کو بدلتیں، ان کے بالوں کو سنوارتیں، ان کے کپڑوں پر جراثیم کش لوشن چھڑکتیں، اور المونیم کے ڈھکن لگے اسپوٹم فلاکس میں تازہ فنائل دے کر ہر ایک بیڈ کے پاس اسٹول پر رکھوا دیتیں اور جب یہ سب کچھ ہو چکتا تب سینی ٹوریم کے سب سے بڑے ڈاکٹر اپنے اسٹاف کے ساتھ آتے اور ایک ایک مریض کو بڑے پیار سے دیکھتے، انھیں تسکین دیتے، ہنساتے، بہلاتے اور آنے والے اچھے صحت مند دنوں کے خوبصورت سپنے دکھلاتے۔ اور شاید انہی سہاروں کو پا لینے کے لیے ہمیں روزانہ بڑے صاحب کا بے چینی سے انتظار رہتا تھا۔ وارڈ کی طرف آتے ہوئے اُن کے جوتے کی مخصوص آہٹ کو سُنتے ہی ہمارے دلوں کی دھڑکنیں تیز ہو جایا کرتی تھیں ——— کبھی کبھی تو ایسا بھی محسوس ہوا کرتا تھا جیسے بڑے صاحب کے رُوپ میں زندگی سامنے کھڑی نس نس میں سرایت کرتی چلی جا رہی ہے۔ ہم ساری مریض عورتیں بڑی آس اور التجا بھری نگاہوں سے بڑے صاحب کے سیاہ چہرے پر چمکتی ہوئی ذہین آنکھوں کو تکا کرتیں، جن میں ہمارے لیے خوشی اور غم کے پیغام ہوا کرتے تھے۔ بڑے صاحب کے چہرے کی مہک، خوشی اور اداسی ان کی بے فکری اور فکرمندی کے انداز، ہم بڑی بے چینی سے دیکھتے اور پل بھر میں اپنی اپنی قسمتوں کا کچھ دنوں کے لیے ہم خود ہی فیصلہ کر لیتے تھے۔ ——— بڑے صاحب کا چہرہ، ان کی سوچتی ہوئی آنکھیں، اور پھر ان کے لبوں کی مسکراہٹ، ان کی چونک، اور سنجیدگی ایسی ہوا کرتی تھی جو ہمارے بیمار پھیپھڑوں کے لیے اکسیر کا کام کر دیتی اور ڈاکٹر صاحب کے دلاسے، اور تسکین کے باوجود اپنی بیماریوں کا اچھا اور بُرا رپورٹ ہر روز ہماری نگاہوں کے سامنے آ جاتا تھا ——— شاید اسی کھوج اور اسی اشارے کے لیے ہم سارا دن اور ساری راتیں اتنی بے چینی سے گزارا کرتے تھے۔ اور جب ان کا راؤنڈ ختم ہو جاتا تو وارڈ کے سناٹے میں اچانک طور پر ٹی۔ بی کے خطرناک جراثیم کا شدید طور پر احساس ہونے لگتا تھا، جو اس وارڈ کے اندر اور باہر ہر طرف فضا میں تیر رہے ہوں گے ———!

کسی کسی بیڈ کی طرف سے آتی ہوئی سوکھی اور حلق میں اٹکی ہوئی کھانسی کی آواز دُوسرے مریضوں کو دہلا دیتی تھی۔ کھانستے کھانستے اُبل پڑنے والی کمزور آنکھیں اور دھنسے ہوئے سینے کے اندر سے اُبھرنے والی گھڑگھڑاہٹوں کی آوازیں، کبھی کبھی مجھے رُلا دیا کرتی تھیں اور میرا جی چاہنے لگتا تھا کہ میں یہاں سے کہیں بھاگ جاؤں۔

ڈولی کی ڈیوٹی دُوسرے وارڈ میں تھی، مگر جب بھی اس کو فرصت ملتی اپنے کوارٹر جانے سے پہلے میرے پاس ضرور آتی چھوٹے سے قد کی دُبلی پتلی مسکراتی ہوئی نرس جب میرے پاس آتی تو اُسے دیکھ کر مجھے بڑا سکون ملتا تھا ——— وہ آتے ہی سب سے پہلے میرا چارٹ دیکھتی۔ پھر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بڑے پیار سے کہتی۔ "بس اب تو جلدی سے اچھی ہو جا ——— پھر ہم یہاں جھیل کنارے جائیں گے، پہاڑ کے دامن میں آنکھ مچولی کھیلیں گے ——— اور ——— اور کیا کریں گے؟ ڈولی پھر شرارت سے ہنس پڑتی ——— اس کے سفید خوبصورت دانت ہنستے میں بہت اچھے لگتے تھے۔ اور اس کی معصوم تمناؤں کو سُن کر کبھی کبھی میں

بڑی بے چینی سے اپنی صحت کا انتظار کرنے لگتی تھی۔

ایک دن ڈولی بہت سے پھل لیے میرے پاس آئی' کل وہ اپنی چھٹی کا ایک دن گزارنے قریب ہی شہر چلی گئی تھی، جہاں دن بھر گھومتے پھرتے ہوئے اُس نے مارکیٹنگ کیا تھا اور مارکیٹنگ کرتے ہوئے اُس نے چند چھوٹے چھوٹے کھلونے چُرا کر اپنے بلوز کے اندر بھی رکھ لیے تھے اور پھر میٹنی شو دیکھ کر واپس آگئی تھی۔

"ارے آج تیرے چہرے پر یہ آثار کیوں پھوٹ رہے ہیں؟" ڈولی نے بڑے تعجب سے مجھ سے پوچھا' میں ہنس پڑی۔ قیسی کا آیا ہوا خط اس کی طرف بڑھاتی ہوئی بولی۔

"میری خوشیوں کا دیوتا ——— دیکھو مجھ سے کتنا پیار کرتا ہے۔"

"اور ——— تیرے لیے تو خوشیوں کی کوئی اور دیوی جیسے ہے ہی نہیں' ——— ڈولی کا مسکراتا ہوا چہرہ ماند پڑ گیا' ——— جیسے وہ اپنی محبت میں کسی دُوسرے کو حصہ دار بنانا نہیں چاہتی ہو۔ مجھ کو ڈولی کا یہ انداز اچھا نہ لگا ——— قیسی کے پیار بھرے خط کی یہ تضحیک تھی ——— شاید ڈولی نے میرے بدلتے ہوئے مُوڈ کو پہچان لیا تھا' کہنے لگی۔

"یہ آدمی لوگ' کبھی کبھی ہمیں بیوقوف بھی بناتے رہتے ——— پھر بعد میں جب انھیں ہوش آتا ہے تو پچھتاتے بھی ہیں اور غم بھی مناتے ہیں۔ مگر وہ سب بیکار ہوتا ہے ———'

میں ہنس پڑی۔ "لگتا ہے کسی نے تمھیں بہت ستایا ہے۔"

ڈولی دھیرے سے مسکرائی بالکل اس طرح جیسے کوئی مریض درد کو ضبط کرتے ہوئے مجبوراً ہولے سے مسکرا دے۔

"بھلا مجھ سے یہ کھیل کون کھیلتا؟ ۔ مگر اسی جگہ اسی ایک نمبر بیڈ پر پُونم کے ساتھ یہ کھیل ہوتے ہوئے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

ڈولی کی آواز بھر آگئی' ابھی وہ مجھ سے کچھ کہنا ہی چاہ رہی تھی کہ اچانک وارڈ کے اندر میٹرن آگئی' سات نمبر بیڈ کی مریضہ کو تیز بخار آگیا تھا۔ ڈولی چپکے سے میرے سرہانے کے دروازے سے باہر نکل گئی اور پونم کی کہانی میرے بیڈ کے گرد منڈلاتی ہوئی مجھ سے دُور ہوتی چلی گئی ——— اِدھر کئی دنوں سے طبیعت بڑی اُچاٹ تھی' کسی کا انتظار بھی تو نہیں تھا' ڈولی کو بخار آگیا تھا' دُوسرے وارڈوں کی تازہ خبریں مجھے پھر کون سُناتا۔

دوپہر کا ریسٹ پیریڈ بڑا لمبا ہوتا تھا ایک بجے سے چار بجے تک تھا۔ سوتے اونگھتے اور خاموشی سے لیٹے لیٹے طبیعت اکتا جاتی تھی۔ مصیبت یہ تھی کہ اس وقت کتاب تک پڑھنے کی اجازت نہ تھی' ایسے سناٹے میں میں نے چپکے سے مسز علی کو پکارا۔ وہ اپنے بیڈ پر میری طرف ذرا اور سرک آئیں۔

"کیا بات ہے بھئی ——— نیند نہیں آرہی ہے کیا؟" وہی پرانا تبسم اس وقت بھی اس کے لبوں پر موجود تھا۔

"میرا یہ بیڈ ——— کبھی مجھ کو چین سے رہنے ہی نہیں دیتا ہے۔"

"تو پھر میرے جانے کے بعد تم میرے بیڈ پر آجانا ——"

"مگر پونم کی کہانی تو وہاں پر بھی منڈلائے گی۔ اور مصیبت یہ ہے کہ وہ کہانی کوئی مجھ کو سناتا بھی نہیں ——"

مسز علی شاید گھر جانے کی خوشی میں بڑے اچھے موڈ میں تھیں —— کہنے لگیں۔

"میں نے تمہیں پونم کی کہانی اب تک اس لیے نہیں کہی تھی کہ تم اسی کے بیڈ پر ہو کہیں ایسا نہ ہو کہ تم پر کوئی اثر پڑے اور تم پریشان ہو جاؤ' پونم بڑی خوبصورت لڑکی تھی' بڑی پیاری —— وہ یہاں سیریس خون اگلتی ہوئی لائی گئی تھی۔ اس کے بھائیوں کے ساتھ ایک اور لڑکا بھی آیا تھا جو سب سے زیادہ خوبصورت تھا اور بدحواس ہو رہا تھا —— بڑے صاحب نے پونم کو دیکھتے ہی صاف کہہ دیا تھا کہ وہ اپنے ہوسٹل میں اتنا کمزور اور سیریس کیس کبھی نہیں لیں گے' پونم اسی وارڈ میں اسٹریچر پر پڑی' سارے وارڈ کو ٹک ٹک تکتی رہی تھی' آخر بڑی مشکلوں سے بڑے صاحب کو راضی کیا گیا اور پونم کو اسی ایک نمبر بیڈ پر جگہ دے دی گئی تھی —— وہ گھبرایا ہوا لڑکا پل بھر کے لیے بھی پونم سے الگ ہونا نہ چاہتا تھا' کبھی اس کے الجھے بالوں پر ہاتھ پھیرتا' اور کبھی اس کے ہاتھ کو پیار سے سہلاتا' اس کی نگاہیں پونم کو ایک ٹک سے دیکھتی رہتیں جن میں پیار کے ساتھ ایک گہرا غم بھی چھپا رہتا تھا۔ پتہ نہیں پونم کی حسین آنکھوں کا اثر تھا یا اس کی پیاری شخصیت کی کشش تھی کہ اس وارڈ کے سارے لوگ اپنے دلوں میں اس کی درد محسوس کرنے لگے تھے۔ پونم بالکل ایک گڑیا کی طرح لگتی تھی اس کی بیماری اور بے بسی کا سارا دکھ اس کی آنکھوں میں جیسے سمٹ کر آ گیا تھا۔ اس کے پیار سو کھے ہوئے لبوں پر ان کہی داستانِ الم کی اتنی تھرتھراہٹیں تھیں کہ اس کی طرف نظر بھر کے دیکھنے کی ہمت بھی نہ پڑتی تھی ——

ان دنوں ڈولی کی ڈیوٹی اسی وارڈ میں تھی' پونم کے آتے ہی سارا کام اُسی کو کرنا پڑا تھا —— پہلے تو دیر تک وہ بڑے صاحب پر جھلاتی رہی تھی کہ انھوں نے اتنا سیریس کیس لے کر اس کی جان مصیبت میں ڈال دی ہے' پھر منٹوں ہی میں اس کو پونم سے زیادہ اس گھبرائے ہوئے لڑکے پر رحم آنے لگا تھا —— جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور جس کی چمکیلی آنکھوں میں بار بار آنسو چھلک آتے تھے۔

"چھی —— یہ دیکھو تو بھلا —— ہائے یہ مرد ہو کر رو رہا ہے۔" ڈولی نے ہنستے ہوئے میرے کان میں چپکے سے یہ بات کہی تھی —— "لگتا ہے جیسے رومیو جولیٹ والی کوئی بات ہے —— ہے نا؟" —— اور اتنا کہہ کر ڈولی پھر بڑے انہماک سے اپنے کاموں میں لگ گئی تھی۔

میں نے گہری نگاہوں سے رومیو کو دیکھا سچ مچ بڑی پُرکشش شخصیت تھی اُس کی۔ اس کا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھ کر آپ ہی آپ گلاب شگفتہ ہوتی ہوئی وہ کلیاں یاد آ رہی تھیں جو تیز دھوپ سے مرجھا گئی ہوں —— وہ بچارا بار بار بڑی مایوسی سے کبھی اس وارڈ کو دیکھتا کبھی اس کی چھت کو تکتا' کبھی ایک قطار سے بچھی ہوئی ہماری پلنگوں پر اس کی نگاہیں جاتیں پھر ایسا معلوم ہوتا جیسے اس کو تسکین کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی ہے۔ میں نے بڑے غور سے پونم کی مانگ کو دیکھا مگر وہ سیندور کے بنا سونی تھی' اور اس کی انگلی میں انگیجمنٹ کی رنگ چمک رہی تھی ——

دھیرے دھیرے پونم اچھی ہونے لگی۔ اس کی آنکھیں صحت مند ہو کر اور بھی خوبصورت نظر آنے لگی تھیں، اس کے ہونٹوں کے خم گداز ہو کر بڑے پیارے لگتے تھے، ڈولی نے پونم کی بڑی محبت اور پیار سے خدمت کی تھی، بالکل اس طرح جیسے اس نے اپنی زندگی کا یہی ایک مقصد بنا لیا ہو ——— ڈولی کی ڈیوٹی دن بھر کی ہوتی پھر بھی وہ ساری ساری رات پونم کے پاس ایک کرسی پر بیٹھ کر گزار دیا کرتی تھی، ایسی تنہائی ویرانے اور اس خطرناک بیماری میں اگر پونم کو ڈولی کی محبت کا سہارا نہ ملتا تو اتنی جلدی وہ اچھی نہ ہو سکتی تھی۔ ڈولی اسے ہنساتی، بہلاتی، اور اس کو زندہ رہنے کی ہمت دلاتی تھی۔ وہ اس کی آنے والی زندگی کے سنہرے دنوں کی جھلکیاں دکھایا کرتی جسے سن کر پونم کی آنکھوں میں آنسو چھلک آتے تھے۔ اور وہ ڈولی کے سوکھے ہاتھوں کو اپنے بیمار چہرے سے لگا کر کبھی سسکنے بھی لگتی تھی۔ "ڈولی مجھے بچا لو ——— ستیش میرے بنا زندہ نہیں رہے گا ———" اس کی آواز میں ایک ٹوٹتے ہوئے دل کی کراہ تھی۔ وہ اپنی زندگی سے زیادہ ستیش کے جیون کی بھکارن نظر آتی تھی ——— !

ڈولی نے گویا اپنی جان نچھاور کر کے پونم کی صحت حاصل کی تھی، وہ اپنے ہاتھوں سے اُسے کھلاتی، پہناتی، اور جب ڈاکٹر نے وارڈ کے اندر تھوڑی دیر کے لیے اسے ٹہلانے کی اجازت دے دی تھی تو ڈولی ہی پونم کا ہاتھ تھامے وارڈ کے اندر اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر چلایا کرتی تھی۔

جب کبھی پونم ڈولی کے ہاتھوں کو پیار سے تھام لیتی یا اس کی انگلیوں سے کھیلنے لگتی تو ڈولی کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہتا تھا، جیسے اس کی ساری محنت اور اس کی ساری تھکان مسرت بن کر اس کی رُوح میں سرایت کرتی جا رہی ہے۔ رفتہ رفتہ ڈولی پونم پر چھا گئی۔ ایسی خوبصورت اور پیاری لڑکی کو جب کبھی ڈولی اپنے انتظار میں بے چین دیکھتی تو اس کا دل کھل اُٹھتا تھا ——— پونم ڈولی کو اتنا چاہنے لگی تھی کہ وہ ڈولی کی پسند کے کپڑے تک پہنتی، ——— اس اندھیرے میں شاید اس اکیلی محبت کو وہ اپنے لیے ایک سہارا سمجھ کر وہی کچھ کرنا پسند کرتی تھی جو ڈولی کو اچھا لگتا تھا ——— ڈولی کو پونم کی اداس ہتھیلیاں اچھی نہیں لگتی تھیں، اسی لیے وہ پونم کے ہاتھوں میں خود سے مہندی لگاتی اور پونم کی لال لال ہتھیلیاں جب مہندی کی خوشبو سے رچی ہوتی تو ڈولی بڑے پیار سے ان سنگِ مرمر کی تراشی ہوئی سفید ہتھیلیوں پر مہندی کی سُرخی کو دیکھتی اس کی خوشبوؤں کو سونگھتی اور پھر ان دہکتی ہوئی نازک انگلیاں کو چوم لیا کرتی تھی ——— ڈولی کی پونم کے ساتھ اس محویت اور سرشاری کو دیکھ کر دُوسری نرسیں اس کا مذاق اُڑایا کرتی تھیں، اور کیتھرائن تو ڈولی کے نام تک سے بیزار تھی، اور اس نے ہر جگہ یہ بات پھیلا رکھی تھی کہ "ڈولی ایک بیمار دق کی مریض لڑکی سے عشق کرنے لگی ہے۔"

چند مہینوں کے بعد پونم کو ایک فرلانگ ٹہلنے کی اجازت مل گئی تھی۔ اور اب وہ بڑی بے صبری سے اپنے گھر جانے کی راہ تکنی لگی تھی ——— اس کے پاس گھر سے اتنے خط آیا کرتے تھے جتنے وارڈ بھر میں سب ملا کر بھی نہ آیا کرتے تھے۔ وہ بڑی خوش ہوتی تھی، اس کی خوشی کے اظہار میں بچوں کی معصومیت کا انداز ہوتا تھا۔ اس کو اپنے رومیو سے بڑا پیار تھا جس کا نام ستیش تھا اور جو ٹینس کا بڑا اچھا چیمپئن تھا اور جس کو پہلی بار کھیل کے میدان میں جیتتے ہوئے دیکھ کر پونم اپنے

آپ کو ہار گئی تھی۔ شاید خوبصورت آنکھیں جب محبت کے بوجھ سے اور بھی جھک جاتی ہیں تو پھر اس پیار کو ٹھکرایا نہیں جا سکتا ہے، اسی لیے ستیش نے بھی اپنی محبت اور انگیجمنٹ کی انگوٹھی سب کے سامنے پونم کو پہنا دی تھی مگر خوشیوں کی یہ گھڑیاں بہت مختصر ثابت ہوئیں"

مسز علی نے بڑی ٹھنڈی اور گہری سانس لی، اور اچانک گھنٹیوں کا شور ہر طرف سے گونج اٹھا، سہ پہر کا ریسٹ پیریڈ ختم ہو چکا تھا۔ وارڈ کے اندر اور باہر اس آواز کے ساتھ ہی زندگی کی ہماہمی شروع ہو گئی تھی۔

میرا دل اس لمبی اور ادھوری کہانی کو سن کر افسردہ ہو گیا۔ لیکن مسز علی کا چہرہ ویسے ہی دمک رہا تھا نجانے کیوں اس وقت مسز علی کی مسکراہٹ مجھے ذرا بھی اچھی نہ لگی۔

رات کو بہت دیر تک میری نیند اُچاٹ رہی، اور میں پونم کی سنی ہوئی کہانی کے سہارے اس کو یاد کرتی ہوئی اس کا انجام سوچتی رہی پتہ نہیں کیسے میں اپنے آپ کو پونم کا سایہ سمجھنے لگی تھی ——— اور اب میرا کیا حال ہونے والا تھا کوئی کچھ بھی کہہ نہیں سکتا تھا۔

ڈولی کئی دنوں سے بیمار تھی ——— پھر بھی سارا دن مجھ کو اس کا انتظار رہا جیسے ہی اس کی طبیعت سنبھلی وہ میرے پاس آ گئی۔ وہ شام بڑی اداس تھی، اور ایسا علاقوں کی عام شاموں کی طرح اس روز بھی شفق پھیلی ہوئی تھی، اور ایسا لگ رہا تھا کہ مغرب کی طرف آسمان پر بہت سی چتاؤں کے شعلے لپک رہے ہوں ———

میں نے ڈولی کا سوکھا اور گہرا سانولا ہاتھ تھام لیا ——— ڈولی میں نے تمہاری پونم کی ادھوری کہانی سن لی ہے اور یہ بھی جان گئی ہوں کہ پونم کی تمہاری محبت اور ان تھک خدمتوں نے بچا لیا تھا، پھر کیا ہوا ڈولی وہ نامکمل سی کہانی تم مجھے سنا سکو گی؟

ڈولی پہلے چپ رہی، بڑی گہری اور اداس نگاہوں سے مجھے تکتی رہی۔ پھر آنسو آہستہ آہستہ اس کی آنکھوں میں تیرنے لگے۔ اس کے کمزور چہرے کا رنگ مدھم پڑتا گیا۔ پھر اس کے لب تھرتھرانے لگے ——— اور وہ میری انگلیوں سے کھیلتی ہوئی بولی۔

"پونم کی جوانی صحت پا کر ایک پھول کی طرح کھل اٹھی تھی جس میں شعلے کی لپک بھی تھی اور چودھویں رات کی ٹھنڈک بھی۔ اس کو ستیش سے بے حد محبت تھی، پونم ستیش کی محبت میں کبھی کبھی اتنی گم ہو جاتی کہ اس کو دیکھ کر میرا دل اداس ہو جاتا تھا؛ وہ دور رہ کر بھی پونم کو پا نہ سکی تھی۔ جب کبھی مجھ کو چھٹی ہوتی اور میں پونم کے ساتھ ڈائننگ میں چلی جاتی تو وہ ہر دلکش موڑ پر ستیش کو یاد کیے جاتی۔ نجانے کیسے میں نے پونم کو اپنی زندگی سمجھ لیا تھا، ستیش سے دور رہ کر اس کو جو چیز تسکین پہنچانے والی تھی وہ اس کی منگنی کی انگوٹھی تھی وہ گھنٹوں اسی سے کھیلتی رہتی، وہی اس کی تنہائی کی ایک اکیلی رفیق بھی تھی اور شاید رازدان بھی۔

جس دن ستیش کا خط آتا پونم کی خوشیوں کا کوئی ٹھکانہ نہ رہتا، اس دن مجھ کو ایسا لگتا جیسے پونم مجھ سے بہت دور ہو گئی ہے اس کی آنکھوں میں مسرتوں کے اتنے چراغ جھلملانے لگتے تھے جن کی روشنی میں میرا وجود اکیلا اور بے سہارا نظر آتا تھا۔

پونم کو سینی ٹوریم میں آئے ہوئے آٹھ مہینے ہو چکے تھے۔ اس عرصے میں اس کے گھر کے لوگ کئی بار آ چکے تھے مگر ستیش اب تک نہ آیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ "میں اس وقت تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں جب تم پُورے طور پر صحت یاب ہو چکی ہو"——— پونم نے ستیش کو خط لکھا کہ اب وہ یہاں آ کر اُسے دیکھ لے، پونم سچ مچ پورنیما کی چاند بن کر چمک رہی تھی، ستیش اپنے کھیلوں کا موسم ہوتے ہوئے بھی آ گیا ——— اور پونم کو اتنا اچھا پا کر بے حد حیران رہ گیا ——— پونم کے ساتھ اس کے پیار میں ذرا بھر فرق نہ آیا تھا ——— لیکن میں نے اس بات کا اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ سینی ٹوریم کی فضا میں سانس لیتے ہوئے ڈرنے لگا ہے، وہ جب بھی وارڈ کے اندر آتا تو اپنے کپڑوں پر یکولیٹس کی پُوری شیشی چھڑک کر آتا تھا، اس کو دیکھ کر صاف پتہ چلتا تھا کہ کسی نے اس کو ٹی۔ بی کے کیڑوں سے ڈرا دیا ہے ——— اس کے چہرے کی رونق مرجھائی سی رہتی، وہ جی کھول کر ہنستے ہوئے بھی ڈرتا تھا ——— جب میں نے یہ محسوس کیا تو جیسے میرے دل میں اچانک اک ٹھنڈک سی پڑ گئی، اور میرے دل نے مجھ سے کہا کہ تو اس زہریلی فضا اور ماحول میں پونم سے بے حد قریب ہے اور ستیش پونم کے دل سے قریب رہ کر اس جگہ اس سے بہت دُور ہے۔"

پونم جب ستیش کے ساتھ باہر نکلتی تو میں ان سے دُور کھڑی انھیں دیکھتی ہوئی سوچا کرتی تھی کہ وارڈ سے باہر بھی ستیش پونم کو اپنے قریب محسوس کرتا ہے یا نہیں، لیکن میں اس بات کا اندازہ نہیں لگا سکی تھی۔ ستیش کے آتے ہی کیتھرائن اس وارڈ کے چکر لگانے لگی تھی، پونم کے لیے اُس کا خلوص بہت بڑھ گیا تھا، وہ بڑے پیارے پیارے گلدستے بنا بنا کر لاتی اور پونم کے سرہانے گلدانوں میں گلاسوں میں سجا دیتی۔ اس کی مسکراہٹوں کے انداز بدل گئے تھے، آواز میں اور بھی مٹھاس بھر گئی تھی اور اس کی آنکھیں جیسے نئی دُلہن کے حجاب سے جھکی جھکی رہنے لگی تھیں ——— کیتھرائن ہمیشہ اپنے شکار پر دُور دُور سے حملہ کرنے کی عادی تھی ——— میں یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی مگر پونم ستیش کی محبت اور اُس سے ملنے کی خوشی میں اتنی مگن اور اتنی گم تھی کہ اس کو کیتھرائن کی نگاہوں کی پیاس کا پتہ بھی نہ چل سکا۔ اور یہی ہُوا کہ ریسٹ پیریڈ کی ظالم گھڑیوں نے کیتھرائن کو ستیش سے بہت قریب آنے کا موقع دے دیا تھا، ویسے بھی بیکاری کا وقت کسی نہ کسی طرح تو کاٹنا ہی پڑتا ہے۔ پونم بیمار تھی اور اس کی ہر سانس میں ستیش کو ٹی۔ بی کے کیڑوں کا خطرہ محسوس ہو سکتا تھا ——— اور کیتھرائن تندرست تھی اور وقتی طور پر ایسے ویرانے میں اُس کو خوبصورت کھلونوں سے کھیلتے رہنے کی عادت ہو چکی تھی۔ ستیش کیتھرائن سے بچ نہ سکا۔

ستیش دو چار دنوں ہی کے لیے آیا تھا مگر وہ یہاں ہفتہ ٹھہر گیا، ستیش چیمپین تھا نا؟ کسی کھیل کے میدان سے وہ کبھی پیچھے نہیں ہٹا تھا، اس کے بٹن ہول میں لگی ہوئی ہر ایک تازہ کلی مجھ کو چپکے سے کیتھرائن کی گزری ہوئی محبت کی داستان سنا دیتی تھی۔ کیتھرائن ستیش کے حُسن جوانی سے کھیلنے کی خاطر تو پونم پر چھا جانا چاہتی تھی ——— اس کے چہرے پر ایک نکھار آ گیا تھا، وہ جان جان کر ستیش اور پونم کو چھیڑتی اور پھر بڑے ناز و ادا سے کہتی "ستیش بابو کا دل کون جیت سکتا ہے بھلا" ——— پونم بڑی معصومیت سے کھلکھلا کر ہنس دیتی ——— اور ستیش کے دل کا چور اس کے چہرے کے بدلتے ہوئے رنگ سے ظاہر ہونے لگتا تھا۔ میں ڈرتی رہتی تھی کیتھرائن کی ہر ایک چال ایسی ہوتی تھی کہ اگر ذرا بھی پونم کو شک ہوتا تو ساری باتیں اپنے آپ

کُھل کر رہ جائیں' ——— جس رنگ کی کلی ستیش کے بٹن ہول میں نظر آتی' ——— ویسی ہی کلیاں اور پھول کیتھرائن اپنے جوڑے میں ضرور لگا کر آتی تھی ——— میں ان نظاروں کو دیکھ دیکھ کر جلتی اور کڑھتی رہتی مگر پونم اس اعتماد کے ساتھ ستیش سے محبت کر رہی تھی کہ اس کی نگاہیں ان چھوٹی چھوٹی چیزوں سے کبھی ٹکرا نہ سکتی تھیں۔

ستیش جب چلا گیا تب میرے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا۔ مگر پونم غمگین تھی اس پر اچانک افسردگی چھا گئی تھی ——— اور میرا جی ہر گھڑی ڈرتا رہتا تھا کہ پونم کی صحت کہیں کمزور نہ ہو جائے یا کیتھرائن پونم کو اشاروں اشاروں میں ستیش کے ساتھ اپنے کھُل کھیلنے کی کہیں کوئی بات کہہ نہ گزرے۔"

کیتھرائن کی جب بھی نگاہیں مجھ سے ٹکرائیں وہ بڑے اعتماد اور بڑے ناز سے مسکرا دیتی' جیسے کہہ رہی ہو ——— میں تو کسی مندر کی دیوی ہوں۔ میری چرنوں پر محبت کے پھول چڑھائے گئے تو کیا ہوا؟ ان قدموں پر تو زندگیاں بھی لٹائی جاسکتی ہیں ———"

گرمیوں کے دن تھے۔ سینی ٹوریم میں یہ زمانہ بڑی قیامت کا سمجھا جاتا ہے۔ مریضوں پر کبھی کبھی تو یہ گرمی اتنا برا اثر ڈالتی ہے کہ انھیں سنبھالنا بھی مشکل ہو جاتا ہے ——— کیتھرائن ایک دن پونم کے پاس آئی تو اس کے بلوز کے گلے میں ایک رُومال اڑسا ہوا دیکھ کر پونم نے مذاق میں آہستہ سے نکال لیا' ——— کیتھرائن کو پتہ بھی نہ چلا کہ پونم نے کیا چیز چوری کی ہے ——— مگر جب پونم نے کیتھرائن کے جانے کے بعد اس رُومال کو دیکھا تو وہ اُسی کے ہاتھ کا بنا ہوا رومال تھا اور جس پر اُس نے ستیش کا نام بھی لکھ دیا تھا۔ اسی ایک معمولی سے رومال نے پونم کو دہلا کر رکھ دیا تھا جیسے ساری تازہ اور رنگین کلیوں کی داستانیں اچانک طور پر پونم کو اسی رومال نے کہہ سنائی تھیں ——— وہ آہستہ آہستہ کمزور ہوتی چلی گئی ——— ایک ہلکی سی چنگاری نے اس کی زندگی سلگا کر رکھ دی تھی ——— اس نے مجھ سے بھی کوئی بات نہ کہی' لیکن میری نگاہوں نے پہلے ہی بہت سے تماشے دیکھے تھے' میں سمجھ گئی کہ کیتھرائن کا وار خالی نہ گیا تھا ——— پونم کا دیٹ تیزی سے گرنے لگا' اور ایک روز جب وہ سو کر اُٹھی تو بخار سے جل رہی تھی' میں پونم کو دیکھ دیکھ کر کڑھتی رہتی ——— مگر پونم ذرا بھی پریشان نہ تھی' بس اُسے ایک ہی چیز کی حسرت تھی کہ ستیش کو صرف ایک بار اور دیکھ لے' جی بھر کے دیکھ لے۔ میں نے پونم کی اس بیماری میں ساری ساری رات خدا باپ کے آگے رو رو کر اُس کی زندگی کی دُعائیں مانگی تھیں ——— مگر ایسا لگتا جیسے قبولیت دُعا کے سارے دروازے بند ہو چکے ہیں۔

پونم جب سے بیمار پڑی تھی ایک عجیب سی تمنا اس کے دل میں تڑپ اُٹھتی تھی' ——— ایک دن مجھ سے کہنے لگی "ذرا مجھے سیندور کی لالی بڑی اچھی سی ڈبیہ کہیں سے لادو'۔ مجھ کو سیندور کی لالی بڑی اچھی لگتی ہے" ——— اس کی آواز میں اتنی تھرتھراہٹ اور ما‌نگ تھی کہ میں چھٹی لے کر شہر گئی اور وہاں سے اس کے لیے ایک چھوٹے سے ڈبہ میں سیندور خرید کر لے آئی۔ پونم نے سیندور بھری ڈبیہ لیتے ہوئے میرا ہاتھ چوم لیا ——— یہ پہلا موقعہ تھا کہ اُس نے میرا ہاتھ چُوما تھا ——— اب تک اس کے پیارے ہاتھوں کو میں ہی چومتی رہی تھی۔ سیندور کی ڈبیہ ہر گھڑی اس کے تکیہ کے نیچے دھری رہتی تھی ——— پونم نے پھر کسی خواہش کا کبھی اظہار نہ کیا ——— جیسے اتنی چھوٹی سی تمنا کے سوا اس کو اور کسی چیز کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

رفتہ رفتہ پونم کی حالت بگڑتی چلی گئی ——— جیسے کوئی دوا اور کوئی دُعا اس کو اب بچا نہیں سکتی تھی ——— بار بار یہی ایک خیال میرے دماغ میں آتا کہ پونم آتے ہی کیوں نہ مر گئی تھی؟ اپنی اتنی محبت بھری یاد دینے کے لیے اس کی زندگی نے چند مہینوں کے لیے موت سے کیوں مہلت مانگی تھی؟

بڑے صاحب نے اس کے گھر والوں کو خبر کر دی تھی، ستیش کے سوا سبھی آ گئے تھے، معلوم ہوا کہ ستیش اپنے کھیل کے سلسلے میں ہندوستان سے باہر گیا ہوا ہے اس کو پونم کی بیماری کی کوئی خبر بھی نہیں تھی

ہوش اور بیہوشی کے درمیان پُونم کی کمزور سانس چل رہی تھی، وہ سیندور کی ڈبیہ کو سب سے چھپائے رکھتی تھی۔ پونم کی زندگی کا آخری دن بڑا حسرتناک تھا۔ اس کی حیات کی مدھم لو میری آنکھوں کے سامنے لرز رہی تھی، نبض رہ رہ کر ڈوبنے لگتی تھی اور اس کا زرد چہرہ موت و حیات کی کشمکش میں بڑا معصوم نظر آتا تھا ——— زندگی اپنا رشتہ توڑ رہی تھی اور موت کا سایہ ہر طرف سے چھاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

یک بیک ہوش میں آتے ہوئے پُونم نے بہت ہی دھیرے سے مجھ کو پکارا۔

"ڈولی!" میں اپنے آنسوؤں کو پونچھتی ہوئی اس کے سینے سے لگ گئی۔

"——— اگر ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اگر ستیش آ جائے تو اُس سے کہہ دینا ——— کہ ——— وہ میری مانگ میں اپنے ہاتھ سے یہ ——— یہ سیندور ——— یہ سیندور بھر دے ———!"

سیندور کی ڈبیہ ایک امانت کی طرح اُس نے میری اُنگلیوں میں تھما دی۔

مرتے ہوئے، اس بے بسی کے عالم میں زندگی سے بھری ہوئی پُونم کی یہ آخری تمنا سُن کر میرا جی چاہا کہ میں چیخ چیخ کر رونے لگوں، لیکن میں ایسا نہیں کر سکتی تھی اس لیے کہ پونم مر رہی تھی اور اس کی یہ آرزو بھی چند لمحوں میں دم توڑ دینے والی تھی ——— اور میں یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی، کہ مرتی ہوئی پونم کی مانگ اب تک سونی تھی اور لال سیندور سے بھری ہوئی ڈبیہ میرے ہاتھ میں کانپ رہی تھی ——— اور ستیش ہندوستان سے بہت دُور نجانے کس میدان میں اپنا کھیل، کھیل رہا تھا۔

پونم کی ارتی جب اس جگہ سے اُٹھی تو میں بھی اُس کے ساتھ ہی چلی گئی، جاتے جاتے پُونم نے اپنی جو امانت مجھے سونپی تھی، شاید اسی امانت نے اتنے بڑے غم کو اٹھا لینے کا بھی مجھے سہارا بخش دیا تھا ——— کتنا بڑا کام تھا میرا، لال لال سیندور سے مجھے پونم کی سونی مانگ سنوارنی تھی ——— موت کی گود میں سسکتے ہوئے بھی، سیندور کی لالی میں وہ زندگی کے خواب دیکھ رہی تھی۔ اور وہی سیندور کی ڈبیہ لیے میں اپنی پونم کا اتم سنکار اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی، نجانے کہاں سے ہمت لے آئی تھی، ——— چتا پر جب آخری بار اس کے چہرے کی ایک جھلک نظر آئی تو مجھے ایسا لگا جیسے سہاگ رات، کوئی دُلہن اپنے دُلہا کا انتظار کرتے کرتے تھک کر سو گئی ہے" ——— ڈولی کے آنسو بے اختیار بہنے لگے اور پھر وہ سسکتی ہوئی بولی۔

چتا سلگنے سے پہلے میں نے وہ لال سینڈور سے بھری ہوئی ڈبیہ پونم کے سرہانے رکھ دی۔

یہ پونم کی آخری نشانی تھی اس کو اسی چتا میں جلنے دو۔"

چتا سلگی، دھواں اٹھا اور پھر شعلوں کی لپک نے پونم کی سونی مانگ میں لال لال سینڈور بھر دیا۔ اس کو دلہن کی طرح سجا دیا اور سینڈور کا سہاگ آخر پونم کے ساتھ ہی چلا گیا۔"

ڈولی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی، ڈوبتی ہوئی شام بھی سسکتی نظر آ رہی تھی، اور آسمان کے کنارے پر شفق کی مٹتی ہوئی لالی کسی جلتی ہوئی چتا کی طرح لگ رہی تھی۔

میں کانپ کر رہ گئی ——— جیسے میری زندگی اور خوشبوؤں کی چتا بھی سامنے دہک کر بجھ رہی ہو ——— !

بادشاہ

ہرچرن چاولہ

پاپا رات کے بارہ بارہ ایک ایک بجے تک گھر کیوں نہیں لوٹتا؟ پاپا دو دو تین تین دن غائب کہاں ہو جاتا ہے؟؟ پاپا آئے دن کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی جھگڑا کیوں مول لے لیتا ہے؟؟؟ اس کی یہ سب باتیں ہماری حویلی کے دس گھروں کے پریت لڑی میں پروتے ہوئے ایک ایک فرد کو کتنا بے چین کرتی ہیں! ان کی راتوں کی نیندیں حرام ہو جاتی ہیں۔ دل کا قرار اڑ جاتا ہے۔ عزت پر حرف آتا ہے۔ ان سب باتوں کا پاپا کیوں خیال نہیں کرتا۔ یہ سب تب مجھ ننھے سے بچے کے ذہن میں نہیں آسکتا تھا مگر وہی دھندلی تصویریں اب جب ذہن کے سکرین پر واضح صورت میں سامنے آتی ہیں تو میرے سامنے پاپے کا ایک مکمل خاکہ بن کر کھڑا ہو جاتا ہے اور میں کہہ اٹھتا ہوں تو یہ تھا پاپا، جو کبھی میری ناپختہ عقل کی گرفت سے باہر ہونے کی وجہ سے میرے لیے ایک بہت بڑا معمہ تھا!

میرے ذہن کے جھروکے میں پاپے کی مختلف تصاویر کا سلسلہ بتدریج سامنے آتا ہے۔ پہلی تصویر میں میں پاپے کو میٹرک کے ایگزامینیشن ہال میں نقل کرتے دیکھتا ہوں اور بار بار منع کرنے پر ایگزامینر سے الجھتے دیکھتا ہوں۔ ایگزامینر کہتا ہے۔

"اے مسٹر چار سو بیس" "اتفاقاً یہی پاپے کا رول نمبر ہے۔" میں تمہیں دو دفعہ ٹوک چکا ہوں۔ اب اگر میں نے تمہیں نقل کرتے دیکھا تو ہال سے باہر نکال دوں گا۔"

"حضور۔ آپ کو کیا فرق پڑے گا نقل تو میں پچھلے تین سال سے کر رہا ہوں۔ پہلے پاس نہیں ہوا تو اب کیا ہوں گا؟ نقل تو میں صرف دل کی تسلی کے لیے کرتا ہوں ورنہ آپ جانتے ہیں نقل میں بھی عقل کی ضرورت ... ..."

"زیادہ زبان لڑانے کی کوشش مت کرو۔ میں نے تمہیں کہہ دیا ہے اب اور موقعہ نہیں دوں گا۔" ایگزامینر آگے بڑھ جاتا ہے۔

"تو حضور میں بھی آپ کو اور موقعہ نہیں دوں گا۔ چاقو کھلنے کی کڑ کڑاہٹ سن کر ایگزامینر مڑ کر دیکھتا ہے۔ واقعی پاپے کے ہاتھ میں آٹھ انچ لمبا چاقو ہے۔

ایگزامینر واپس آکر قریب آتا ہے اور چاقو کی طرف اشارہ کر کے کہتا ہے۔ "یہ کیا ہے؟ تم مجھے چاقو سے ڈرانا چاہتے ہو؟ گیٹ آؤٹ نکل جاؤ باہر!" وہ پاپے سے پرچہ چھیننا چاہتا ہے۔ پرچہ خاموشی سے ایگزامینر کے حوالے کر کے پاپا کھلا چاقو نوک کے سہارے میز پر گاڑ دیتا ہے۔

"تو جناب اس سے نہیں ڈرتے۔ لیجیے میں آپ کی ڈرانے والی چیز سے ملاقات کراتا ہوں۔"

پھر اس سے پہلے کہ وہ معاملے کی نوعیت کو سمجھ سکے پاپا اس کی ٹانگوں میں گھس کر اسے کندھوں پر اٹھا لیتا ہے اور زمین پر پٹک دیتا ہے۔ دو تین میزیں الٹ جاتی ہیں۔ پرچوں پر سیاہی بکھر جاتی ہے۔ ایک ہڑبونگ سا مچ جاتا ہے۔ کچھ چپڑاسی اور دوسرے لوگ پاپے کو باہر نکال دیتے

ہیں۔ ایکزامینر گرد آلود پھٹے کپڑوں سے اٹھتا ہے اور آفس کی طرف چلا جاتا ہے۔

دوسری تصویر میں ایگزامینیشن ہال میں نقل کرنے، دنگا کرنے اور ایگزامینر پر حملہ کرنے کے الزام میں پاناوہ کورٹ سے ڈیڑھ سال قید بامشقت کی سزا پاتا ہے۔ ہمارے چاچا رنگی لال (پانے کے والد) اسے ضمانت پر رہا کروا کے سیشن کورٹ میں اپیل دائر کرتے ہیں اور پانا پھر اسی دوران ایک دن اسی ایگزامینر کو جو کہ مقامی ہائی سکول کا ہیڈ ماسٹر بھی ہے بھرے بازار میں گھیر لیتا ہے۔

"خان یہ تیری بغل میں ڈنڈا رہتا ہے نا۔ میں جانتا ہوں بڑا مضبوط ہے مگر یاد رکھ یہ تیرے کسی کام نہیں آئے گا۔"

پھر لپک کر اس کی بغل سے وہ ڈنڈا کھینچ لیتا ہے اور اپنے دوسرے بازو پر اس زور سے مارتا ہے کہ ڈنڈے کے پرخچے اڑ جاتے ہیں۔ "یہ بھی تیری یہ پستول بھی جسے تو شیعے میں دابے پھرتا ہے تیرے کسی کام آئے گی۔ اسے تو میں تیرے گلے سے نیچے اتار دوں گا اور تجھے پتہ بھی نہیں چلے گا۔ تیرے کام آئیں گا تو میں صرف میں اور وہ اس لیے کہ تجھ پر ہاتھ اٹھا کر میں اسی دن سے ادائی ہوں۔ قسم خدا کی مجھے نہیں پتہ تھا کہ تو ہمارا مہمان ہے۔ لاہور سے یہاں نوکری کو آیا ہے ورنہ کبھی تجھ پر ہاتھ نہیں ڈالتا۔ اب آرام سے یہاں رہ۔ کوئی تیری طرف آنکھ بھی اٹھائے تو قسم رسول پاک کی اس کی آنکھ نکال کر باہر پھینک دوں گا ——"

تیسری تصویر میں سیشن کورٹ سے اسے چھ ماہ قید کی سزا ملنے کے بعد، پولیس والے اسے ہتھکڑی لگا کر جیل جانے والی موٹر کی طرف لیے جا رہے ہیں۔ ہم سب رشتہ دار اس سے بغل گیر ہو ہو کر مل رہے ہیں، جب وہ ماں سے ملتا ہے تو کہتا ہے۔

"اماں بیری پر چڑھا ہوں۔ بیر ملیں نہ ملیں کانٹے تو چبھیں گے ہی۔ تو فکر نہ کر۔ میں بس ابھی گیا اور آیا۔ یاروں سے ملے کئی دن ہو گئے۔" اور باپ سے ملتے ہوئے وہ کہتا ہے۔

"لالہ۔ تونے بڑا ظلم کیا اپیل کر کے۔ اب بتا چھ مہینے میں مل سکوں گا سب سے؟"

پھر بھیڑ میں سے مجھے بازوؤں پر اٹھا کر وہ مجھے چومتا ہے اور کہتا ہے۔ "کاکا بول جیل سے کیا لاؤں تیرے لیے؟"

تصویریں الٹتی جاتی ہیں۔

آج پانے نے تھانے دار کو پیٹ دیا ہے۔ آج پانے نے سمندخان کو چھرا گھونپ دیا ہے۔ آج پانے نے یہ کر دیا ہے۔ آج اس نے وہ کر دیا۔ پھر ایک تصویر سامنے آ کر جیسے تھم کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اس میں پانا ں پپلاں کے زمیندار کی لڑکی شانو کو پنگھٹ سے زبردستی اٹھا لاتا ہے۔ کچھ دن عبس بیجا میں رکھتا ہے۔ پھر گھر لا کر باپ کے سامنے ڈال کر کہتا ہے۔ "لے لالہ سنبھال اپنی بہو۔ پپلاں کے زمیندار کی اکلوتی بیٹی ہے۔"

"ظالم۔ قصائی۔ بیری یہ تونے کیا کیا؟ مجھے پتہ ہوتا کہ تو اولاد کے بھیس میں میرے گھر میں راکھشش پیدا ہو رہا ہے۔ تو پیدا ہوتے ہی تجھے زہر دے دیتا۔"

لالہ رنگی لال سسکتی شانو کو بازو سے پکڑ کر اٹھاتا ہے اور کہتا ہے۔ "چل بیٹیا۔ تجھے ابھی تیرے باپ کے گھر پپلاں لے چلتا ہوں۔"

"لے چل اسے پپلاں۔ لالہ لے چل اپنے ساتھ، جو جاتی ہے یہ تو۔" پانا باپ کی طرف پیٹھ موڑ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے کان شانو کے جواب پر لگے ہوئے ہیں۔ شانو رنگی لال سے ہولے ہولے کہہ رہی ہے۔ "نہیں —— نہیں لالہ اب مت لے چل مجھے وہاں۔ اب

میں وہاں جانے کے قابل نہیں رہی۔"

زنگی شانو کا ہاتھ چھوڑ دیتا ہے۔ پاٹا منہ موڑتے موڑتے کہتا ہے ———

"لالہ سن لیا۔ رکھ لے اسے۔ میرے سِوا تجھے اور کون بیٹی دے گا۔"

زنگی زور سے دو ہتڑ پانے کی پیٹھ پر مارتا ہے۔ جس سے وہ لرز کر رہ جاتا ہے۔ مگر پتہ نہیں چلتا کہ یہ لرزش باپ کی دھپ سے پیدا ہوئی ہے یا دبی دبی اُس ہنسی سے جو شانو کے جواب سے اس کے انگ انگ سے پھوٹ نکلی ہے۔ "نالائق۔ خنزیر۔ جانے کس جنم کا بدلہ لینے کے لیے تو نے میرے گھر میں جنم لیا ہے۔"

شانو کو زنان خانے میں چھوڑنے کے بعد زنگی لال سب کے پوچھنے۔ منع کرنے اور ٹوکنے کے باوجود سر پر پگڑی باندھ کر باہر چلا جاتا ہے۔ اور پھر کچھ دن بعد جو کھٹے میں ایک نئی تصویر اُبھر آتی ہے۔ جس میں پاٹا باقاعدہ ٹھاٹھ باٹ سے برات لے جا کر شانو کو بیاہ لاتا ہے۔ برات کے آگے آگے شہر بھر کے غنڈے۔ لفنگے۔ شرابی۔ جواری۔ چاقو باز گھُمر ناچتے جاتے ہیں۔ جب اُسے ان سب کے گھُمر کا مزہ نہیں آتا تو گھوڑی سے اتر کر دو ایک کے سر پر دھپیں مار کر کہتا ہے :-

"اوئے کنی رن دے پترو۔ یہ تم گھمر ناچ رہے ہو یا ماتم کر رہے ہو اپنے باپوں کا؟"

پھر ڈھول والے کی طرف دیکھتا ہے۔ دونوں کی آنکھیں ملتی ہیں۔ اشاروں ہی اشاروں میں کوئی بات ہوتی ہے۔ ڈھول پر ہڈیاں توڑ دھن بج اُٹھتی ہے اور وہ خود یاروں کے گھیرے میں گھر کبھی اسکا کی کمر میں ہاتھ دے کر کبھی اس کی کمر پر ہاتھ رکھ کر دونوں ہاتھوں پر زنگ برنگے رومال لہراتا جھوم جھوم کر ناچنے لگتا ہے۔ گھمر میں جب خوب گرمی آجاتی ہے تب وہ بزرگوں کو للکارتا ہے۔

"او بزرگو۔ کچھ اوپر سے وار و بھی نا!"

کچھ بزرگ۔ کچھ دوست۔ کچھ عورتیں گھونگھٹ نکالے جھینپتی جھیپتی بزرگوں سے نظریں بچاتی بھیڑ کے ایک کونے سے پانے کی پگڑی کے شملے سے روپیہ یا اٹھنی چھوا کر یا اس کے سر سے کوئی سکّہ گھما کر ڈھول بجانے والے میراثی کے ہاتھ پر رکھ دیتی ہیں۔ ڈھول والا ایک لمحہ کے لیے رک کر نوٹ یا سکّہ سر سے اوپر وار کر کہتا ہے "ویل دیل۔ پانے دی دیل۔ رُوپے دی دیل"

اور پھر نوٹ ڈھول کی کسنی میں اُڑس لیتا ہے یا سکہ ململ کے کُرتے کی پہلو والی جیب کے غار میں انڈیل دیتا ہے۔ ڈھول پھر دندنا اٹھتا ہے۔ ڈھی تنگ۔ ترٹی تی تنگ۔ ڈھی تنگ تری تی تنگ۔

زمین پر پاؤں کے تیز چکروں سے دھول اڑنے لگتی ہے اور پاٹا یہ کہتا ہوا "دیکھا حرامیو۔ یوں گھمر مارا جاتا ہے!" اپنی گھوڑی پر واپس آ بیٹھتا ہے۔ اس طرح جب بھی گھمر میں کچھ دھیما پن آتا ہے۔ پاٹا گھوڑی سے اُتر کر انہیں "یوں گھمر مارا جاتا ہے حرامیو" بنانے کے لیے رکاب میں پاؤں رکھنا ہی چاہتا ہے کہ کوئی بزرگ اسے سمجھاتا ہے "اسے اسے پگلے۔ کچھ صبر کر۔ اب ٹھنڈا ہو جا۔"

اور پاٹا ٹھنڈی آہ بھر کر دوستوں سے کہتا ہے۔ "اوئے موذیو۔ کوئی غنڈ کو بلا کر لے آؤ۔"

جب برات لڑکی والوں کے گھر کے پاس پہنچتی ہے تو ناچ کا ایک بھرپور دور پھر اُمڈ آتا ہے۔ کوئی پھر بلا اٹھتا ہے "ہائے غنڈ یہاں ہوتا تو ایمان سے مزا آجاتا۔"

اسی وقت اچانک وہاں غنڈہ بھی آجاتا ہے۔ "اوئے میں آگیا۔ میں آگیا اور میرے دیرو شاباش تگڑے ہوجاؤ"

رنگ برنگے چیتھڑوں کا لبادہ پہنے۔ سر پر کالا باغ کا خالی کلاہ رکھے وہ ہاتھ کے ڈنڈے پر بندھے گھنگھروؤں کو بجاتا گھر میں ایک نئی جان ڈال دیتا ہے۔ سب کے چہرے خوشی سے تمتا اٹھتے ہیں۔ "واہ بھئی وا۔ بلے بلے بلے! رنگ لگا دیا! مزہ آگیا!!"

پانے کے ہونٹوں پر ایک پیاری پیاری سی مسکراہٹ آجاتی ہے۔ وہ لاڈ سے بزرگوں سے کہتا ہے "بزرگو۔ ویل ویل! چاچا فلک شیر آگے بڑھ!! حبیب ڈھیلی کر!"

گھڑ بارتی۔ ڈھول بجاتی۔ مشعلیں جلائے آگے بڑھتی ہوئی برات ایک تنگ گلی کے سرے پر اچانک رک جاتی ہے۔ آگے سے کچھ شور سنائی دیتا ہے جیسے باڑھ زدہ دریا کے آگے کوئی بند باندھنا چاہے لیکن پانی تمام پتھر تمام ملبہ لڑھکا کر پھسلا کر گڑگڑاتا ہوا نکل جانے کی کوشش کرے برات کا ریلہ گلی کے آر پار بندھے رسے کو توڑ کر آگے بڑھنا چاہتا ہے کہ سن سے ایک گولی فضا کو چیرتی ہوئی نکل جاتی ہے اور شہباز خان چلا کر کہتا ہے۔ "خبردار کوئی آگے بڑھا تو گولیوں سے بھون دوں گا"

ادھر سے ایک بزرگ اپنے تہمد کو سنبھالتا۔ شملے کو ٹھیک کرتا اس کے پاس آتا ہے اور للکارتا ہے "دیکھوں تو! کون ہے جو ہے سامنے آئے! میں خون پی جاؤں اُس کا"

ایک جوان شہباز خان سے آکر کہتا ہے۔ "خان تیری پانچ بوتلیں۔ پندرہ سیر گڑ اور کھانڈ کے دس سیر لڈو آج پہنچ جائیں گے۔ پانے نے کہا ہے۔ رسہ اٹھا لے۔"

شہباز خان کے چہرے کا رنگ بدل جاتا ہے۔ وہ جوان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھتا ہے۔

"یہ پانے کی برات ہے؟ پانا! مُونچھیل جواری نا؟"

نوجوان اثبات میں سر ہلا دیتا ہے۔ خان ایک جھٹکے سے رسہ کھینچ لیتا ہے اور اپنے ساتھیوں سے کہتا ہے "تم نے میری ناک کٹا دی اوئے میں پانے کو کیا منہ دکھاؤں گا۔ ارے پانے کو کیا منہ دکھاؤں گا؟" پھر برات کو مخاطب کرکے کہتا ہے۔ "جاؤ جاؤ بھائیو عیش کرو"

اس کے بعد کچھ دھندلی۔ مدھم مدھم۔ مٹی مٹی سی تصویریں سامنے آتی ہیں۔ جن میں پانا ایک فرمانبردار بیٹا۔ ایک اچھا ذمہ دار خاوند اور ایک مطیع ملازم ثابت ہوتا ہے۔ دن میں وہ ایک کامیاب پٹواری ہے۔ صبح شام وہ ایک تابعدار بیٹا ہے اور رات بھر جورو کا غلام ہے۔ دفتر میں معاملات زمین بسوا۔ بسنہ۔ جریب۔ مثلات سب کا اسے بخوبی علم ہے۔ ماں باپ کی طرف اس کے کیا فرائض، اس کا اسے پورا خیال ہے۔ بیوی کی خواہشات کیا ہیں۔ ان سے وہ اچھی طرح واقف ہے۔ وہ سب کو خوش رکھتا ہے۔ سب کی خواہشات کا احترام کرتا ہے۔ سب اس سے راضی ہیں۔ دفتر اس لیے کہ اس کا سب کام ہمیشہ مکمل رہتا ہے۔ ماں باپ اس لیے کہ اب ان کا ہاتھ کبھی تنگ نہیں رہتا۔ بیوی اس لیے کہ پیار کے ساتھ وہ زیورات سے بھی پکی بیری کی طرح لدی پھندی رہتی ہے۔ کسی کو اتنا سوچنے کا وقت کہاں کہ وہ بیک وقت سب کو خوش کیسے رکھتا ہے۔ مگر اب یہ تصویریں مدھم ہونے کے باوجود میری سمجھ میں صاف اور واضح سامنے آنے لگتی ہیں تو میں دیکھتا ہوں کہ ان کے پیچھے اس کی اس کمائی کا ہاتھ ہے جو وہ دوسرے ذرائع سے حاصل کرتا ہے۔

ایک تصویر میں ایک چوبارے پر پانا جوا کھلوا رہا ہے۔ چنڈال چوکڑی جمی ہوئی ہے۔ نیا تھانے دار وردی پہنے سپاہیوں کے ساتھ

چڑھتا ہے کہ پانے کو اطلاع ہو جاتی ہے۔ بتی بجھوا دی جاتی ہے۔ بساط الٹ دی جاتی ہے۔ پلندا داروغہ کو ایک طرف سے جا کر کہتا ہے۔ "تیرے کو تیرا حصّہ نہیں ملا؟"

"حصّہ؟ میں تو یہ سلسلہ ہی بند کرنے آیا ہوں۔"

"یہ سلسلہ تو تیرا باپ بھی بند نہیں کر سکتا۔" پھر وہ اندھیرے میں کلائی پر رکھے پستول اور ہتھیلی پر رکھی نوٹوں کی گڈی پر ٹارچ کی لمبی لائٹ مارتا ہے۔ "بولو چاچا۔ ان دونوں میں سے کیا لوگے؟"

تھانیدار گرجتا ہے۔ "تو مجھے پستول سے ڈرانا چاہتا ہے۔"

پانا نرمی سے کہتا ہے۔ "نہیں۔ تو ان کھلونوں سے کیوں ڈرنے لگا۔ تجھے تو حبیب خان والی لائن پر سیر کراؤں گا۔"

پھر وہ تالی بجاتا ہے۔ "اوئے یاسینہ۔ لانا تو وہ ڈبیہ۔"

یاسین ایک ڈبیہ لا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے۔ پانا اسے کھول کر اپنی ہتھیلی پر رکھ کر اسے دکھاتا ہے۔ نرم نرم روئی کے گالے پر کالے کالے مروڑے ہوئے بالوں کے دو گچھے پڑے ہیں۔ پانا بتاتا ہے۔ "یہ حبیب خان کی مونچھیں ہیں۔ اس نے بھی ان پر تاؤ دے کر قسم کھائی تھی کہ میرا اڈا بند کرا دے گا۔ میرا اڈا تو بند نہیں ہوا۔ اس کی مونچھیں ضرور بند ہو گئیں اس ڈبیہ میں۔"

دوسرے دن پانے نے سو روپے کا نوٹ تھانے دار کو بھجوا دیا جو قبول کر لیا گیا اور پھر باقاعدہ سو روپیہ ماہانہ تھانیدار کے ہاں جانے لگا۔ پھر جیسے اس کی زبان پر تالے لگ گئے۔ اگر اس کا کوئی ساتھی پانے سے یہ کہہ دے کہ یہ سوجھی مت سمجھو دیکھیں وہ ہمارا کیا کر لیتا ہے۔ تو پانا اس کی گردن پر دھپ جما کر یہ کہے گا۔ "اوئے جا او پاگل کی اولاد۔ کتّے کو ہڈی ڈالتے رہنا چاہیئے تاکہ تابعداری میں اس کی دُم ہلتی رہے۔ پھر جب ہم کماتے ہیں تو دیتے ہوئے ہمیں کیوں موت آئے۔"

ایک اور تصویر جو میرے ذہن میں اُبھر آ کر آتی ہے۔ کسی چٹان پر کھُدی مورتی کی طرح صاف اور واضح مگر اس کا ہر زاویہ اتنا گھناؤنا۔ نفرت انگیز اور بھیانک ہے کہ یاد آتے ہی جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ یہ تصویر تقسیم وطن کی ہے۔ گھر کے کچھ افراد بچ بچا کر کیمپ پہنچ گئے ہیں مگر پانا گولیوں کی بوچھاڑ میں دندناتا پھرتا ہے۔ ہم شہر کے ایسے محلّے سے نکلے ہیں۔ جہاں سے کم ہی لوگ بچ کر نکل سکے ہیں۔ ہمارے بچاؤ میں پانا کی کوششیں شامل ہیں۔ ورنہ خدا جانے ہمارا کیا ہوتا۔ پانا ہر روز کیمپ آ کر ہماری ضرورتیں پوچھ جاتا ہے۔ شام تک سب کو ان کی مطلوبہ چیزیں مل جاتی ہیں۔ نہیں ملتا تو پانا۔

اگلی تصویر میں کیمپ کے پاس ریلوے لائن پر گاڑی کھڑی ہے۔ مال گاڑی کے کھلے ڈبّے۔ فٹ بورڈ اور دروازے تک مہاجرین سے بھر جاتے ہیں۔ ہر کوئی پہلی گاڑی سے نکل جانے کو بے چین ہے۔ مگر بوڑھے ماں باپ اپنے خون کی گرمی سے مجبور آخر تک کسی کی راہ میں آنکھیں بچھائے بیٹھے رہتے ہیں۔ گاڑی پہلی سیٹی بجاتی ہے۔ پھر دوسری اور پھر تیسری۔ پھر ہولے ہولے رینگنے لگتی ہے وہ مایوس ہو جاتے ہیں کہ اب وہ نہیں آئے گا۔ گاڑی نکل جاتی ہے اور وہ اُس کے کچے دھاگے سے بندھے۔ دل کے ہاتھوں مجبور۔ کیمپ میں ہی رہ جاتے ہیں شاید اگلی گاڑی کے جانے تک وہ آ جائے۔

دوسرے دن پانا کیمپ میں شافو کے پاس آتا ہے جو کہ ہندوستان جانے کے لیے ساس سُسر کے ساتھ کیمپ آئی ہوئی ہے وہ سب

کے سامنے اس سے پوچھتا ہے۔
"میرے پروگرام کا تو تجھے پتہ ہی ہے بول! تیری کیا مرضی ہے؟"
"میری مرضی۔ میں ہندوستان جاؤں گی۔"
"میرے پاس نہیں رہے گی؟"
"نہیں"
"کیوں؟"
"میں ان کے پاس رہوں گی جو مجھے عزت سے بیاہ کر لائے تھے۔ تم تو مجھے اٹھا کر لائے تھے۔"
"تو تُو لالہ اور ماں کے ساتھ ہندوستان جائے گی؟"
"ہاں وہ بوڑھے ہیں۔ تم جو سہارا ان سے چھین رہے ہو۔ وہ انہیں میں دوں گی۔"
"مگر تو ابھی جوان ہے۔"
"یہ جوانی جس کی امانت ہے اسی کی امانت رہے گی وہ جب چاہے آکر سنبھال لے۔"
"یہ تیرا آخری فیصلہ ہے۔"
"ہاں آخری اور اٹل۔"
"اچھا تو پھر خدا حافظ۔"
وہ تھکے قدموں سے کیمپ چلا جاتا ہے۔ جیسے وہ چل نہیں رہا گسٹ رہا ہو۔ چاچی دوڑ کر اسے پیچھے سے پکڑ لیتی ہے۔
"پانے۔ مت جا پتر۔ دیکھ میرے سفید بالوں کا خیال کر۔"
"ماں۔ تم سب یہاں رہ جاؤ۔ میں سب ٹھیک کر دوں گا۔ یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"
ماں مڑ کر زگی لال کی طرف دیکھتی ہے جو بڑھ کر کہتا ہے۔
پانے تو جا۔ جا ہم سمجھیں گے ہماری ایک اولاد کم ہوئی تھی۔ پھر وہ ماتھا پیٹ کر کہتا ہے۔
"ہماری تقدیر"
"لالہ ماں جا۔ ماں جا۔ میں نے ہمیشہ تمہاری محبت کا جواب محبت سے دیا ہے۔ اپنے فرض اور محبت میں کبھی کوتاہی نہیں کی، مگر ان سب سے اوپر بھی مجھے ایک چیز زیادہ عزیز ہے وہ ہے میری لگن۔ میں سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں۔ اپنے پرائے۔ دنیا جہان۔ مذہب ملک گر اپنی لگن نہیں چھوڑ سکتا۔"
وہ بات ختم کرکے کیمپ سے باہر نکل جاتا ہے۔ شانو اور ماں سسکتی رہ جاتی ہیں۔ زگی لال ان کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر انہیں تسکین دینے کی کوشش میں خود بھی رسکنے لگتا ہے۔
لدھیانہ (ہندوستان) آکر زگی لال کسی مہاجر کے مکان میں مقیم ہو جاتا ہے۔ گلی کی طرف کھلنے والے دروازے میں ایک

چھوٹی سی دکان کھول لیتا ہے۔ جو کبھی کبھی چولہا گرم کرنے کا سامان مہیا کر دیتی ہے اور کبھی فاقوں کی نوبت آجاتی ہے۔ شانو الگ اپنی جگہ دن بھر مشین پر محلہ داروں کے کپڑے سیتی رہتی ہے۔ بڑھیا نزدیکی ریلوے لائن سے کوئلے یا گلی گلی سڑک سڑک تنکے چنتی پھرتی ہے تاکہ رات کے ایندھن کا بندوبست ہو سکے۔ کبھی موقعہ ملتا ہے تو لوگوں کے گھر میں کپڑے دھو آتی ہے۔ برتن چوکا صاف کر آتی ہے۔ شانو رات کو لیمپ کی مدھم روشنی میں اپنے ننھے دیور اور نند کو پڑھاتی اور سوال حل کرواتی ہے۔ پڑھاتے پڑھاتے ایک دن استانی سے وہ خود بھی طالب علم بن جاتی ہے۔ محلے کی ایک استانی کے کپڑے مفت سی کر وہ اس سے انگریزی کے کچھ ابجد اور کچھ سوالات وغیرہ سیکھنے لگتی ہے۔ کچھ دن بعد وہ اُس اُستانی کے سمجھانے اور ساس باپ کی اجازت سے ایک سرکاری ہسپتال میں باقاعدہ نرسنگ کی ٹریننگ حاصل کرنا شروع کر دیتی ہے۔ رنگی لال بابا کو شانو کے ٹریننگ کرنے اور اپنی تنگ دستی کی اطلاع دیتا ہے۔ وہاں سے اور کوئی جواب نہیں آتا۔ مگر ہر ماہ ایک منی آرڈر باقاعدہ آنا شروع ہو جاتا ہے جس کے کوپن پر ماں کو پیری پونا۔ لالہ کو آداب اور شانو کو ہمت بڑھانے والے چند الفاظ کے ساتھ شاباشی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا۔ پھر ہوتے ہوتے کوپن پر کچھ الفاظ زیادہ آنے لگتے ہیں۔ وہی الفاظ اور زیادہ ہو کر پوسٹ کارڈوں پر منتقل ہو جاتے ہیں اور اِدھر اُدھر سے خط و کتابت کا ایک سلسلہ چل نکلتا ہے۔ کچھ دنوں بعد شانو کو علیحدہ بند لفافے آنے لگتے ہیں۔ رنگی لال شانو کے چہرے پر پھلجھڑیاں چھوٹتی دیکھتا ہے۔ اس کی آنکھوں میں پاسنے کی شبیہہ اُبھرنے لگتی ہے۔ وہ اسے ہر لحظہ، ہر پل آس پاس گھومتا پھرتا محسوس ہوتا ہے۔ شانو سے ہنستا بولتا سنائی دیتا ہے مگر جب تلخ حقیقت اس کے سامنے ننگی ہو کر کھڑی ہو جاتی ہے تو وہ تڑپ تڑپ اُٹھتا ہے۔ اس کے سپنے چُور چُور ہو جاتے ہیں۔ وہ ٹھنڈی آہیں بھرتا سر پر ہاتھ رکھے کہیں گم ہو جاتا ہے اور اس کے لبوں سے "ہائے ربا کیا کر دیا۔ تو نے ظلم ڈھا دیا" نکل جاتا ہے۔

شانو اب ایک مقامی ہسپتال میں نرس لگ گئی ہے۔ پاسنے سے اب بھی اس کی خط و کتابت باقاعدہ ہوتی ہے۔ اب بھی اس کے گالوں میں پھول مسکراتے ہیں۔ دل میں لڈو پھوٹتے ہیں۔ ذہن میں پھلجھڑیاں چھوٹتی ہیں۔ اُس کی آنکھوں میں خوشی کے ساون بھادوں گھر گھر آتے ہیں۔

شانو کچھ دنوں سے اُداس اُداس رہنے لگی ہے۔ رنگی لال اور اس کی بیوی نے کئی دفعہ اسے جھنجھوڑا ہے۔ محلے والیوں نے بڑھیا کے دل کے آئینے میں بال ڈال دیا ہے۔ "چاچی نوکری کرنے والی بہو کب تک تمہاری ہو کر رہ سکے گی۔"

چاچی بھاگو اپنے ہی وہم کی ماری، دوسروں کی ڈرائی شانو کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ ڈالتی ہے۔ اس کی اداسی کو شک کی نگاہوں سے دیکھتی ہے بار بار پوچھتی ہے۔ "شانو تو کس کے لیے اُداس ہے۔"

شانو پہلے پہلے ٹکر ٹکر اس کی طرف دیکھتی ہے پھر یکلخت ننھے ننھے موتی اس کی پلکوں پر لرزتے اور ستاروں کی مانند ٹوٹ کر زمین کی گہرائیوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ بھاگو کے بہت تنگ کرنے پر وہ صرف اتنا کہہ پاتی ہے۔ "ماں اب میں تمہیں کیا بتاؤں؟ تم کب کر سکتی ہو؟؟"

اور محلے والیاں تماشائی بھُس میں چنگی ڈال بھالو دوُر کھڑی کی طرح ناک پر اُنگلی رکھ کر کہتی ہیں: "تو کیا چاچی وہ تمہیں بتائے کہ مجھے خصم چاہیے یہ تو سمجھنے کی باتیں ہیں۔"

———

رنگی لال کی دوکان پر ایک بڑھا جانی رام کبھی کبھی آ بیٹھتا ہے۔ جانی رام جھنگ کا باسی ہے۔ تقسیم کے ریلے میں وہ بھی اس کنارے آن لگا ہے۔ وہ گھر کے تمام زیورات کا بھرا بھرایا ڈبہ اپنے ایک پٹھان دوست کے ہاں امانت رکھ آیا ہے یہ کہہ کر کہ جب ہم اپنے گھروں کو واپس آئیں گے تو سنبھال دینا مگر جب یہاں آ کر اسے محسوس ہوتا ہے کہ واپس جانا اب محض خواب و خیال ہی ہے تو وہ کسی کے مشورے پر گھر سے زیورات لے آنے کے لیے مقامی ملٹری کے دفتر میں درخواست دیتا ہے۔ اپنی اس خط و کتابت کے بارے میں جب وہ رنگی لال کو مطلع کرتا ہے تو رنگی لال کہتا ہے۔

"بیلی۔ میرا بھی ایک ہیرا اُدھر رہ گیا ہے۔ میں بھی ملٹری والوں کو عرضی دے دوں؟"

"ہاں۔ آجکل تو خوب شنوائی ہو رہی ہے۔ دونوں ساتھ ساتھ چلیں گے۔"

رنگی لال اپنے بیٹے کو برآمد کر لانے کے لیے ملٹری کی مدد کے لیے درخواست دیتا ہے۔ اور ایک دن دونوں عرضیوں کی منظوری آجاتی ہے اور پھر ایک ہی دن ملٹری کے کچھ جوانوں کے ساتھ وہ سرحد کی طرف نکل جاتے ہیں۔

قیام پاکستان سے صرف دس ماہ بعد دو ہندو مسلح ملٹری کے چھ جوانوں کے ساتھ لاہور آتے ہیں۔ پھر وہاں سے تین تین جوانوں کے ساتھ ایک جھنگ اور دوسرا میانوالی چلا جاتا ہے۔ میانوالی سٹیشن پر اُترتے ہی رنگی لال کو ایک بہت بڑا ہجوم گھیر لیتا ہے "ہمارا بھائی آ گیا۔ ہمارا ویر آگیا" کے نعرے لگنے لگتے ہیں۔ کئی لوگ خوشی سے رونے لگتے ہیں۔ ملٹری کے تین جوانوں میں گھرا رنگی لال سٹیشن سے باہر آتا ہے۔ کچھ لوگ اسے بانہوں میں لے کر ایک تانگے کی طرف بڑھتے ہیں۔ ملٹری کے جوان کہتے ہیں۔

"نہیں آپ اسے نہیں لے جا سکتے۔"

رنگی لال ملٹری والوں سے کہتا ہے "آپ لوگ گھبرائیے نہیں۔ مجھے کوئی خطرہ نہیں۔ آپ یہیں سٹیشن پہ ویٹنگ روم میں ٹھہریے۔ میں اپنے بیٹے کو لے کر آتا ہوں۔"

مگر اپنی ڈیوٹی سے مجبور جب وہ کسی طرح بھی رنگی کو چھوڑنے پر رضامند نہیں ہوتے تو شہر کے کچھ معززین اور خود رنگی لال کے لکھ کر دینے کے بعد وہ مان جاتے ہیں۔ ہجوم رنگی کے گلے میں ڈھیروں پھولوں کے ہار ڈال کر ڈھول بجاتا ایک جلوس کی شکل میں محلہ شیر علی خان کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔

پانا اپنے باپ کی آمد کی خبر سن کر اپنی منیاری کی ضلع بھر کی بڑی دکان "چیپ ہاؤس" جو اس نے ہندوؤں کے چلے جانے کے بعد قابو کی ہے، پر اپنے نوکروں کو ضروری ہدایات دے کر رنگی لال کے آنے سے پہلے کھسک جانے کے خیال سے آتا ہے کہ سید اور دراز میں سے ایک لفافہ بڑھا کر کہتا ہے "شیخ صاحب۔ آپ کا خط۔ دیکھیئے کونے میں لال سیاہی سے "ضروری" لکھا ہے۔"

شانو کا خط پڑھتے ہی وہ سوچوں کی اتھاہ گہرائیوں میں گم صم ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ لوگ رنگی لال کو بڑی شان و شوکت سے "چیپ ہاؤس" کے سامنے لاتے ہیں اور خوشیوں میں مست ہو کر اس کے اردگرد گھمر ناچنے لگتے ہیں۔ پانا خوشی کے آنسو آنکھوں میں لیے دوڑ کر باہر آتا ہے اور رنگی لال کے قدموں سے لپٹ جاتا ہے۔ دیوانہ وار پوچھتا ہے۔ "لالہ ذرا۔ بکرا۔ ماں تاں راضی اے ناں۔ بچے تاں خوش ہیں ناں؟"

وہ پھر لالہ کے گھٹنوں پر بوسے دینے لگتا ہے۔ حاضرین کے آنسو نکل آتے ہیں۔ باپ اور بیٹا بھی رونے لگتے ہیں۔ زنگی کہتا ہے "چل پُترا اپنے گھر۔ ادھر میرا گھر برباد ہوگیا۔ میری دنیا کالی ہوگئی پُتر"

وہ بھبک کر رو اُٹھتا ہے۔ افضل۔ رب نواز خاں۔ حبیب اللہ خاں بڑھ کر اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر ڈھارس بندھاتے ہیں "چاچا صبر کر۔ تیرا پُتر تیرے ساتھ ضرور جائے گا۔ حوصلہ رکھ"

زنگی لال دو دن وہاں ٹھہرتا ہے۔ یہ پانے کی تیاری کا تقاضہ ہے۔ پانا دن رات ایک کرکے جوبارے دکان۔ مکان اور دوسرے پھیلے ہوئے کاروباری سلسلوں کا بندوبست کرتا ہے۔ دوستوں اور ساتھیوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر دبا کر کہتا ہے "مونڈیو۔ دل چھوٹا نہ کرو۔ میں لبس گیا اور آیا۔ ذرا اُس خنزیر کراڑ کا حال پوچھ آؤں جس نے تمہاری بھرجائی... ..." پھر وہ سوچوں میں ڈوبا آسماں کی خلاؤں میں گھورنے لگتا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سی کرختگی آجاتی ہے۔ جو قتل سے پہلے قاتل کے چہرے پر دیکھی جا سکتی ہے۔

پانا لالہ کے ساتھ چھ بجے صبح لدھیانہ پہنچتا ہے۔ اس کے چھوٹے بہن بھائی اُسے گھیر لیتے ہیں۔ ماں اس کے گال اس کا ماتھا۔ اس کا سر چومتی چومتی تھوکوں سے لیتھڑ دیتی ہے۔ زنگی لال "میرا پُتر۔ میرا پُتر" کہتے کہتے دیوانہ ہوکر صحن میں ناچنے لگتا ہے۔ محلّہ والے سب اکھٹے ہو جاتے ہیں۔ بھاگو اور زنگی لال کو مبارکبادیں ملتی ہیں اور جب ان سب باتوں سے پانے کو فرصت ملتی ہے تو وہ خوشی سے بیر بہوٹی شانو کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ زنگی لال کے اشارے پر سب اِدھر اُدھر کھسک جاتے ہیں۔ شانو لجاتی شرماتی اندر بھاگ جاتی ہے۔ پانا اس کے پیچھے اندر جا کر اُسے بازوؤں کے گھیرے میں نہیں لیتا۔ اس کے گالوں پر بوسے ثبت نہیں کرتا۔ اس سے لپٹ لپٹ نہیں جاتا۔ چھوٹتے ہی پوچھتا ہے "کہاں ہے وہ کراڑ۔ لے چل مجھے اُس خنزیر کے پاس۔ ابھی۔ اسی وقت۔ اسی لمحے"

شانو سہمی سہمی سی پانے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہے۔ "چودھری صاحب۔ بیٹھو تو۔ ملک صاحب صبر تو کرو۔ لے جاؤں گی۔ لے جاؤں گی بھی"

"نہیں مجھے یہ کام ابھی کرنا ہے۔ میں اسی لیے تو آیا ہوں"

شانو سر سے پاؤں تک لرز کر رہ جاتی ہے۔ پھر سنبھلتی ہے اور کہتی ہے "اب تو دیر ہوگئی۔ تم ایک دن دیر سے آئے! میں کل شام وہاں ہو آئی"

"بے وفا! بے شرم!! تجھے شرم نہ آئی وہاں جاتے۔ میں ابھی... ..." پھر وہ اپنے تہبند میں ہاتھ ڈالتا ہے۔ وہاں کوئی ہتھیار یا چاقو نہ پاکر غصّے سے کانپتا ہوا کمرے میں اِدھر اُدھر کوئی چیز تلاش کرتا ہوا زور زور سے گالیاں دینے لگتا ہے "حرام زادی۔ اُلّو کی پٹھی۔ بے شرم۔ میں ابھی تیرے تکے اڑاتا ہوں"

پاکستان سے آئے نئے نئے مہاجر کا گھر ہے۔ خالی خالی کمرہ اس کے ذہن کی طرح بھائیں بھائیں کر رہا ہے۔ اسے بُری طرح محسوس ہوتا ہے کہ وہاں وہ سب کچھ تھا یہاں نہیں۔ غریب اور بے بس مہاجر ہے۔ جس کی بیوی بھی اس کے بس میں نہیں۔ پھر وہ اس کی گردن کو دونوں ہاتھوں سے دبا کر دھکیلتا ہوا دیوار سے جا لگاتا ہے اور پوچھتا ہے۔

"بول پھر کیا ہُوا ؟"

" ذرا گردن تو چھوڑو میری تو بتاؤں۔ تم تو کچھ سُنے بغیر ہی مجھے ذبح کیے ڈالتے ہو"۔

وہ ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی کر دیتا ہے ۔" تو پھر ٹھیک ٹھیک بتا۔ ورنہ یہیں ڈھیر کر دوں گا"۔

تم چاہے مار ڈالو مگر میں جھوٹ نہیں بولوں گی کیونکہ تمہاری عزت سے پہلے میری عزت کا سوال تھا"۔

"تو"۔

"تو اسے حاصل کچھ بھی نہیں ہُوا"۔

"کیوں ؟"

"کیونکہ میں ایک چاقو اپنے ساتھ لے گئی تھی اور ایک ... ..." اس کی آنکھوں سے ایک عجیب تبسم کا شعلہ سا بھڑک اٹھتا ہے۔

"چاقو"۔

"ہاں ۔ وہاں رکھا ہے"۔

پانا شانو کے گلے سے ہاتھ ہٹا لیتا ہے ۔ وہ ڈھیل ڈھالی گٹھڑی کی طرح زمین پر گر پڑتی ہے۔ پانا دوڑ کر اس اندھیرے کونے سے گندے کاغذات اور پتوں کا ڈھیر ہٹاتا ہے۔ چوہوں کے بل کو ادھیڑ ڈالتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد ایک خون آلود چاقو نکال کر دیکھتا ہے۔ خون کو سونگھتا ہے اور انسانی خون کی بو پہچان کر بڑبڑاتا ہے "تو پھر تمہیں میری ضرورت نہیں تم اپنی حفاظت خود کر سکتی ہو"۔

"اگر میں اپنی حفاظت خود کر سکتی تو پھر تمہیں کیوں لکھتی ۔

"پھر یہ خون آلود چاقو ... ... ؟"

اس چاقو کے دستے پر کسی مرد کے ہاتھوں کے نظر نہ آنے والے نشانات ہیں"۔

"مرد ؟ کون ہے وہ ؟ وہ کیوں تیرا ہمدرد بنا پھرتا ہے میں ابھی ... ..." وہ غصّے سے کانپنے لگتا ہے۔ شانو اس کے غصے سے لاپروا اس سے پوچھتی ہے۔" بلاؤں اُسے"۔

"ہاں میں ابھی اس کی انتڑیاں اس چاقو سے باہر نکال دوں گا"۔

شانو اُس کی دھمکی سے بے نیاز آواز دیتی ہے" گردھر۔ ذرا اوپر آنا"۔

تھوڑی دیر بعد میں سیڑھیوں کے پاؤں میں آکھڑا ہوتا ہوں۔ اوپر سیڑھی کے کونے پر چوبارے کے دروازے کے عین بیچ پانا چاقو کھولے کھڑا ہے۔ اس سے سولہ سیڑھیاں نیچے کھڑا میں اُسے ایک حقیر کیڑا نظر آتا ہوں۔ جو لمحہ بہ لمحہ رینگتا ہُوا اس کی جانب بڑھ رہا ہے اور بڑا ہوتا جا رہا ہے ۔ میں آخری سیڑھی چڑھ کر اس کے پاس جا کھڑا ہوتا ہوں۔ میں کافی اونچائی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہوں کیوں کہ اس عرصے میں میرا قد کافی نکل آیا ہے" کیا بات ہے پانے"۔

"تو تُو یہاں آکر گودھے سے گردھر بن گیا۔ ہمارے ٹکڑوں پر پل کر تمہیں ہماری ہی تھالی میں چھید کرتے شرم نہیں آئی۔ بے شرم میں

ابھی تمہیں اس بے شرمی کا مزہ چکھاتا ہوں۔"

وہ چاقو والا ہاتھ اٹھاتا ہی ہے کہ شانو میرے آگے آجاتی ہے "بے شرم تم ہو۔ تم ایک دن دیر سے کیوں آئے۔ بولو میں کیا کرتی"

"تم اس چاقو سے وہ کام کرتی جو اب مجھے کرنا پڑے گا" وہ چاقو شانو کی چھاتی میں اتارنا ہی چاہتا ہے کہ میں آگے بڑھ کر اس کی کلائی پکڑ لیتا ہوں۔ تھوڑی دیر کی کش مکش کے بعد چاقو اس کے ہاتھ سے گر کر دس سیڑھیاں نیچے لڑھکتا چلا جاتا ہے۔ نیچے سے ساتویں سیڑھی پر چاقو پر نظریں جمائے وہ مایوس۔ بھرائی ہوئی اور بے بس آواز میں کہتا ہے "اُف خدایا۔ وہاں شریف۔ بدمعاش۔ دس نمبریا بادشاہ سب کچھ تھا۔ یہاں میں بے بس۔ مجبور اور تنہا ہوں"

وہ تیز قدموں سے سیڑھیاں اُترتا ہے "غلطی میری ہے۔ میں دوسری ریاست میں چلا آیا"

نیچے اُتر کر وہ دروازے سے باہر نکل جاتا ہے پھر کبھی واپس نہ آنے کے لیے۔

خود غرض

رضیہ فصیح احمد

پتلی گلی کے ساتھ ساتھ بہتی نالی میں دروازے کے نزدیک ہی منو کا پہلا پہلا کارنامہ بہہ نکلنے کی کوشش میں ناکام یونہی بے حقیقت سا پڑا تھا۔ مجال ہے جو کبھی بہا دیں۔ محلے کے سب سے اونچے کوٹھے کی باسی شکیلہ نے چیل جیسی تیز آنکھیں سکیڑ کر سوچا۔ قریب تھا کہ وہ نزدیک کھیلتے ہوئے منو کو اس بات پر سرزنش کرے کہ اس کی نگاہ پاس کھڑے ہوئے سرخ اسکوٹر پہ پڑ گئی۔ پل بھر میں نالی کی ساری غلاظت اس کے جذبہ تجسس میں بہہ گئی۔

"کیوں رے منو ڈاکٹر بیٹھا ہے یا گیا؟" کھلی آنکھوں سے کھڑا اسکوٹر دیکھنے کے باوجود اس نے پوچھا۔

"بیٹھا ہے۔" منو نے لٹو گھماتے ہوئے اطمینان سے کہا۔

"نیچے یا اوپر؟"

"اوپر۔" منو نے لاپرواہی سے کہا۔ جھمبرائے ہوئے چہرے کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اپنے خیال کی کامیابی پہ مسکرائیں۔ پلٹیں، پھر زبان کی معیت میں انہوں نے نچلی پڑوسن سے کہا۔

"بیٹھا ہے۔"

"کب سے؟"

"بڑی دیر سے، نونو کے ابا باہر جا رہے تھے جب بھی اسکوٹر کھڑا تھا۔"

"چلو اچھا ہے کوئی تو ہے جو بیچاری کے پاس بیٹھتا ہے۔"

"ہاں اور کیا، کوئی تو ہے، ماں باپ بہن بھائی اور بھاوج کوئی نہ بیٹھے پر کوئی تو ہے۔" ان جملوں سے ہمدردی نہیں طنز کے شرارے جھڑ رہے تھے۔ اسکوٹر پہ بیٹھنے والا سرخ و سپید ڈاکٹر جس کے آنے سے اندھیری گلیوں میں روشنی ہو جاتی ہے۔ جس کے سرخ اسکوٹر سے گندی گلیاں سج جاتی ہیں۔ جاتا بھی ہے تو کہاں موت کے منہ میں۔ دوا کی گولیاں لوہے کے چنے نہیں ہوتیں کہ چبانے میں اتنی دیر لگے۔ نہ ہی انجکشن کی سوئی گھنٹوں کبھی رہ سکتی ہے۔ اس پہ بھی جب پوچھو یہی جواب ملتا ہے کہ اوپر بیٹھا ہے۔ حد ہے ان مردوں کے ندیدے پن کی، گھر میں دیکھو کیسی پیاری گڑیا سی بیوی بیٹھی گھنٹوں انتظار کرتی ہے اور پھر جب گلی میں آئے گا مجال ہے کسی کی طرف دیکھ لے۔ سامنے گلی میں دروازے سے آدھا دھڑ نکالے کھڑے رہو تو پلٹ کر نہیں دیکھے گا۔ چھت پر کھڑے نیچے کسی سے چلا چلا کے باتیں کیے جاؤ، ساری دنیا آتے جاتے سر اٹھا کر دیکھے گی، مگر نہ دیکھے گا تو یہ کمینہ! اس کو ایسی مار پڑی رہتی ہے علاج کی جیسے دو منٹ دوا نہ کھلائی یا انجکشن نہ لگایا تو پتہ نہیں کیا ہو جائے گا۔ جانے کیوں کھینچ تان کے غریب کی زندگی لمبی کیے جا رہا ہے۔ اب اس میں دھرا کیا ہے، کل کوٹھے پہ نظر آئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے شگفتہ نہیں شگفتہ کا بھوت ہو۔ منہ پہ آنکھیں ہی آنکھیں اور دانت ہی دانت۔ ہائے کوئی کیسے اس شکل کو گھنٹوں دیکھ سکتا ہے۔ پھر شکل ہی تو نہیں اتنی دیر

یں تو جانے کتنے جراثیم نکلتا ہوگا۔ ہم تو جاہل ہو کر بھی اتنا سمجھتے ہیں اور وہ سب کچھ جانتے بوجھتے توبہ ——— اس دن ایک منٹ کو کھڑے کھڑے اس پڑوسن کم بخت کی بے وقوفی سے سامنا ہو گیا تھا تو کیسا لگا تھا جیسے غٹاغٹ جراثیم گلے کے رستے پیٹ میں اُترے جا رہے ہوں۔ کئی قدم دور رہتی پھر بھی یہ سوچ سوچ کر رات بھر نیند نہ آئی تھی کہ جو اتنی ہی دیر کا کچھ اثر ہو گیا تو۔

" شگفتہ کا کوٹھا نظر آتا ہے یہاں سے ؟" نچلی پڑوسن نے پوچھا۔

"ہاں تھوڑا سا۔"

"کیا ہو رہا ہے ؟"

"پتہ نہیں، باہر تو کوئی نہیں۔"

"کمرے میں ہوں گے۔"

"تو اور کیا، علاج تو کمروں میں ہوتا ہے۔" تیکھی ہنسی میں طنز و حسد کی چنگاریاں۔

کوئی مالی باغ بھر کے تنومند بار آور اور سرسبز درختوں کو چھوڑ کر دیمک لگے پیڑ کے پیچھے پڑ جائے تو کیا اسے عقل مندی کہا جائے گا۔

"نکلا نکلا ——— ہنس رہا ہے وہ بھی ہنس رہی ہے، وہ زینے میں چلا گیا ——— وہ منڈیرے سے جھانک رہی ہے۔"

"جب تک وہ چلا نہیں جائے گا یہ جھانکتی رہے گی۔"

"وہ بھی اسکوٹر پر بیٹھ کر ایک دفعہ اوپر دیکھے گا۔"

"ہاں ضرور۔"

"کیوں نہیں ڈاکٹر جو ہوا۔" پردہ ہٹا کر گلی میں آتے دیکھ کر دونوں نے اپنے قہقہے روک لیے۔ نچلی پڑوسن آدھا دھڑ نکال کر اپنے بچے کو آواز دینے لگی۔ اُدھر بچے کو ٹھے کی باسی شکیلہ چلائی۔ "منّو اے منّو بات تو سُن۔" مگر ڈاکٹر نے کسی طرف بھی نہ دیکھا، چپ چاپ اپنے سکوٹر پر بیٹھا۔ ایک دفعہ اوپر دیکھا اور لمحہ بھر میں سُرخ پھولوں جیسے اسکوٹر سے بھی گلی سونی ہو گئی۔

"دیکھا۔" نچلی پڑوسن خفت مٹانے کو بولی۔

"آج ہی کیا روز ہی دیکھتی ہوں۔" اوپر والی پڑوسن پیچ و تاب کھا کر بولی ——— "میں نے تو سنا ہے، اللہ جانے سچ یا جھوٹ کہ نکاح ہو گیا ہے رات کو بھی آتا ہے۔ ایمان کی بات ہے کئی دفعہ رات کو اس کے اسکوٹر کی آوازیں میں نے بھی سنی ہے۔"

راتوں کو اسکوٹر کی آواز کیوں نہ سُنے گی دن بھر جو اس کے انتظار میں تلملائی پھرتی ہے۔ نچلی پڑوسن نے ذہن کے اس فقرے کو دھکا دے کر کہا۔ "اے ہے سچ مچ ؟ کمال ہے مُردے سے بیاہ۔"

"اس مرد ذات کی کچھ نہ پوچھو۔ سنا نہیں عورت کو تین دن قبر میں بھی بھاری ہیں۔"

"ہاں۔ وہ ٹوٹو کے ابا آ رہے ہیں۔"

کم بخت ٹوٹو کے ابا کو تین میل سے تاڑ لیتی ہے۔" اب میں چلوں کہیں گے ہر وقت کوٹھے پر چڑھی باتیں بگھارتی رہتی ہے۔" نچلی پڑوسن

کے صحن میں جھاڑو دیتی جمعدارنی نے یہ ساری گفتگو دھیان سے سُن کر پلّو باندھ لی۔ محلّے کی یہ سُنی سنائی باتیں بڑھیوں کی پٹاریوں کی طرح وقت پڑے بڑی کام آتی ہیں۔ یہاں سے نکل کروہ سیدھی شگفتہ کے کوٹھے پر پہنچی جہاں وہ روز دن میں دو بار خون سے گلنار اگالدان صاف کیا کرتی تھی زینے پر وہ ٹی بی وارڈ میں آنے والے ڈاکٹروں کی طرح مُنہ پر دوپٹے کا ڈھاٹا باندھ لیتی تھی۔ مگر جب کبھی کوئی ضروری بات کہنی ہوتی تو یہ ڈھاٹا کھل جاتا اور وہ گھنٹوں باتیں کرتی رہتی۔ باتیں اس کی کمزوری تھیں مگر اس سے بھی زیادہ کمزوری وہ لمحہ تھا جب شگفتہ جہیز کے بکس میں سے پیسے یا کبھی نیا کا نیا دوپٹہ نکال کر اسے دے دیتی تھی جسے بڑی ترکیبوں سے نیفے میں اڑس کر یا کوڑے کی ٹوکری میں چھپا کر وہ باہر نکلتی تھی۔ ایسے لمحے کے لیے اسے شگفتہ کی ہمدردی حاصل کرنی ہوتی تھی اور ہمدردی حاصل کرنے کے لیے اُسے گھر والوں یا پاس پڑوس کی باتیں کچھ اس انداز سے سنانی پڑتی تھیں کہ شگفتہ کو دنیا سے نفرت اور بیزاری کا احساس اتنا زیادہ ہو جائے کہ بکس میں پڑے پڑے سڑنے والے کپڑے اور پیسے اس کی نظر میں بیکلت ہیچ ہو جائیں۔ آج بھی اس نے اپنے گالوں پر تھپڑ مارتے ہوئے اور دُنیا کے جہنم داصل ہو جانے کی فوری دعا کرتے ہوئے شگفتہ کو یہ بات بتائی کہ محلے میں اس کا ڈاکٹر کے ساتھ نکاح ہو جانے کا چرچا ہو رہا ہے۔ تیر خالی گیا۔ شگفتہ روئی نہ پیٹی نہ اس نے محلے والیوں کو کوسنے دیئے نہ دنیا سے فوری رخصت سفر باندھنے کا اعلان کیا۔ بس ایک لمحے کے لیے اس کے چہرے پر ایسی سُرخی چھائی جیسے بیماری کے شروع کے دنوں میں مستقل رہتی تھی پھر وہ سُنی اَن سُنی کر کے اندر کمرے میں چلی گئی۔ جمعدارنی نے کچھ دیر پیپل اور نئے دوپٹے کی آس لگائی پھر مایوس ہو کے چلی گئی۔ شگفتہ کے دل نے یہ بات سُن کر قلا بازی کھائی تھی۔ اور پھر جیسے معلق ہو گیا تھا کیا ایسا ہو سکے گا کبھی ——— کیا دنیا یہ معجزہ دیکھے گی کہ جسے سلیم جیسے شخص نے ٹھکرا دیا اسے اس سے کہیں زیادہ خوب صورت اور قابل شخص نے اپنا لیا ——— کیا وہ زبانِ خلق کو نقارہ خدا سمجھنا شروع کر دے۔ مگر خود اس شخص کی زبان تو بالکل بند ہے۔ اگر وہ اشارہ دے دے تو کیا شگفتہ دوسرے ہی دن سے ٹھیک ہو کر نہ بیٹھ جائے مگر وہ گہرا آدمی ہے۔

ایک دن نریا حیرت سے کام لے کر شگفتہ نے اس سے کہا تھا۔

"ڈاکٹر آپ یہاں اتنی دیر بیٹھتے ہیں تو آپ کے بچے انتظار کرتے ہوں گے۔"

"میرے بچے نہیں ہیں۔" ڈاکٹر نے ہنس کر کہا تھا۔ اس کی ہنسی ایسی بے ڈھب تھی کہ دوسرا اور خاص سوال شگفتہ کے منہ میں ہی رہ گیا زبان پر نہ آسکا۔ اور باتوں باتوں میں جب اس نے یہ سوال جمعدارنی سے کیا تو اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ "کنوارا ہے بی بی۔" یہ چھوٹے چھوٹے جھوٹ بڑے نفع بخش ہوتے ہیں۔ جمعدارنی کو تجربہ تھا اور اسی دن سے شگفتہ نے یہ قیاس کر لیا تھا کہ وہ اسی لیے دل وجان سے اسے صحت مند بنانے پر تلا ہوا ہے کہ وہ ٹھیک ہو جائے تو اسے اپنے گھر اور دل کی ملکہ بنا کے رکھے۔ اسی امید پر اس نے جلد ٹھیک ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ کہ سہیلہ کی شادی کم بخت آن ٹپکی اور بھرتے زخم جیسے کسی نے ناخون مار کر کھرچ دیے۔ یہ ڈاکٹر ہی جو منہ سے کچھ پھوٹ دیتا تو یہ دکھ اتنا شدید نہ رہتا اس نے ڈاکٹر کی بھولی ہوئی ماچس کو ہونٹوں سے لگاتے ہوئے سوچا۔ مسالے کا نمکین نمکین مزا اس کے ہونٹوں پر رچ گیا اور بارود کی سی خوشبو اس کی ناک میں بس گئی۔ ان خوبصورت سڈول انگلیوں نے اس ماچس کو اتنی بار تو ضرور چھوا تھا کہ اس کے ہر حصے پر ان کا لمس ثبت ہو گیا ہو۔ وہ پہلی ماچس نہیں تھی جسے ڈاکٹر یہاں چھوڑ گیا تھا۔ سگریٹ پینے کے بعد ماچس کی ڈبیا بھول جانے میں اسے کمال حاصل تھا اور شگفتہ نے بھی آج تک کوئی ڈبیہ اسے واپس نہیں دی تھی بلکہ ساری کی ساری ڈبیاں قیمتی تحفوں کی طرح اپنے جہیز کے بکس میں بند کر دی تھیں۔

"اے ہے سہیلہ، شگفتہ کو پینے کا پانی تو دے آ۔ ڈاکٹر کہہ گیا تھا۔ اس کے پاس پانی نہیں ہے۔ پھر جمعدارنی نے بھی کہا تھا میں تو بالکل

بھول ہی گئی۔ اس شادی نے تو مجھے ہر چیز بھلادی۔ کام بھی تو اتنے ہیں کہاں تک کوئی یاد رکھے۔"

"فضل کے ہاتھ بھجوا دیجئے امی، میں کام کر رہی ہوں" "امی تو بالکل سٹھیا گئی ہیں۔ دیکھتی نہیں دلہن بننے والی ہوں سے کے اس دق زدہ کی خدمت کیے جاوں تاکہ مجھے بھی یہ روگ لگ جائے۔۔۔۔ ایسا ہی ہے تو خود کیوں نہیں چلی جاتیں، اپنا تو یہ ریڈی میڈ بہانہ ہے کہ ٹانگوں کے درد کے مارے چڑھا ہی نہیں جاتا یوں سارے محلے کا چکر لگاتی پھرتی ہیں۔۔ ۔۔ فضل بھی گھر والوں کا حال دیکھ چکا تھا۔ اسی کی جان فالتو تھی تھی۔ نل سے گرم آگ پانی نکال کر جگ بھرا، زینے پر چڑھ کر ہاتھ بڑھا کر جگ رکھتے ہوئے بولا "بی بی جی یہ پانی اٹھا لینا مجھے آپا جی بلا رہی ہیں" اور بغیر جواب کا انتظار کیئے وہ دھڑ دھڑ کر کے نیچے اتر گیا۔ کمرے سے شگفتہ نکلی۔ پانی کا جگ اٹھاتے ہوئے لمحہ بھر کو زینے کے سرے پر رکی۔ نیچے سے بھائی بھاوج کے ساتھ سہیلہ کے قہقہوں کی آواز آئی۔ مختلف قسم کی بھنبھناہٹوں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ نیچے جتنا شور شرابا تھا اوپر اتنا ہی سناٹا تھا۔ نیلے آسمان کے سمندر میں سفید بادل کا ایک تنہا ٹکڑا شگفتہ کے سر کے عین اوپر عجب بے کسی کے عالم میں چپ چاپ پڑا تھا۔ برابر کے مکان کی چھت کے کنگورے پر ایک چیل اداسی سے بیٹھی اونگھ رہی تھی اور وہ خود کتنی تنہا تھی، بالکل تنہا۔۔ ۔۔ گھر میں کوئی اس سے باتیں کرنے والا نہ تھا۔ پہلے دن بھائی بھاوج کی آمد کی خوشی میں وہ بے چین ہو کر نیچے اُتر گئی تھی بھائیوں نے دور سے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا تھا اور بھاوجیں صاف کنی کترا گئی تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر پکسی اور جونی کو پیار کیا تو دونوں بھاوجوں کے چہرے ایسے سفید پڑ گئے جیسے کسی نے ان کے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو۔ ذرا دیر بعد دونوں بھائی بھاوجیں ان کے بچے اور سہیلہ سب کمرے میں غائب ہو گئے اور وہ صحن میں اکیلی بیٹھی رہ گئی۔ ماں نے کہا۔

"تم جا کر لیٹ جاؤ تھک جاؤ گی" اشارہ سمجھ کر وہ واپس چلی اور چند سیڑھیاں چڑھ کر دیوار سے ٹیک لگا کر زینے میں بیٹھ گئی۔ ذرا دیر بعد سب اپنے اپنے بلوں سے نکل آئے۔ بڑے بھائی نے کہا۔

"میں نے آپ کو کتنا لکھا تھا کہ شگفتہ کو سینی ٹوریم میں ڈال دیں مگر آپ نہیں مانیں۔ اب دیکھیئے بچوں والے گھر میں اس کا یوں پڑا رہنا اچھی بات ہے۔"

"میں کیا کروں، سینی ٹوریم کا نام سنتے ہی وہ رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیتی ہے۔ کہتی ہے وہاں جاتے ہی میں مر جاؤں گی۔ اس کا ڈاکٹر بھی کہتا ہے کہ وہ نہیں چاہتی تو زبردستی بھیجنا مناسب نہیں۔ اسی لیے تو اس نے اوپر رہنا منظور کر لیا ہے، بیچاری نیچے آتی کہاں ہے۔ یہ تو آج تم لوگوں کی خاطر آ گئی تھی۔"

"اب شادی میں سب ہی مہمان آئیں گے تو وہ کیا کہیں گے اور وہ کیا اکیلی اوپر ٹنگی رہے گی۔"

"میں اسے سمجھا دوں گی وہ تو خود احتیاط کرتی ہے۔ سمجھدار ہے کوئی بچہ تو نہیں ہے۔"

اس دن سے شگفتہ بالکل ہی نیچے نہیں اتری تھی اور شام کو یہ سب بتاتے ہوئے وہ ڈاکٹر کے سامنے رو پڑی تھی۔ ڈاکٹر نے تسلی دیتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔ رسی جیسا ہاتھ جس میں پانچ ہڈیاں جھول رہی تھیں۔ ابھری ہوئی ہڈیوں کے سائے میں اس کے گالوں کے گڑھے اور پیلے زرد رنگ کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے کہا تھا کہ وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گی تو پھر کوئی اس سے پرہیز نہیں کرے گا۔ رات کو صحن میں محلے بھر کی عورتیں اور لڑکیاں ڈھولک لے کر بیٹھ جاتی تھیں۔ ان کے جوتے صحن کے ایک کونے میں لگے ہوئے پپیتے کے درخت تلے پھیلے رہتے

تھے۔ صحن کی بتی بجھا دی جاتی تھی، مگر باورچی خانے سے آنے والی اور چاندکی روشنی میں عورتوں کے دوپٹوں کے گوٹے، کانوں کے جھمکے اور ناک کی لونگیں چمک چمک جاتی تھیں۔ سب سے اونچے کوٹھے کی مالکن شکیلہ بیچوں بیچ بیٹھی نزدیک کی بیٹھک میں مردوں کی موجودگی سے باخبر اونچی آواز میں فحش مذاق کرتی رہتی تھی۔ ہر مذاق کے بعد ملے جلے قہقہے اور تھوڑی دیر بعد ڈھولک اور تالیوں کی تھاپ پر گانے کی آواز شگفتہ تک پہنچتی رہتی تھی ان گانے والیوں میں اس کے افسر بھائیوں کی بیویاں بھی ہوتی تھیں جو مردوں کی محفلوں میں بے تکلفی سے پہنے جانے والے بغیر آستین کے بلاؤزوں میں اس وقت بے چینی سی محسوس کرتی تھیں اور اپنے ساری کے پلو کندھے کے گرد لپیٹ کر بڑے تکلف سے زمین پر بیٹھ جاتی تھیں۔ دونوں کے بچے نزدیک کے پلنگ کی صاف شفاف چادر پر پڑے آرام سے سو رہے ہوتے تھے۔ جب کبھی گیت اور قہقہے بریک وقت رک جاتے تو مردانی بیٹھک کے قہقہے بھی شگفتہ کے کانوں میں پڑ جاتے۔ اس کا دل چاہتا وہ بھی نیچے جائے پھر اسے اس وحشت کا خیال آتا جو اسے دیکھتے ہی سارے مجمع پر چھا جائے گی۔ بھاوجیں خنکی ہو جانے کا بہانہ کر کے بچوں کو اندر لٹانے لے جائیں گی اور وہیں کی ہو رہیں گی — بہت سی عورتوں کو یاد آ جائے گا کہ ابھی ان کے شوہروں نے کھانا نہیں کھایا ہے اور انھیں گرما گرم سدھی پکا کر دینی ہے حالانکہ ان کا کھانا اب ہضم ہونے کے قریب ہوگا۔ اس کی وجہ سے ذرا سی دیر میں رنگ میں بھنگ پڑ جائے گا اور اسے پٹے ہوئے کتے کی طرح واپس آنا ہوگا اور پھر شادی کے یہ گیت وہ کیسے سن سکے گی پاس جا کر —— دور ہی سے جب وہ ڈھولک کی تھاپ سنتی ہے اور" جن " "ماہی اور" "اڑیا" سے مخاطب کیے گاتے سنتی ہے تو یہ خیال اسے جینے نہیں دیتا کہ یہ سہیلہ اور سلیم کی شادی کے گانے ہیں۔ کتنی ہی مرتبہ دروازے اور کھڑکیاں بند کر کے وہ کمرے میں گھٹ کر بیٹھ گئی تھی کہ گانے کی آواز کانوں میں نہ آ سکے اور کتنی ہی مرتبہ وہ ماچس کی ڈبیوں کے ڈھیر میں منہ چھپا کر اتنا روئی تھی کہ ان کا سب مسالہ تر ہو کر چلے ہوئے پٹاخوں کی طرح پُھسپھسا ہو کر رہ گیا تھا۔

آج سہیلہ کی شادی کا دن تھا اور شگفتہ نے قسم کھائی تھی کہ وہ پیاسی مر جائے گی، مگر ہرگز آواز دے کر پانی نہ مانگے گی۔ کیا واقعی وہ لوگوں کے ذہنوں سے اس حد تک اتر گئی ہے کہ بھرے گھر میں کسی کو بھی خیال نہیں کہ اس کے لیے کھانا پانی اوپر گیا ہے یا نہیں۔ کسی کو احساس نہیں برات کی دید سے محروم، نیچے کے سارے ہنگاموں سے بے نیاز بہن کی شادی میں کسی چیز کی حقدار نہ ہونے والی کوئی ہستی خونِ جگر سے اپنی بھوک اور پیاس مٹاتی بھٹکتی ہوئی روح کی طرح جلتے صحن کے چکر کاٹ رہی ہے۔ اسے یہ خبر نہیں تھی کہ ایک دور اندیش بھابی نے صبح ہی اوپر چڑھ کر زینے کے دروازے میں یہ سوچ کر تالا ڈال دیا تھا کہ برات دیکھنے کے بہانے نیچے اور عورتیں اوپر نہ چڑھ جائیں۔ جانے سہیلہ دلہن بن کر کیسی لگ رہی ہوگی۔ سوچنا نہ چاہتے ہوئے بھی وہ سوچ رہی تھی۔ رخصت ہونے سے پہلے جب وہ اس سے ملنے آئے گی تو وہ اس سے کیونکر ملے گی۔ .. یہ سب خیالات لمحہ بھر کو آتے اور پھر شدت کی پیاس سے ہار کر واپس چلے جاتے۔ پیاس سے شگفتہ کی زبان چٹخ رہی تھی پیاس کے خیال کو بھلانے کے لیے وہ منڈیر کے پاس جا کر نیچے جھانکنے لگی۔ مہمانوں کے شامیانے سامنے میدان میں لگائے گئے تھے اسی لیے ان کے مکان کی گلی سنسان پڑی تھی۔ یہ بھی اچھا ہی تھا کہ شادی کی ہڑبونگ ذرا دور تھی۔ اس نے سوچا۔ اسی وقت گلی کے منہ پر ڈاکٹر کا سُرخ اسکوٹر ابھرا —— مگر یہ کیا۔ اس کے پیچھے سُرخ پھولوں کا یہ ڈھیر کیسا تھا۔ اسکوٹر آگے بڑھ کر اسی جگہ کھڑا ہوا، جہاں ہمیشہ کھڑا ہوتا تھا اور پچھلی سیٹ سے سُرخ جوڑے سنہرے پلّو والی بنارسی ساڑھی میں جھلمل جھلمل کرتی ایک حسین لڑکی اتری اس نے اندر جانے کے لیے

قدم بڑھایا تو ڈاکٹر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا اور ایسی نظروں سے اسے دیکھا کہ شگفتہ کو لگا اس کے زخمی پھیپھڑوں میں کسی نے سوئیاں ہی سوئیاں بھونک دی ہوں۔ ڈاکٹر شادی شدہ تھا اور سلیم اس وقت دولہا بنا بیٹھا تھا۔۔ شگفتہ کو دیکھنے جب عورتیں آئی تھیں تو ان کے پسند کر لینے کے بعد سلیم کو ان کے گھر بلایا گیا تھا۔ لڑکیوں نے زبردستی اسے گھسیٹ کر کھڑکی میں سے سلیم کو دکھایا تھا اور اتفاق سے سلیم نے بھی اسی وقت کھڑکی پر نظر ڈالی تھی۔ سلیم خوب صورت نہ سہی مگر جاذب نظر ضرور تھا۔ اس کو ایک نگاہ دیکھتے ہی شگفتہ کے دل پر اس کی موہنی صورت نقش ہو گئی تھی جس میں جان اور رنگ اس کی بہنیں سلیم کی باتیں سنا سنا کر بھرتی رہتی تھیں۔ آج انہوں نے یہ کہا وہ کہا، یہ مذاق وہ چھیڑ۔۔۔ اور آخر میں طے ہو گیا کہ اس کا ہونے والا دولہا بے حد ضدی ہے۔ منگنی ہو جانے کے بعد وہ اکثر آنے لگا تھا۔ اس کی ضد تھی کہ شگفتہ کے جہیز کی ہر چیز اس کی پسند کی ہونی چاہیئے۔ وہ سہیلہ کے ساتھ زبردستی بازار جاتا اور سارے کپڑے اپنی پسند کے خریدتا۔ سہیلہ نے ایک دن چڑ کر کہا تھا "توبہ ہے، میرا تو ایسے آدمی کے ساتھ ایک دن گزارہ نہ ہو۔ مجال ہے جو اپنی ایک بات بھی ٹل جائے۔" شگفتہ یہ بات سن کر دل ہی دل میں مسکرائی تھی۔ بھلے کو اگر ایک آدمی ضدی ہو بھی تو پھر کیا، وہ خود تو ضدی نہیں تھی۔ ضد تو زور اسی وقت پکڑتی ہے جب دونوں ایک سے ہٹ دھرم ہوں۔۔۔ اور آہستہ آہستہ سہیلہ نے یہ کہنا شروع کر دیا تھا کہ آج وہ سلیم کی ضد توڑ کر رہی۔ اس کے مقابلے میں اپنی پسند کا جوتا یا کوٹ خرید کر چھوڑا۔ گھر والے ہنستے اور کہتے۔

"اس ضدی کو تو سہیلہ ہی ٹھیک کرتی ہے۔" مگر اس کی آخری ضد کوئی بھی نہ توڑ سکا۔ شگفتہ اس کی ہر بات کو ضد بننے سے پہلے ہی مان لینے کے منصوبے بناتی رہی مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی کیونکہ سلیم نے اعلان کر دیا کہ وہ شگفتہ کے بجائے سہیلہ سے شادی کرے گا!

بظاہر سہیلہ بہت۔ دئی پٹی کہ ہائے شگفتہ کیا کہے گی کہ میں نے اس کے میاں کو پھانس لیا مگر اس ضدی نے صاف کہہ دیا کہ شادی ہو گی تو سہیلہ سے ورنہ اس گھر سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔

خاندان کے پانچ بڑوں کی کانفرنس ہوئی جس کا ٹیپ کا بند تھا "لڑکے بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔" ارے نئی پود کو تو بدلتے ایک زمانہ لگتا ہے لیکن یہ بڑے جو چھوٹوں کو ہر وقت ٹوکتے رہتے ہیں۔ وقت پڑنے پر سارے اصول طاق پر رکھ کر کیسے کھٹاک سے بدل جاتے ہیں۔ نیشن ایبل بہو کے آتے ہی اماں نے برقع اٹھا کر طاق پر رکھا اور ہاتھ میں پرس ڈال کر کیسے مزے سے گھومنے لگیں جیسے برقع سے کبھی کوئی ناطہ ہی نہ رہا ہو۔ ابا جنہوں نے شگفتہ کو اسکول میں پڑھانے پر بھارتی حکومت کی سی ضد اختیار کی تھی اور اس کے مرن برت پر جا کر کہیں پچھلے تھے بعد میں اسے کالج میں داخل کرانے پر اس لیے جھٹ سے تیار ہو گئے تھے کہ اس طرح اچھا رشتہ ملنے کی امید تھی اور پھر اس کے بعد جب وہ آگے پڑھنا چاہتی تھی تو سب بڑوں نے یہ طے کیا تھا کہ وہ کچھ دن نوکری کر کے اپنا جہیز بنا لے تو زیادہ بہتر ہے۔ بڑے بھائی جو عورتوں کی ملازمت کے سخت خلاف تھے کہہ گئے تھے "ہم بھائیوں سے بھی جو ہو سکے کریں گے مگر اچھا ہے جو وہ کچھ دن کام کرے، کچھ کپڑے وپڑے ہی بن جائیں گے" تو یہ تھے بڑوں کے اصول جن پر ایک وقت ان کی ساری آن بان اور ناک کا دار و مدار ہوتا تھا اور دوسرے وقت مصلحت دیکھ کر وہ موم کی ناک کی طرح مڑ جاتے تھے۔ چنانچہ اس وقت بھی یہی فیصلہ ہوا کہ شگفتہ اور سلیم کی بچپن کی منگنی تو ہے نہیں نہ ساتھ کے کھیلے ہیں کہ شگفتہ کو زیادہ رنج ہو یا اس کا دل ٹوٹے اور جب وہ اس سے کسی صورت کرہی نہیں رہا تو پھر کیوں اسے ہاتھ سے جانے دیا جائے۔ آج کل بڑی مشکل سے ملتے ہیں، ممکن ہے شگفتہ کو اس سے بھی اچھا بر مل جائے۔ شگفتہ سے رائے لیے بغیر بالا ہی بالا یہ سب طے کر لیا گیا اور ایک دن ماں نے بڑی اونچ نیچ

اور دنیاداری کی ڈھیر سی باتوں کے ساتھ یہ بات اس کے گوش گزار کر دی . . . یہ اس کی بدقسمتی کہ مختلف وجوہات سے شادی ٹلتی ہی گئی تو اس کے سرپرستی ہی رہی یہاں تک کہ اسے خون تھکوا کے چھوڑا اگر بات کو یہ کہہ کر دبا دیا گیا کہ شگفتہ کو پہلے ہی ڈاکٹر نے دق بتادی تھی اسی لیے تو یہ منگنی توڑ دی گئی تھی۔ پھر ایک دن ماں بہت سی دنیاداری کی باتوں کے ساتھ اس کے جہیز کے کپڑوں پر ہاتھ صاف کرنے آئیں جو اس نے اپنی ملازمت کے پیسوں سے بنائے تھے اور اس دن وہ دنیا میں سب سے زیادہ ضدی لڑکی بن گئی اس نے اپنے کپڑوں کے بکس کو ہاتھ تک نہ لگانے دیا اور اعلان کر دیا کہ یہ سب کپڑے اس کے ساتھ قبر میں دفن کر دیے جائیں۔

ڈاکٹر کے واپس چلے جانے کے بعد وہ منڈیر سے ہٹ آئی۔ پیاس کی شدت اپنی انتہا کو پہنچ گئی تھی مگر اب پیاس بجھانے کی اسے کوئی آرزو نہ تھی۔ لڑکھڑاتے قدموں سے وہ اپنے کمرے میں آئی۔ جہیز کے کپڑوں کا بکس کھولا اور کپڑے نکال کر پلنگ پر ڈھیر کرنے لگی۔ ایک شال پر اس نے بہت سے آئینے قطار اندر قطار جڑوائے تھے۔ اسے اٹھاتے ہوئے ایک آئینے پر اس کی نظر پڑی تو اس نے دیکھا ابھری ہوئی ہڈیوں والا نوکیلا بے حد مدقوق چہرہ اس کا منہ چڑا رہا ہے اور پھر قطار اندر قطار سارے آئینے اسی صورت اس کا منہ چڑانے لگے۔ گھبرا کر اس نے شال پلنگ پر پھینک دی۔ وہ کتنی پاگل تھی کیا ڈاکٹر پھولوں کے مقابلے میں کانٹوں کی یہ گٹھڑی چن لیتا۔

"کیا یہ کپڑے پہنیں جا سکیں گے۔ اس کے اندر سے کسی نے اس سے پوچھا۔

ہاں کیوں نہیں "

کب ؟"

"ابھی" شال کے آئینوں کا چہرہ بڑی خوفناکی سے مسکرایا۔

شگفتہ نے سرخ شنیل کا جوڑا اٹھایا جس پر سلمہ ستارے کا کام جگر جگر کر رہا تھا۔ قمیض کو دیکھ کر اندازہ ہوا کہ اس کے جیسے دو بڑی آسانی سے اس میں سما سکتے ہیں اپنے پہنے ہوئے کپڑوں پر ہی اس نے یہ جوڑا چڑھا لیا اور گوٹے کے جال کا دوپٹہ اوڑھ لیا۔ آئینے کی مدد کے بغیر اپنا سراپا بڑا خوبصورت لگا۔ مہینوں سے بند شنیل کے کپڑوں کی نرم نرم خنکی اسے اچھی لگی۔ پھر اسی سوٹ پر اس نے سرخ رنگ کی ایک بنارسی ساری لپیٹ لی۔ ایسی ہی ساری تو ڈاکٹر کی بیوی پہنے ہوئے تھی۔ اس ساری پر اس نے نائلون کی ایک اور ساری لپیٹ لی، پھر ایک اور پھر ایک اور۔ اب وہ کپڑوں کا بورا سا نظر آ رہی تھی۔ اپنی ہیئت کذائی پر وہ دل ہی دل میں ہنسی۔ جتنے جوڑے باقی رہ گئے تھے ان کے دوپٹے اس نے ایک کے اوپر ایک لپیٹ لیے تھے۔ ان کپڑوں میں گھسٹتی گھسٹاتی وہ باہر گئی اور وہ برائین اٹھالائی جو بہت دیر سے اسے پیاس بجھانے کی دعوت دے رہا تھا۔ اس میں بالکل پانی جیسی سیال سی چیز تھی جو بڑے بھائی کے اسکوٹر کی پیاس بجھاتی تھی۔ اس میں بو ضرور تھی مگر بو سے ایسا کون سا فرق پڑتا ہوگا۔

کمرے میں واپس آ کر اس نے اس بدبودار پانی کو اپنے اوپر بکھرے ہوئے کپڑوں کے اوپر خوب فراخدلی سے ڈالا۔ ڈاکٹر کی بھولی ہوئی ماچس کی ڈبیوں کا ڈھیر اپنے پاس رکھا۔ ان کے نزدیک لیٹ کر باقی ماندہ کپڑے اپنے اوپر پھیلا لیے۔ آئینوں والی شال سب سے اوپر ڈالی۔ پھر ماچس کی ایک ڈبیہ کو پیار سے ہونٹوں پر لگا لینے کے بعد بڑی عقیدت و احترام سے کھولا۔ احتیاط سے ایک دیا سلائی نکال کر بالکل ڈاکٹر کے سے انداز میں سلگائی اور بڑے دل میں بھیگے ہوئے اپنے کپڑوں پر رکھ دی۔

جب شگفتہ کی اور کپڑوں کی راکھ گٹھڑ میں باندھ کر نیچے لائی گئی تو اس میں ماچسوں کے ڈھیر کا تو نام و نشان بھی نہیں تھا البتہ کپڑوں پر بنے ہوئے سچے کام کے چاندی کے تار کالی کالی راکھ میں خوب چمک رہے تھے۔ بھابیوں نے اس گٹھڑ کو دیکھ کر چیخ ماری "ہائے میری شگفتہ" اور ایک دوسرے سے لپٹ گئیں۔ بھائیوں نے سبکتے ہوئے سر دروازے پر ٹیک دیے۔ سہیلہ سرخ ریشمی کپڑوں اور زیوروں میں لدی ہوئی آئی اور اسی چارپائی سے لپٹ گئی جس پر بہن کی جلی ہوئی چتا پڑی تھی ماں پہلے ہی سے بے ہوش پڑی تھیں۔ شادی کے سارے مہمان پرسے کے مہمان بن گئے تھے۔ اونچے کوٹھے کی شکیلہ نے چق میں سے جھانکتے ہوئے نچلی پڑوسن سے کہا "وہ بھی آیا ہوا تھا ———"

"ہاں، آج تو اپنی بیوی کو بھی لایا تھا۔"

"ہئے ہئے یہ ظلم تو دیکھو۔ تبھی تو بیچاری جل مری۔ ایک تو اسے اپنے ساتھ رکھنے سے انکار کر دیا اوپر سے سوکن کو بھی لے کے چلا آیا۔"

"اے ہے تو کیا اسی لیے۔؟"

"تو اور کیا۔ دیکھو کیسا خاموش منمنا بنا بیٹھا ہے بدذات جیسے اس نے تو کچھ کیا ہی نہیں۔"

"ہائے یہ مرد کی ذات وہ تو اب گئی جس کی خاطر گھنٹوں آ کر بیٹھتا تھا دیکھتے ہیں۔ اب آتا ہے یا نہیں۔"

"دیکھو کیسی فکر لگی ہوئی کٹنی کو، آئے یا نہ آئے تجھے تو منہ لگانے سے رہا۔ ذہن کے اس خیال کو جھٹک کر اس نے بڑی مایوسی سے کہا۔" اب کیا منہ لے کر آئے گا۔"

ہائے کیسے افسوس سے کہہ رہی ہے جیسے اس کے نہ آنے سے بے چاری کا دل ٹوٹا جا رہا ہو۔ یہ سوچتے ہوئے نچلی پڑوسن نے چق سے آنکھیں گاڑتے ہوئے کہا" وہ تو غریب گھل گھل کے مر گئی اور خود دیکھو کیسا ہٹا کٹا ہے، سرخ و سپید" ہائے کیسے دیدے پھاڑ کے دیکھ رہی ہے زمانے کی شرم بھی تو نہیں رہی" ایمان کی بات ہے مجھے تو اتنے سفید مرد اچھے نہیں لگتے۔ مرد تو سانولا سلونا ہی اچھا لگتا ہے۔"

"رہنے دے میں کیا تیری نظریں نہیں پہچانتی، ایک دفعہ گڑ جائیں تو اٹھتیں نہیں اس پر سے جیسے گڑ پر مکھی چپٹ گئی ہو" ٹھیک ہی تو ہے بہن مرد میں چسب ہونی چاہیئے نہ کہ رنگ روپ۔"

"اور کیا اب دیکھو جیسے ٹوٹو کے ابا ———"

"ہاں یا منو کے ابو ———"

بھابیاں اب خاموشی سے گھٹنوں میں سر دیئے رو رہی تھیں یہ مرنے والے اتنے خود غرض کیوں ہو جاتے ہیں۔ جہیز کے کپڑے کسی کو نہ دیے نہ سہی مگر اتنے قیمتی کپڑوں کو جلا کر راکھ کرنا کیا ضرور تھا۔ سینکڑوں کا تو کام ہی تھا ان پر، دیکھا نہیں۔ راکھ کیسی جگہ جگہ کر رہی ہے۔ سہیلہ سرہانے ہل ہل کر قرآن شریف پڑھ رہی تھی۔ آنسوؤں سے اس کی آنکھیں بار بار دھندلائے جاتی تھیں۔ بہن ہو کر ایسی خودغرضی۔ ذرا نہ سوچا کہ سالوں بعد تو کہیں شادی کی نوبت آئی تھی۔ اب پھر ٹل جائے گی۔ مرنا تو تھا ہی اب ویسے ہی بدن

ین کون سی جان رہ گئی تھی دو چار مہینے کی بات تھی۔ چلو دو چار مہینے نہ سہی دو چار گھنٹے ہی انتظار کر لیا ہوتا۔ سب رو رہے تھے مگر ڈاکٹر خاموش صورت تصویر بیٹھا تھا جیسے وہ کسی مریض کو دیکھنے آیا ہو اور وہ پہلے ہی مر چکا ہو۔ سب رو رہے تھے مگر ان سب کے بیچوں بیچ بیٹھی شگفتہ کی خود غرض روح ہنس رہی تھی۔ اب اس سے ڈر کر کوئی بھی اِدھر اُدھر نہیں بھاگ رہا تھا۔

خول

ہنس راج رہبر

"تکلیف نہ ہو، تو ذرا سگریٹ اٹھا دیجیے۔" میں نے پرتاپ سنگھ سے کہا اور کانس پر رکھی ڈبی کی طرف اشارہ کیا۔

"واہ، اس میں تکلیف کیا ہوگی! اور حکم۔" اس نے ڈبی میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

"شکریہ۔" میں نے سگریٹ نکال کر ہونٹوں میں دبائی اور کنکھیوں سے جیت کی طرف دیکھا۔

"میں خود نہ سگریٹ پیتا ہوں نہ شراب" پرتاپ سنگھ نے اپنے کردار کی وضاحت کی اور اس کی مونچھوں تلے ایک مخصوص مسکراہٹ نمایاں ہوئی۔ "لیکن کوئی دوسرا پیئے تو مجھے اعتراض نہیں۔ میں ہر طرح کے لوگوں کی صحبت میں مزے سے رہ سکتا ہوں اور میرے دل میں کسی کے لیے ذرا بھی نفرت نہیں ہے۔"

"بھاپا جی، یہ ہم جانتے ہیں۔" جیت نے طنزاً کہا۔ اور ایک تیکھی نظر سر سے پاؤں تک اس پر ڈالی۔

پرتاپ سنگھ نے صرف کچھا اور بنیان پہن رکھی تھی۔ کیس اور داڑھی کے علاوہ اس کی ٹانگیں اور باہیں بھی بن مانس کی طرح بالوں سے سیاہ تھیں۔

جیت، ناصر اور میں تینوں ایک کمرے میں اکٹھے رہتے تھے۔ اس نئی بستی میں یہ کمرہ جس میں بجلی کے علاوہ نہانے وغیرہ کی بھی سہولت تھی۔ پرتاپ سنگھ کی کوشش اور سفارش ہی سے ہمیں مل سکا تھا۔ ورنہ دہلی جیسے شہر میں رہائش کے لیے جانے کب تک پریشان ہونا پڑتا ہے۔ اس لیے ہم اس کے ممنون تھے۔

اس کمرے سے چند قدم کے فاصلے پر پرتاپ سنگھ کا ذاتی مکان تھا جہاں وہ بیوی بچوں سمیت گرہست جیون گزار رہا تھا۔ یہ اس کی مہربانی اور ہمدردی ہی تھی کہ وہ ہم جیسے ملنگوں سے بھی بے تکلف تھا۔ اور جب چاہے کچھا بنیان پہنے ہوئے ہمارے کمرے میں چلا آتا تھا۔ ہمارے ساتھ بیٹھ کر چائے پیتا۔ گپ شپ اور دل لگی بھی کرتا تھا ورنہ عام زندگی میں معمولی لوگوں کے سامنے اس کا پہناوا، بول چال اور رویہ بالکل مختلف تھا۔

جب وہ گھر سے باہر نکلتا تو کھلی آستین کا کلف لگا ہوا سفید باریک کرتہ اور پائجامہ پہنتا، سر پر ہلکے سرخ کی دستار سجاتا اور اپنی وقت صرف کرکے داڑھی چڑھانے کے لیے فکسو لگاتا تھا۔ یہ گرمی کا پہناوا تھا۔ سردی کے موسم میں وہ ایک دم بڑھیا سوٹ پہنتا تھا۔ جس پر داغ دھبہ یا کوئی نشان خوردبین سے بھی دکھائی دینا مشکل تھا۔ اس پہناوے اور رکھ رکھاؤ کے ساتھ جب سنجیدگی اور متانت بھی مل جاتی تھی تو دیکھنے والوں پر اس کا رعب پڑتا تھا اور وہ کوئی اہم شخصیت نظر آتا تھا۔ پھر سیاسی، سماجی اور اعلیٰ موضوعات پر بات چیت کرنے کے چند ایسے نایاب نکتے اسے معلوم تھے کہ سامعین حیران رہ جاتے اور پہلی ایک دو ملاقاتوں

ہی میں اس کی قابلیت اور ذہانت کی دھاک دلوں پر بیٹھ جاتی۔ صاف ستھرے پہناوے اور رکھ رکھاؤ کی طرح سنجیدگی اور ایک مخصوص مسکراہٹ بھی اسی لیے اس کی شخصیت کا حصّہ بن گئی تھی کہ وہ لوگوں کے اس بھرم کو نبھائے رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔

ہماری یہ خوش قسمتی تھی کہ پتاپ سنگھ ہمارے ساتھ بے تکلفی برتتا تھا اور جب چاہے بغیر داڑھی باندھے، صرف کچھ بنیان پہنے ہوئے ہمارے کمرے میں چلا آتا تھا۔ شروع شروع میں ہم بھی اسے اہم شخصیت تصوّر کرتے تھے اور اس کی فراخدلی کی قدر کرتے تھے۔ لہذا جب کبھی ہمارے یہاں بے تکلف دوستوں کی محفل جمتی تو ہم اسے بھی مدعو کر لیتے تھے۔ مختلف موضوعات پر بحث چلتی، ہنسی اور دل لگی رہتی۔

ہم نے ایک اسٹوو رکھ چھوڑا تھا۔ جی چاہے تو چائے دن میں کئی مرتبہ بنتی تھی اور یہ سلسلہ صبح آنکھ کھلتے ہی شروع ہو جاتا تھا۔

"جیت، کیا تم اتنے سست ہو کہ اٹھ کر چائے بھی نہیں بنا سکتے؟ مجھے کم از کم تم سے اس بات کی اُمید نہیں تھی۔"

"جی ہاں، تمھیں کیوں اُمید ہوگی۔ نواب جھجر بنے کروٹیں جو بدل رہے ہو۔" جیت جواب دیتا اور منہ ڈھانپ کر دوبارہ سونے کا بہانہ کرتا۔

"بھائی ناصر، تمھیں اٹھو اور ہمت کرلو۔ یہ تو مہا نالائق نکلا۔" میں "مہا" پر خاص زور دیتا اور پھر ہنستا۔

"اچھا، میں چائے بناتا ہوں۔ لیکن یہ بتاؤ کہ برتن کون دھوئے گا۔" ناصر شرط پیش کرتا۔

"یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ وہ تو جیت دھو ہی لے گا۔" میں جواب دیتا۔

"کیوں جیت، ٹھیک ہے نا؟" ناصر اس سے پوچھتا۔

"تم چائے تو بناؤ برتن بھی دُھل جائیں گے۔" جیت جھٹ منہ اُگھاڑ کر گول مول بات کہتا۔

"اپنے آپ کیسے دُھل جائیں گے۔ پہلے طے کرلو۔ میں پھر اُٹھوں گا۔"

کچھ دیر اس طرح چپقلش رہتی اور ہمیں چائے سے بھی زیادہ مزا اس چپقلش میں آتا مگر اس کے بعد بھی جیت اور ناصر میں سے اگر کوئی نہ اُٹھتا تو میں خود چائے بنا کر انھیں بڑے ادب سے پیش کرتا۔

اتوار کو ناصر، جیت اور میرے علاوہ دیپک اور شاہد بھی آتے اور متفقہ طور پر طے پایا کہ دوپہر کا کھانا ہمارے گھر پر بنے۔ ہم نے چائے کے سامان کے علاوہ دُوسرے برتن بھی رکھ چھوڑے تھے اور ایسے پروگرام اکثر بنتے رہتے تھے۔

تجویز دیپک کی تھی اس لیے وہ خود ہی لپک کر بازار گیا۔ ڈھائی تین سیر گوشت اور اس میں ڈالنے کے لیے گھی، دہی اور مسالا وغیرہ خرید لایا۔ وہ ہمتی آدمی تھا اور دل کا بھی شاہ تھا۔ کنجوسی اسے چھو تک نہیں گئی تھی، گھر تھا، بیوی اور بچے تھے۔ مگر دوستوں کے ساتھ مل کر کھانے پکانے کا اسے خاص شوق تھا اور وہ گوشت پکانے کے ہنر کا بھی ماہر تھا۔

اس کی رہنمائی میں سب کام خود بخود سرانجام پا جاتے تھے اور "میں" "تو" کی گنجائش ہی نہیں رہتی تھی۔ جونہی گوشت بن کر تیار ہوا جیت تندور سے روٹیاں لگوا لایا۔ شاہد نے سلاد کاٹا، ناصر نے اور میں نے پلیٹیں صاف کیں اور بیٹھنے کے لیے دسترخوان

بچھا دیا۔

"اور کسی برتن وغیرہ کی ضرورت ہو تو گھر سے لیتا آؤں" پرتاپ سنگھ نے اپنی خدمات پیش کیں وہ بھی اس دعوت میں مدعو تھا۔

"برتن وغیرہ سب ہیں۔ آپ اطمینان سے بیٹھ جائیے۔" میں نے اُسے جواب دیا اور وہ میری چارپائی کے پائیں سے ٹیک لگا کر دری پر بیٹھ گیا۔

دیپک نے گوشت پلیٹوں میں ڈال ڈال کر سب کے سامنے رکھا۔ سلاد اور روٹیاں درمیان میں رکھ دیں اس کے بعد دیپک خود پلتھی مار کر بیٹھ گیا اور اُس کے "ست سری اکال" کہتے ہی سب نے کھانا شروع کر دیا۔

"گوشت بہت اچھا بنا ہے" پرتاپ سنگھ نے لقمہ منہ میں رکھتے ہی داد دی۔

"اچھا کیوں نہ بنتا، اُستاد کے ہاتھ لگے ہیں۔" جیت نے دیپک کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"بہت کم لوگوں کو گوشت کی پہچان ہے۔ کھانے کی بات الگ رہی وہ خریدنے ہی میں مار کھا جاتے ہیں۔ اس لیے پہلے اس بات کی داد دیجیے کہ میں بڑھیا گوشت خرید کر لایا۔ شاباش ہے سردار شیر۔" اُس نے خود ہی اپنی پیٹھ پر تھپکی دی اور ہونٹ کھل جانے سے اُوپر کے دو سنہری دانت چمک اُٹھے۔

دیپک ہم سب میں بھاری بھرکم قسم کا پہلوان آدمی تھا۔ بڑے شوق سے کھاتا اور ساتھ ہی چٹخارے لے لے کر باتیں بھی کرتا تھا۔ ایک مرتبہ شروع ہو جانے تو گوناگوں کھانوں کی باتیں، شراب کی باتیں، عورتوں کی باتیں ——— باتیں جو ختم ہونے میں نہیں آتی تھیں۔

"ہم جب پہلے پہل دہلی میں آئے تو پانچ روپے فٹ کے حساب سے بید بُنتے تھے، اندھی کمائی تھی۔ ہر سال دو تین مہینے بمبئی میں گزارتا تھا اور تاج محل ہوٹل میں خوب عیش کرتا تھا۔" اُس نے اپنی پاٹ دار آواز میں بات شروع کی۔

"اچھا دیپک صاحب، یہ بتائیے ایک بیٹھک میں کتنی شراب پی سکتے ہیں؟" ناصر نے پوچھا۔

"پینے کو تو پوری بوتل کئی مرتبہ پی ہے لیکن عام طور پر آدھا کافی ہے۔ اُس سے سرور آجاتا ہے۔" اُس نے آنکھیں چمکا کر جواب دیا۔

"آپ لوگوں نے شراب کا ذکر چھیڑا۔ اجازت ہو تو میں بھی اپنا زندگی کا ایک واقعہ بیان کروں؟" پرتاپ سنگھ نے لقمہ مُنہ کو لے جاتے جاتے رُک کر پوچھا۔

"ہاں ہاں، شوق سے بیان کیجیے۔" ناصر نے اور میں نے بیک وقت کہا۔

"آپ بھی چھپے رستم معلوم ہوتے ہیں۔" دیپک نے تجسس میں بھر کر آنکھ جھپکی۔

پرتاپ سنگھ نے لقمہ واپس پلیٹ میں رکھ دیا اور گھٹنوں کے بل آگے کو جھک کر بات شروع کی۔

"امرت سر کی بات ہے۔ اس وقت میری عمر سترہ اٹھارہ سال ہو گی۔ . . ."

"گستاخی معاف، کیا میں پوچھ سکتا ہوں کہ اس وقت آپ کی عمر کیا ہے۔" جیت نے اُسے ٹوکا۔

" ۴۰ سال "

" گویا تین سال بعد آپ کی عمر پچاس سال ہو جائے گی، اس کا مطلب ہے کہ ہم سب میں آپ ہی بزرگ آدمی ہیں۔"

" نہیں صاحب، بزرگی کا حق بھی مجھے پہنچتا ہے۔" دیپک بول اُٹھا اور اُس نے آگے کہا۔ " میری عمر اس وقت ۵۱ دو مہینے اور گیارہ دن ہے۔ ۱۴ جون ۱۹۱۲ء کو یہ کمترین اس دُنیا میں تشریف لایا تھا۔"

" حضور کی آمد کی اطلاع پائی۔ اب پرتاپ سنگھ کو اپنا واقعہ بیان کرنے دیجیے۔ ورنہ وہ کھانے کی طرح ٹال کیسے بیٹھے رہیں گے۔" ناصر نے کہا اور پلیٹ میں رکھے تکے کی طرف اشارہ کیا۔

" ہاں سردار جی، عرض کیجیے یعنی فرمائیے۔" جیت پرتاپ سنگھ سے مخاطب ہوا۔

" اس حساب سے یہ تیس سال پرانا واقعہ ہے۔"

" یہ تو ظاہر ہے مگر آپ جھٹ پٹ بیان کر دیجیے۔ اگر دیپک نے کہیں دیپک راگ شروع کر دیا تو دس سال اور پرانا ہو جائے گا۔" جیت میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔

ہم سب ہنس پڑے اور دیپک کھلکھلا کر ہنسا۔

" ہم لوگ نہر کے کنارے پک نک پر گئے۔" پرتاپ سنگھ بولا اُس نے پک نک کا یہ واقعہ تفصیل سے بیان کیا اس میں جو لوگ شامل تھے ان کے نام تک گنوائے لیکن مُدعا یہ تھا کہ وہاں سب نے وہسکی پی اور پرتاپ سنگھ کے گھر کے برابر والے پڑوسی رام کھتری نے ایک جام اُسے بھی پیش کیا۔ پرتاپ سنگھ بڑے تذبذب میں پڑ گیا۔ کرے تو کیا کرے۔ اتفاق سے بھورام کا بیٹا گوتم بھی پک نک میں شریک تھا۔ اسے دیکھ کر پرتاپ سنگھ کو ترکیب سوجھی اور اس نے ملائمت سے کہا۔ " بھورام جی۔ اگر آپ پہلے گوتم کو پلا دیں تو میں بھی پی لوں گا۔" پرتاپ سنگھ اپنی اس سوجھ پر آپ ہی مسکرایا اور اُس نے آگے کہا ۔" بھورام شرم کے مارے پانی پانی ہو گیا۔ چونکہ وہ اپنے بیٹے گوتم سے پینے کو نہیں کہہ سکا اس لیے میں بھی بچ گیا اور مجھے خوشی ہے کہ اس وقت کا جو بچا تو اب تک بچا ہوا ہوں۔"

" اگر آپ پکے ہوئے ہیں تو ہم اپنے ڈوب جانے پر فخر کرتے ہیں"۔ دیپک نے جھٹ کہا اور ساتھ ہی ایک قہقہہ سارے کمرے میں گونج اُٹھا۔ پرتاپ سنگھ کی مونچھوں کے تلے جو مخصوص مسکراہٹ نمودار ہوئی تھی وہ پھیکی پڑ گئی۔

دیپک ایک آرٹسٹ تھا اور فلموں کے بینر بنا کر روزی کماتا تھا۔ اسے اب شکایت تھی کہ کمپٹیشن کی وجہ سے ریٹ اتنے گر گئے ہیں کہ روپیہ سوا روپیہ فٹ پر بھی کام مشکل سے ملتا ہے اس لیے گزشتہ چند سال سے ہمبئی جا کر عیش کرنے کی حسرت پوری نہیں ہو سکی۔ مگر اس کم آمدنی میں بھی وہ حسرت کو زندہ رکھے ہوئے تھا اور ہفتے میں ایک دو مرتبہ جشن ضرور منا لیتا تھا۔ جب کام ہاتھ میں ہوتا تو وہ گدھے کی طرح اس میں جٹ جاتا۔ رات دن کچھ نہ دیکھتا اور جب بینر بن کر تیار ہو جاتا تو تکان اتارنے کے لیے لگا تار شراب پیتا۔

جیت، ناصر اور میں زندہ رہنے کے لیے مختلف دھندے کرتے تھے۔ مثلاً جیت ایک اچھا اکاؤنٹنٹ تھا اسے کہیں

کہیں فل ٹائم یا پارٹ ٹائم کام مل ہی جاتا تھا لیکن اس خشک اور بے کیف کام میں اُس کا دل کم ہی لگتا تھا اور پھر ہمارے فلسفے کے مطابق کسی طرح باقاعدگی اور پابندی شخصیت کا انحطاط تھا۔ اس لیے جی میں آئی تو وہ لگاتار کام پر جاتا رہتا اور نہ آئی تو ہفتوں مالک کو مُنہ نہ دکھاتا۔ اور پھر نہ آسکنے کے لیے بہانے تراشتا۔ نتیجہ معلوم۔ نوکری چھوٹ جاتی تھی۔ اس لیے سال میں سات مہینے نہیں تو وہ پانچ مہینے ضرور بیکار رہتا تھا۔ میں جو گھر والوں سے بغاوت کر کے نرنجن سنگھ کے بجائے ایس نرنجن بن گیا تھا۔ اور زیادہ تر وقت نئی دہلی کے کافی ہاؤس میں انٹیلیکچولوں کے درمیان گزارتا تھا، ٹائپسٹ بھی تھا، ایک بلاک میکنگ کمپنی کا ایجنٹ بھی تھا اور ایک ہفتہ وار اخبار کے لیے کمیشن پر اشتہار بھی فراہم کرتا تھا۔ دراصل مقررہ آمدنی کچھ نہیں تھی جواری کی طرح داؤ لگ جانے والا سودا تھا۔ ہم تینوں میں صرف ناصر ہی ایک ایسا تھا جو ایک ماہوار رسالے میں سوا سو روپے مہینہ پر مستقل طور پر ملازم تھا اور ترجمے ورجمے سے بھی کچھ کما لیتا تھا۔

ہم تینوں میں سے کوئی کچھ بھی کمائے آمدنی خرچ سب کا مشترک تھا۔ ایک دُوسرے کو ہم اتنا سمجھ گئے تھے کہ کوئی کسی سے کچھ نہ چھپاتا تھا۔ پیسے ہاتھ میں آئے تو خوب مزے رہتے۔ بوتل آتی اور دیپک اور شاہد جیسے ہم پیالہ اور ہم نوالہ دوست بھی مدعو ہوتے۔ لیکن اگر ہاتھ تنگ ہوتا تو سگریٹ تک پینے کو ترس جاتے، بعض مرتبہ فاقے بھی ہوتے یا جیوں تیوں کر کے پیٹ بھرتے۔ ایسی حالت میں پرتاپ سنگھ کو ہماری ہر حرکت عجیب لگتی اور وہ چونکتا "یار یہ ناصر بھی عجیب آدمی ہے۔" ایک دن اُس نے مجھ سے کہا۔" کل دوپہر کو حلوائی سے پاؤ بھر ربڑی اور ایک ڈبل روٹی تولا کر کھائی مگر ہوٹل تک کھانا کھانے نہیں جا سکا۔"

پرتاپ سنگھ کو کیا معلوم کہ ان دنوں زندگی تنگ دستی میں گزر رہی تھی۔ ہوٹل کا ہم پچھلے مہینے کا بل بھی ادا نہیں کر پائے تھے اس لیے مالک کو منہ دکھاتے شرم آتی تھی۔ لیکن حلوائی سے اُدھار ابھی مل رہا تھا۔ ہمارا خیال تھا کہ پرتاپ سنگھ ہماری عادت سے ناواقف ایک معصوم آدمی ہے اور اُس کی نیت میں کسی قسم کا کھوٹ نہیں ہے۔

لیکن اس دن ونس آیا اور اُس نے بڑے تپاک سے پوچھا۔" سُنا ہے کل دشمنوں کی طبیعت خراب تھی ؟"

"ہاں، ویسے ہی ذرا سر بھاری تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"اسی لیے دفتر نہیں گئے ؟"

"دفتر . . . . ہاں دفتر بھی نہیں گیا۔ مگر یہ بتائیے آپ کو یہ سب اطلاع کہاں سے ملی ؟" میں نے دریافت کیا۔

"اطلاع جیسے کوئی بات نہیں۔" اُس نے جواب دیا۔" کل شام کو دہلی سے لوٹتے وقت آپ کے پڑوسی اور دوست پرتاپ سنگھ سے ملاقات ہو گئی۔ انھوں نے یونہی آپ کی رنگینیوں کا ذکر چھیڑا اور پھر بتایا کہ رات کو خوب پی . . . . ."

" اور دن بھر نڈھال ہو کر چارپائی پر لیٹا رہا۔ دفتر تک نہیں گیا۔" میں نے اس کے مُنہ سے بات چھینی اور وہ مُسکرا کر چُپ ہو گیا۔

ونس نہایت بھلا اور شریف آدمی ہے۔ اس بستی میں اُس کا اپنا مکان ہے۔ ادبی ذوق رکھتا ہے اس لیے اس سے ہماری نئی نئی واقفیت ہوئی ہے۔ وہ پرتاپ سنگھ کی طرح رکھ رکھاؤ نہیں برتتا اور پارسا بھی نہیں بنتا۔ ایک کاروباری شخص کی طرح

عام ڈھنگ سے گر بسر زندگی گزار رہا ہے۔ آڑے وقت میں کبھی پانچ دس روپے اُدھار مانگیں تو ل جاتے ہیں۔ اس سے زیادہ اُس کے ساتھ ہمارا کوئی لگاؤ نہیں۔ اس سے شراب کا اور دفتر نہ جانے کا ذکر چھیڑنے کی کیا تک تھی؟

ذرا دیر لگتی ہے لیکن کوئی شخص جیسا بھی ہو لوگ اسے سمجھ لیتے ہیں۔ گزشتہ پانچ سات مہینے میں ہم نے بھی اس بات کو بخوبی سمجھ لیا تھا کہ پرتاپ سنگھ ہماری کمزوریاں جمع کر کے انھیں ادھر اُدھر منتشر کرنے میں ایک خاص حظ محسوس کرتا ہے۔ مقصد شاید اپنی پارسائی اجاگر کرنا ہو۔ میلے غلیظ شخص کو پاس کھڑا کر لینے سے سفید پوشاک زیادہ چمک اُٹھتی ہے۔

"آپ لوگ پورے بوہیمین ہیں۔" وہ ایش ٹرے میں پڑی کتابیں اور فرش پر بکھرے ہوئے سگریٹ کے ٹکڑوں کی طرف اشارہ کر کے کہتا۔

"شاید اسی لیے آپ کو ہمارا پڑوس پسند نہیں۔"

"پسند کیوں نہیں؟ میں تو خوش ہوں کہ آپ لوگ میرے پڑوسی بنے۔ میرے لیے یہ بھی ایک تجربہ ہے۔"

ہم یہ بات کئی بار سن چکے تھے۔ جیت ہم تینوں میں زیادہ شوخ اور منہ پھٹ تھا۔ اور جذباتی بھی زیادہ تھا اس لیے وہ اپنے پر ضبط نہ رکھ سکا۔

"بھاپا جی، پھر ذرا ہوشیار رہنا۔ کہیں آپ کو یہ تجربہ مہنگا نہ پڑے۔" اُس نے چیلنج کیا۔

"مہنگا کیا پڑے گا! آپ لوگ جانتے ہی ہیں۔ میں ہر طرح کی صحبت میں رہنے کا عادی ہوں اور ہر طرح کا مذاق برداشت کر لیتا ہوں۔"

"بس، پھر ٹھیک ہے" جیت نے کہا اور کنکھیوں سے میری اور ناصر کی جانب دیکھا۔

کہنے کو پرتاپ سنگھ فراخدل اور جدید بنتا تھا لیکن ہماری نظروں میں وہ اس بوڑھے اور کھوسٹ سماج کی علامت تھا جس کی ریاکاری اور زنگ لگی سے چڑھ کر ہم نے بغاوت کی راہ اپنائی تھی اور اس بے سمت بغاوت نے ہمیں وہ کچھ بنا دیا تھا جو اب ہم تھے۔ پرتاپ سنگھ دوسروں کی کمزوریوں میں خاص دلچسپی لیتا تھا ہمیں ریاکاری کے چہرے سے پارسائی کی نقاب نوچ لینے میں مزا آتا تھا۔ اسی لیے جیت نے اسے جو چیلنج دیا اور اس سلسلے میں اپنی جو تجویز بتائی اُس سے ہم بہت خوش ہوئے۔

اتفاق سے اگلے دن سنیچر تھا اور شام کو دیپک بوتل لے کر آ پہنچا۔ پرتاپ سنگھ ایسے موقعوں کی تاک میں رہتا تھا کہ ہماری شراب کی محفل میں بھی وہ ہمارے پاس بیٹھ سکے۔ جب ہم پی کر بہکتے تو ہماری باتیں سننا بھی اس کے لیے ایک تجربہ تھا۔ مگر اس کا یہ رویہ ہمیں پسند نہیں تھا اس لیے ہم بے اعتنائی دکھاتے اور اُسے ٹالنے کی کوشش کرتے تھے لیکن اس پر کسی بھی بات کا اثر نہ ہوتا تھا۔

"یار پرتاپ سنگھ، ہم سوڈا لانا بھول گئے اگر آپ کو تکلیف نہ ہو . . . . ."

"ہاں، ہاں۔ میں ابھی لائے دیتا ہوں۔"

وہ لپک کر بازار جاتا اور سوڈے کی بوتلیں لا دیتا۔

"اوہو، نمکین بھی تو نہیں۔"

"بادشاہو فکر نہ کرو وہ بھی آ جائے گا۔"

نمکین، برف اور سوڈا وہ ہر چیز بغیر تکلف کے آتا۔ آٹھ، دس آنے، روپیہ ڈیڑھ روپیہ جیب سے خرچ ہو جائیں تو بھی کچھ پرواہ نہیں۔ لیکن جب تک ہم پیتے تھے وہ ہمارے پاس موجود رہتا۔ ہم نشے میں جو اول جلول حرکتیں اور باتیں کرتے وہ چپ بیٹھا انھیں دیکھتا، سنتا اور اگلے دن تفریح طبع کے لیے اُن کی ہم سے چرچا بھی کرتا۔

اب جب اُس نے تجربے کی بات کہی اور جیت نے اسے چیلنج دیا تو ہم نے اپنی تجویز دیپک کو بھی بتائی پہلے تو وہ خوب ہنسا اور پھر بولا۔ "تم دیکھنا، میں بھاپے کا کیسا مُرغا بناتا ہوں۔ آدھی ہی رات کو بانگ دے گا ککڑ کوں!"

اس کے ککڑ کوں پر ہم بہت ہنسے۔

سنیچر اور اتوار کو پرتاپ سنگھ بغیر بلائے ہی ہمارا کمرہ ضرور جھانک لیتا تھا اس لیے اسے دیپک کے آنے کا سراغ مل گیا اور جب ہم پینے بیٹھے تو حسب معمول وہ بھی آ ٹپکا۔

جیت اور ناصر دو دو پیگ پی کر ہی سرور میں آ گئے اور تجویز کے مطابق کھل کھیلے۔

"اس کمینے شخ ... ص ۔ کو یہاں سے ہٹا ... ... دو۔"

جیت نے آنکھیں چڑھا کر لڑکھڑاتی آواز میں کہا۔

"تمھیں کیا، بیٹھا رہنے دو۔" میں بولا۔

"مجھے سخ ... ... ت اعترا ... ض ... ... ہے" جیت نے آواز اُونچی کی۔

"صرف جیت ... ہی کو نہیں ... ... مجھے بھی اعتراض ہے۔" ناصر نے بھی وہی ایکٹنگ کیا اور کہا "میں گواہی دیتا ہوں کہ یہ شخ ... ص ... ... فطرتاً ... ... کمی ... نہ ہے اور ہمیں ... ... ننگے ... ... دیکھ کر ... ... خوش ہوتا ہے۔"

"ٹھیک ... ٹھیک ... ... بالکل ٹھیک ... ... جو شخ ... ص ... ... خود ن ... ... نگا ہونا ... ... پ ... پسند ہی نا نا ... ہیں کرتا ... وہ ہمیں ... کیوں ن ... ... نگا چاہتا ہے۔" جیت نے ناصر کی تائید کی۔

"اچھا، میری سنو۔" دیپک نے ہاتھ اٹھا کر ان دونوں کو خاموش کیا، "اگر آج اسے بھی ننگا کر دیا جائے تب تو تمھیں کوئی اعتراض نہیں۔"

"ناہیں۔" جیت نے سر ہلا کر جواب دیا۔

اس دوران ہم نے ایک ایک پیگ اور پی لیا۔ ناصر نے اپنا خالی گلاس فرش پر رکھ کر ہونٹ پونچھے اور پھر کہا "مگر آ ... ... پ ... اس شخص کو ن ... ... نگا ... ... ہیں کر سکتے۔ اس نے ان ... ... ک ... ... پڑوں کے ... ...

علاوہ . . . . وہ . . . . . اپنے سارے جسم . . . . پر . . . . . . بہت موٹا . . . . خول چڑھا . . . . . رکھا ہے ۔"

"میں ابھی اتارتا ہوں " دیپک بولا ۔ "اس نے ایک ہلکا سا پیگ بنایا اور پرتاپ سنگھ کے سامنے رکھ کر اس سے کہا۔

"لو، خالصہ جی ۔ اسے چپکے سے پی لو ۔ چھوکروں کی بات رہ جائے گی ۔"

"دیپک جی، آپ جانتے ہیں ۔ میں نے آج تک کبھی نہیں پی اور نہ پیوں گا " پرتاپ سنگھ گھگیایا۔

"نہیں . . . پی تو یہاں . . . . ماں . . . . . " جیت نے ایک موٹی سی گالی پھینکی۔

پرتاپ سنگھ گالی پی گیا اور اپنے مخصوص انداز میں مسکرایا ۔

"خالصہ جی، مسکرانے سے کام نہیں چلے گا ۔ بہتر ہے کہ بھلامانسی سے مان جاؤ ورنہ مجھے دیپک شاہی پر اترنا پڑے گا ۔"

جب اس نے دوبارہ انکار کیا تو دیپک نے اسے اٹھا کر گھٹنوں میں دبوچ لیا۔

"میں اس کا منہ کھولتا ہوں ۔ تم اس میں پیگ انڈیلنا اونٹ کو جیسے نال سے چھاچھ پلائی جاتی ہے ۔ ہم اسے شراب پلائیں گے" جب پرتاپ سنگھ دیپک کے گھٹنوں میں دبکا ہاتھ پاؤں ٹپک رہا تھا تو میرے لیے ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو رہا تھا ۔ اس لیے میں اٹھ کر باتھ روم میں چلا گیا۔

"ارے ڈالو یار ۔" دیپک نے جیت سے کہا ۔

ناصر نے سر پکڑ رکھا تھا اور دیپک ہونٹ کھول رہا تھا مگر جونہی جیت نے پیگ انڈیلا پرتاپ سنگھ نے جھرجھری لے کر ہونٹ بھینچے اور سر ہلا دیا ۔ شراب اس کے سر اور داڑھی کے گھنے بالوں میں بکھر گئی اور وہ پنجرے میں چوہے کی طرح سٹپٹانے لگا۔

میں کواڑ کی آڑ سے یہ منظر دیکھ رہا تھا اور مجھے اس آدمی پر ترس آگیا۔

"بس، اب چھوڑ دو ۔ اتنا ہی کافی ہے ۔" میں نے کہا ۔

"یار ہمیں بھی تجربہ پورا کر لینے دو ۔" جیت بولا ۔

"چھوڑ دو، دیپک ۔ ہو گیا ۔"

دیپک نے اسے چھوڑتے ہوئے کہا ۔" چلو تمہارے کہنے سے معاف کیا۔

اس رات جب ہم سونے لگے تو ہمارا خیال تھا کہ پرتاپ سنگھ کے ساتھ جو بنی ہے اسے وہ عمر بھر نہیں بھولے گا اور ممکن ہے کہ ہمیشہ کے لیے ہم سے ناراض ہو جائے ۔

لیکن صبح ہم سو کر اٹھے ہی تھے کہ وہ حسب معمول ہمارے کمرے میں آیا اور مسکرا کر کہنے لگا ۔

"یار، رات تو آپ لوگ بہت زیادہ بہک گئے تھے ۔"

ایک تصویر ایک پتھر

جاویدہ اخلاق

نواب شوکت الملک پھولوں سے لدے پھندے لان میں مہمانوں کے ساتھ مصروفِ گفتگو تھے ...... قصرِ زریں میں ایک سال بعد پھر سے بہار آگئی تھی ویسے تو بہار ہمیشہ اپنے مقررہ وقت پر آکر چپکے چپکے دھیرے دھیرے اُس پرفسوں محل کو اپنی معطر بانہوں میں سمیٹ لیتی. فواروں کا پانی ہلکے سروں میں گنگناتا رہتا اور وسیع و عریض سرسبز تختے رنگ برنگے پھولوں سے بھر جاتے ۔ ستونوں سے لپٹی ہوئی بوگن ویلا کی پھیلی بانہیں بوجھل ہو ہو کر نیچے گرتیں اور مالی لمبی لمبی سیڑھیاں لگاکے انھیں باندھتے پھرتے مگر فضا میں وہ رنگینی وہ انشار وہ مچلتی تڑپتی زندگی پیدا نہ ہوتی جب تک شہزادی تابندہ یونیورسٹی کے تعلیمی ہنگاموں کو چھوڑ کر چند روز کے لئے قصرِ زریں کے درودیوار کو جگمگا نہ دیتی ۔ نواب شوکت الملک کو تو اپنی اکلوتی بیٹی سے شدید محبت تھی ہی مگر تابندہ ویسے بھی اردگرد کی تمام اونچی سوسائٹی کی رونق اور موضوعِ خاص تھی ۔ وہ خوب صورتی میں اپنی مثال آپ یونیورسٹی کی بہترین مقرر اور آزاد ماحول میں پلی ہوئی ایک دلفریب اور پرکشش شخصیت کی مالک تھی ۔

نواب شوکت الملک اور اُن کے سیکرٹری مرزا علی نواز زاہد لگاتار آنے والے مہمانوں میں بیحد مصروف ہو چکے تھے مگر جو لوگ پیشتر پہنچ چکے تھے اُن کے آرام اور ضروریات کی ذمہ داری تو شہزادی تابندہ اور مرزا علی نواز کی دونوں صاحبزادیوں شائستہ اور نیلم کو سونپ دی گئی تھیں پھر فرض شناس ہمیش بھی تو اُن کے ساتھ ایک میزبان کی حیثیت سے دیکھ بھال میں مصروف تھا ۔

مرزا علی نواز کہنے کو تو نواب شوکت الملک کے سیکرٹری ہی تھے مگر قصرِ زریں کے تمام رہنے والوں اور خود نواب شوکت الملک کے لئے اُن کی حیثیت ہمیشہ بڑے بھائی کی سی رہی ۔ عمر کا تفاوت تو صرف چار سال کا تھا مگر عادات و اطوار کا فرق اتنا وسیع تھا کہ مرزا علی نواز زندگی بھر سیکرٹری کے بجائے ایک شفیق بھائی ۔ مہربان دوست اور انتہائی قریبی عزیز کی خدمات انجام دیتے رہے ۔ اُن کے لئے تابندہ اور اپنے چاروں بچوں میں قطعاً کوئی فرق نہیں تھا ۔ اور تابندہ اور شائستہ میں تو ویسے ہی دوستی اور پیار کا ایک نہ ٹوٹنے والا رشتہ قائم ہو چکا تھا ۔ بچپن سے دونوں ساتھ رہیں اور اب دونوں اکٹھی ہی فارغ التحصیل ہو کر گھر آئیں تھیں ۔ مرزا علی نواز کا بڑا لڑکا اور لڑکی پاکستان میں تھے اور سب سے چھوٹی بچی نیلم سینئر کیمبرج کی تعلیم کے بعد کالج میں داخلے لے چکی تھی ——— نواب شوکت الملک کی تمام زندگی کا سرمایہ تو دو ہی بچے تھے ۔ ہمایوں فر اور تابندہ مگر چار سال ہوئے ان کی بدبختیوں کی طویل فہرست زندگی کا یہ سرمایہ بھی بانٹ لے گئی ۔ شہزادہ ہمایوں فر آکسفورڈ یونیورسٹی کا نمایاں طالب علم ۔ تیراکی کا چیمپئن ایک مقابلے میں موت کی لہروں میں روپوش ہو گیا اور اب تو صرف تابندہ ہی اُن کی زندگی کا سہارا بن کر رہ گئی تھی ۔

نواب شوکت الملک ویسے تو خاندانی روایت کے ماتحت ہر سال ہی اپنے جدِ امجد ۔ ہز ہائنس عظمت الملک جہاں زیب کی یاد میں ایک تاریخی دعوت دیا کرتے تھے جس میں اردگرد کے تمام علاقہ کی اریسٹوکریسی، کی شمولیت لازمی تھی ۔ یہ جشن نما دعوت دو تین روز تک جاری رہتی مگر اس دفعہ شہزادی تابندہ اور شائستہ کی ڈگری حاصل کرنے کی خوشی میں یہ رونق دوبالا ہو گئی تھی ۔ آج دعوت کا پہلا دن تھا اور مہمانوں کی لگاتار آمد

جاری تھی۔

مرزا علی نواز نے یہ دیکھ کر اطمینان کا سانس لیا کہ سب کام درست اور طریقے کے مطابق ہو رہے تھے ورنہ ذرا سی بد انتظامی سے اتنے ڈھیر سے معزز مہمانوں کے سامنے خواہ مخواہ خفت محسوس ہوتی۔ کہیں ایک سال بعد تو ایسا موقعہ آتا تھا۔

اب تو شام نزدیک تھی۔ گیٹ کے باہر بے شمار کاریں ترتیب سے کھڑی تھیں۔ طویل کار یڈ رمیں سے لوگ آ جا رہے تھے۔ روز گارڈن میں رنگ برنگی روشنیوں کے درمیان کرسیاں اور صوفے دائروں اور نیم دائروں کی شکل میں دھرے تھے۔ گنجان درختوں سے پرے بادل کی سیاہ لکیروں کے پاس آدھا چاند بادل کے ایک چھوٹے سے سفید ٹکڑے کی مانند نظر آ رہا تھا۔ گھنی بیلوں میں چڑیاں مسلسل شور مچا رہی تھیں لوگ ہنس رہے تھے۔ بول رہے تھے۔ ٹولیوں میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ چائے کا دور تقریباً ختم ہو چکا تھا۔

مرزا علی نواز نے محسوس کیا کہ اُس وقت وہاں ہر شخص خوش تھا۔ وجیہہ و پُرکشش نواب شوکت الملک۔ ایوننگ سوٹ میں ملبوس سگار پیتے مسکراتے ہوئے۔ مہمانوں کو کل کے شکار کا پروگرام بتا رہے تھے۔۔۔۔۔۔ سیٹھ دیا نکے بہاری خوش تھے کہ انہوں نے جاپان کے تعاون سے ہوٹل کے ڈیزائن پر جو عظیم الشان ہوٹل تعمیر کروایا ہے اُس کے لئے انہوں نے جاپانی لڑکیوں کی خدمات بھی حاصل کر لی ہیں۔۔۔۔۔ بیگم وسیع الدین ہنس ہنس کر بتا رہی تھیں کہ اُن کا لڑکا انگلینڈ سے سرجری کی ڈگری اور ایک عدد بیوی سمیت واپس پہنچ گیا ہے۔ تابندہ، شائستہ اور نیلم خوش تھیں کہ نجیب تین سال بعد انگلینڈ سے واپس آ کر اپنے پُرانے ماحول میں فوراً رچ بس گیا ہے۔ اور نجیب خوش تھا کہ واپس پہنچتے ہی اُسے ایک مشہور غیر ملکی فرم میں شاندار مشاہرہ پر ملازمت مل گئی تھی۔

مگر مرزا علی نواز کی طبیعت بدستور بدمزہ تھی جس کا ایک خاص باعث تھا مگر اُس کی شدت صرف مرزا علی نواز ہی محسوس کر سکتے تھے۔ دوسرے لوگوں کے لئے شاید وہ اتنی اہم بات نہ تھی۔ دراصل ملک کے بٹوارے پر جہاں اور بہت سی مشکلات نے جنم لیا تھا۔ وہیں ہندوستان میں مقیم مسلمان والدین کے لئے معقول رشتے ناطوں کی کمی جان کا روگ بن گئی تھی۔ ایسی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور حسین لڑکیوں کا کیا بنے گا۔ اچھے لڑکے تو عنقا ہی ہو گئے تھے جو کہ تمام شرائط پر پورے اترتے اور جو اتر سکتے تھے وہ کب کے جا چکے تھے کیونکہ ہندوستان میں رہ کر اُن کا مستقبل روشن نہیں ہو سکتا تھا۔ جسے دیکھو یہی رونا روتا تھا کہ لائق شریف برسر روزگار اور کھاتے پیتے گھرانے کا لڑکا ملنا ناممکن ہے۔ مگر جو چیز سب سے زیادہ مرزا علی نواز کے لیے سوہانِ روح بنی ہوئی تھی وہ یہ تھی کہ بعض بااثر لوگوں کے اصرار اور حالات کے دباؤ تلے آ کر اب چند آزاد خیال مسلمانوں نے مجبوراً ہندو گھرانوں میں رشتے ناطے طے کرنے شروع کر دیئے تھے ایسی چند ایک مثالیں تو موجود ہی تھیں مگر غضب یہ ہُوا کہ گذشتہ ہفتے مرزا علی نواز کے رشتہ کے بھائی مرزا قدرت اللہ بیگ نے اپنی لڑکی توصیف کی شادی رائے صاحب جے کشن کے لڑکے سے کر دی تھی اور مرزا علی نواز کو اُس وقت علم ہُوا جب توصیف اپنے سسرال جا چکی تھی۔ ایک شدید غم۔ بے بسی، اور غصے کے احساسات کے ساتھ ساتھ مرزا علی نواز کو یہ بات انتہائی مضحکہ خیز اور انوکھی سی بھی لگ رہی تھی۔ ویسے بھی اب وہ عمر کے اس دور میں پہنچ چکے تھے جب قوت برداشت کم ہو جاتی ہے اور وہ تو شروع سے ہی ذود رنج اتشی مزاج۔ مذہبی قسم کے بے دھڑک سے آدمی تھے۔ اکثر غصہ آنے پر آپے سے باہر ہو جاتے اور اس وقت بھی وہ شک اور غصے کے ملے جلے احساسات کے تحت ادھر اُدھر بکھری ہوئی تمام خوشیوں سے بیزار اپنے بڑے لڑکے اور لڑکی کو کوس رہے تھے جو پاکستان میں کراچی اور لاہور بیٹھے ہوئے اب تک تابندہ۔ شائستہ اور نیلم کے لیے کوئی مناسب بندوبست نہ کر سکے تھے اور قصر نسرین میں شام کی چڑیوں کی طرح شور مچاتی ہوئی

ایسٹوکریسی کی تمام نئی پود کو وہ بار بار شک اور تنقید کی کڑی نظروں سے دیکھتے ہوئے اِدھر سے اُدھر گذر جاتے ۔ مہیش اور اس کے گھرانے کو وہ پشتوں سے جانتے تھے ایک شریف اعلیٰ تعلیم یافتہ جوان ہونے کے علاوہ وہ ایک دِل آویز شخصیت کا بھی مالک تھا ۔ نواب شوکت الملک کو اُس سے خاص اُنس تھا ۔ شائد ہمایوں فر کی یاد میں ۔ وہ تھا بھی اتنا مہذب اور محتاط کہ کوئی اُس کے کردار کے متعلق ایک لفظ بھی تو نہ کہہ سکتا ۔

اُس کے انگلینڈ کے طویل قیام میں لڑکیاں اکثر اُس کو یاد کرتیں اور مرزا علی نواز کو کبھی یہ ناگوار نہیں گزرا تھا مگر اس وقت اُن کو مہیش کی موجودگی بھی کچھ رہی تھی ۔ یہ کیسے اندھے بہرے احساسات تھے جنھوں نے کبھی کچھ نہ دیکھا کبھی کچھ نہ سُنا مگر پھر بھی ایک انوکھے شک کے دعوے دار تھے ۔ صرف کبھی کبھی مہیش کی افسردگی ۔ خاموشی اور زخمی نظریں کچھ چھپانے کی کوشش میں زیادہ عریاں ہو جاتیں اور مرزا علی نواز صاف محسوس کرتے کہ ایسے میں تابندہ کی نقرئی ہنسی ٹوٹ پھوٹ سی جاتی ۔ اور ہاتھوں کی رزش ایک بے طرح دھڑکتے ہوئے دِل کا پتہ دیتی مگر نواب شوکت الملک انجان بے پرواہ ۔ اُسی سکون سے سگار پیتے ہوئے چھوٹی چھوٹی باتوں میں مصروف رہتے ۔ اور تابندہ تھی بھی تو اتنی پیاری اور قیمتی لڑکی کہ مرد تو مرد ۔ عورتیں بھی اُسے محوِ حیرت دیکھتی رہ جاتیں ۔ نواب شوکت الملک اور مہر پرور کی تمام خصوصیات تقریباً اُس میں اکٹھی ہو گئیں تھیں مگر طبیعت کا چلبلا پن یہ بے ساختہ ہنسی اور شرارت سے بھرپور نظریں نہ جانے وہ کہاں سے اُڑا لائی تھی ۔ ماں باپ تو دونوں اِس سے محروم تھے ۔ بہار کی رنگینیاں اس کے ہمرکاب رہتیں اور اُس کی موجودگی سے قصرِ زرّیں میں قوس قزح ہلکورے لیتی رہتی ۔

یوں تو نواب شوکت الملک نے قصرِ زریں کی سجاوٹ میں کوئی کسر باقی نہیں چھوڑی تھی اور اپنے مشرقی اور مغربی اعلیٰ ذوق کے ماتحت اس کو اِس طرح آراستہ پیراستہ کیا تھا کہ وہ سفید ۔ مرمریں ستونوں والا طویل و عریض محل اِردگرد کے علاقہ میں ایک مثالی چیز بن کر رہ گیا تھا ۔ مگر باوجود ہر کوشش کے وہ اِس میں یہ بہار زندگی کی رونق اور گہما گہمی پیدا نہ کر سکے ۔ یہ چیز ان کے بس میں ہی نہ تھی ۔ وہ تو خود دُکھوں چوٹ کھائے تھے جنھوں نے زندگی بھر ہنس ہنس کر غموں کی صراحی میں سے خم پر خم لنڈھائے تھے ۔ اگرچہ ہمیشہ وہ اپنی دانست میں انتہائی احتیاط سے پے در پے حوادث کے ساغر سکون و خاموشی سے پی جاتے تھے مگر انجانے میں افسردگیاں چھلک چھلک کر اِدھر اُدھر بکھر جاتیں اور قصرِ زرّیں ایک اُداس تنہا ماحول میں اونگھتا رہتا ۔

یہ اُداسیاں یہ تنہائیاں آج سے نہیں پشتوں سے اِس محل پر مسلّط ہو چکیں تھیں ۔ اس کے اصل بانی ہز ہائی نس عظمت الملک جہاں زیب اپنے خاندان کے آخری ہز ہائی نس اور نواب شوکت الملک کے پردادا تھے ۔ ان کی جوانی میں ہی انگریز حکومت نے بعض شکوک اور بدگمانیوں کی بنا پر انھیں گدی سے معزول کر کے ریاست پر قبضہ کر لیا تھا مگر گذشتہ والیانِ ریاست کے وقار اور عوام کے امن کی خاطر اُن کو ایک وسیع و عریض جاگیر جو کچھ پہاڑی اور کچھ میدانی علاقے پر مشتمل تھی دے کر سالانہ وظیفہ بھی مقرر کر دیا گیا تھا ۔ اور یوں ہز ہائی نس عظمت الملک ایک ریاست کے مطلق العنان حکمران کے بجائے صرف ایک رئیس اور جاگیردار بن کر رہ گئے تھے ۔

یہ حقیقت تھی کہ وہ حکومت چلانے کے معاملے میں نااہل نہیں تھے مگر زمانہ شناس نہ تھے ۔ طبیعت میں تو آنیت کوٹ کوٹ کر بھری تھی ۔ شاہانہ مزاج کے آدمی تھے مگر دِل میں ہندوستان کے گذشتہ فرمانرواؤں کے زوال کا دکھ اور ملک کی کھوئی ہوئی عظمت کا غم رکھتے تھے ۔ انگریز حکمرانوں سے اُن کی کبھی نہ بنی نت نئے جھگڑے کھڑے رہتے ۔ کئی انگریز کمشنروں اور افسروں کو اُن کے دربار سے بددل ہو کر نکلنا پڑتا اور کئی شرفا اور اُمرا جو حکومت کی نظر میں مشتبہ اور پُرانے انگریز دشمن خاندانوں کے افراد تھے اُن کو ریاست میں عزت کی نظر سے دیکھا جاتا اور

دربار میں مقبول تھے ۔ گو اُن دنوں ملک کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا حکومت کو گزند پہنچانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا مگر انگریز حکمران کہیں بھی کسی بھی سرکشی اور مطلق العنانی کو پسند نہیں کرتے تھے ۔

ہز ہائی نس عظمت الملک نے کبھی ان حالات کا جائزہ لے کر وقت کے تقاضے کو سمجھنے کی کوشش ہی نہ کی مگر جب چند فتنہ پرداز اور منتقم افسروں نے ریاست کے بعض غداروں اور ذاتی مفاد کے خواہش مند لوگوں کی مدد سے چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو شکوک و شبہات کا جامہ پہنا کر حکومت کو پیش کیا تو آخر کار انھیں ریاست کی گدّی سے ہاتھ دھونے پڑے ۔ لیکن تھے عجب دل گردے کے آدمی ۔ اس اچانک اور عظیم انقلاب نے اُن کے خاندان کی بنیادیں ہلا دیں ۔ روحانی اور دماغی طور پر نواب عظمت الملک ختم ہو گئے مگر ماتھے پر شکن تک نہ آئی ۔ ریاست چھین جانے کے بعد بھی ان کے کرّو فر اور تحمّل و بے نیازی کا وہی عالم تھا ۔ دی ہوئی مقررہ معیاد کے اندر اندر انہوں نے نہایت خوش اسلوبی سے اپنا قیمتی ذاتی سامان، خدام اور بیگمات کو جاگیر کے بوسیدہ قلعے میں منتقل کر دیا ۔ روانگی کے روز صبح انہوں نے ایک دربارِ عام منعقد کرنے کی اجازت طلب کی ۔ پنڈال میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی اور باہر حکومت کی فوج کا پہرہ تھا ۔ چند انگریز افسر جنھیں نوّاب کو بے دخل کر کے ریاست پر قبضہ کرنے کا حکم ملا تھا دربار میں موجود تھے ۔ باوجود اتنی گہما گہمی کے ہر طرف ویرانی برس رہی تھی ۔ اکثر لوگ غمگین اور افسردہ تھے ۔ نقیب نے آواز دی "ہز ہائی نس عظمت الملک جہاں زیب شاہ تیمور زرخان مرزا مشیر الدولہ" ۔ لوگ سرونقد کھڑے ہو گئے اور نواب صاحب اپنے پورے شاہانہ لباس میں خراماں خراماں چلتے گدّی پر رونق افروز ہو گئے ۔ پھر تمام درباریوں کو جن میں اُن کے دشمن بھی شامل تھے درجہ بدرجہ خلعتوں سے نوازا گیا ۔ درباریوں کی فہرست ختم کر کے نقیب نے کرنل سائمن اور کمشنر ہمفرے کا نام پکارا تو وہ ہڑبڑا کر کھڑے ہو گئے (ان دونوں کو حکومت کی طرف سے نواب کے عارضی طور پر ریاست کا نظم و نسق درست رکھنے کے اختیارات دیئے گئے تھے) ہز ہائی نس کے اشارہ پر دونوں مبہوت سے آگے بڑھے اور خلعت حاصل کئے مگر کرسیوں تک پہنچتے پہنچتے واقعہ کی تہ تک بھی پہنچ گئے ۔ احساسِ خفّت سے اُن کے چہرے تمتما اُٹھے ۔ اہلِ دربار میں کچھ لوگ ہنس پڑے کچھ رو پڑے ۔ پھر فرداً فرداً تمام انگریز افسروں کو تحائف دیئے گئے ۔ باہر سے آئی ہوئی فوج کی رات کی دعوت کے بندوبست کا خرچ اور سپاہیوں کو بخشش دی گئی ۔ اس تمام جھنجھٹ سے نپٹ کر ہز ہائی نس نے عوام کو مخاطب کیا اور کہا ۔

"میں نے کوئی ایسی بات نہیں کی جس کے لئے مجھے آپ لوگوں کے سامنے جواب دِہ یا شرمسار ہونا پڑے ۔ کسی ذاتی مفاد یا دنیاوی لالچ کے لئے میں نے کسی شاہ عالم کی آنکھیں نہیں چیریں ۔ کسی نواب علی وردی کے محلات نہیں لوٹے کسی سراج الدولہ کے سینے میں چھرا نہیں گھونپا اور کسی ٹیپو سلطان کو شہید نہیں کیا ۔ میں اپنے ملک اور قوم کا مجرم نہیں بلکہ غیروں کا مجرم ہوں اور مجھے اپنے اس جرم پر فخر ہے ۔ اس گدّی کے ہوتے ہوئے مجھے بہت سے غم تھے مگر اب کوئی غم نہیں سوائے آپ لوگوں کی محبت اور یاد کے اور اس چیز کو میں مرتے دم تک سنبھال کے رکھوں گا ۔"

کچھ لوگ پشیمان اور متاسف تھے ۔ زیادہ لوگ سسکیاں بھر رہے تھے اور غیر ملکی فاتح افسر خاموش کھڑے ایک مفتوح حکمران کو جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے جو سب سے ہاتھ ملا کر اس وقار اور بے نیازی سے جا رہا تھا ۔ جیسے چند لمحوں کے لئے انھیں یہ عزت بخشنے ہی آیا تھا ۔

اور یوں نواب عظمت الملک جہاں زیب گدّی چھوڑ دینے کے بعد مستقل حکمران بن کر رہ گئے ۔ اس اقتدار کی موت کے بعد وہ غیر فانی ہو گئے تھے شاعروں نے اُن کے گیت اور مصوّروں نے اُن کی تصویریں بنا لیں تھیں ۔ وہ عرصے تک غیر شعوری طور پر لوگوں کے دلوں پر حکومت کرتے

ے۔ اور انھیں ہز ہائی نس عظمت الملک کی ایک خوب صورت قدِ آدم تصویر سالہا سال سے قصرِ زریں کی گیلری میں نیلے ریشمی پردوں کے درمیان آویزاں تھی
سکے اپنی کردار کی طرح یہ تصویر بھی غیر فانی تھی۔ لاتعداد حوادث و انقلاب میں جو اس خاندان پہ گزرے یہ تصویر جوں کی توں محفوظ رہی اور ہزاروں
جنے بستے طوفانوں میں بھی اس کو کوئی گزند نہ پہنچی ۔ یکے بعد دیگرے آنے والی نسلوں کے سروں پر یہ ہمیشہ ایک شاہانہ وقار سے مسکراتی رہی ۔
ران کے بیٹے پوتے اور پڑپوتے ہر ایک معزز مہمان کو جو قصرِ زریں میں وارد ہوتا ۔ ہز ہائی نس کی تصویر سے تعارف کروانا ضروری سمجھتے ۔
ر اُن کی خصوصیات پر روشنی ڈالی جاتی اور نو وارد لوگ نظروں ہی نظروں میں اُن کو خراجِ عقیدت پیش کرتے دبے پاؤں گیلری میں سے
رکر ہال میں آجاتے ۔ یہ ہال ہسپانوی طرزِ تعمیر کا بہترین نمونہ تھا۔ ہز ہائی نس تمام محل اسی طرز پہ بنوانا چاہتے تھے کہ اُن کی زندگی میں ایک دوسرا
ناک واقعہ رونما ہوا تھا۔ اُن کی چہیتی بیگم جہاں آرا ایک صبح اچانک اپنی خواب گاہ میں مردہ پائی گئیں۔ عام خیال تھا کہ دل کی حرکت بند ہو
نے سے موت واقع ہوئی ہے۔ مگر ہز ہائی نس عظمت الملک سمجھتے تھے کہ چونکہ بیگم جہاں آرا کو ریاست چھوٹنے کا شدید صدمہ تھا اور وہ جب
جاگیر پہ آئیں ہمیشہ اداس اور خاموش رہیں پھر ایک رات وہ چپ چاپ عازمِ سفر ہو گئیں اور انھیں ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اگر وہ کبھی جاگ کر دیکھیں
تم ریاست کے محلات میں موجود ہوں گی مگر اُن کی یہ خواہش کبھی پوری نہ ہو سکی کہ وہ دوبارہ موتی محل کے فانوس کو نور میں بیگم
اں آرا کو تلاش کر سکیں۔ یہ اندلسی محرابیں ادھوری رہ گئیں اور ہز ہائی نس باقی زندگی میں قصر زریں کی تعمیر میں کوئی خاص دلچسپی نہ لے سکے ۔
ئی برس بعد اس کی تکمیل ہز ہائی نس کے بڑے بیٹے نواب مظفر الملک نے کی۔ پھر ہر نسل کے ساتھ ساتھ اس کی وسعت اور خوب صورتی
ں اضافہ ہوتا رہا ۔

نواب مظفر الملک ایک نہایت سمجھدار دور اندیش انسان اور نواب شوکت الملک کے دادا تھے۔ دراصل نواب شوکت الملک کی پرورش اور اعلیٰ
ہم و تربیت انھیں کے ہاتھوں سرانجام پائی تھی۔ کیونکہ ان کے والد نواب عضنفر الملک تو انھیں عالمِ طفلی ہی میں جبکہ ابھی وہ نواب شوکت الملک
ہیں بلکہ صرف شہزادہ عالی گہر تھے ۔ تب ہی چھوڑ کر فوت ہو چکے تھے۔ نواب مظفر الملک بڑے بیٹے کے فوت ہو جانے کے بعد پوتے کو ایک
رمایۂ عظیم سمجھتے تھے۔ انھیں شہزادہ عالی گہر شوکت الملک سے والہانہ اُلفت تھی کیونکہ انھیں یقین تھا کہ شوکت الملک ہو بہو ہز ہائی نس کی تصویر
ہیں۔ وہی ستواں ناک، غلافی آنکھیں، لمبا قد، مردانہ وجاہت کا مجسمہ۔ شاید چوتھی پشت میں آکر ہز ہائی نس عظمت الملک نے پھر جنم لے لیا تھا کیونکہ
ہزادہ عالی گہر وہی نیک نیتی، خلوص، جبر و سہار اور رعب و دبدبہ لے کر آئے تھے جس نے ہز ہائی نس کو زندگی بھر تپے کے درجے تھے اور روحی بدقسمتیوں
پر برتر رکھی تھی ۔

نواب شوکت الملک کو بچپن سے کسی نے غصے کی حالت میں نہیں دیکھا تھا۔ غیر متوقع سلوک۔ حاسدوں کے طعنے۔ دشمنوں کی بے وفائی
وہ خاموشی سے پی جاتے اُن کا خلوص اور نیک نیتی بے پایاں تھے۔ زندگی بھر کبھی کسی کو شک اور بے یقینی سے نہیں دیکھا۔ عظیم سے عظیم غم جس نے
ان کے دل کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے بظاہر اُن کی زندگی میں کوئی انتشار پیدا نہ کر سکے۔ وہ تو صبر و سکون کی سنگین چٹان تھے جس سے ٹکرا کر
ہر سے بڑا المیہ بھی ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتا ــــ اور مرزا علی نواز زاہد کو ان کی انھیں خصوصیات سے چڑ تھی مرزا صاحب ایک متمول گھرانے
کے فرزند اور شہزادہ عالی گہر کے بچپن کے دوست اور رفیق تھے اور ایک عرصے اس نواب خاندان کے پرائیویٹ سیکرٹری اور جاگیر کے منتظم کی
حیثیت سے کام کر رہے تھے اُن کے آباؤ اجداد جو کہ اس خاندان کے بہی خواہوں میں سے تھے ریاستی حالات تبدیل ہوتے ہی دلّی میں جا کر آباد

ہو گئے تھے۔ اتفاق سے ان دونوں نے بچپن میں ابتدائی تعلیم ایک ہی انگلش سکول سے مکمل کی مگر چند سال بعد شہزادہ عالی گہر کو نواب مظفر الملک نے اعلیٰ تعلیم کی خاطر یورپ بھجوا دیا تھا اور ان کے یورپ کے قیام میں ہی مرزا علی نواز زاہد۔ علی گڑھ سے تعلیم مکمل کر کے ایک اچھے عہدے پر فائز ہو گئے مگر تھوڑی ہی مدت بعد سیاست کے چکر میں پھنس کر نوکری گنوا بیٹھے۔ انھیں دنوں نواب متاع الملک جو شہزادہ عالی گہر کے چچا اور نواب مظفر الملک کے چھوٹے بیٹے تھے دلّی میں ایک خوب صورت رہائش گاہ بنوانے میں مصروف تھے انھیں اتفاق سے جب مرزا علی نواز کی ذاتی پریشانیوں کا علم ہوا تو انہوں نے عارضی طور پر انھیں نواب مظفر الملک کا سیکرٹری بنا کر حاکم پور بھجوا دیا مگر بعد میں مرزا علی نواز اپنے مستقبل کے بارے میں مزید تگ و دو ختم کر کے وہیں کے ہو کے رہ گئے کیونکہ ضعیف العمر نواب مظفر الملک کے لئے اُن میں اور شہزادہ عالی گہر میں کوئی فرق نہیں تھا اور مرزا علی نواز بھی اُن کی دیکھ بھال میں ایک دلی سکون سا محسوس کرتے پھر نواب متاع الملک بھی ایک پُر شفقت اور بلند فطرت انسان تھے اور وہ بھی مرزا علی نواز کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتے تھے مگر موت نے مہلت ہی نہ دی اُن کو انہوں نے تو اپنے جواں سال بھتیجے شہزادہ عالی گہر شوکت الملک کی یورپ سے واپسی کا بھی انتظار نہ کیا جن سے انھیں شدید الفت تھی اور ایک رات اپینڈے سائٹس کے درد سے ہار مان کر قصرِ زریں کے سرمئی ستونوں کے سائے میں بوڑھے باپ، جہیتی بیگم اور اکلوتی بیٹی مہر پرور کو حسرت سے دیکھتے ہوئے ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے اور مرزا علی نواز کے لئے اب اس بے آسرا خاندان کو چھوڑ کر کہیں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اور نواب مظفر الملک کی وفات کے بعد انہوں نے ایک طویل عمر نواب شوکت الملک کے ساتھ ایک باوفا دوست۔ پُر خلوص و نیک نیت مشیر اور حقیقی بڑے بھائی کی حیثیت سے گذار دی تھی حالانکہ دونوں کی طبیعتوں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ ایک آگ تھا تو دوسرا پانی۔ بلکہ مرزا علی نواز زاہد تو ایسا بارود کا گولہ تھے جو بعض اوقات بنا آگ دکھائے ہی شعلۂ جوالہ بن جاتا۔ تیز طبیعت۔ زود رنج۔ تنکی مزاج اور خطرناک حد تک صاف گو تھے مگر ساتھ ساتھ نیک نیتی۔ خلوص اور شرافت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ پابندِ صوم صلوٰۃ اور خالص مذہبی قسم کے انسان تھے۔ اکثر اوقات نواب شوکت الملک کی مغربی روش کو ناپسندیدگی سے دیکھتے مگر اُن سے شدید اُنس اور الفت کے باعث اندر ہی اندر کُڑھ کر خاموش رہتے۔

پُر سکون و باوقار نواب شوکت الملک ایک ایسا بحرِ بے پایاں تھے۔ جس میں لاکھوں لدے پھندے سفینے غرق ہو چکے تھے۔ لاتعداد طوفانوں سے آشنا ہونے کے باوجود ان کے بحر کی موجوں میں کبھی اضطراب نہ آیا۔ مرزا علی نواز اور دیگر احباب کے لیے یہ باعث حیرت ہو تو ہو لیکن یہ حقیقت تھی کہ وہ ایک زبردست شخصیت کے مالک تھے شاید زندگی بھر کے غموں نے انھیں کندن بنا دیا تھا کبھی کبھی تنہائی میں وہ ماضی کے اوراق اُلٹتے تو ذہن کے پردے پر ایک رنگین فلم متحرک ہو جاتی۔ چالیس برس پیشتر قصرِ زریں میں بڑی گہما گہمی تھی۔ چار پانچ سال کی عمر کے دھندلے سے نقوش اُبھرتے۔ دور کے رشتہ داروں کے جھمگٹے۔ نوکروں۔ کنیزوں کے ٹولے۔ اَبّا میاں اور چچا میاں کے وہ ملکی اور غیر ملکی احباب پھر دادا حضرت کی نگرانی میں وہ دعوتیں اور جشن جو وہ ہز ہائی نس کے وقار کی یاد میں دیتے رہتے تھے جو شینوں کے اس سیلاب۔ قہقہوں گالوں کے شور اور باہر سے آئے ہوئے مہمانوں کی گہما گہمی میں ایک گبھرو کی شکل کا معصوم بچّہ حیرت سے انگلی منہ میں ڈالے چھوٹی بیگم کا زرکار پلّو تھامے قصرِ زریں کے سجے سجائے ایوانوں میں گھومتا پھرتا۔ یہ ننھے شہزادہ عالی گہر شوکت الملک نہ جانے

ان میں کیا بات تھی کہ ہر انسان ایک نظر دیکھ کر بغور دوسری دفعہ ضرور دیکھتا اور دادا حضرت ڈلار میں آ کر انھیں ساتھ لئے مہمانوں میں چلے جاتے اور فخر یہ کہتے کہ یہ ہز ہائی نس کی زندہ تصویر ہے۔ بچپن ہی سے اِس مناسبت کی وجہ سے وہ لمبی چوڑی تصویر اُن کے ننھے سے ذہن پہ چھائی رہ گئی تھی اور وہ کچھ بھی نہ سمجھتے ہوئے بغور اُس کا مطالعہ کیا کرتے۔

اور انھیں ایسا معلوم ہوتا۔ بوڑھی انّا کی سُنائی ہوئی کہانیوں کا کوئی ذی شان راجہ گیری میں آ کر نیلے پردوں کے درمیان کھڑا ہو گیا ہے۔ دن اسی نرمی اور آہستگی سے گزر رہے تھے جیسے رنگین پھولوں پہ شبنم کی پھوار کہ یکلخت ایک ہولناک طوفان آیا تھا۔ یہ نہ مٹنے والا نقش انھیں بخوبی یاد تھا۔ اُن کے والد نواب صفدر الملک شکار کے دلدادہ۔ مقامی حکام کے ساتھ شیر کے شکار کے لیے ایک دور دراز شکار گاہ میں۔ ہاتھی پہ بیٹھتے ہوئے اچانک گولی چل جانے کے باعث خود اپنا ہی نشانہ بن گئے۔ لوگوں کی آہ و فغاں اور نواب صفدر الملک کے آخری جلوس کو وہ حیرت سے دیکھتے رہے مگر جب بہت دنوں تک ابا میاں واپس نہ لوٹے اور چھوٹی بیگم آنسوؤں اور آہوں کے ہجوم میں پلنگ سے لگ کر رہ گئیں تو ننھے شہزادہ عالی گہر کا دل بے طرح اداس رہنے لگا۔ بلا مقصد اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد وہ چپ چاپ جا کر نواب مظفر الملک کے گھٹنے سے لگ کر کھڑے ہو جاتے۔ بوڑھے دادا انھیں دیکھ کر جلد جلد آنسو خشک کرنے لگتے جن سے اُن کی داڑھی بھی تر ہوتی۔ آخر اُن کی اداسی اور تنہائی دیکھ کر دادا حضرت نے انھیں سوری بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ جب چچا میاں نواب منائع الملک انھیں لے کر چلنے لگے تو اماں حضرت کی ہچکی بندھ رہی تھی یہ ننھے سے دل کے لیے گہرا صدمہ تھا جس کا اثر مہینوں رہا۔ آدھی رات کو وہ بڑی بڑی سیپیوں جیسی آنکھیں آنسو بھرتی ان کے بستر پہ جھک جاتیں اور وہ اماں۔ اماں کا شور مچا دیتے۔ پھر بوڑھی سسٹر دوڑی آتی اور انھیں تھپک تھپک کر سُلا دیتی۔

سکول کا خوش آئند زمانہ انھیں اچھی طرح یاد تھا جب نواب منائع الملک ہر مہینے ڈھیروں تحائف لے کر انھیں ملنے آتے۔ انعام و کرم کی خوشی میں تمام نوکروں کے چہرے کھِل اُٹھتے مگر نہ جانے چچا میاں کی اپنی ہنسی کہاں کھو گئی تھی۔

شہزادہ عالی گہر اُن کا خاموش اداس سا چہرہ دیکھ کر بجھ کر رہ جاتے۔ پھر وہ دادا حضرت اور چچی دلہن سے لے کر قصرِ زریں کے بوڑھے مالیوں اور راناؤں تک کے زبانی بھیجے ہوئے پیغام انھیں دیتے مگر باوجود انتظار کے اماں حضرت کا ذکر نہ آتا۔ تنگ آ کر وہ خود ہی پوچھتے تو یک لخت چچا میاں کا چہرہ اور ویران ہو جاتا اور وہ نظریں چرا کر دور نیلے پہاڑوں اور بادلوں کو بغور دیکھنے لگ جاتے ایسے لمحوں میں سات سالہ شہزادہ عالی گہر ایک ماہر سُراغ رساں کی طرح عمیق نظروں سے اُن کے دل کا چور پکڑنے کی کوشش کرتے اور پھر خود ہی کسی انجانی حقیقت سے ڈر کر رہ جاتے۔ آخر کار وہ خوفناک حقیقت اُن کے سامنے آ کر رہی۔ جب ایک سال بعد وہ چھٹیوں میں گھر پہنچے تو قصرِ زریں اسی طرح تھا مگر اماں حضرت نہیں تھیں ان کا دل کٹ کر رہ گیا۔ کتنی ڈھیروں اداسیاں تھیں ہر طرف۔ کوئی اُس معصوم روح کی ویرانی کا تصور نہیں کر سکتا تھا اور تب ہی سے انہوں نے دل کے گھاؤ چھپانا سیکھ لیا تھا۔ سب کی نظریں بچا کر وہ چپ چاپ چھوٹی بیگم کے آراستہ پیراستہ کمرہ میں چلے جاتے اور اُن کے منقش پلنگ پر گھٹنے باندھ کر گھورتے رہتے۔ جیسے ابھی ابھی ایک معطر ہیولیٰ اُٹھے گا اور انھیں آغوش میں سمیٹ لے گا۔ پھر سسک سسک کر اُن کی آنکھیں سوج جاتیں۔ دادا حضرت اور چچا میاں کے استفسار پر وہ دل کا درد چھپائے بلبلا اُٹھتے کہ ساتھ کھیلنے والے دوست یاد آ رہے ہیں اور چچا انھیں سینے سے لپٹا کر تسلی دیتے کہ وہ عنقریب ہی انھیں دوستوں کے پاس لے چلیں گے۔ انھیں دنوں کی ایک دلچسپ سی افراتفری بھی انھیں یاد تھی۔ چچی جان اکثر اوقات اُن کے لئے امی کی جگہ لے بیٹھتیں تھیں ایک دن سخت بیمار پڑ گئیں۔ قصرِ زریں میں ایک ہلچل مچی ہوئی تھی اور شہزادہ عالی گہر سہمے ہوئے

سے ایک اور بھیانک خلا کا تصور کر رہے تھے۔ چھوٹی بیگم کی طرح چچی دلہن کا بھی ویران کمرہ اور خالی پلنگ اُن کی نظروں میں گھوم رہے تھے مگر جب چند لمحوں بعد وہ کمرہ اور زیادہ آباد ہو گیا۔ لوگ مسرور و خوش ادھر اُدھر بھاگ دوڑ کرنے لگے اور کسی چھوٹے سے بچے کی رونے کی آواز سنوا تہ آنے لگی تو وہ بےحد حیران ہوئے اور پھر جب چچا میاں انھیں لیے ہوئے ننھی سی بہن مہرپرور دکھانے لے گئے تو انھیں وہ لال سی بیلی سی بچی سخت بُری لگی جس کی وجہ سے اتنی پریشانی پیدا ہوئی تھی اور بیچاری چچی دلہن بیمار پڑ گئیں تھیں۔

چالیس برس پیشتر کی کہانی کل کے واقعات معلوم ہونے مگر نواب شوکت الملک ماضی کے دھندلکوں میں بھٹکنے کے عادی نہیں تھے بظاہر ایسا معلوم دیتا تھا کہ وہ زندگی کے تمام نشیب و فراز فراموش کر چکے ہیں جو انھیں شہزادہ عالی گہر سے نواب شوکت الملک بننے تک پیش آئے۔ اسی لیے مرزا علی نواز کے لئے ان کی شخصیت ہمیشہ ایک معمہ رہی تھی اور اب جبکہ جوانی کے سمن زار پیچھے چھوڑ کر وہ دونوں بڑھاپے کے لق و دق صحرا کے کنارے کھڑے تھے طبائع کا یہ اختلاف بدستور باقی تھا۔ اور اس وقت بھی مرزا علی نواز ایک علیحدہ کمرہ میں انھیں خیالات میں محو تھے۔ باہر سے آئے ہوئے تمام مسلمان لڑکوں کو وہ ان چوبیس گھنٹوں میں اچھی طرح جانچ پرکھ چکے تھے۔ کوئی ایک بھی تو اُن کی نظر میں تابندہ یا شائستہ کے لیے ان کے معیار پر پورا نہیں اترتا تھا۔ اچھے لڑکے تو عنقا ہی ہو گئے تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی تقریبن پٹ پلٹ کر پاکستان پر جا بیٹھیں تھیں۔ آخر ان با عزت مسلمان گھرانوں کا کیا بنے گا۔ انھیں اپنے چاروں طرف سوچنے سمجھنے کی کھ کا جال سا بچھا ہوا نظر آتا۔ اللہ تعالیٰ ہی حامی و ناصر ہے مرزا علی نواز کی تو راتوں کی نیند بھی حرام ہو گئی تھی مگر نواب شوکت الملک نے کبھی کسی تردد کا اظہار نہیں کیا تھا۔ شائستہ تابندہ کے لئے ان کی نظر انتخاب عامر ساجد علی خان پر پڑ چکی تھی . . . . عامر ساجد علی خان دیتے نواب با عزت گھرانے کا فرد۔ ورنہ نواب شوکت الملک کا دور کا رشتہ دار تھا مگر بچپن میں یتیم ہو چکا تھا اور نواب شوکت نے اُس کی تعلیم پر بے دریغ روپیہ خرچ کیا تھا اور اب تعلیم ختم کرکے واپس آنے سے پہلے یورپ کی سیر و سیاحت میں مشغول تھا۔ شکار سے سب لوگ واپس آ چکے تھے۔ ہال میں ریفریشمنٹ کا بندوبست کیا گیا تھا۔ مرزا علی نواز فرصت دیکھ کر نواب شوکت الملک کے پاس جا پہنچے۔ لڑکیاں وہاں پہلے سے موجود تھیں اور مرزا قدرت اللہ بیگ اور توصیف کے اس ڈاک میں آئے ہوئے خط پڑھے جا رہے تھے۔ مرزا قدرت اللہ بیگ نے ان لوگوں سے اپنے اس غیر اسلامی فعل کی معافی چاہی تھی کہ انھوں نے خاندانی وقار اور سب عزیزوں کی مرضی کے خلاف اپنی لڑکی کا رشتہ انتہائی مجبوری کی حالت میں ایک ہندو گھرانے میں کر دیا تھا۔ مرزا علی نواز کا پارہ یک لخت ایک سو دس پر پہنچ گیا۔ وہ اب مرزا قدرت اللہ بیگ کا نام بھی سننا گناہ سمجھتے تھے۔ اور زبان تو کبھی بھی ان کے بس میں نہ تھی ——" کافر، کمینہ۔ بےغیرت۔ اسے جرأت کیسے ہوئی ہمیں مخاطب کرنے کی"۔ وہ غصہ سے اُبل رہے تھے۔

نواب شوکت الملک جو اُن کی تلخ کلامی سے ہمیشہ ہی نالاں رہتے تھے افسوس بھری نظروں سے اُن کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "کسی بھی با عزت انسان کے لئے ایسے الفاظ مناسب نہیں۔ دوسرے اُسے اختیار ہے جو بہتر سمجھے کرے"۔ مرزا علی نواز تلملا اُٹھے "ہاں۔ ہاں۔ بڑا با عزت ہے نا مغل فرمانرواؤں کی اولاد"۔ ؎

"یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو!"

اور پھر زندہ رہنے کی خاطر اسلام کو قربان کرنے کا حق اُسے کس طرح حاصل ہو گیا ہوا ہے؟ —— نواب شوکت الملک جز بز سے ہو کر رہ گئے۔

اور آدھیف کا خط تو مرزا علی نواز نے بغیر پڑھے ہی پرزے پرزے کرکے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا تھا۔ "بے حیا۔ چھنال کہیں کی" وہ عورتوں کی طرح ہاتھ چلاتے ہوئے بولے "اب ہماری بچیوں کے ساتھ تعلقے کرنے بیٹھی ہے" "میں بخوبی جانتا ہوں یہ سب کچھ ایک منظم سازش کے ماتحت ہو رہا ہے، اعلیٰ مسلمان خاندانوں کا ضمیر مردہ کرنے کی خاطر۔ میں ان شیطانی سکیموں کو کچل کے رکھ دوں گا" وہ غصے سے کانپ رہے تھے "تابندہ شائستہ اور نیلم فضا ناساز گار دیکھ کر چپکے سے اٹھ کر چل دیں اور نواب شوکت الملک سنی ان سنی کرکے باقی خطوط دیکھنے میں مصروف ہو گئے چند منٹ کی خاموشی کے بعد مرزا علی نواز کی طبیعت سکون پذیر ہو گئی اور وہ دھیرے سے بولے "اس اجتماع میں اگر تابندہ اور عامر ساجد علی خان کی نسبت کا اعلان کر دیا جائے تو زیادہ رونق اور خوشی کا باعث ہوگا" نواب شوکت الملک نے چونک کر حیرت سے انھیں دیکھا "یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ عامر کے پہنچنے میں ابھی ڈیڑھ دو ماہ کا عرصہ تو لگ ہی جائے گا"

"تو اس اعلان کے لئے عامر کی موجودگی کونسی ضروری ہے" مرزا علی نواز ہٹ دھرمی سے بولے۔ نواب شوکت الملک نے لاجواب سا ہو کر خط نیچے رکھ دیئے اور چند لمحے سوچ کر کہنے لگے "موجودگی تو واقعی ضروری نہیں مگر اس کی خواہش اور رائے کا معلوم ہونا تو ضروری ہے"

"اس کی خواہش یا رائے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا" مرزا علی نواز کا لہجہ پھر سے گرم ہو رہا تھا۔

"سوال کیوں نہیں پیدا ہوتا۔ ہو سکتا ہے وہ کہیں اور خواہش مند ہو" "میں زبردستی تو نہیں کر سکتا" نواب شوکت الملک رک رک کر انتہائی بیزار لہجہ میں بول رہے تھے ——"بہرحال ساجد علی خان کی واپسی پر اس سے دریافت کیا جائے گا۔ مرزا علی نواز بھنا کے رہ گئے" "اس کی خواہش کہیں اور ہو تو کیا قرضہ دینا تھا اس کے آباو اجداد کا۔ ہزاروں روپیہ خرچ کیا ہے اس کی تعلیم و تفریحات پر —— اور وہ ہمیں اب یہی بدلہ دے گا نا۔ احسان فراموش۔ بدبخت کہیں کا"

شدتِ جذبات سے اُن کی آواز گلوگیر ہو گئی۔ نواب شوکت الملک نے بے بسی سے اُن کی طرف دیکھ کر سر تھام لیا۔ اور مرزا علی نواز بڑبڑاتے ہوئے کمرہ سے نکل گئے "نہ جانے اس شوکت الملک کو اللہ تعالےٰ نے کس مٹی سے بنایا ہوا ہے" وہ چل کر سوچ رہے تھے "خدا ہی حافظ ہے خاندان کے وقار کا"

گیلری اور ہال میں مہمان فنِ مصوری اور سنگ تراشی کے نادر نمونے دیکھ دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔ معلوم نہیں نواب شوکت الملک آرٹ کے یہ انمول موتی دنیا کے کس کس کونے سے ڈھونڈ کر لائے تھے۔ سردار شمشیر سنگھ جی۔ روشن دریچے کے سامنے رکھے ہوئے بُدھ کے ایک مرمریں مجسمہ کو بغور دیکھ رہے تھے۔ ویسے بُدھ کے بُت تو انہوں نے سینکڑوں ہی دیکھے ہوئے تھے مگر یہ کیسا بُت تھا۔ زندگی سے بھرپور —— مسکراتے ہوئے ادھ کھلے ہونٹ۔ ملتجی ہوتی نیم باز آنکھیں۔ پیشانی پر تقدس کا نور لیے۔ سکھ و طمانیت کے گہرے جذبات میں چور۔ زندگی و موت کے تمام عقدے حل کرکے مطمئن انداز میں مسکرا رہا تھا۔ سردار صاحب کے تعریفی کلمات سن کر اب بہت سے لوگ اس بُت کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ کمرہ کے دوسرے کونے میں رائے بہادر راجہ رام —— شو اور پاربتی کے سنگ اسود کے مجسموں پر نثار ہو رہے تھے۔ نواب شوکت الملک انھیں بتا رہے تھے کہ یہ نادر مجسمہ انھیں ایک نیپالی سردار نے دیئے تھے۔ جن نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر ان کو ایک جلتے ہوئے مندر سے حاصل کیا تھا۔

مرزا علی نواز کو نواب شوکت الملک کی انھیں غیر اسلامی عادات سے چڑ تھی۔ بیچارے پانچ وقت کے نمازی۔ جنھوں نے نوجوانی میں ہی انگریزی لباس تک ترک کر دیا تھا قصرِ زریں میں نماز ادا کرنا غلط سمجھتے تھے۔ جہاں چاروں طرف آرائشی مجسمے نصب تھے۔ مگر نواب شوکت الملک

تو آرٹ کے دلدادہ تھے اُن کے خیال میں اگر اُن کے کمرں میں - رفائیل - مائیکل اینجلو اور رینائے کے شاہکار موجود تھے تو بدھ اور شیو کی مورتیوں میں کیا حرج تھا - جو کہ آرٹ کا بہترین نمونہ تھیں اور انھیں تحفتہً پیش کی گئیں تھیں - وہ انھیں بے جان آرائشی چیزوں سے زیادہ وقعت نہیں دیتے تھے اور انھیں کے درمیان خلوص سے فریضۂ نماز ادا کر لیا کرتے -

مرزا علی نواز کی عادت تھی کہ کام میں بیحد مصروف ہونے کے باوجود اپنے خیالات کے تانے بانے سے باہر نہیں نکلتے تھے - کتنی ہی تو سوچیں تھیں - ڈھیروں خدشے جو مہمان داری کی شدید مصروفیات کے باوجود جونکوں کی طرح ذہن سے چمٹے خون چوس رہے تھے - ہولناک شبہات کی بنا پر ان کی دیکھنے اور سننے کی قوت کئی گنا زیادہ ہو چکی تھی - ہز ہائی نس کی تصویر کے سامنے مہیش اور تابندہ - چند اور لوگوں کے ساتھ کھڑے مصروف گفتگو تھے - شائستہ نہ جانے کدھر تھی - ہاں یاد آیا - رات کو کھیلے جانے والے ڈرامہ کے لئے لان کے ایک گوشہ میں پھولوں سے لدے پھندے کنجوں کے درمیان اسٹیج بنوانے کا کام بھی تو لڑکیوں کے ذمّہ تھا - یقیناً شائستہ اور نیلم وہیں ہوں گی . . . . مہیش کہہ رہا تھا "نواب شوکت الملک تو واقعی ہز ہائی نس کا صحیح عکس ہیں - بڑی زبردست مشابہت ہے - میں سوچتا ہوں بڑا زبردست کردار تھا تمہارے جدِ امجد کا بھی - ایک ناقابلِ تسخیر قوتِ ارادی کے مالک ہوں گے لیکن میرے خیال میں تم میں تو قوتِ ارادی نام کو بھی نہیں - بھئی راج پاٹ تج دینے کے لئے بھی ہمّت کی ضرورت ہوتی ہے اور تم تو بڑی بزدل ہو" مہیش ایک معنی خیز انداز میں رُک رُک کر بول رہا تھا ـــ

"شاید تمہارا خیال صحیح ہی ہو - میں واقعی بڑی کم ہمّت ہوں ، ایک نقرئی قہقہہ بلند ہوا مگر اُس میں ٹوٹتے ہوئے جلترنگ کا نوحہ تھا - تابندہ بے بسی سے ساری کا آنچل مروڑ رہی تھی - مرزا علی نواز کے دل و دماغ کو ایک شدید دھچکا سا لگا اور انہوں نے امریکن سیاحوں سے ہندوستانی معاشرت پر روشنی ڈالتے ڈالتے - اچانک پیچھے ٹیک لگا کر ایک لمحے کے لئے آنکھیں بند کر لیں - سب کچھ غائب ہو گیا تھا صرف چاروں طرف آرزوؤں کی رنگین کرچیاں بکھری ہوئی نظر آئیں - جن کے نوکیلے کناروں پر چلتے ہوئے دو سرمست دل - نتائج سے بے پرواہ - سبک رفتاری سے آگے بڑھ رہے تھے - انھیں ایسا محسوس ہوا - الحمرا کا قدیم روایتی منقّی ابھی شہزادی سے جادو کے سُرخ قالین پر پاؤں دھرنے کی التجا کرے گا اور پھر سب کے دیکھتے دیکھتے اچانک اُسے اُڑا کر آسمان کی نیلی وسعتوں میں گم ہو جائے گا - دوسرے ہی لمحے انہوں نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں - دل کٹ سا گیا تھا . . . نہیں نہیں تابندہ ایسے نہیں کر سکتی ہرگز نہیں کر سکتی - انہوں نے ایک پُر اعتماد باپ کی طرح سوچا - اور واقعی کچھ بھی تو نہیں تھا - سب باتیں معمول کے مطابق تھیں لوگ کھڑے تھے - بیٹھے تھے ہنس بول رہے تھے - مہیش اور تابندہ اب آگے بڑھ کر نواب شوکت الملک سے گفتگو میں مصروف ہو چکے تھے - شیو کی مورتی کو راجہ رام جی ابھی تک بغور دیکھ رہے تھے - پاربتی جی ناگ کے پھن پر اُسی سکون سے لیٹیں تھیں - نواب شوکت الملک اور سر ضیاء الدین کسی بات پر بے ساختہ مسکرا رہے تھے - کوئی غیر معمولی بات نہ تھی - تو کیا یہ سب اُن کے تصوّر کا واہمہ ہوتا ہے - اُن کے اپنے دماغ کی اختراع - یہ دھوپ چھاؤں کا کھیل - یہ منزلیں - یہ فاصلے -- یہ اشارے کنائے - یہ اداس ملتجی نظریں - چاندنی میں افسردہ سائے - کچھ بھی نہیں اُن کے احساسات کا ناگ ایسے ہی پھنکارتا رہتا ہے . . . .

رائے بہادر کہہ رہے تھے "جب دنیا بنی تو پرم آتما نے دکھوں کے سات سمندر کر دیئے - شیو جی یہ دیکھ کر بے قرار ہو گئے - انسانی ہمدردی سے مجبور ہو کر انہوں نے ساتوں سمندروں کو بلویا اور دکھوں کے سات گھڑے بھر کر اپنے پاس رکھ لئے مگر کچھ شریر دیوتا اس تاک میں تھے کہ ان کو چرا

انسانی زندگی کو عذاب میں مبتلا کیا جائے: تنگ آ کر شوجی نے اُن گھڑوں کو پینا شروع کر دیا۔ چھ گھڑے وہ پی گئے مگر ساتواں منہ سے لگایا ہی تھا کہ ایک شریر اور دیر دیوتا نے گرز مار کر اُسے توڑ دیا اور اس ایک گھڑے کے تمام دکھ دنیا میں بکھر گئے۔"

"میں تو سوچتا ہوں صرف ایک گھڑے کے باعث ہی دنیا دکھوں کا گھر بن کے رہ گئی ہے۔ اور اگر شوجی باقی چھ سمندر بلو کبھی نہ جاتے تو دنیا کا کیا حال ہوتا۔"

غیر ملکی سیاح محظوظ ہو کر قہقہے پر قہقہے لگا رہے تھے۔ "ہمیں ہندوستان بہت پسند ہے۔ یہاں کی ہر چیز دلچسپ۔ غیر یقینی۔ پُراسرار اور عجیب و غریب ہے حتّیٰ کہ روایات اور خدا بھی"۔

مرزا علی نواز کے چہرے پر بھی مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور وہ ہشاش بشاش سوچ رہے تھے کہ نواب شوکت الملک بھی تو شوجی کی سنگین مورتی ہی ہے۔ دکھوں کے سمندر پی جانے والا۔ ان کی زندگی کا ہر باب قسم قسم کے غم و اندوہ۔ تنہائیوں محرومیوں کا حاصل تھا مگر ایسا ٹھیلا انسان کہ اس کے چہرے سے کبھی کوئی تردّد ظاہر ہی نہیں ہوا۔ ہر نئے دکھ کو چپ چاپ پی کر شانت ہو جاتا ہے۔ اور اس عمر میں بھی محفلوں کی رونق ہے۔ ہر قسم اور ہر عمر کے لوگ اس کی موجودگی میں خوش رہتے ہیں۔ واقعی بے پناہ شخصیت ہے اس انسان کی بھی۔

اور مرزا علی نواز کو یاد آیا کہ جب نواب شوکت الملک ابھی شہزادہ عالی گُہر ہی تھے اور انگلینڈ میں تعلیم کا آخری سال مکمل کر رہے تھے تو انھیں ایک سوئیڈ لڑکی کرسٹینا سے گہری دلچسپی پیدا ہو گئی تھی اور اُن دنوں وہ مرزا علی نواز کو خط لکھتے ہوئے لاشعوری طور پر اس کا ذکر کر دیتے۔ انہوں نے لکھا تھا کہ کرسٹینا مذہبی قسم کی سادہ سی پیاری لڑکی ہے۔ میرے اکثر دوست میرا مذاق اُڑاتے ہیں کہ میں نے ایک سوئیڈ لڑکی کو انگریز لڑکیوں پر ترجیح دی ہے۔ دراصل یہ لوگ احساسِ برتری میں مبتلا ہیں اُن کا خیال ہے کہ اکثر سوئیڈ بدھوا و ربد رنگ ہوتے ہیں۔ اور وہ کبھی بھی صحیح انگلش لب و لہجہ اختیار نہیں کر سکتے۔ مگر کرسٹینا تو بیحد سُلجھی ہوئی اور عظیم ہے۔ مجھے اُس کا ایکسینٹ بھی دلچسپ لگتا ہے۔ میں ہندوستان واپس آنے سے پہلے تمام یورپ کا چکر لگانا چاہتا ہوں اور کرسٹینا کا اصرار ہے کہ میں اُن کے ہاں چند روز ٹھہر کر اُس کے والدین سے ضرور ملوں۔"

اور مرزا علی نواز کو بخوبی یاد تھا کہ انہوں نے کتنی سختی سے شہزادہ عالی گُہر کو اس محبت سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔ کیونکہ اُن دنوں اُن کے چچا نواب مناع الملک اور دادا نواب مظفر الملک زندہ تھے۔ مرزا علی نواز کو معلوم تھا کہ ان کے چچا اپنی اکلوتی بیٹی مہر مہ درکا رشتہ شوکت الملک سے طے کر چکے ہیں اور اس شادی سے انکار دونوں بزرگوں کے لئے ایک سانحہ عظیم سے کم نہ ہوگا۔ مگر نواب شوکت الملک بھی تو اپنی جگہ صحیح تھے۔ اتنی دنیا گھومنے پھرنے اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ کیسے ایک ایسی لڑکی سے شادی کر لیتے جس کے متعلق وہ کچھ بھی تو نہیں جانتے تھے۔ انھیں اُس کی پیدائش کا ایک دھندلا سا ہنگامہ یاد تھا جب چچا میاں انھیں چھوٹی بہن دکھانے لے گئے تھے اور انھیں اُس روتی کے کالے کی سی بچی سے بڑی گھبراہٹ ہوئی تھی۔ یا پھر لڑکپن میں انہوں نے چند بار ضرور ایک خوبصورت سی ضدی لڑکی کو ماماؤں کی چٹیاں کھینچتے دیکھا تھا۔ وہ چھوٹی بہن سمجھ کر اکثر اس کے لئے تحائف بھی بھیجا کرتے تھے مگر اب اچانک اُس کو زندگی کے ساتھی اور بیوی کے روپ میں دیکھنے کے لئے ان کے دل و دماغ قطعاً آمادہ نہیں تھے۔ شادی ہر انسان کا ذاتی معاملہ ہے آخر اُس میں زبردستی کیوں کی جائے۔

پھر مرزا علی نواز کے تمام پند و نصائح کے جواب میں انہوں نے بڑے سکون سے اطلاع دی تھی کہ وہ آج کل سوئیڈن میں ہیں اور کرسٹینا سے شادی کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ واپسی پر وہ اُن کے ہمراہ ہوگی۔ مرزا علی نواز کے کئی خطوط کا پھر کوئی جواب نہ آیا۔ وہ اپنی سیر و سیاحت میں

بے طرح مصروف تھے۔ کافی عرصہ بعد ایک دور دراز جگہ سے انہوں نے لکھا تھا کہ "جزیروں کی یہ دنیا حیرت انگیز ہے یہاں اندھیرے اجالے کے اس کھیل کا بہت سا حصہ دیکھ چکا ہوں۔ یہاں گرمیوں میں آدمی رات کو بھی سورج چمکتا ہے اور سردیوں کی دوپہروں میں راتوں کے سائے ڈولتے ہیں۔ یہ پُراسرار گہرا اور ملگجے اندھیروں کا لامتناہی سلسلہ مجھے بیحد پسند آیا ہے۔ کم از کم اس میں ایک انوکھا پن ایک انفرادیت ہے۔ کرسٹینا کی طرح۔ بہار اور گرمی کے موسم میں تین چار ماہ سورج غروب نہیں ہوتا اور برف پوش پہاڑیاں جھلمل جھلمل کرتی رہتی ہیں۔ خدا نے اس ملک کو خوبصورتی کی دولت سے مالا مال کر دیا ہے۔ نیلگوں جھیلیں، سرسبز جزیرے، تناور درختوں کے گھنے سلسلے۔ پھولوں سے لدے پھندے باغات کہیں کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ مگر کرسٹینا ہندوستان دیکھنے کے لئے بیتاب ہے وہ اُسے ایک پُراسرار جادونگری سمجھتی ہے۔ جہاں عظیم الشان معبدوں میں دیوداسیاں رقص کرتی ہیں۔ ریاستوں کے حکمران ہیرے موتی پہنے ہاتھیوں پہ بیٹھ کر شیروں کا شکار کرتے ہیں۔ اور جہاں پُرانے مسلمان فرمانرواؤں کے محلات اور حرم سرائیں ہیں۔ اس کے ذہن میں عجیب و غریب تصورات ہیں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ سویڈن کے لوگوں میں ہم مشرقیوں کی طرح سادگی اور خلوص ہے۔ کرسٹینیا کے ماں باپ کا سلوک بیحد پُرشفقت اور اپنائیت کا حامل رہا۔ اُس کا بھائی انجینئری کی تعلیم حاصل کر رہا ہے اور ٹیبل سٹوڈنٹ ہے۔"

اور پھر آخر میں مرزا علی نواز کی اُس نامہ آہ و زاری کے جواب میں۔ جو انہوں نے نواب شوکت الملک کو اُس شادی سے باز رکھنے کے لئے کی تھی انہوں نے صرف یہ لکھا تھا کہ "مجھے نظم میں نہیں نثر میں خط لکھا کرو تمہارا خط پڑھ کر مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انیس و دبیر کا لکھا ہوا کوئی مرثیہ پڑھ رہا ہوں"۔ اور مرزا علی نواز نے اُس کے بعد اُن کو کچھ نہ لکھنے کی قسم کھالی تھی کہ حالات نے یکایک پلٹا کھایا۔ نواب شوکت الملک کو اچانک موت کا بیرحم ہاتھ دبوچ کر لے گیا اور وہ مہر پرور اور شوکت الملک کی شادی کا ارمان اپنے ساتھ ہی لے گئے۔ ضعیف العمر نواب مظفر الملک کی حالت قابل رحم تھی وہ تقریباً بینائی سے محروم ہو چکے تھے اور اِس جانکاہ صدمہ کو برداشت کرنا ان کی برداشت سے باہر تھا صرف شہزادہ عالی گہر کے انتظار میں اُن کی جان اٹکی ہوئی تھی۔ مرزا علی نواز نے گھبرا کر تار دن پہ تار دیئے اور شہزادہ عالی کے رنگین خوابوں پہ سویڈن نا روے کا پراسرار دھندلکا ہمیشہ کے لئے چھا کر رہ گیا۔ جھلملاتی وادیوں پہ تاریکی چھپ گئی اور اُن کے دل کے سونے گوشوں میں ایک اور سورج غروب ہو گیا۔ کبھی نہ نکلنے کے لئے۔

جب وہ واپس قصر زریں پہنچے تو چاروں طرف دل گداز اُداسیاں اور تنہائیاں بکھری پڑی تھیں۔ مہر پرور کالج واپس جا چکی تھی مگر انہیں کب شوق تھا اُسے ملنے کا۔ بوڑھے دادا نواب مظفر الملک نے جب لرزتے کانپتے اپنی آخری خواہش بیان کی تو وہ کانپ گئے۔ آنسوؤں کا طوفان سا اٹھا جو انہوں نے منہ پھیر کر پی لیا اور اِس شادی کے لئے ہاں کر دی۔ نواب مظفر الملک میں قدرے زندگی لوٹ آئی مگر شہزادہ عالی گہر کتنی روز تک زندگی سے عاری۔ چپ چاپ۔ مرمریں ستونوں کے درمیان ٹہل ٹہل کر سوچتے رہے۔ سگار پیتے رہے کتنے دن اور کتنی راتیں اِس طرح گزر گئیں اور مرزا علی نواز باوجود کوشش کے اُن سے کوئی بات نہ کر سکے۔ پھر ایک دن اچانک ٹہلتے ٹہلتے وہ دیوار پہ ایک خوبصورت پینٹنگ دیکھ کر رُک سے گئے۔ یہ پہلے تو یہاں نہیں ہوتی تھی۔

انہیں ڈلارنا کا خوب صورت علاقہ یاد آ گیا۔ دُور برفانی چوٹیاں۔ نیچے گہرے بادل سیاہی مائل سبز جنگل اور جھیل کے کنارے کنارے بل کھاتی ہوئی پگڈنڈی۔ سُرخ چھتوں والے گھر اور پھولوں کے تختوں پر سے سلسلہ وار گزرتے ہوئے پرندے۔

—— مرزا علی نواز انھیں بتانے لگے "مہر پرور ایک عظیم فنکار ہے۔ اس کے علاوہ اس کی دوسری پینٹنگز بھی قابل دید ہیں اور سب پینٹنگز

دیکھنے کے بعد پہلی دفعہ شہزادہ عالی گہر کے دل میں مہر پرور کو دیکھنے کی ایک دبی دبی سی خواہش پیدا ہوئی ماضی کی یادیں بیدار ہو گئیں۔ نواب متاع الملک کا والہانہ پیار اور شفقت یاد آئے جب ابا حضور شکار گاہ میں گولی لگ جانے سے ہلاک ہو گئے تھے تو بعد میں چچا میاں کیسے انھیں دن رات سینے سے چمٹائے چمٹائے پھرتے تھے اور اس شفیق انسان کا سایہ سر سے اُٹھ جانے کے بعد وہ اپنے غموں میں ایسے ڈوبے کہ اُن کی بیٹی سے دو لفظ تسلی کے بھی نہ کہہ سکے۔ انھیں اس مظلوم لڑکی پر ترس سا آ رہا تھا اور ضمیر کی ملامت پریشان کر رہی تھی ———

——— مگر انھیں زیادہ دن پریشان ہونے کی ضرورت نہ پڑی۔ مہر پرور خود ہی ایک ہفتہ کے لئے اپنی والدہ اور دادا سے ملنے اچانک آ گئیں اور شہزادہ عالی گہر ششدر کھڑے رہ گئے۔ اُن کے اندازے کے قطعاً برعکس ایک انتہائی دلفریب پیکر ان کے سامنے تھا۔ اگرچہ عادات و سکنات۔ لب و لہجہ اور وضع قطع۔ مغربی تعلیم و تربیت اور یوروپین ماحول کی پرورش کی غمازی کرتے تھے مگر کنول سے نین کٹوروں میں جھلکتا ہوا ایک نمایاں غم اور پاکیزگی مشرقیت کے مظہر تھے۔ وہ اتنی مہذّب۔ سنجیدہ اور علیم تھی کہ شہزادہ عالی گہر ششدر رہ گئے۔ انھیں تمام حالات کے متعلق افسوس تھا اور چند ہی روز میں وہ اپنے آپ کو مہر پرور سے کافی قریب محسوس کرتے شاید یہ خون کا جوش تھا یا ایک ہی ماحول کی پیداوار ہونے کا اثر۔ ساڑھیوں کے رنگین لہراتے آنچل۔ زرکار غرارے۔ چھنے ہوئے دوپٹے چوڑیوں کی کھنک۔ پرانے قصرِ زریں کا نقشہ پیش کرتے۔ نپا تلا باوقار لب و لہجہ اور دلکش شخصیت۔ نواب متاع الملک سے مشابہہ اور انگلش ادب پر بے تکان گفتگو انھیں اپنے بے تکلف انگریز دوستوں کی یاد دلاتے۔ کرسٹینیا سے جنسی لگاؤ ایک جوان بحث ضرور تھی مگر یہ اپنا پن۔ یہ بے ساختہ پن یہ جاذبانہ کشش کچھ اور تھی۔ اکثر اوقات وہ اپنے اور کرسٹینیا میں ایک دوری ایک بُعد سا محسوس کیا کرتے تھے ——— وہی دوری جو مشرق و مغرب میں ہے وہی بُعد جو دونوں سرزمینوں کے رسم و رواج۔ گفت و شنید اور عادات و لباس میں ہے مہر پرور انھیں اپنے سے بہت قریب نظر آتیں۔ بہرحال اب وہ اپنے فیصلہ پر متاسف نہیں تھے۔

شادی کے تین سال کس رنگینی میں گزرے اُن کا تصوّر تو نواب شوکت الملک کو ہی ہوگا۔ مرزا علی نواز کو تو وہ لرزا دینے والا واقعہ ہی یاد تھا جب جب شہزادہ ہمایوں فردوس سال کا اور تابندہ صرف دو گھنٹے کی تھی تو مہر پرور سب کو بلکتا چھوڑ کر موت کی وادیوں میں گم ہو گئی تھی۔ کیسا طوفانی ساون تھا وہ بھی گرجتے برستے بادلوں کے ساتھ چیختی ہوئی ہوا فراٹے بھر رہی تھی۔ بجلی رہ رہ کر چمکتی اور مرزا علی نواز نے ٹوٹے ہوئے دل اور رستی آنکھوں کے ساتھ آسمان کی طرف دیکھ کر سوچا تھا کہ مہر پرور نے سفر کے لئے کیسے غلط موسم کا انتخاب کیا ہے۔

سوچتے سوچتے اُن کا دل نئے سرے سے بھر آیا۔ انہوں نے پر رونق بھرے ہوئے ہال پر نظر دوڑائی۔ لوگ خوش گپیوں میں محو کافی کی چسکیاں لے رہے تھے۔ تابندہ کی تمام دوست لڑکیاں۔ نواب شوکت الملک کے گرد جمع۔ اُن کی اعلیٰ فوٹوگرافی کے البم دیکھ دیکھ کر شور مچا رہی تھیں۔ شائستہ اور تابندہ کسی اہم موضوع پر آہستہ آہستہ مصروفِ گفتگو تھیں۔

مرزا علی نواز کو اُن پرانے دنوں کو یاد کر کے نواب شوکت الملک پر تپتے سہرے سے بہت ترس سا آ رہا تھا۔ انہوں نے مہر پرور کی اچانک جدائی کو کس سنگین خاموشی سے برداشت کر لیا تھا یہ ایک طویل قصّہ تھا۔ مگر برسوں ایک بھٹکی ہوئی روح۔ ایک تنہا افسردہ سایہ۔ روشن اور تاریک راتوں میں۔ جلتے بجھتے ستاروں کے ساتھ۔ قصرِ زریں میں ٹہل ٹہل کر عمریں بتاتا رہا۔ تین چار برس بعد غم کی شدت میں کمی آنے پر عزیزوں دوستوں نے اُن کی شادی کے لیے بہت اصرار کیا۔ بہترین رشتے بتائے مگر وہ مسکرا کر ٹال جاتے۔ زندگی قدرے معمول پر آ گئی تھی کوئی خاص فرق نہ تھا سوائے اس کے کہ اب وہ سال میں ایک بار یورپ کا چکّر ضرور لگاتے تھے۔ ہر دفعہ لوگوں کو یقین ہوتا کہ اب وہ ضرور اُدھر سے بیوی ساتھ لے کر آئیں گے مگر واپسی پر ان کے ساتھ

سوائے جگہ جگہ ملک ملک سے خریدے ہوئے آرائشی سامان، قیمتی پینٹنگز اور مرمریں مجسموں کے اور کچھ نہ ہوتا۔

مرزا علی نواز بھی بعض اوقات اُن کی تنہا زندگی سے گھبرا اٹھتے اور ادب آداب بالائے طاق رکھ کر الجھ پڑتے۔ "یہ تم دنیا تیاگ کر آخر کہاں کے مجاہد بن جاؤ گے۔ مجاہد بھی تو دنیا نہیں چھوڑ دیتے۔ احمد شاہ ابدالی سا مجاہد ستر برس کی عمر میں محمد شاہ رنگیلے کی پری جمال لڑکی دیکھ کر سُدھ بُدھ کھو بیٹھا اور تم جوانی میں ہی تارک الدنیا ہو گئے ہو۔" شہزادہ عالی گہر اُن کی زبان کی روانی پر بے ساختہ ہنس پڑتے اور پھر اطمینان سے سگار سلگا کر کوئی دوسرا موضوع شروع کر دیتے۔ دن گزرتے چلے گئے اور پھر یونہی یونہی ٹہلتے۔ سوچتے۔ سگار پیتے۔ یورپ کی سیریں کرتے۔ ہمایوں فراز تابندہ کو بغور دیکھتے۔ وہ شہزادہ عالی گہر سے نواب شوکت الملک بن کر رہ گئے۔

وقت گزرتے کہاں پتہ چلتا ہے۔ مرزا علی نواز نے سوچا۔ اُن کے اپنے بچے بھی تو کب کے جوان ہو چکے ہیں۔ شہزادہ ہمایوں فرخی تو تقریباً ان کے بیٹے حامد نواز کا ہم عمر ہی تھا۔ ہمایوں فرخی یاد آتے ہی اُن کی آنکھوں میں لال ڈورے سے تیر گئے۔ کتنا خوب صورت و ذہین لڑکا تھا۔ نواب شوکت الملک کچھ ایسی قسمت لے کر پیدا ہوئے تھے کہ جب ایک جانکاہ غم کو وہ قطرہ قطرہ کر کے چوس لیتے تو قدرت اُن کے لئے دوسرا ایک تیار کر کے رکھ دیتی۔ صرف چار سال قبل شہزادہ ہمایوں فرخی آکسفورڈ میں تعلیم حاصل کر رہا تھا۔

نواب شوکت الملک زندگی کی گذشتہ بدنصیبیاں کافی حد تک فراموش کر کے اب ہمایوں فراز تابندہ کے مستقبل کے دھندوں میں مصروف رہتے ہر باپ کو ہی اپنے بیٹے سے شدید محبّت ہوتی ہے اور ہمایوں فرخی ماں باپ دونوں کی صفات اور خوبصورتی کا مجموعہ تھا۔ نواب شوکت الملک اکثر اس کی جدائی سے گھبرا کر انگلینڈ جا نکلتے اور اس دفعہ بھی انہوں نے اچانک ہی پروگرام بنا لیا تھا۔ مرزا علی نواز کو یاد آیا کہ انگلینڈ پہنچ کر انہوں نے کافی دنوں کے بعد انہیں ایک طویل خط لکھا تھا جس کا ہر لفظ درد سے پُر تھا۔ انہوں نے لکھا تھا۔

"تمھیں انتظار رہا ہوگا مگر میں بہت دنوں کے بعد تمھیں مخاطب کر رہا ہوں۔ ہمایوں فرصحت مند اور خوش اپنے تعلیمی مشاغل میں مصروف ہے۔ علی نواز۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ آسمان کو مجھ سے کیا دشمنی ہے کہ وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر رنگا رنگ بدنصیبیاں مجھے تحفتہً پیش کرتا رہتا ہے۔ ایسے ایسے چرکے کہ جن کا میں وہم و گمان بھی نہیں کر سکتا۔ تاک لگائے میرے ہی انتظار میں رہتے ہیں ؂

کیوں گردشِ مدام سے گھبرا نہ جائے دل

انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں "

اب ایک اور المیہ دکھانے قدرت کشاں کشاں مجھے یہاں لے آئی۔ اس سے پہلے تمھیں اطلاع نہ دے سکا کہ ویلز میں گھومتے مجھے ایک دن اچانک کرسٹینا مل گئی۔ اُسی طرح خوش بخوش سادہ و بلند فطرت۔ زندگی کے طویل دُکھ بھرے سفر نے ابھی اُسے زیادہ نہیں تھکایا تھا حالانکہ اس دُنیا کے نوّے فیصد لوگوں کی طرح اُس کی زندگی کی کشتی بھی کئی بار غم و الم کی چٹانوں سے ٹکرا چکی تھی۔ اب اُس کے دو جڑواں لڑکے ادھر ہی انجینیئری کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ خاوند سے شادی کے ابتدائی سالوں میں ہی علیحدگی ہو گئی تھی۔ وہ ایک آوارہ مزاج شخص تھا اور اُسے چھوڑ کر فن لینڈ چلا گیا تھا۔ ماں مر چکی تھی اور بھائی نوازہ ہنس مکھ بھائی ایک کار کے حادثے میں ہلاک ہو گیا تھا۔ وہ اب اپنے بوڑھے باپ کے پاس رہتی تھی جس کی بینائی کمزور ہو چکی تھی اور اُسے دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔ قدرت کی بے رحمی میں کوئی فرق نہیں ہوتا چاہے وہ مشرق میں ہو یا مغرب میں۔ اُس کا ایک چچا اُس کے ساتھ تھا جو عرصے سے فرانس میں مقیم تھا۔ وہ لوگ اپنے بچوں کو ملنے آئے تھے۔ چار پانچ دفعہ کی ملاقات میں اس نے ایک

دفعہ بھی تو گذشتہ واقعات کی طرف اشارہ نہیں کیا۔ اب اُن باتوں کے دوہرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اور اس دن وہ واپس جا رہی تھی۔ وہ تمام وقت تقریباً ہم لوگوں نے اکٹھے گذارا۔ ہوائی اڈے پر رونق تھی۔ کرسٹینیا نے "تائید کی کہ میں واپس جا کر تا بندہ کی تصویر اُسے ضرور بھیجوں۔ ہوائی جہاز روانہ ہو گیا۔ لوگ رومال ہلا رہے تھے مگر سب کے دیکھتے دیکھتے دو بلندی پر پہنچ کر اچانک اس میں آگ کے شعلے نمودار ہوئے اور ہوائی جہاز گہائی بلندی کی طرح نیچے آ رہا۔ مشکل سے ایک دو مسافر زندہ بچے۔

اس حیران کن حادثے کی تفتیش جاری ہے مگر کیا فائدہ۔ میں سوچتا ہوں زندگی اور موت کی سرحدیں کتنی قریب قریب واقع ہیں۔ صرف ایک قدم کا فاصلہ ابھی ابھی وہ سب یہاں کھڑے تھے۔ ہنس بول رہے تھے۔ دوستوں سے گرمجوشی سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ آنے والے دنوں کے وعدے اور تاکیدیں ہو رہی تھیں پھر جہاز نے سیٹی دی۔ پنکھوں کی گردش تیز ہو گئی۔ لوگوں نے رومال ہلائے اور دو مسرت لمحے وہ سب عدم کی وادیوں میں گم ہو چکے تھے۔ کرسٹینیا کا کچلا ہوا اور جلا ہوا جسم میرے سامنے تھا۔ کسی محبوب ہستی کو یوں دیکھنا ایک روح فرسا منظر ہے۔ میرے جسم میں کپکپی دوڑ گئی اور ایسے لگا ان قیمہ بنے گوشت کے لوتھڑوں سے میں نے کبھی بھی محبت نہیں کی تھی۔ زندگی بھر کے تمام نازک اور لطیف احساسات حرفِ غلط کی طرح مٹ گئے اور صرف دہشت و خوف باقی رہ گیا۔ کتنی عجیب بات ہے۔ اپنی بدقسمتی کا یہ آخری ہولناک سین بھی میں نے دیکھ لیا ہے۔"

مگر نواب شوکت الملک کا خیال غلط تھا کہ وہ ان کی بدقسمتیوں کا آخری ہولناک ڈرامہ تھا۔ ابھی ایک اور عظیم بدقسمتی بھاگم بھاگ ان کے تعاقب میں چلی آ رہی تھی۔ انھیں واپس ہندوستان پہنچے ابھی ایک ماہ ہی ہوا تھا کہ جو ان سال شہزادہ ہمایوں فر ڈوب کر ہلاک ہو گیا۔ نہ جانے اُسے کس کی نظر لگ گئی۔ قصرِ زریں میں ایک قیامت خیز زلزلہ آیا اور مرزا علی نواز نے سسکتے ہوئے سوچا تھا کہ نواب شوکت الملک اب ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئے۔ اور عارضی طور پر یہ ہوا بھی۔ اُن سب رسمی کاموں سے نپٹ کر نواب شوکت الملک نے اپنے آپ کو کمرہ میں مقید کر لیا تھا۔ بہت کم وہ باہر نکلتے مرزا علی نواز ضرورتاً ان کے کمرہ میں جاتے تو وہ چت لیٹے سوچتے ہوتے۔ پائپ پکڑے پکڑے، اُن کے ہاتھ لرزنے لگتے تو چور نظروں سے مرزا علی نواز کی طرف دیکھ کر کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے بستر کی سلوٹیں درست کرنے لگ جاتے۔ پھر کئی ماہ کے اضطراب اور تنہائی کے بعد وہ شدید غم کے اس جرعے کو بھی قطرہ قطرہ کر کے پینے میں کامیاب ہو گئے۔ محل کا وہ ونگ جس میں کبھی شہزادہ ہمایوں فر کی رہائش تھی صاف کروا کے اور ہمایوں فر کا انگلینڈ سے آیا ہوا سامان لگوا کر بند کر دیا گیا تھا حتیٰ کہ کپڑے تک تیار الماریوں میں سجے تھے۔ کبھی کبھی وہ یہ سب کھلوا کر غور سے ایک ایک چیز دیکھتے اور پھر خاموش و مطمئن سے باہر نکل آتے۔ ہمایوں فر کے چلے جانے سے جو خلا پیدا ہو گیا تھا۔ اُس کو پُر کرنے کی کوشش میں انہوں نے مرزا عامر ساجد علی کو آکسفورڈ پڑھنے کے لئے بھیج دیا ہوا تھا اور معمول کے مطابق سال میں ایک دفعہ یورپ کا چکر بھی لگا آتے تابندہ اور اُس کی روشنیوں کی آمد پر رنگین ہنگامے ہوتے۔ سالانہ دعوتیں۔ جلسے اور شکار کے پروگرام بنتے۔ احباب کا تانتا رہتا اور اس گہما گہمی اور قہقہوں کے ریلے میں مرزا علی نواز سوچتے کہ یہ آخری المیہ تھی۔ نواب شوکت الملک کے سنگین کردار سے ٹکرا کر ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔" دُنیا سے دکھ بلو کر پی جانے والا"

دوپہر کے کھانے کے بعد رات ٹیرس، پر کھیلے جانے والے ڈرامہ کے لئے سب اپنی اپنی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ طے یہ پایا تھا کہ حصہ لینے والے تمام افراد اپنے اپنے لئے کسی مشہور تاریخی کردار کا رول پسند کر لیں۔ صحیح ایکٹنگ اور کامیاب نقشہ پیش کرنے والے کو ایک سونے کا کپ

انعام میں دیا جائے گا۔ تابندہ، شائستہ اور ان کی سہیلیوں کے اصرار پر نواب شوکت الملک بھی ہنستے ہوئے اُس میں حصہ لینے پر رضامند ہو گئے اور مرزا علی نواز کو ان کی یہ بیٹک گنا کر بچھڑوں میں ملنے والی حرکات پر سخت حیرت ہوتی تھی اور اسی تجسس کے ماتحت وہ نواب شوکت الملک کی پُر سکون تنہا زندگی اور یورپ کے چکروں کا راز جاننے کے لیے خود کی خاطر ایک دو دفعہ ان کے ساتھ بھی گئے تھے مگر تمام یورپ گھومنے کے بعد اُن کو کوئی عورت ایسی نظر نہ آئی کہ جس کے متعلق وہ کہہ سکیں کہ نواب شوکت الملک کی زندگی میں اس کا کوئی دخل ہے پھر معلوم نہیں تمام عمر انہوں نے دوسری شادی کیوں نہیں کی۔ ابھی تک تو لڑکیاں اس پر مٹی پڑتی ہیں، مرزا علی نواز نے جل کر سوچا۔

زنبیں تیاں گُل ہوتے ہی پردے کھینچ دیئے گئے۔ ندیم شعرا کی محفل جمی تھی۔ خان عتیق الرحمٰن۔ دوپلی ٹوپی اور اچکن میں ملبوس کھڑے تھے۔

یہ کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو

ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

انہوں نے اس سوز و گداز سے پڑھی کہ مرزا علی نواز کی آنکھیں بھی پاکستان میں بیٹھے ہوئے عزیزوں کو یاد کر کے پُرآب ہو گئیں۔ چند لمحوں بعد۔ راجہ رام جی۔ چندر پت بنے ہرن کا شکار کھیل رہے تھے۔ کہیں بیگمات اودھ تھیں تو کہیں مسز کرن سنگھ۔ رانی جھانسی بنی بیٹھی تھیں۔ رائے بہادر سنگت رائے اشوک کے روپ میں کالنگا کی لڑائی کے بعد جنگ و جدل سے ہمیشہ کے لئے توبہ کر رہے تھے۔ پھر یکے بعد دیگرے۔ پرتھوی راج سنجوگتا۔ راجپند ریتا۔ نورجہاں جہانگیر۔ راجہ رنجیت سنگھ اور رانی جنداں ظاہر ہوئے۔ چند لمحوں بعد قیدی بادشاہ۔ بہادر شاہ ظفر۔ برما کی ایک جھونپڑی میں حسرت کی تصویر بنے بیٹھا تھا نادر شاہ۔ ملکہ وکٹوریہ اور لارڈ کلائیو کے بعد پردہ اُٹھا تو کرشن کنہیا بانسری تھامے کھڑے تھے۔ بازوؤں پر ریشم کے رنگین ڈورے۔ ہاتھوں میں پھولوں کے گجرے پہنے۔ کیلے سور نینوں میں پریت کا انتھاہ ساگر لیے مہیش کھڑا تھا۔ مرزا علی نواز نے شکر ادا کیا کہ تابندہ اور شائستہ گوپیوں میں شامل نہیں تھیں۔

ابھی مرلی کی دُھن لوگوں کے کانوں میں گونج ہی رہی تھی کہ کچھ دیر بعد دوبارہ پردہ اُٹھا۔ سٹیج نیم روشن تھی۔ خاموشی اور آدھی رات کے سناٹے میں ایک ہندی شہزادہ، چادر میں ملبوس کشکول تھامے پریشانی اور تذبذب کے عالم میں۔ مڑ مڑ کر خوابیدہ محل اور سوئے سوئے بیوی بچے پر الوداعی نظریں ڈالتا۔ چوروں کی طرح دبے پاؤں رخصت ہو رہا تھا۔ یہ تھا دنیا کا ایک عظیم مفکر اور راہبر۔ شہزادہ سدھارتھ گوتم بُدھ۔ حیرانی کے عالم میں مرزا علی نواز چند لمحوں کے لئے سکتے کے عالم میں آگئے انھیں ایک نظر میں ایسا محسوس ہوا۔ شہزادہ ہمایوں فرائی دلکش شخصیت لئے عدم کی وادی سے لوٹ آیا ہے۔ وہی بلند روشن پیشانی۔ غلافی آنکھیں۔ ستواں ناک۔ جمپئی رنگت۔ میک اپ کے زبردست جادو نے عمر کا تفاوت مٹا کر نواب شوکت الملک کو تئیس برس پیشتر کا شہزادہ عالی گہر بنا دیا تھا۔ لوگ مبہوت سوچ ہی رہے تھے کہ سین بدل گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد پردہ اُٹھنے پر چالیس سالہ ریاضت کے بعد کا مہاتما بدھ اُن کے سامنے تھا۔ برگد کے عظیم الشان درخت تلے آلتی پالتی مارے۔ معرفت کے استغراق میں۔ پسلیوں کی ہڈیاں باہر نکلی ہوئیں مگر تقدس۔ الوہیت۔ عظمت کے نور سے سرشار نیم باز آنکھوں اور تبسم لبوں پر ایک عجیب دلنریب سکون و خوشی کی چمک۔۔ جو زندگی کا بھید پا لینے کے بعد میں آتی ہے۔ بدھ گوئیان حاصل ہو چکا تھا اور نواب شوکت الملک فرسٹ پرائز جیت چکے تھے

رات کا ہنگامہ دیر تک جاری رہا اور علی الصبح مہیش سب لوگوں سے ملے بغیر فوری طور پر روانہ ہو گیا تھا۔ مرزا علی نواز کو تو اس کی کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہ آئی مگر اُس نے اپنی نئی جلسے تقرری پر پہنچ کر تابندہ کو لکھا تھا۔

"میری روانگی اتنی عجلت میں ہوئی کہ میں تم سے مل بھی نہ سکا امید ہے مجھے مجبور سمجھ کر تم معاف کر دو گی۔ میں اس خاموش، پرسکون اور تنہا جگہ میں واپس آ گیا ہوں تاکہ تمہاری آرزو کا دیپ جلائے رکھوں۔ نواب شوکت الملک کا پُر شفقت رویہ۔ ناقابلِ یقین بھروسہ اور بے کراں اعتماد ایک دھڑکتے ہوئے امنگوں بھرے دل کو ختم کر دینے کے لئے کافی ہیں۔ قصرِ زریں کے باسیوں کی بے پناہ بلندی کے سامنے اپنی پستی کا شدید احساس مجھے یہاں لے آیا ہے تاکہ میرے جذبات کے کومل دھارے خشک نہ ہو جائیں۔ تم سے دور رہ کر جو تمنا شعلہ جوالہ بن جاتی ہے۔ قریب پہنچ کر اور اپنی بے بسی دیکھ کر اس کا گلا گھٹ کے رہ جاتا ہے۔ وہاں رہتے ہوئے اگر میں مر نہ جاتا تو کم از کم تمام انسانی خواہشات سے بالاتر ایک دیوتا بن کے رہ جاتا۔ مگر میں ایک عام انسان ہوں۔ ان گنت خواہشات کا مجموعہ اور ان حقیر انسانی جذبات و احساسات دلفریب تمناؤں اور رنگین آرزوؤں سے چمٹے رہنا چاہتا ہوں۔ میں بندر کی طرح اپنی شدید محبت اور طوفان خیز جذبات کو ہمیشہ کے لئے نہیں تیاگ سکتا۔ اس لئے ڈر کے بھاگ آیا ہوں کہ یہاں تمہاری دل کش یاد کو ہمیشہ دل سے لپٹائے رکھوں۔ جب تک تم ہمت سے کام لے کر ان قیود کو توڑ نہ دو جنہیں مذہب کا نام دیا جاتا ہے۔ سب احباب کا خیال ہے کہ تمہارا یہ مثالی اقدام بہت سے لوگوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہو گا۔

اس چھوٹی سی امریکن کالونی کے باہر دور دور تک گھیرے درختوں میں پوشیدہ سرسبز دیہات اور کالی کے مندر ہیں جب البیلی کنواریاں پائل اور آشاؤں کے دیپ جلائے۔ کیلے کے پتوں پر مہکتے ہوئے پھول رکھے ان ڈھکی چھپی راہوں پر لہراتی ہوئی مندروں کو جاتی ہیں تو میرے من مندر کی گھنٹیاں بھی خود بخود بج اٹھتی ہیں اور میں لاتعداد خواہشوں کے پھول اپنی دیوی کے قدموں پر ڈھیر کر دیتا ہوں مگر میرے دل کے مندر پر کبھی کالی نہیں سجے گی۔ تمہاری آرزو کا چراغ کبھی نہیں بجھے گا میری پرستش میں کوئی فرق نہیں آئے گا اور تم جب بھی مجھے پکارو گی اپنا منتظر پاؤ گی۔"

سب مہمانوں کے چلے جانے کے بعد قصرِ زریں کی خاموشی و تنہائی تو قدرتی بات تھی مگر یہ غیر معمولی اداسی طویل سے طویل تر ہوتی چلی گئی۔ جسے تابندہ کی پر رونق موجودگی بھی دور نہ کر سکی۔ نہ جانے کیا بات تھی۔ نواب شوکت الملک گھبرا کر سوچتے۔ تابندہ کی بلا وجہ خاموشی و افسردگی انہیں پریشان سا کر دیتی اور پھر یہ پریشانی و افسردگی چھینٹے سا... سے میں پھیل سی جاتی اور ہر فرد غیر معمولی طور پر محتاط اور چپ چاپ سا نظر آتا۔ دوسروں سے کچھ چھپانے کی فکر میں مصروف مگر سب کی پریشانیوں افسردگیوں کا باعث علیحدہ علیحدہ تھا۔ نواب شوکت الملک کی سگار نوشی اِن دنوں بڑھ گئی تھی اور وہ طویل برآمدوں میں ٹہلتے رہتے۔ اور مرزا علی نواز اب غصہ اور کابیاں بھول کر ایک شکست خوردہ مضمحل انسان کی طرح خالی دل سے پہروں سوچا کرتے کہ کیا ہوا۔ اگر عامر ساجد علی خان نے جذبات کی فراوانی اور خود غرضی سے کام لے کر زندگی کا ساتھی چنتے وقت تابندہ کے مقابلہ میں ایک معمولی لڑکی کو ترجیح دی جو سرجری کی ٹریننگ کے لئے وہاں آئی ہوئی تھی اور اب وہ پاکستان میں ہی سیٹل ہونا چاہتا ہے۔ احمق انسان ضمیر کی آواز سے مجبور ہو کر لکھتا ہے کہ "میں زندگی بھر آپ کے احسانات فراموش نہیں کر سکتا۔ کاش خدا مجھے اتنی توفیق دے کہ میں ان کا بدلہ چکا سکوں۔ بدنہ تو تم نے خوب پکایا ہے بھلے آدمی۔ یا شاید تم اتنے سادہ لوح تھے کہ تم اس عظیم نعمت کا تصور ہی نہ کر سکے جو شوکت الملک تمہیں بخشنا چاہتے تھے تمہارا قصور نہیں یہ ستاروں کے کھیل ہیں۔ قسمت کا قصور ہے یا پھر شوکت الملک کا اس کے اندھے اعتماد کا جس نے ایک خوبصورت زندگی کا نقشہ تو تیار کر دیا مگر جس سے اسے لاعلم رکھا۔ تابندہ کے لیے رشتوں کی کمی نہیں۔ امیر کبیر گھرانوں کے لڑکے اسے سر آنکھوں پر بٹھانے کو تیار ہیں مگر وہ مکمل انسان وہ آسمان کا تارہ جو نواب شوکت الملک اپنی اکلوتی لاڈلی بیٹی۔ اپنی زندگی کے آخری سہارے کے لئے ڈھونڈنا چاہتے ہیں۔ وہ مشکل سے ملے گا۔

تم نے اپنے محسن کو کتنا دکھ دیا ہے عامر ساجد علی خان۔"

اور شائستہ اپنی پینٹنگز بھول کر اُن ڈھیروں رازوں کے درمیان گھبرائی گھبرائی گھومتی رہتی جن کا سب کو علم ہونے پر بھی اُسے انجان بننا پڑا تھا دوسرے اُسے یقین تھا کہ یہ عارضی اثرات جلد زائل ہو جائیں گے اور تابندہ سے کسی غلط اقدام کی اُسے ہرگز توقع نہ تھی۔

چند دنوں کی تشنجی سی حالت کے بعد واقعی حالات بدستور نارمل ہوتے جا رہے تھے۔ مرزا علی نواز اب اکثر تیلوں نامیوں کے متعلق بھاگ دوڑ میں مصروف رہتے۔ تابندہ و شائستہ کی دلچسپیاں اب پھر سے شروع ہو گئیں تھیں اور نواب شوکت الملک نت نئے مہمانوں کے ساتھ شکار کا پروگرام بناتے ہی رہتے۔ عامر ساجد علی خاں اب ایک بھولا بسرا افسانہ بن کر ماضی کے اوراق میں دفن ہو چکے تھے۔ قصر زرّیں میں اب کسی کو ان کا انتظار نہ تھا۔

وہ بہار کا ایک خوشگوار دن تھا۔ نواب شوکت الملک صبح سے شکار کے لئے گئے ہوئے تھے۔ خلیق الرحمٰن صاحب کا پیغام پاکر کہ چند اہم امور پر فوری طور پر گفتگو کرنی چاہتا ہوں مرزا علی نواز بھٹ سے روانہ ہو گئے۔ جاتے جاتے کہہ گئے کہ رات دیر سے لوٹوں گا۔ تابندہ اور شائستہ اگر مناسب سمجھیں تو ایک دن کے لئے نیلم کو لینے چلی جائیں۔ اس کا کالج ایسٹر کی چھٹیوں کے لئے بند ہو رہا تھا۔

شائستہ تو چلی گئی مگر باوجود اس کے شدید اصرار کے نہ جانے کیوں تابندہ نے جانے سے انکار کر دیا۔ معلوم نہیں آج اس میں اتنی بیقراری کہاں سے بھر گئی تھی کہ قصر زرّیں کے مرمریں برآمدوں، دُور افتادہ گوشوں اور سرسبز روشوں پر گھوم گھوم کے تھکتی ہی نہ تھی۔ اس نے ایک ایک کمرہ جا کر دیکھا۔ ہمایوں فرکی چیزوں کی جھاڑ پونچھ اپنے سامنے کروائی۔ نواب شوکت الملک کے آراستہ پیراستہ بیڈ روم میں کتنی ہی دیر رنگین تتلی کی طرح بیقراری سے گھومتی رہی اور پھر آنسو پونچھ کر چپ چاپ آتشدانکے دیپ جلائے، کیلے کے پتوں پر آدھ کھلے پھول رکھے۔ ڈھکی چھپی پگڈنڈیوں پر سے لہراتی ہوئی کائی لگے مندروں کی طرف نکل گئی ———

نواب شوکت الملک رات کو جب واپس لوٹے تو اُن کے قدیم ذاتی نوکر حاجی محمد نے ان کو ایک بند خط دیا۔ وہ تابندہ کا تھا۔ نواب شوکت الملک چونک پڑے۔ اُس نے لکھا تھا۔

"سب ملازم یہ سمجھ رہے ہیں کہ میں بعد میں شائستہ اور نیلم کو لینے جا رہی ہوں۔ مگر میں آپ کو ایک لمحہ کے لیے بھی دھوکے میں رکھنا گناہ کے مترادف سمجھتی ہوں۔ آپ جو ہمیشہ صرف ایک شفیق باپ ہی نہیں۔ ایک بے تکلف قریبی دوست اور ایک ہمدم و دمساز کی طرح پیش آتے رہے ہیں۔ میں مہیش کے ساتھ جا رہی ہوں اور جب یہ خط آپ تک پہنچے گا ہم شادی کے بندھن میں جکڑے جا چکے ہوں گے۔ میں نے یہ قدم انتہائی مجبوری کی حالت میں اُٹھایا ہے۔ کیونکہ میں بخوبی جانتی ہوں کہ محترم چچا علی نواز اور آپ۔ کوئی قدرت اللہ بیگ نہیں ہیں جو شادیانے بجا کر مجھے ایک ہندو گھرانے میں بیاہ دیں گے۔ مجھے معلوم ہے کہ مذہب کی خاطر آپ دونوں تنا ہو جائیں گے اور کوئی ایسا فیصلہ طلب مرحلہ آنے پر آپ لوگوں کے اندر سویا ہوا محمود غزنوی فوراً گرز تھام کر اُٹھ بیٹھے گا اور سب کو نیست و نابود کر دے گا۔ اس ہنگامہ کے پیش نظر میں خاموشی سے خود ہی چلی جا رہی ہوں کیوں کہ میں اُس وقت کے تصور سے ہی کانپ جاتی ہوں۔ میں نہیں کہہ سکتی میرا یہ فعل صحیح ہے یا غلط مگر کم از کم اس میں ایک ایڈونچر ایک جدت ضرور ہے شائد اس کے اور مہیش کے سہارے یہ زندگی کامیاب طریقے پر گزر جائے۔

آپ کو چھوڑ کر جاتے ہوئے ایک لا انتہا غم ساتھ لئے جا رہی ہوں جس سے زندگی بھر مفر نہیں۔ میں اب آپ کی شفقت و محبت کی حقدار نہیں لیکن اگر کبھی آپنے اپنی فطری بلندی کے ماتحت میری اِس خطا سے چشم پوشی کر کے مجھے معاف کر دیا تو میری گمشدہ خوشیاں مجھے واپس مل جائیں گی اور

سب کو یقین ہے کہ وہ دن جلد ہی آئے گا۔"

گو بظاہر کسی کو کچھ نظر نہ آیا اور نواب شوکت الملک خط ٹیبل پہ رکھ کر آرام سے کرسی پر بیٹھ گئے مگر یکلخت تمام کمرہ ان کی نظروں سے اوجھل ہو گیا پھر ایک ٹھنڈی سفید دھند اردگرد پھیل گئی جس میں چیزیں معلق سی نظر آئیں۔ حاجی محمد کا کبھی سر غائب ہو جاتا کبھی پاؤں۔ پھر بتدریج دھند چھٹ گئی اور انہوں نے ایک پُرسکون انداز میں کہا "کہ رات زیادہ ہوگئی ہے تم لوگ آرام کرو" انجان حاجی محمد اس حقیقت سے بے خبر کہ اُس کا مہربان آقا کن زلزلوں کی زد میں ہے خوشی خوشی سونے کے لئے چلا گیا۔

رات سرد اور خاموش تھی چودھویں کے چاند کی شبتی کرنیں ایک خاموش جادو جگا رہی تھیں۔ قصرِ زریں ایک پرفسوں خواب میں مدغم تھا نواب شوکت الملک ٹہلتے ہوئے باغ میں نکل آئے۔ سب فوارے بند تھے۔ صرف ایک کا پانی آہستہ آہستہ اُبل کر ایک ہلکی سی آواز پیدا کر رہا تھا۔ مرمری حوض کے کنارے ودھم سبز روشنیاں جل رہی تھیں۔ ایک تنہا گلاب کا پھول ٹوٹ کر دھیرے دھیرے پانی کی لہروں پر لرز رہا تھا۔ دو راج ہنس گردن میں گردن ڈالے سوئے پڑے تھے۔

نواب شوکت الملک چپ چاپ ایک پتھر کے بنچ پر بیٹھ گئے۔ "انسان کی زندگی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر کیوں گزرتی ہے" وہ آہستہ سے بڑبڑائے۔ پیدائش اور موت کے درمیان یہ بحرِ زخار کیوں حائل ہے جس کی بلاخیز تاریک ہولناک موجوں سے لڑتے لڑتے ہر انسان دم توڑ دیتا ہے۔ نہ جانے کن انجانے گناہوں کی پاداش میں جن کا اُسے علم بھی نہیں ہوتا۔ اگر اس عارضی زندگی کی کشتی یونہی پھولوں سے لدی پھندی۔ پُرسکون موجوں کے دوش پر تیرتی ہوئی موت کے ساحل سے جا لگے تو کیا بگڑ جاتا ہے۔ یہ دنیا آلام کا گھر کیوں ہے۔ وجود سے عدم کی طرف سے بھلا یہ راستہ ہی کتنا ہے۔ اس حقیر زندگی کی حقیقت ہی کیا ہے۔

جیسے کوئی سفر میں سستانے کے لئے چند لمحے ٹھہر کر آگے بڑھ جائے مگر یہ چند لمحے بھی اتنے جاں گسل کیوں ہیں کہ روحیں درد سے چلا اُٹھتی ہیں۔ میں نے سو روپ بھرے۔ میں نے سو رنگ سے جینا چاہا تلخیٔ زیست مگر کم نہ ہوئی۔"

انہوں نے پیچھے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں اور قصرِ زریں جگمگا اُٹھا۔ کونا کونا آباد تھا۔ ہز ہائی نس عظمت الملک جہاں زیب ہیروں کے ہار پہنے ایک والئی ریاست کے کرّوفر کے ساتھ گزر رہے تھے اور دو رویہ لوگ تعظیم کے لئے کھڑے تھے۔ نواب مظفر الملک قصرِ زریں کی تکمیل میں مشغول تھے۔ کام کرنے والے اَن گنت لوگوں کا کس قدر ہجوم تھا۔ ابّا میاں اور چچا میاں کے دوستوں کے قہقہے سارے میں گونج رہے تھے۔ امّاں حضرت ستنے زرتار کے ساتھ فرشی غرارہ ڈھلمے دعوت کے انتظاموں میں مصروف تھی اور شہزادہ عالی گہر اُن کی انگلی پکڑے ساتھ ساتھ گھوم رہے تھے۔ یونیورسٹی کے طالب علم اِدھر اُدھر کھڑے ہنس بول رہے تھے۔ بحث۔ مباحثے۔ مقابلے کرشینیا اُن کی طرف دیکھ کر اُس سادگی سے مسکرائی اور رومال ہلانے لگی۔ سامنے ٹیرس پر ہمایوں فر اور تابندہ۔ گورنس کے ساتھ دو چھوٹے چھوٹے فرشتوں کی طرح آگے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ ہمایوں فر۔ دیکھتے دیکھتے کتنا جوان ہو گیا تھا۔ انگلش چینل میں کس قدر پانی تھا۔ کون اسے تیر کر عبور کر سکتا ہے۔ ہمایوں فر تو بے تکی باتیں کرتا ہے۔ انہوں نے گھبرا کر دوسری طرف دیکھا۔ مہر بیہ ور کھڑی تھیں۔ اپنی بے مثال خوبصورتی اور وقار کے ساتھ۔ ذرّہ برابر بھی تو فرق نہیں آیا تھا۔ موت نے اُن کی جوانی کو ہمیشگی بخش دی تھی۔ خوابیدہ آنکھیں اور بکھرے بکھرے بال۔ نواب شوکت الملک انہیں دیکھ کر ٹُٹ سے گئے۔ بڑے غم بھول کر اُن کو زندگی بھر کے نداز راستے کہ

یاد آنے لگے جو ہر انسان صرف بیوی سے ہی کہہ سکتا ہے۔ اُن کا دل چاہا مہر پرور کی گود میں سر رکھ کے رو دیں۔ مگر صبح کاذب کے ساتھ ساتھ تمام سین درہم برہم ہوتے جا رہے تھے۔ صرف سیکڑوں میل دور۔ ذہن کے کسی گوشے میں مرزا علی نواز غصّے سے ہاتھ ہلاتے ہوئے۔ قدرت اللہ بیگ کی لڑکی زہیف کو کوس رہے تھے۔ کافر۔ ملحد۔ بے حیا۔ چھنال کہیں کی۔

نواب شوکت الملک نے آنکھیں کھولیں تو چاند بعید قریب آ گیا ہوا تھا۔ چاروں طرف ایک بھیانک سنّاٹا تھا۔ جس میں غیر مرئی شیطانی سائے چلتے پھرتے محسوس ہوتے تھے۔

انھیں جرمنی میں دیکھی ہوئی ہینز بالڈنگ کی مشہور پینٹنگ "THE THWEE WITCHES." یاد آ گئی۔ جس میں تین چڑیلیں غیض و غضب کے عالم میں آپس میں گتھم گتھا لڑ رہی تھیں۔ وہ اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور بولے "تم صحیح کہتے تھے مرزا علی نواز زاہد، ہم کچھ بھی نہیں۔ ہم نہ مرزا ہیں۔ نہ افغان۔ نہ سیّد نہ مسلمان —— ہم صرف کھوئے ہوئے وقت کے سائے ہیں۔ ہم سب۔ ہز ہائی نس جہاں زیب سے لے کر ہمایوں فر یک اور بیگم جہاں آرا سے لے کر تابندہ تک۔ اور ان مردہ یادوں کے اوپر بھیانک بد قسمتیاں اپنے سیاہ پر پھیلائے بیٹھی ہیں۔ اب تمھیں کس کا انتظار ہے قصرِ زریں کی جادوگرنیو؟ کس کا تم ان تمھیں شاد کام کر سکتا ہے۔ تم جو چپ چاپ ٹکٹکی باندھے "تاک لگائے بیٹھی ہو۔

علی الصبح ہراساں نوکروں کے شور سے مرزا علی نواز گھبرا کر اُٹھ بیٹھے اور جب بدحواسی میں ننگے سر ننگے پاؤں بھاگتے ہوئے ہال میں پہنچے تو ہز ہائی نس کی آخری عبرتناک تصویر ٹوٹ چکی تھی۔ نواب شوکت الملک مردہ پڑے تھے۔ گولی کنپٹی کے قریب لگ کر دماغ میں سے نکل گئی تھی۔ سُرخ کشن جمے ہوئے خون سے گہرے سرخ ہو گئے تھے پستول نیچے گرا پڑا تھا۔ کمرہ خاموش و پُرسکون تھا۔ کونوں میں مرمریں مجسمے مجرموں کی طرح گم سم کھڑے تھے۔ بہار کی ہلکی خنک ہوائیں ریشمی پردے سرسرا رہی تھیں۔ سرہانے کی ٹیبل پر تابندہ کا کھلا خط پڑا تھا اور نواب شوکت الملک سب سے بے نیاز ایک زرکار دوشالہ اوڑھے، پُرسکون انداز میں صوفے پر لیٹے۔ ابدیت کے گہرے خواب دیکھ رہے تھے۔ ع

"منزلِ عشق پہ تنہا پہنچے کوئی تمنّا ساتھ نہ تھی

تھک تھک کر اس راہ میں آخر ایک ایک ساتھی چھوٹ گیا"

مرزا علی نواز نے غم و اذیّت کی شدید تشنجی حالت میں آگے بڑھ کر تابندہ کا خط اُٹھا لیا۔ دو سطریں پڑھنے کے بعد وہ ایک بوجھل پتھر کی طرح ان کے ہاتھ سے پھسل کر نیچے گر پڑا —— وہ خود فراموشی کی حالت میں جھومتے ہوئے آگے بڑھے اور پاگلوں کی طرح سُرخ سُرخ آنکھوں سے اُس بے جان جسم کو تکتے ہوئے آہستہ سے بڑبڑائے۔

"تو تم ایسے تھے نواب شوکت الملک۔ باہر سے پتھر کی سنگین مورت اور اندر سے کانچ کے دیوتا۔ تم تو دنیا کے دُکھ پی جانے والے تھے مگر اس ایک پتھر کی چوٹ برداشت نہ کر سکے اور چور چور ہو کر رہ گئے۔ میں سدا کا نیچ تنگ مزاج ہمیشہ تمھیں شبہوں کی نظر سے دیکھتا رہا۔ زندگی بھر تمھارے ساتھ رہنے کے باوجود تمھیں پہچان نہ سکا میں کم حوصلہ۔ پست انسان کبھی تمھاری بلندی کو نہ پا سکا۔ میری سوچنے کی سطح کتنی نیچی تھی۔ مجھے بخش دینا مجھے معاف کر دینا شہزادہ عالی گہر —— وہ تڑپ کر گرے اور اُن کے یخ بستہ پاؤں سینے سے لگا کر چیخ چیخ کر رونے لگے۔ یکایک وہ کانپ گئے نواب شوکت الملک کا خوابیدہ چہرہ بکھرے اطمینان کے گہرے جذبات میں سرشار تھا نیم وا ہونٹوں اور ادھ کھلی آنکھوں کے گوشوں میں ایک پُراسرار مسکراہٹ رقصاں تھی۔ بدھ کی لازوال پُرسکون مسکراہٹ کی طرح۔ وہ بدھ نہیں جو تذبذب و دُکھ کے عالم میں۔ مڑ مڑ کے سب کو تکتا۔ ننگے پاؤں شاہی محلات سے رخصت ہو رہا تھا۔ بلکہ وہ بدھ جس پر چالیس سالہ ریاضت کے بعد ہستی کے راز منکشف ہو گئے تھے۔ جس نے گیان حاصل کر لیا تھا۔"

مرزا علی نواز چپ چاپ آنسوؤں کی جھالروں میں سے انھیں تکتے رہے اور پھر بچوں کی طرح بلک کر بولے "کیا سچ مچ تم نے خوشی و انبساط کی سرحدوں کو چھو لیا ہے۔ کیا تمھارے غموں کا خاتمہ ہو گیا ہے نواب شوکت الملک؟"

تنکے کا سہارا

عفرا بخاری

وہ دونوں بڑی سیدھی سادی زندگی بسر کر رہے تھے۔

خیر دین پنڈت منڈی میں ایک دکان کا معمولی منشی تھا۔ دن بھر گھٹنے جوڑے کام کرتا۔ رات کو گھر آتا، کھانا کھا کر باہر نکل جاتا۔ تکیہ شاہ غوث کے ملنگوں سے واقفیت ہو گئی تھی۔ وہاں بیٹھ کر دو پیالے بھنگ کے پیتا۔ کچھ دیر گپ شپ لڑاتا۔ پھر گھر لوٹتا تو بیوی کی قربت کے سوا اسے اور کسی چیز کی چاہت نہ ہوتی۔ روکھا اور کم گو آدمی تھا۔ ہر کام خاموشی سے کرنا جانتا تھا۔ بعض اوقات تو بیوی سے بھی ہمکلام ہوئے کئی کئی دن گزر جاتے۔ اس کے باوجود ہر کام انجام پاتا۔ کبھی کبھار ترنگ میں ہوتا تو بیوی سے منڈی کی باتیں کرنے لگتا۔ ان باتوں سے ہلدی نمک مرچ سونٹھ کھل بنولوں کی ایسی بو چھوٹتی کہ زینب کو چھینکیں آنے لگتیں مگر وہ پنڈت کے مخصوص اور انوکھے اظہارِ محبت کو پچھلے کئی سالوں سے اچھی طرح جان گئی تھی اس لیے خاموش رہتی اور بڑے غور سے ہر بات سن لیتی۔

پنڈت کی رشتے داری کم تھی۔ اس نے اپنی بیوی کو کبھی ایک رات کے لیے بھی کہیں جانے نہیں دیا تھا۔ حتیٰ کہ وہ بیٹیوں کے گھر بھی کبھی نہ گئی تھی۔ پنڈت کو بیوی کے بغیر نیند نہیں آتی تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے اپنی بیوی سے محبت تھی۔ محبت کے سے لطیف جذبے سے تو وہ آشنا ہی نہ تھا۔ البتہ وہ بیوی کا عادی ضرور ہو چکا تھا۔ اس وقت اس کی عمر پچاس کے اور بیوی کی عمر چوالیس پینتالیس کے لگ بھگ ہو چکی تھی۔ لیکن اپنی بڑھتی ہوئی عمر کا اسے کوئی احساس نہ تھا۔ اس کے جسم میں طاقت تھی۔ اعصاب میں تناؤ تھا اور جذبات بھی نہ ٹھنڈے تھے پھر وہ محض برسوں کے شمار سے اپنے آپ کو بوڑھا کیوں سمجھ لیتا۔ زینب بھی ہٹی کٹی تھی اسے بھی اپنی صحیح عمر معلوم نہ تھی۔ ویسے وہ اپنی عمر سے کافی چھوٹی نظر آتی تھی۔

ہر روز صبح اذانوں کے وقت جب وہ اٹھ کر نہاتی تو کئی کنسوئیاں لینے والی پڑوسنیں اس پر ہنستیں مگر اسے کسی کی پروا نہ تھی۔ نہا دھو کر وہ آدھ سیر دودھ کو جسے وہ رات کو ہلکی آنچ پر ابال کر رکھ چھوڑتی تھی کڑھی میں ڈال کر چھوٹی سی بلونی کے ساتھ خوب بلوتی۔ پھر ہاتھ ڈال کر اوپر سے مکھن اتار لیتی۔ اور یہ ذرا سا مکھن وہ پنڈت کی روٹی پر رکھ دیتی۔ باقی دودھ میں پانی ملا کر لسی بنا لیتی۔ ایک چھوٹے سے ڈبے میں خالص گھی بھی سوغات کے طور پر اس نے رکھا ہوا تھا۔ کبھی کبھی وہ اس گھی سے بھی دو پراٹھے پکا لیتی۔ دوپہر کا کھانا پنڈت رومال میں باندھ کر ساتھ لے جاتا تھا یہ کھانا دو تین سوکھی روٹیوں اور اچار کی ایک پھانک پر مشتمل ہوتا۔ دکان سے ایک ڈلی گڑ کی لے کر وہ ان روٹیوں کو شکر اور اطمینان کے ساتھ کھا لیتا۔ رات کو وہ ضرور سالن پکا لیتی۔ صبح کو خیر دین پنڈت چلا جاتا تو وہ صحن میں ٹاٹ کے پردے کے پیچھے کھاٹ ڈالے پڑی رہتی۔ کبھی کوئی ہمسائی آ جاتی تو اس سے دو باتیں کر لیتی۔ کبھی خود بھی اکتا کر پڑوس میں چلی جاتی۔ اس کی عمر کی دو چار بیاہی عورتیں اکٹھی ہو جاتیں تو کچھ اس قسم کا مذاق چل نکلتا جس میں گھٹے گھٹے ناآسودہ جذبات کی تسکین کا وافر سامان موجود ہوتا۔ پڑوس سے پلٹتی تو گلی کی آوازوں پہ کان لگائے بیٹھی رہتی۔ کوئی تانگہ چھم چھم کرتا گزر جاتا، کوئی موٹر رکشا پیں پیں کرتی آ جاتی۔ کھیلتے لڑکوں میں سر پھٹول ہو جاتی۔ یا دو پڑوسنیں اونچی آواز میں جھگڑ پڑتیں، وہ جھٹ ٹاٹ کا پردہ سرکا کر باہر دیکھنے

لگتی اور جب تک معاملہ رفع دفع نہ ہو جاتا وہاں سے نہ ٹلتی۔ محلے میں ہونے والی ہر چھوٹی بڑی بات اس کے علم میں رہتی۔

ان کے دو بیٹے تھے۔ جنہیں بہت جلد بیاہ کر انہوں نے الگ کر دیا تھا۔ دونوں کسی دوسرے شہر میں رہتے تھے۔ کبھی کبھار دس پندرہ دن کے لیے آجاتے تو پنڈت کو ان کی موجودگی بری طرح کھٹکتی۔ اس کے دونوں بیٹے دونوں کمروں پر قبضہ جما لیتے۔ اور وہ گھر کے ہوتے ہوئے خود کو بے گھر سا محسوس کرنے لگتا۔ گرمیوں کے دن ہوتے تو اس کا ٹھکانہ گلی میں بنتا۔ اور سردیاں ہوتیں تو وہ اپنی کھاٹ بھوٹ مانگنے والے کے چھپر تلے لے جاتا۔ جہاں پھر رات بھر الاؤ جلائے اپنے تانگے گھوڑے کے درمیان کھاٹ بچھا کر سوتا۔

اسے اپنے پوتے پوتیوں اور بہوؤں سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ جب کوئی بہو پلو کو منہ پر جھکائے اس کے سامنے آتی تو اسے بڑی کوفت ہوتی اور اس کی نظریں خواہ مخواہ بیوی کی طرف اٹھ جاتیں۔ جسے ان دنوں پیڑھی پر بیٹھے بیٹھے حکم چلانے کے سوا اور کوئی کام نہ ہوتا تھا۔ وہ جھنجھلا جاتا۔ اسے یوں لگتا جیسے اس کی بیوی مفت میں روٹیاں توڑتی ہے۔ ایسی غیر مصرف بیوی کو کھانا پلانا جھنڈ رگائے کو گھاس ڈالنا تھا لیکن جونہی بیٹے رخصت ہو جاتے۔ بیوی کے متعلق اس کی رائے تبدیل ہو جاتی اور وہ اس رات منڈی کی ڈھیروں باتیں کرنے کے بعد بیوی کو پالتو گھوڑی کی طرح تھپکتا۔

سردیوں کی آمد تھی۔ لوگوں نے ہلکے کپڑے اوڑھ کر کمروں میں سونا شروع کر دیا تھا۔ جب ایک رات اچانک رحیم آدھمکا۔ اس کے ایک ہاتھ میں لوہے کا ٹرنک اور دوسرے ہاتھ میں چادر لپٹا ہوا بستر تھا۔ اسے دیکھ کر دونوں کو بڑا تعجب ہوا۔ بیس برس پہلے وہ ایک رات اچانک گھر سے غائب ہو گیا تھا۔ اب وہ اچانک آگیا تھا۔ مگر انہیں تو یوں لگا جیسے وہ سچ مچ کل ہی گیا تھا اور آج آگیا۔ اس کی صورت بھی تو نہ بدلی تھی۔ وہی چار فٹ سے ذرا نکلتا چھوٹا قد۔ نحیف و نزار جسم اندر کو دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھیں۔ زرد چہرہ البتہ خشخشی داڑھی اور سر کے چھوٹے چھوٹے پٹوں میں ضرور سفیدی جھلکنے لگی تھی۔

زینب نے جھٹ پٹ ایک کھاٹ بچھا دی بولی ——— "بیٹھو جیو آئے کو آج ہم اتنے برسوں بعد کیسے یاد آگئے" ——— رحیم نے ٹرنک دیوار کے پاس رکھا اور بستر ٹکایا۔ پھر کھاٹ پر بیٹھتے ہوئے نیچی نظروں سے مسکرا کر بولا ——— "اپنے شہر میں رہا ہی نہیں، دور دور گھوما ہوں۔ دیس سے باہر بھی ہو آیا ہوں" ——— "اچھا" ——— زینب نے دلچسپی اور حیرت سے کہا ——— پنڈت کو رحیم کا آنا اور زینب کا یوں باتوں میں دلچسپی لینا بالکل پسند نہ آیا چند رسمی باتوں کے بعد وہ اٹھ کھڑا ہوا اور زینب کو حقہ بھرنے کو کہہ کر دوسرے کمرے میں چلا گیا ——— زینب نے اُپلا توڑ کر انگیٹھی میں ڈالا اور بات کو جاری رکھتے ہوئے بولی ——— "بیوی بچوں کا کیا حال ہے۔ کتنے بیٹے بیٹیاں ہو گئے ہیں" ——— ؟ رحیم نیچی نظروں سے کمرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ کمرے کا ایک حصہ باورچی خانے کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا زینب کی بات سن کر بولا ——— "بیاہ نہیں کیا ———"

"ہائے رے کیوں نہ کیا"؟ زینب کو بڑا اچنبھا ہوا اور اس کے ساتھ اسے رحیم پر ترس بھی آنے لگا۔ اتنے سال بیچارے نے کیسے اکیلے میں گزارے ہوں گے ——— اکیلا مرد بھی معصوم بچے کی طرح کیسا بے یار و مددگار اور لٹا پٹا سا نظر آتا ہے۔ زینب کے دل میں خواہ مخواہ ممتا پیدا ہونے لگی تھی۔

رحیم کچھ کھسیانا سا ہو گیا تھا بولا ——— "بس بھابی حالات ہی کچھ ایسے رہے" ———

زینب کی ممتا اچھل پڑی ٹھنڈا سانس لے کر بولی ——— "ہاں سچ کہتے ہو۔ ماں بہنیں ہوتیں تو فکر کرتیں۔ تم نگوڑے تو میرے یہاں بھی نہ ٹکے

ورنہ گھر بس جاتا۔ آج یوں دردر تو نہ پھرتے۔ جانے تمہیں کیا ہوا تھا کہ ایکا ایکی غائب ہو گئے —— " زینب نے چلم میں جلتے ہوئے اُپلے ڈالے اور دوسرے کمرے کی طرف چلی گئی —— رحیم نے کندھے سے چارخانہ رومال اتارا اور داڑھی اور پٹوں پر سے گویا سفر کی گرد اڑانے لگا۔ اس وقت اسے برسوں پہلے کی دبلی پتلی مگر کڑوے مزاج کی زینب یاد آ رہی تھی۔ جسے اُس نے پہلے پہل اس گھر میں دیکھا تھا۔ وہ خوبصورت نہ تھی مگر اسے تو دیکھنے میں بہت اچھی لگتی تھی۔ ان دنوں وہ چچا سے لڑ جھگڑ کر اپنے رشتے کے بھائی خیر دین پنڈت کے پاس آ کر رہا تھا۔ پہلے وہ اپنے باپ کے پاس رہتا تھا۔ اس کی ماں ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی مر گئی تھی۔ باپ کے بعد وہ اپنے ایک رنڈوے چچا کے پاس آ گیا۔ اس چچا نے اسے ایک چائے خانے میں ملازم کروا دیا تھا۔ مگر کچھ عرصہ بعد چچا سے اُس کا جھگڑا ہو گیا اور وہ پنڈت کے پاس چلا آیا۔ اب تک وہ مردوں کے ساتھ رہا تھا۔ انہیں میں پلا بڑھا تھا، انہی کی خو بو اور طور طریقوں سے آگاہ تھا۔ اب ایک ایسے گھر میں جہاں اس پر بلاوجہ جھلانے والی ایک عورت بھی موجود تھی اسے رہنا بڑا عجیب لگا —— زینب کے قریب رہنا اسے اچھا لگتا تھا۔ مگر زینب خواہ مخواہ ہی اُس کی دشمن ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس غیر ہمدردانہ ماحول میں وہ زیادہ دیر خود کو نہ کھپا سکا، اور ایک رات مایوس و دل شکستہ اس گھر سے اچانک غائب ہو گیا —— وہ چاروں کھونٹ گھوما تھا۔ سو قسم کے پیشے اختیار کیے تھے۔ کئی کاموں کا ماہر تھا۔ ملک سے باہر بھی ہو آیا تھا۔ مگر اس کا بیاہ نہ ہو سکا۔ کسی عورت نے اسے درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ خود قدم بڑھا کر کسی عورت تک پہنچنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ عورت اس کے لیے اب تک ایک عجوبہ بنی ہوئی تھی —— عورت کی قربت اس پر بدحواسی طاری کر دیتی —— برسوں کا تجربہ اعتماد اور اپنی ذات پر بھروسہ کسی بارودی شے کی مانند بھک سے اڑ جاتا۔ اُس کے پاؤں اکھڑ جاتے اور وہ کسی نوعمر لڑکے کی مانند جھینپنے لگتا۔ اُس کی رگوں میں بجلیاں سی دوڑ جاتیں۔ دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی اور اپنی نیت کے بارے میں وہ ایک شک و شبہ میں مبتلا ہو جاتا۔ عورت کا محض تصور ہی اسے پست و نڈھال کر سکتا تھا۔ عورت خواہ کیسی بھی ہوتی اسے ایک اچٹتی سی نگاہ سے اپنا تابع اور محکوم بنا سکتی تھی۔ وہ عورت کے اس جادو اور اپنی کمزوری سے بخوبی آگاہ تھا۔ اس لیے وہ کسی عورت کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنے سے خوف کھاتا تھا۔ مردوں والی کوئی بات اُس میں نہ تھی۔ اور کسی عورت سے بیاہ کرنا اور اسے اپنے قبضہ قدرت میں رکھنے کا تصور بھی اس کے لیے محال تھا۔

زینب حقہ پہنچا کر لوٹی تو اب تک دل ہی دل میں اس پر ترس کھا رہی تھی۔ اسی جذبے کے تحت اس نے اپنے ہاتھ سے رحیم کا بستر کھولا اور اسے کھاٹ پر بچھا کر بولی " تھکے ہوئے ہو لیٹ جاؤ —— " رحیم کے دل میں زینب کے لیے تشکر اور احسان مندی کے جذبات پیدا ہو رہے تھے اس نے فوراً زینب کے حکم کی تعمیل کی اور اپنے چھوٹے سے جسم کے گرد بھاری کمبل لپیٹ کر دراز ہو گیا۔ تھکا ہوا تھا اس لیے بہت جلد سو گیا اسے نہیں معلوم زینب نے کب برتنوں کی کھٹ پٹ بند کی۔ کب لالٹین کی لو مدہم کر کے اسے ایک کونے میں رکھا اور کب اپنے کمرے کا دروازہ بھیڑتی پنڈت کے پہلو میں جا لیٹی —— صبح وہ دیر سے اٹھا۔ پنڈت جا چکا تھا اور زینب کے پشت پر پڑے کھلے بالوں سے پانی کی بوندیں ٹپک رہی تھیں —— زینب کے بال ابھی تک لمبے اور سیاہ تھے۔ ان کھلے لمبے بالوں پر ایک اچٹتی سی نظر ڈالتے ہی رحیم کے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ اسے یوں لگا جیسے یہ سیاہ بال آگے بڑھ کر سانپ کی طرح اس کے دل کے گرد لپٹ گئے ہیں۔ اس نے گھبرا کر نظریں زمین میں گاڑ دیں کانپتے ہاتھوں سے ناشتہ کیا پھر جلدی سے کچے صحن میں بچھی کھاٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ ذرا سی دیر میں زینب تولیے سے بال جھٹکتی ہوئی آئی اور ایک تکیہ کھاٹ پر ڈال کر بولی —— " لیٹ رہو گے " —— رحیم گھبرا گیا۔ جلدی سے تکیہ دبوچ کر بولا " ہاں ہاں " پھر جیسے سہارا لینے کو بولا " بڑھاپے میں یہی تو شامت ہے۔ ذرا تھک جاؤ تو جسم چست ہونے کا نام نہیں لیتا —— " زینب بالوں پہ تولیہ لپیٹتے ہوئے کھل کھل ہنس پڑی

وہ لو ابھی سے بوڑھے ہوگئے، میری عمر کے ہو گے۔"

رحیم کی زبان گنگ ہوگئی حلق میں پھندا سا پڑ گیا۔ ایک پنتالیس کے پیٹے میں آئی ہوئی عورت بڑے دعوے سے اپنے آپ کو جوان کہہ رہی تھی۔ ایک وہ تھا کہ جوانی میں بھی خود کو جوان کہتے اور سمجھتے خوف کھاتا رہا — جواب کو ٹال کر اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

ہولے ہولے رحیم کی وہ پہلی جھجک دب گئی مگر اب بھی زینب کو قریب پا کر اس کے خون کا دباؤ بڑھ جاتا اور جسم سے پسینہ چھوٹنے لگتا۔

پنڈت کا، گھر سے بہت بے معلوم سا تعلق تھا۔ صبح کو جاتا تو رات گئے لوٹتا۔ سارا اختیار زینب کے ہاتھ میں تھا اور زینب کا رویہ اس کے ساتھ بڑا ہمدردانہ تھا۔ یوں گھر کی فضا میں کچھ ایسی اپنائیت اور ہمدردی گھل مل گئی تھی کہ بہت جلد رحیم اسے اپنا گھر سمجھنے لگا۔

زینب کام سے فارغ ہو جاتی تو رحیم کے پاس کھاٹ ڈال کر بیٹھ جاتی۔ اور رحیم اسے اپنے گھومنے پھرنے کے قصے سنانے لگتا۔ بات کرنے کا ڈھنگ رحیم کو خوب آتا تھا۔ دونوں ہاتھ سر کے نیچے باندھے وہ اپنی نظریں مستقل نیلے آسمان پر جمائے رکھتا۔ اور معمولی بات کو بھی یوں دلچسپ بنا کر سناتا۔ کہ زینب اس کی سمجھ عقل کی قائل ہوگئی تھی۔ کئی بار وہ باتیں سنتے کھو سی جاتی۔ اور سوچتی رحیم بیاہ کر لیتا تو اس کی بیوی سچ مچ بڑی قسمت والی ہوتی کتنی عقل کتنا تجربہ اس کے پاس تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے دل میں محبت کی آنچ موجود تھی۔ پنڈت تو اس کے مقابلے میں کھردرا پتھر تھا۔ ایک دن اسی سوچ میں اس نے کہا — "وہ پنڈت کو دیکھا ہے کیسا روکھا آدمی ہے۔ سب سے بگاڑ بیٹھا ہے۔ ہونوں تک کو تو گھر میں ٹکنے نہیں دیتا دن بھر گھر میں تنہا کلپتی رہتی تھی۔ اچھا ہوا تم آ گئے۔ اب تم بیاہ کر لو تو کچھ رونق ہو جائے —" رحیم لیٹے سے یوں بازو پھیلائے اٹھا جیسے ہاتھ سے چھوٹتی کسی شے کو سنبھالا دینا چاہتا ہو۔ پھر خفیف سا ہو کر بولا

"دنیا جوانی کے ساتھ اور عاقبت بڑھاپے کے ساتھ۔ اب اس عمر میں دنیاوی باتیں اچھی نہیں لگتیں۔ اب تو توبہ استغفار کا وقت ہے، عمر گدھوں کی طرح کھاتے پیتے گزار دی کوئی نیکی کا کام نہ کیا۔ اب ہی سنبھل جائیں تو بہت ہے جانے کب بلاوا آ جائے۔" زینب کو اس کی باتیں عجیب لگیں مگر وہ دل سے اس کی سمجھ بوجھ کی قائل ہو چکی تھی۔ اس لیے ٹھنڈا سانس بھر کر بولی — "تم ٹھیک کہتے ہو۔ ہم جاہل لوگ نہ گھر سے نکلے نہ دنیا دیکھی نہ ایسی سمجھ کی باتیں آئیں۔ ہم تو اب بھی انہیں دلدروں میں پڑے ہیں۔ آنکھیں کھلتی ہی نہیں — دو کلمے جو کبھی یاد کیے تھے وہ بھی بھول چکے ہیں۔

زینب کو قائل دیکھ کر رحیم کا حوصلہ بڑھ گیا۔ بولا

"پنڈت کو دیکھ کر تو بہت افسوس ہوا بے چارہ بالکل ڈھلک گیا ہے اس سے تو میں ہی نگڑا ہوں گا۔ سچ کہتا ہوں ہاتھ لگا دوں تو گر پڑے۔ پر خدا یاد نہیں۔"

"نشہ کرنے والے آدمی کا یہی حال ہوتا ہے،" زینب دانتوں میں نیلا پھرتے ہوئے بولی۔

"تم سے بھی تو بالکل بیگانہ ہے۔ مجھے تو یوں معلوم پڑتا ہے اگر اسے بھوک نہ لگے تو وہ کبھی نہ آئے — کتنے دن مجھے آئے بھی ہو گئے پر تم سے بات کرتے نہیں دیکھا — ایسے مرد کا بھی کیا فائدہ جو بیوی کے دکھ سکھ میں شریک نہ ہو" — رحیم نے زینب کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

رحیم کی ہمدردی پر زینب کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ بولی:۔

اسی حال میں کچھ گزر گئی ہے کچھ اور گزر جائے گی۔"

رحیم نے اپنی جھکی ہوئی چور نظروں کو ہولے ہولے اونچا کیا۔ پھٹی ایڑیوں والے پاؤں ان پر پڑا ہوا شلوار کا ادھ میلا پائنچا پھر قمیض کا داغ دھبوں والا گھیرا اور اس کے ساتھ ہی گود میں پڑے ہوئے کھردرے ہاتھ جن کے ناخن گھس چکے تھے اور ہتھیلیوں کی لکیریں گہری اور کالی ہو چکی تھیں ان ہاتھ پیروں میں کوئی جاذبیت نہ تھی۔ مگر رحیم کا سانس انہیں دیکھ کر پھولنے لگا اس نے آہستہ سے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور ان پر رکھ کر آنکھیں موند لیں۔ اس وقت اسے ایک بہت عجیب خیال آیا جیسے زینب نے خود اپنے اوپر سوت لانے کو اسے کہا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو زینب جا چکی تھی اور اس کے ہاتھ اپنے ہی سینے پر پڑے تھے۔

چند دن بے کار رہ کر رحیم نے وہی بڑوں کا چھابا لگانا شروع کر دیا تھا۔ صبح صبح وہ سامان لے آتا۔ پھر وہ اور زینب مل کر بڑے بناتے پکوڑیاں تلتے چٹنی بناتے یوں گھل مل کر کام کرتے۔ جیسے سچ مچ میاں بیوی ہوں زینب کو تو کبھی ایسا خیال نہ آیا تھا لیکن رحیم تو پنڈت کو محض ایک وہم سمجھنے لگا تھا ——— جب سب کچھ تیار ہو جاتا تو وہ ہاتھ دھو کر دور بیٹھ جاتا اور بیڑی پینے لگتا تب زینب اس کا چھابا نکال کر لاتی اور سلیقے سے سجا دیتی۔ رحیم دور بیٹھا اسے دزدیدہ نظروں سے دیکھتا رہتا۔ اس وقت وہ اسے مکمل طور پر اپنی ملکیت لگتی۔ اور وہ مسرور ہو اٹھتا۔ رحیم سہ پہر جاتا اور رات دس دس بجے سے پہلے نہ آتا۔ خیر دین بہت جلد آ جاتا تھا۔ جب رحیم آتا تو وہ خراٹے بھر رہا ہوتا۔ زینب دروازہ کھولتی پھر اسے کھانا نکال کر دیتی۔ اس کی اپنی بیوی بھی اتنا سکھ نہ دے سکتی تھی جتنا زینب دے رہی تھی۔ اور وہ تو زینب کو ہی سب کچھ سمجھ رہا تھا۔ زینب کا دوسرے کمرے میں جا کر سونا اسے بڑا کھلتا۔ اور وہ اسے زیادہ سے زیادہ اپنے کمرے میں روکے رکھنے کے لیے باتوں میں لگا لیتا۔

ایک دن دونوں فارغ ہو کر صحن میں بیٹھے تھے کہ ایک منہارن آواز دیتی ہوئی ٹاٹ کا پردہ سرکا کر اندر آ گئی۔ شاید رحیم نہ ہوتا تو زینب اپنے آپ کرے میں سے چوڑیاں چن لیتی مگر رحیم کی موجودگی میں وہ کچھ کھسیانی سی ہو گئی۔ بولی ——— "بہوئیں تو گھر نہیں کس کو پہناؤں گی ——— "

"تم خود پہنو گی" ——— منہارن نے کہا۔

"اے واہ اس عمر میں پہنتی اچھی لگوں گی"۔ زینب پر رحیم کی موجودگی سوار ہو گئی تھی ———

"سو برس کی عمر پائے میاں اللہ اگلے سال بیٹا دے سہاگنیں بھی کبھی بوڑھی ہوئی ہیں" ——— منہارن نے رحیم کی طرف دیکھ کر جھٹ سے کہا۔

اور رحیم کا رنگ ہلدی کی گانٹھ ہو گیا۔ زبان تالو سے چمٹ گئی اور حلق خشک ہو گیا۔ ہاتھ پاؤں کانپنے لگے۔

زینب کھلکھلا کر ہنس پڑی تھی ——— بولی ——— "تم لوگوں کو خوب باتیں بنانی آتی ہیں جاؤ بھئی پھر کبھی آنا"

مگر اب تک رحیم اپنے دھڑکتے دل پر قابو پا چکا تھا۔ جوش سے بولا ——— "اب آ گئی ہے تو پہن لو عورت کو کبھی سنگار برا لگا ہے"

زینب نے تعجب سے رحیم کی طرف دیکھا پھر ٹوکرے پر سے کپڑا الٹ کر چوڑیاں دیکھنے لگی ——— رنگ برنگی چوڑیاں تھیں ——— نیلی پیلی کالی سرخ ـ زینب کو سنہرے والی سرخ چوڑیاں پسند آئیں ——— منہارن نے خوب پھنسی پھنسی چڑھا دیں تو رحیم نے جیب سے پیسے نکال کر اسے دے دیے۔

زینب رحیم کی اس حرکت پر خوش بھی تھی اور متعجب بھی۔ رحیم جس کے منہ سے اس نے آج تک بڑھاپے موت گناہ اور سزا کی باتیں سنی ہیں اور جنہیں سن کر اسے موت کے فرشتے کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ کئی بار سوتے میں سنائی دی تھی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی تھی اسی رحیم کی شخصیت یہ دوسرا رخ اسے بڑا پسند آیا ——— نئی نویلی چوڑیاں اس کی بانہہ میں پڑی تھیں اور وہ ان کی چمک کو اپنے دل میں محسوس کر رہی تھی اور سوچ رہی تھی

بچارے نے شادی نہ کی مگر جورو کے ایسے چاؤ تو دل میں ضرور رہوں گے۔ اس وقت وہ رحیم کو خوش کر دینے والی کوئی بات کہنا چاہتی تھی — چوڑیاں ولائی میں گھما کر بولی ——

" رحیم تم شادی کر لیتے تو تمہاری بیوی تو تم سے بہت خوش رہتی۔ سچ کہتی ہوں پاؤں دھو دھو کر پیتی۔ بگڑا تو اب بھی کچھ نہیں ہے، مگر تم؛
—— رحیم نے سر کھجاتے ہوئے بات کاٹ دی

"سر سفید ہو گیا داڑھی سفید ہو گئی اب اس عمر میں بیاہ کر کے بچے پیدا کرتا اچھا لگوں گا —" زینب خفیف سی ہو کر چپ ہو گئی۔

اس دن دال پیستے ہوئے زینب کی چوڑیاں چھن چھن بج اٹھیں تو رحیم کا دل گویا اچھل کر حلق میں آ گیا۔ یہ ایک ایسا ملکوتی نغمہ تھا جسے اس نے ندگی میں پہلی بار سنا تھا۔ وہ نغمے کی نغمگی میں کھو کر رہ گیا — زینب نے اسے کھویا کھویا سا دیکھا تو بولی "کیا سوچ رہے ہو" اس وقت رحیم کو سرخ رنگ داڑدں کے سوا کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ زینب کی آواز سن کر وہ چونکا پھر سنبھل کر بولا "سوچتا ہوں یہی چوڑیاں اپنی کسی بھوکی بانہہ میں چھنکتیں تو ان کی واز کیسی من موہنی لگتی اب تمہارے ہاتھوں میں چھنکتیں کتنی عجیب لگ رہی ہیں۔ عمر کے مختلف مدارج میں انسان مختلف بہروپ بھرتا ہے۔ ایک ت میں جو بہروپ پسند آتا ہے دوسرے وقت میں وہی بہروپ ناپسند ہو جاتا ہے —" زینب نے ہولے سے سر ہلایا اور بولی۔

" سچ کہتے ہو پر جو اس راز کو سمجھ لے —" ایک دن زینب پر ایک عجب انکشاف ہوا اس انکشاف نے زینب کو سچ مچ متوحش کر کے رکھ دیا وہ سخت حیران تھی۔ بائیس برس بعد قدرت اس سے یہ کیسا مذاق کرنا چاہتی تھی — دو چار گھریلو ٹوٹکے آزما دیکھے پر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ سخت پریشان تھی سننے والے کیا کہیں گے۔ بہو بیٹے کیا سوچیں گے۔ ایک دن گھبرا کر تاجو کے گھر جا پہنچی تاجو نے سب کچھ سن کر کہا — "تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے تمہارا میاں خیر سے زندہ ہے۔ پھر یہ کوئی ایسی انہونی یا انوکھی بات بھی نہیں ہے چین سے آنے والے دنوں کا انتظار کرو —" زینب کسمسا کر بولی؛

" پر رحیم کیا کہے گا —"

تاجو بھڑک اٹھی بولی —— "اب سمجھی اس بڈھے نے تمہیں خوب بہکا دیا ہے"

زینب نے برا مان کر کہا "—— تم اسے خواہ کچھ کہو۔ پر وہ ہے عقل کا پتلا اور دین مذہب کی ایسی باتیں کرتا ہے کہ دس مولوی اس کے سامنے نہ ٹکیں میں نے تو مانو اس کو دل میں اپنا پیر مان لیا ہے۔ ایسا نیک پرہیزگار اور ہر وقت اللہ اللہ کرنے والا آدمی تمہیں سارے شہر میں نہ ملے گا — زینب گھر آ گئی مگر اس کی پریشانی کم نہ ہوئی تھی۔ وہ ہر وقت اپنے آپ کو چادر میں لپیٹے رکھتی۔ پھر بھی رحیم کا سامنا کرنے سے گھبراتی —— یہ بھی اچھا تھا کہ رحیم کو نظریں جھکائے رکھنے کی عادت تھی۔ مگر آخر کب تک بات چھپ سکتی تھی۔ ایک دن رحیم نے اسے ٹوکا۔ تو وہ بوکھلا گئی پریشان ہو کر بولی "—— پیٹ میں رسولی ہو گئی ہے "—— یہ جھوٹ خود بخود اس کے منہ پر آ گیا تھا۔

رحیم بہت پریشان ہوا بولا "تم نے پہلے کیوں نہ بتایا۔ اچھا کل سارے کام بند میں تمہیں ہسپتال لے چلونگا —"

زینب نے کہا " ایک حکیم صاحب کی پڑیاں کھا رہی ہوں اسی سے آرام آ جائے گا —"

رحیم بولا "— مجھے تو ان جاہل حکیموں پر اعتبار نہیں — بس تم تیار ہو جانا کل ضرور ہسپتال چلیں گے "

زینب نے ٹالنے کو کہا "سچی بات یہ ہے کہ ہمارے یہاں ہسپتالوں میں جانے کی ریت نہیں ہے —"

"یہ سب جاہلیت کی باتیں ہیں "—— رحیم اڑ گیا مگر زینب کو نہ ماننا تھا نہ مانی۔ رحیم کو سب سے بڑا خدشہ یہ تھا کہ زینب پنڈت کے ساتھ ہسپتال

نہ چلی جائے۔ مگر پنڈت کو تو جیسے اس کی بیماری کی اب تک خبر ہی نہ مل سکی تھی۔ وہ اسی طرح صبح جاتا اور شام کو آتا تھا ——— رحیم کی بہت کوششوں کے باوجود جب زینب ہسپتال جانے پر آمادہ نہ ہوئی تو ایک دن وہ کسی ڈاکٹر سے زبانی احوال بتا کر دوا لے آیا ——— اس دوا کو زینب نے آنکھ بچا کر پھینک دیا زینب کی حالت دگرگوں ہوتی چلی جا رہی تھی رحیم سب کچھ دیکھتا مگر کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے گھر کا سارا کام سنبھال لیا تھا اور زینب کو کھاٹ سے اُترنے نہیں دیتا تھا۔ زینب عجیب عذاب میں پڑی تھی۔ اگر اسے کہیں سے زہر دستیاب ہو جاتا تو وہ کھا کر سکھی ہو جاتی۔ مشکل یہ تھی کہ جھوٹ کا بھانڈہ پھوٹنے میں بس تھوڑے دن رہ گئے تھے اور رحیم سمجھتا تھا یہ ساتھ چھوٹنے والا ہے۔ وہ دن رات مضطرب رہتا۔ ایک دن اسی اضطراب میں وہ ہوش و حواس کا دامن چھوڑ بیٹھا۔ صبح سویرے پنڈت کے سامنے اس نے زینب سے کہا۔

"بہت انکار ہو چکا آج تمہیں میرے ساتھ ہسپتال چلنا ہو گا میں تمہاری یہ حالت نہیں دیکھ سکتا" ——— پنڈت کو اس کی بات پر بڑا تعجب ہوا اس نے گھور کر رحیم کو دیکھا اور بولا۔

"ہوش سے بات کرو میاں یہ بیوی تمہاری نہیں میری ہے"

رحیم کو غالباً عمر میں پہلی بار طیش آیا اور بڑا بے وقت آیا۔

بولا۔ "جانتا ہوں۔ یہ تیرے میلے کپڑے دھوتی ہے اس لیے تیری بیوی ہے یہ تیرے لیے کھانا بناتی ہے۔ اس لیے تیری بیوی ہے۔ اس کے علاوہ اس کا تیرے ساتھ کیا واسطہ"

پنڈت نے اب رحیم کی بجائے بیوی کو بھرپور نظر سے دیکھا رحیم سے تو وہ پہلے روز سے خار کھائے بیٹھا تھا اب جو بیوی کے جھکے جھکے شرمندہ چہرے کو دیکھا تو آپے سے باہر ہو گیا۔

زینب کو جھونٹوں سے پکڑ کر بولا۔

"بتا کتیا میرے ساتھ کیا چھل کر رہی ہے تیرا اس بونے کے ساتھ کیا واسطہ ہے"

پنڈت نے دیکھتے دیکھتے دو چار گھونسے رسید کر دیے تو زینب زور زور سے چیخنے لگی۔

"میرا پیر بھائی ہے اور کیا ہو گا اس کے ساتھ میرا واسطہ"

"تیرے پیر بھائی کی ایسی کی تیسی بہت دیکھے ہیں ایسے ٹھگ" ——— پنڈت نے ایک گھونسہ اور رسید مارا ——— شور سن کر دو ٹپڑوسنیں بھی آگئیں رحیم نے حوصلہ پا کر کہا۔

"بوڑھی زنانی کو مارتے شرم نہیں آتی کسی مرد پر ہاتھ اٹھاؤ" پنڈت کٹہ نان رہا تھا ایک پڑوسن نے بڑھ کر ہاتھ پکڑ لیا۔

بولی "خدا سے خیر مانگو۔ اللہ جیتا جاگتا بیٹا دے۔ اس حالت میں کوئی زنانی کو پیٹتا ہے" ——— پنڈت جھنجھلا گیا اس نے ایک لات رحیم کے جڑ دی رحیم چیخنی کھا کر دور جا گرا۔ گرتے میں اس نے دیکھا زینب اپنے بکھرے بال سمیٹتے ہوئے خفیف سا مسکرا دی۔ ممکن ہے یہ محض اس کا وہم ہو۔ مگر جب وہ اٹھا تو زمین اس کے سامنے لٹو کی مانند گھوم رہی تھی اور اس کی آنکھیں ماتھے پر جا لگی تھیں اور وہ کچھ نہیں دیکھ سکتا تھا۔

کُتّے کی دُم

نوید قریشی

دُتّے نے سوچا شاید اب اسے کوئی سواری نہ ملے، اس نے تانگے کی میلی چکٹ سی پھٹی ہوئی سیٹ کے نیچے سے لیمپ سگریٹ کا ادھ جلا ٹکڑا نکال کر سلگا لیا اور دو تین لمبے لمبے کش لے کر گھوڑے کی پشت پر تھپکی دی۔

"چل اوئے سوہنیا، رب دے آسرے" اس نے گھوڑے کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔

"او ــــ ساڈوں سجناں دے ملن دا چا دے .. .. او .. .. ساڈوں سجناں دے .. .. .."

اس کی آواز گھوڑے کی ٹاپوں کی مسلسل "کلپ، کلوپ، کلپ، کلوپ" کے ساتھ رات کے ٹھٹھرے ہوئے خاموش ماحول میں دور تک ابھرتی گئی۔

"او .. .. ساڈوں سجناں دے .. .. .."

گھوڑے کی دلکی چال میں مستانہ پن آ چلا تھا، جیسے اسے بھی کسی سجن کے ملنے کا ارمان کشاں کشاں لیے جا رہا ہو، لیکن اگلے ہی چوراہے پر دُتّے نے لگامیں کھینچ لیں۔ دو آدمی اچک کر پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ گھوڑا پھر اسی چال سے سیاہ لمبی سڑک پر دوڑنے لگا۔

"یار۔ قادرا ــــ سونھ رب دی، اب مجھ سے نہیں رہا جاتا" ایک شخص دوسرے شخص سے مخاطب ہوا۔

"کیوں جان جوکھوں میں ڈالنے کی سوچ رہا ہے ماجے۔" دوسرے نے کہا "کنجری بھی کسی کی ہوئی ہے۔"

"چھڈ اوئے چھڈ" ماجا بولا "تجھے کیا معلوم عشق کیا ہوتا ہے" اس نے ہاتھ ہوا میں لہرایا اور ساتھ ہی اس کا جسم اور آواز بھی لہرانے لگی

"او ــ توں نیں جاندا ــ عشق دے مانبلے اوتّے۔"

دُتّے نے گردن گھما کر پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی دونوں سواریوں کی طرف دیکھا اور خود ہی بول پڑا۔

"سچ اے میاں جی ــ عشک دے مانبلے اوتّے ــــ یہ عشک بڑی نامراد چیج اے۔ انسان کو کسی قابل نہیں چھوڑتا" اس نے ایک لمبی سرد آہ کھینچی "عشک نے گالب لکما کر دیا، ورنہ ہم دی آدمی تھے کام دے۔"

تانگے کی پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے دونوں دوستوں نے دتّے کی طرف دیکھا، اور پھر ان میں سے ایک نے بڑے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے کہا "کیا تسیں وی عشق دے مارے ہوئے اوں ــــ مولبی جی"۔ دتا مسکرایا اور اس کا دایاں ہاتھ خود بخود اس کی چھوٹی سی داڑھی کو ٹٹولنے لگا، جیسے اجنبی سواری کے کہے ہوئے لفظ "مولبی" نے اسے اپنے چہرے پر چھوٹی سی داڑھی کا احساس دلا دیا ہو۔ اس نے جھوم کر چابک کو ہوا میں لہرایا اور دلکی چال میں بدمست گھوڑے کی کمر پہ "شڑ" کی آواز پیدا کر کے بولا "کون مائی دا لال عشک سے بچ سکتا اے میاں جی ــ باوے آدم نے بھی عشک کیا ــــ ہم نے دی ــــ آخر ہیں تو اسی کی اولاد ــــ"

" رنڈی سے عشق کرنا کہاں کی عقلمندی ہے ، ہمارا یار رنڈی سے عشق جھاڑتا ہے " قادر نے اپنے دوست ماجے کی طرف دیکھتے ہوئے سگریٹ کا بھرپور کش لیا " رنڈی اور چیچک انسان کو قابلِ نفرت حد تک بدصورت بنا دیتی ہے ۔ .. .. رنڈی سے کبھی وفا نہیں ہو سکتی کیوں مولبی جی ؟ "

دلا ہنس پڑا ——" او بھولے بادشاہو ، کیسی گل کرتے ہو ۔ کنجری جب عشق کرنے پر آتی ہے تو مائیں اپنا آپ لٹا دیتی ہے " وہ بڑے پُر اعتماد اور ٹھہرے ہوئے لہجہ میں بولا " میرے گھر میں بھی کنجری ہے میاں صیب ! "

قادر اور ماجا اس غیر متوقع انکشاف پر چونک پڑے ۔ دُلّے نے مُسکرا کر بات آگے بڑھائی " مہتابے کی دکان تو تسی دیکھی ہوگی جی —— پوری ہیرا منڈی میں بس یہی پنواڑی ہے ، جس کے ہاں کوکین لگا پان ملتا ہے ۔ مہتابے کی دکان کے سامنے والے چبارے پر میں نے اس مست جوانی ، اکھ مستانی اور اس کی موٹی مچ نانی کو پہلی واری دیکھا "

" موٹی مچ نانی .. .. .. " ماجا اور قادر بے ساختہ ہنس پڑے ۔ دلا بھی زیرِ لب مسکرا دیا ۔ آگے کو جھک کر اس نے دلکی چال میں لہک لہک کر دوڑتے ہوئے گھوڑے کی پیٹھ پر تھپکی دی اور بولا " بس جی اس مستانی اکھ نے ہنس کر ایسا تیر پھینکا کہ میرے دل کا کبوتر زخم کھا کے اس کے کوٹھے کی طرف اڑانیں مارنے لگا اور میاں جی آپ تو جانتے ہیں ۔ جب آدمی کا دل زور دار ہوا میں چڑھی ہوئی پتنگ کی طرح آگے آگے اڑتا جائے تو اس کے پیچھے چلنا ہی پڑتا ہے ، سو اپنے دل کے بقے کبوتر کے پیچھے پیچھے میں بھی چڑھ گیا اس کھٹے میٹھے مکئی کے دانے دے کوٹھے تے ، اس نے جب ہنس کر میٹھی میٹھی نظروں سے دیکھا تو مائیں پر کبوتر دل —— جی —— پھنیر سپ کی طرح جھومنے لگا "

قادر اور ماجا پھر ایک دم زور کا قہقہہ مار کر ہنس پڑے " کمال کر دیا مولبی جی ۔ دل کو سانپ بنا دیا " دلا مسکرایا اور بولا " جوشِ جوانی میں منایا ہوا دل سپ ہی تو بن جاتا ہے ، اور بس جی اس دن سے تو مائیں ایسا ہو گیا کہ ہیرا منڈی کے دوسرے سب ہیرے مٹی معلوم ہونے لگے ۔ صرف بالاں کی بیٹھک ہی پکھراج ، یکوت اور لیلم ہیروں کی چمکتی ہوئی کان نظر آنے لگی ۔ دل تو میاں صیب مستی میں آیا ہوا پھنیر سپ بن ہی گیا سی ۔ بالاں بھی مائیں بڑی چالاک سپیرن تھی ، لمبی لمبی انگڑائیاں لیتی اور شراب کے نشے سے چڑھی ہوئی آنکھوں اور پیار کے رس میں گھولی ہوئی باتوں کی بین بجا کر وہ میرے دل کے پھنیر سپ کو مست کرتی جاتی ۔

" دلیا —— میری جنڈری تے میرے بلیا —— کل آندی واری میرے لیے بھلا کیا لائے گا " وہ اپنے ہونٹوں کی رس بھریاں لٹکا کر کہتی میں جھوم کر اس کی رس بھریوں کو چوسنے کے لیے آگے بڑھتا ۔ اس کو کلاوے میں بھر کر کہتا " جو تو کہے میری حکم دی بیگمے ۔ یہ چڑی کا گلفام تو تیرا اپنا ہی ہے اور پھر میاں جی اس چڑی کے گلفام نے اپنا گھوڑا تانگہ بھی بیچ دیا ۔ دلا مسکرا کر لمحے بھر کو خاموش ہو گیا ، پھر ماجے اور قادر کی طرف دیکھ کر بولا " آپ بھی کہیں گے میاں صیب ، کیا ہیر وارث شاہ سنانے لگا ہے "

" اوہ —— نیئں ، نیئں —— یار کمال کر دیا " دونوں دوست یک بیک بے تکلفی سے بول اٹھے اور پھر ان میں سے ایک نے اپنا سگریٹ سلگانے کے بعد ایک دُلّے کو پیش کرتے ہوئے کہا " فیر مولبی جی " —— دلا مسکرا کر آگے کو جھکا ۔ گھوڑے کی پشت سہلا کر بولا " اس وقت میرے پاس دراصل عربی نسل کے مشکی گھوڑے اور دو پشوری تانگے تھے میاں صیب ۔ کسی راجے سالے سے کم نہیں تھے اپنے ٹھاٹھ ۔ مائیں ۔ کوئی ٹنڈا لاٹ بھی اپنی ریس نہیں کر سکتا تھا ۔ پر آہ ! ہائے —— یہ رناں ، یہ کسبیاں ، لکھ نوں ککھ کر دیتی ہیں ۔ ان کی جھولی مائیں قیامت تک نہیں بھر سکتی —— پر میاں جی ۔

بالاں چاہے لاکھ کنجری تھی، کبھی کبھی تو ایسا سلوک کرتی تھی، جیسے ایک اصلی بیوی اپنے پیارے خوند کے ساتھ کرتی ہے - لیکن اس وقت اس کی موٹی مچ نانی اپنے تندور جیسے پھولے ہوئے جسم کو دھکاتی ہوئی بالاں کی طرف ایسے دیکھتی کہ بالاں کو کوئی بھولا ہوا سبق آجاتا - سچی محبت کے دیوے اس کی آنکھوں میں بجھ جاتے۔ میرا دل چاہتا مائیں اس کی موٹی مچ نانی کو —— اس ٹھنڈے تندور کو، چابک مار کر، بلے کا ڈھیر کر دوں، پر میاں جی اس کو ڈھیر کرنے کے لیے چابک کی نہیں، دولت کی ضرورت تھی - اور میرے پاس بس ایک گھوڑا تانگہ باقی تھا، پر رب جو کرتا ہے، ٹھیک ہی کرتا ہے - میں بالاں کی نانی کو دولت کی مار سے ڈھیر کرنے کی فکر میں خود ہی ڈھیر ہو گیا -

ایک دن میں گامے کنجر کی بیٹھک پر تھا اور اسی روز دو جواریوں اور گامے کنجر کے چیلوں میں نال کی ادائیگی پر جھگڑے کا شکار میں بھی ہو گیا اور میاں جی —— پورے تین انچ چاقو میرے موڑھے میں اُتر گیا - دُتّے کا دایاں ہاتھ اس کے بائیں شانے کی طرف یوں میکانکی انداز میں اُٹھ گیا جیسے اب تک اس کے زخم کا اندمال نہ ہوا تھا - اپنے شانے کو بے خیالی میں سہلاتے ہوئے اس نے بات جاری رکھی " تو میاں صیب پورے دو مہینے ہسپتال میں پڑا رہا - وہ تو قسمت کا ستارہ تیز تھا کہ میں بچ گیا اور دو مہینے بعد جب ہسپتال سے نکلا تو مجھے پتہ چلا کہ بالاں کوئٹے چلی گئی ہے - میں نے سوچا دلیا چھڈ کنجری دی یاری، کبھی آخر کسی اے اور میں نے بالاں کے خیال کو دل سے نکال دیا - پر میاں جی —— کوئی پورے ایک سال بعد ایک دن اچانک بالاں مجھے بیڈن روڈ پر مل گئی - میں حیران رہ گیا - بالاں سوکھ کر کانٹا ہو گئی تھی، اس نے بعد میں مجھے بتایا کہ ایک گاہک نے اسے ایک موذی بیماری کا تحفہ دے کر اس حالت پر پہنچا دیا ہے -

گدگدے پنڈے والی بالاں، جس کی لوئی لوئی بہاری کی موج تھی، اب بڑھے دریا کی طرح سوکھ گئی تھی جے تسی برا نہ مناؤ تو میاں صیب امان نال اب وہ رن بالکل ننگی تھی، بالکل کھسرا معلوم ہوتی تھی -

اس دفعہ پھر ماجا اور قادر بے ساختہ کھلکھلا کر ہنس پڑے اور قادر نے دتے کے کندھے پر ہاتھ مارا " واہ مولبی جی واہ —— کی شے اد —— ایسا لگتا ہے جیسے اس کھو کا پانی بھی چکھ چکے او - .. " دلّا اس کا اشارہ سمجھ گیا، بولا " نیں میـــاں جی، رن مٹی کی دی ہوتے لکھ رُوپے دی ——"

ماجا جو دتے کی داستان میں نسبتاً زیادہ دلچسپی لے رہا تھا بولا " چھڈ جی چھڈو - یہ بات : تسی اپنی بالاں کی طرف آؤ "

گھوڑے کی چال دھیمی ہو گئی تھی - سرکلر روڈ کے اختتام پر دتے نے تانگا کراؤن بس کے اڈے کی طرف موڑ لیا، گھوڑے کو پانی پلانے کے لیے پیاؤ پر اور بھی ایک تانگا رکا ہوا تھا - دتے کا گھوڑا کسی گھنٹے کا پیاسا معلوم ہوتا تھا - ابھی اس کا منہ حوض ہی میں تھا کہ دتے نے لگامیں کھینچ لیں - گھوڑا ہنہنایا گویا اپنی ازلی بے زبانی سے اس ظلم پر خدا سے فریاد کر رہا ہو اور پہلے کی سی برق رفتاری سے دوڑنے لگا -

" ہاں مولبی جی - فیر " ماجے کی دلچسپی بدستور قائم تھی - دتے نے ہلکے سے ہنس کر پھر بات شروع کر دی - بالاں کو دیکھ کر مجھے ترس آ گیا اور کچھ اس کے اچھے دنوں کا خیال بھی آیا - میرے دل میں اس کے پیار کا دیا ذرا چمکا اس نے مجھے بتایا تھا کہ اب وہ بالکل بے آسرا ہے - اس کی نانی نے اسے الگ کر دیا ہے کیونکہ ایک سال کے مسلسل علاج پر خرچ کرتے کرتے وہ مایوس ہو گئی ہے کہ اب بالاں بیٹھک کے قابل نہیں - میں نے سوچا میاں صیب چلو اس یار پر تھوڑا خرچ اور سہی اور میاں جی اس کو میں اپنے گھر لے آیا - دن رات جان مار کر میں نے بالاں کا علاج کرایا - اصل میں اب مجھے ایسا لگتا تھا جیسے بالاں ہیرا منڈی کے چوبارے پر بیٹھنے والی نہیں ہے، میری گھر والی ہے - میری جند تے میری جان ہے - چھ سات مہینے

تک اس کا علاج ہوتا رہا۔ ایک دن دوپہر کو بالاں نہا کے دھوپ میں بال سکھا رہی تھی۔ میری نظریں اس کے پنڈے پر پڑیں۔ نال ایمان دے میاں صاحب، میرا دل ایک دم اچھل پیا۔ میاں جی وہ بیمار اور لاغر بالاں تو پتہ نہیں کہاں تھی، میرے سامنے بالکل نئی چڑھتی جوانی والی بالاں کھڑی تھی میں نے تنبورے کی طرح تنے تنائے پنڈے کو دیکھ کر اسے چھیڑا "تیری ہک تے آلنے پائے جانگلی کبوتراں نے ۔۔ ۔۔ ۔۔"

وہ ہنس پڑی، میں نے دل میں سوچا دیا — تو بھی کسی سکندر سے کم نہیں ہے۔ بھلا ایسی رن — ایسی سوہنی رن کوئی زندگی میں روز روز ملتی ہے۔

دُتّے نے مسکرا کر قادر کی طرف دیکھا اور ایک لمبا سانس کھینچ کر بولا "میاں صیب — اب مائیں اس سوہنی کا پیار میرے دل میں دن بدن بڑھتا ہی جاتا ہے، وہ بھی مجھے چاہتی ہے اور جب کنجری دل سے کسی کو چاہتی ہے تو مائیں جان لٹا دیتی ہے، اپنا آپ تباہ کر لیتی ہے، دھوکہ نہیں دیتی بے وفائی نہیں کرتی۔

آخری الفاظ دُتّے نے بڑے پُر اعتماد لہجے میں کہے اور ہلکے سے مسکرا کر خاموش ہو گیا۔

قادر اور ماجے نے دتے کے چہرے سے نگاہیں ہٹا کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر ماجے نے جھوم کر قادر کی ران پر زور کا دو ہتڑ مارا "دیکھا اگر رنڈی چاہے تو زندگی بھر ساتھ دے سکتی ہے"۔

قادر مسکرا دیا "ہم نے تو یار یہی سنا ہے کہ رنڈی اور چیچک نکلے بغیر نہیں رہتی"۔

ماجا ہنسا "چل او چل اُتّر— نکلے بغیر نہیں رہندی"

مصری شاہ آ گیا تھا —— دونوں دوست اتر کر ایک دوسرے سے مذاق کرتے ہوئے ایک تنگ سی گلی میں مڑ گئے۔ دُتّے نے تانگہ آگے بڑھایا اور چند گز کے فاصلے پر سمندر خاں چائے والے کی دکان کے سامنے روک لیا۔" او—سمندر لالے، چونی والی اک چینک تو بنا یار — پتی ذرا تیز پائیں"۔ دُتّے نے تانگے میں بیٹھے بیٹھے چائے کا آرڈر دیا اور بلند آواز میں گانے لگا۔

"سونے دی اے کل ماہیا۔ لوکاں دیاں سدن اکھیاں، ساڈا روندا اے دل ماہیا۔ ہو ہو ۔۔ ۔۔ ساڈا ۔۔۔۔ دل ۔۔ ۔۔ ۔۔"

"او دُتّے میٹھ ذرا اچی واج نال یار" سمندر خاں چائے والے کے قدموں میں بیٹھے ہوئے ایک میلے کچیلے ملنگ قسم کے چھوکرے نے کہا، جو سمندر خاں کی پنڈلیاں سوت رہا تھا۔ کی واج اے یار تیری — کلیجہ کڈ لیندی اے"—

دلا مسکرا کر بولا "عشق دی دین اے پترا — عشق دی"—

اس نے چینک ختم کر کے لیمپ مار کر سگریٹ سلگایا اور تانگہ آگے بڑھا لیا۔ اپنے احاطے میں پہنچ کر دُتّے نے تانگہ روک لیا۔ اُتر کر گنگناتا ہوا اصطبل کی طرف چل دیا۔ کوٹھڑی کے مٹیلے دروازے کے پیچھے ہلکی ہلکی روشنی دیکھ کر وہ ٹھٹک گیا۔ اس وقت اصطبل میں کون ہو سکتا ہے؟ وہ ہاتھ مار کر دروازہ کھولنے ہی والا تھا کہ اسے آواز سنائی دی "اگر دلا آ گیا تو غضب ہو جائے گا ۔۔ ۔۔"

جواب میں کسی مرد نے کہا "اوئے دُتّے دی ماں دی ۔۔ ۔۔ ۔۔"

دُتّے کا خون ایک دم کھول اٹھا۔ اس نے بجلی کی سی تیزی سے آگے بڑھ کر کوٹھڑی کے بند کواڑ پر ایک بھرپور ٹھوکر ماری۔ کواڑ ایک جھٹکے کے ساتھ کھل گئے۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں اس کے گھوڑے کا مالشیا مراد اور بالاں میاں بیوی والی حالت میں نظر آئے۔

———

اے مریم کے خدا

بشریٰ نجم

آمنہ باجی پورے دنوں سے تھیں۔ امی تو ہر وقت بس جائے نماز پر بیٹھیں رہتیں۔ ہر وقت دست بہ دعا، "یا اللہ خیر کیجیو۔ بس یہ وقت خیریت سے گزار دیجیو۔ آمنہ بیٹی کو چاند سا بیٹا دیجیو تاکہ وہ سلمان کی موت کا غم بھول جائے۔" "تو تو بڑا رحیم ہے۔ بڑا کریم ہے۔" "بس ہم دکھیوں پر رحم ہی کرنا۔۔۔۔۔"

اور ادھر آمنہ باجی تھیں کہ ہر وقت خاموش، غمگین اور اداس۔ کسی طرح ان کا دل ہی نہیں بہلتا تھا۔ میں کالج سے واپس لوٹ کر فوراً ان کے کمرے میں جاتی۔ کالج کے اور سہیلیوں کے دلچسپ قصے باجی کو سناتی لیکن ان کے لب پر کبھی مسکراہٹ نہ کھیلی۔ سلمان بھائی کے المناک حادثے کے بعد ان پر ایک سکتہ سا چھا گیا تھا۔ ایسے لگتا تھا کہ ان کے پیٹ میں بوجھ نہیں تھا بلکہ ان کے دل پہ بوجھ تھا ــــ ایسا بوجھ جس سے انہیں سانس لینا دوبھر ہو گیا تھا۔

ایک رات گہری نیند میں مجھے چیخوں کی آواز سنائی دی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھی، مجھے اپنے ساتھ والے کمرے سے باجی کے چیخنے اور امی کے باتیں کرنے کی آواز آئی۔ میں بھاگ کر باجی کے کمرے کی طرف گئی۔ امی فوراً پکار دیں۔ "درانہ بیٹی تم باہر ہی رہو۔ دعا کرو کہ سب خیریت ہو۔"

میں باہر بڑے کرب و اضطراب کے عالم میں ٹہل رہی تھی۔ اور آمنہ باجی کی چیخیں بلند تر ہوتی جا رہی تھیں۔ اور میں اپنی مٹھیوں کو اتنا ہی بھینچتی چلی جا رہی تھی۔ اتنے میں بچے کے رونے کی آواز آئی اور میری پلکوں سے آنسوؤں کے بند ٹوٹ گئے۔ کچھ لمحوں کے بعد امی نے کواڑ کھولا "درانہ بھانجا مبارک ہو، آجاؤ۔" میں جنگلی ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرتی ہوئی آمنہ باجی کی طرف لپکی اور ان کے نم ہوئے منہ اور بھیگی ہوئی آنکھوں کو دیوانہ وار چومتے ہوئے پکاری۔ "باجی مبارک ہو۔ باجی دیکھا وہ کتنا بڑا کارساز ہے۔" اور یہ کہتے ہوئے ان کے پہلو میں لیٹے ہوئے چندا کو دیکھا۔ اف کتنا پیارا۔ کتنا معصوم اور کتنا خوب صورت بالکل سلمان بھائی۔ میری آنکھوں سے پھر آنسو جاری ہو گئے۔

امی نے مجھے آمنہ باجی سے جدا کرتے ہوئے کہا "بیٹیا۔ جی ہولا نہ کر۔ اب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

" پر امی آمنہ باتیں کیوں نہیں کرتی؟ اسے کیا ہو گیا ہے؟ یہ اس طرح ٹکٹکی باندھے ہوئے میری طرف کیوں دیکھ رہی ہے؟ یہ بولتی کیوں نہیں؟ اس نے رونا کیوں بند کر دیا ہے؟ امی ڈاکٹر کو بلاؤ، امی ڈاکٹر کو بلاؤ، باجی کو کچھ ہو گیا ہے۔

" گھبراؤ نہیں درانہ۔ یہ تو کافی دیر سے ایسے ہی پتھر بنی ہوئی ہے، تم جاؤ، کچھ دیر اپنے کمرے میں آرام کر لو، میں آمنہ کی دیکھ بھال کرتی ہوں پھر کچھ وقت کے بعد تم آمنہ کے پاس آجانا، جاؤ میری بیٹی۔" امی مجھے کاندھوں سے پکڑ کر دروازے تک لے آئیں۔

اپنے کمرے میں بیٹھ کر میں کافی دیر تک آمنہ باجی کے متعلق سوچتی رہی، کسی کروٹ چین نہ آ رہا تھا، اک عجیب سی الجھن تھی، دماغ میں جیسے چکیاں چل رہی تھیں، غنودگی کے عالم میں تھی کہ کسی نے مجھے جھنجھوڑا۔

"درانہ اٹھو، جلدی کرو۔ آمنہ تجھے بلا رہی ہے۔ اس کی حالت غیر ہوگئی ہے۔"

سامنے امی گھبرائی ہوئی کھڑی تھیں۔

میں ننگے پاؤں ننگے سر آمنہ باجی کی طرف بھاگی۔ پیچھے پیچھے امی تھیں۔

"باجی کیا بات ہے؟ دل میلا نہ کرو، زندگی سے اتنی بیزار نہ ہو، سلمان بھائی کو ہی تم نے سب کچھ سمجھ لیا ہے۔ کیا ہم تیرے کچھ بھی نہیں! امی کے ہاتھوں کی طرف دیکھو، ان ہی ہاتھوں نے تمہیں لوریاں دی ہیں، ان آنکھوں کی طرف دیکھو جنہوں نے تمہارے لیے رت جگے کیے ہیں۔ اس آغوش کی طرف دیکھو آمنہ جس نے اس زندگی کے تپتے ہوئے ریگستان کی لو تک تمہیں نہیں لگنے دی ہے۔ میری طرف دیکھو آمنہ۔ میں بچپن میں بھی تم سے مار کھاتی رہی۔ لڑکپن میں بھی تم مجھے برا بھلا کہتی رہیں، جوانی کے صحرا میں تم نخلستانوں کی تلاش کرتی رہیں اور ایک سراب سے دوسرے سراب کی طرف مجھے بھی اپنے ساتھ ہم سفر رکھا اور آج ہمیں ان تمام وفاؤں کا صلہ تم یہ دے رہی ہو۔ آمنہ لوٹ آؤ۔ لوٹ آؤ ہماری طرف، ہماری محبت ہماری ہمت آج بھی تمہیں سہارا دے سکتی ہے۔ سلمان بھائی تو بے وفا تھے، بے وفا تھے، میری بجو کا ساتھ چھوڑ گئے۔ میری بجو سے روٹھ گئے" "بے وفا بے وفا" اور میں بلک بلک کر رو رہی تھی۔ ساتھ ہی منّے نے بھی زور زور سے رونا شروع کر دیا تھا۔

آمنہ باجی نے اپنے دونوں سرد ہاتھوں سے میرا منہ اپنے قریب کھینچتے ہوئے کہا۔

"درانہ قسم دو۔ اسے اپنا سمجھو گی۔ اس کی ماں کا نام درانہ ہے۔ یہ روتا نہ رہے گا۔ قسم دو درانہ۔ ق ... س ... م ...."

اور ان کا چہرہ خود بخود کعبہ کی طرف ڈھلک گیا اور باجی کے پہلو سے روتے ہوئے ننھے کو اٹھا کر اپنے کمرے کی طرف بوجھل قدموں سے لوٹ آئی۔

جذبات اور احساسات سب کچھ گڈمڈ ہو گئے تھے۔ میرے آنسو منجمد ہو چکے تھے۔

دوسرے دن صبح پھر آمنہ باجی کو نہلا دھلا کر دلہن بنا کر سلمان بھائی کے پہلو میں چھوڑ آئے۔

منّا سارا دن بلکتا رہا، روتا رہا، میں نے بازاری دودھ کئی بار اسے پلانے کی کوشش کی لیکن وہ روئے جا رہا تھا، امی نے کئی مرتبہ منّے کو لینا چاہا لیکن میں نے انہیں ایک بار بھی منے کو چھونے نہ دیا۔

دوسری رات ڈھل رہی تھی۔ منا رو رو کر ہلکان ہو چکا تھا۔ سسکیاں بھر رہا تھا اور مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے وہ بھی دم توڑ رہا ہو، میں نے بھی اندھیرے میں ہی سسکیاں لینی شروع کر دیں۔ میرا گلا رندھ چکا تھا، میری چھاتی میں درد ہو رہا تھا، میرے سینے کے اندر اک ہلچل سی مچی تھی اور میں زیر لب کہہ رہی تھی۔ "تو اتنا ظالم تو نہیں ہے؟ ایک ہی گھر کی طرف تیری کیوں نظر ہو گئی ہے؟ میں بھی تو عورت ہی ہوں، کنواری ہوں تو کیا ہوا، ماں تو بن سکتی ہوں" ——— اے مریم کے خدا تو اگر حضرت مریم کے ہاں حضرت عیسٰی بغیر کسی مرد کے پیدا کر سکتا ہے تو کیا ایک کنواری کی چھاتیوں میں دودھ نہیں بھر سکتا؟ بول اے مریم کے خدا بول۔ میرا یہ بچہ بھی کیا ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جائے گا! کیا عمر بھر ندامت کی زندگی بسر کرتی رہوں گی؟ کہ بہن کے ساتھ کیا ہوا عہد بھی پورا نہ کر سکی؟" میری چھاتی میں اور بھی زیادہ درد شروع ہو گیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے سینے کے اندر کوئی چیز ٹھاٹھیں مار رہی ہو، میں نے دیوانگی اور وارفتگی کے عالم میں اپنی قمیص اٹھا کر روتے ہوئے منے کو اپنی ننگی چھاتیوں کے ساتھ لگا کر بھینچا اور پھر مجھے ایسا لگا کہ جیسے میری چھاتیاں پھٹ جائیں گی، میں نے اپنی ایک چھاتی منے کے منہ دے دی، تھوڑی دیر تو وہ روتا رہا ——— اور پھر اس نے چسکیاں لینی شروع کر دیں ——— منا غٹا غٹ دودھ پی رہا تھا ——— اک طوفان

کے بعد اک خاموشی تھی ـــ منا میرے پہلو میں لیٹا میٹھی نیند سو رہا تھا اور میں اپنی سسکیوں کے درمیان اپنی انگلیاں اپنے دانتوں میں دبائے آہستگی سے کہتی جا رہی تھی :-

اے مریم کے خدا ـــ اے مریم کے خدا ـــ اے مریم کے خدا "

بلونت سنگھ

—— دُور تک نقشِ قدم، نقشِ قدم، نقشِ قدم

ابھی گاڑی اسٹیشن سے کافی دور تھی، جبکہ مسٹر ہانڈہ نے ریل کے ڈبے کا دروازہ کھولا اور دونوں طرف کی سلاخوں کو پکڑ کر کھڑے ہو گئے۔ شہر کی فیکٹریوں کی دھواں اڑاتی ہوئی چمنیاں دُور ہی سے دکھائی دینے لگی تھیں۔ رفتہ رفتہ غریبوں کے کوارٹر اور امیروں کی کوٹھیاں بھی نظر آنے لگیں۔

مسز ہانڈہ باتھ روم میں لباس تبدیل کر رہی تھیں، بلکہ میک اپ کر کے پوری اوور ہالنگ کر رہی تھیں۔ چالیس سال کے آس پاس ہونے کے باوجود بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ کسی زمانہ میں وہ بھی مہکتی کلی رہی ہوں گی۔ خود ہانڈہ صاحب بھی بڑھاپے کی جوانی —— یعنی پچاسویں سال میں داخل ہو چکے تھے۔ سر پر آنے والے گنج کے آثار دکھائی دینے لگے تھے۔

رتنا، مسز ہانڈہ، اب بھی اتنی ہی اَن پڑھ تھیں جتنی کہ شادی کے موقعہ پر تھیں۔ لیکن اب وہ اَن پڑھ نہیں رہی تھیں۔ شوہر صاحب کاروباری آدمی تھے۔ بڑے بڑے بیوپاریوں اور افسروں سے میل جول رکھنا پڑتا تھا۔ اس لیے انہوں نے بیوی کو چھری کانٹے سے لے کر آئی ایم سوری، پلیز، ہاؤ نائس —— تک سب کچھ سکھا دیا تھا۔ رتنا کو ان باتوں میں جلد ہی مہارت حاصل ہو گئی۔ اس کی بول چال، رکھ رکھاؤ، نشست و برخاست سے یہ اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا کہ وہ جاہل تھیں۔

گاڑی کھٹا کھٹ بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں دُور سے دھوپ میں نہایا پلیٹ فارم دکھائی دینے لگا۔

ہانڈہ صاحب اپنے پرانے دوست مسٹر سُوری کے بیٹے کی شادی پر جا رہے تھے۔ کلکتہ میں وہ اپنے کاروباری معاملات میں اس قدر پھنسے ہوئے تھے کہ ان کا وہاں سے دو دن کے لیے نکلنا بھی ناممکن تھا۔ لیکن سُوری ان کی لاچاری کو خاطر میں لانے والے نہیں تھے، انہوں نے لکھ دیا کہ تم نہیں آؤ گے تو لڑکے کی شادی روک دی جائے گی۔ ہانڈہ صاحب جانتے تھے کہ سُوری ہٹ کا پکا ہے، اس لیے انہیں ہتھیار ڈالنے پڑے۔ رتنا نے بھی زور دیا تو ہانڈہ صاحب سارا کام کاج چھوڑ کر چل دیئے۔ سُوری نے زور دیا کہ انہیں کم از کم آٹھ دن تک ان کے یہاں رہنا پڑے گا۔

سُوری صاحب اپنے زمانہ کے چھیلا مانے جاتے تھے۔ ان کی صحبت میں ہانڈہ صاحب نے بھی بہت موج ماری، لیکن کاروبار میں پڑ کر ان کی ساری رنگین مزاجی ہوا ہو گئی۔ سارے رنگ دُھل گئے یا پھیکے پڑ گئے۔ ان رنگین دنوں کی یاد کبھی آ جاتی تو دل میں ایک ہُوک سی اُٹھتی۔

پلیٹ فارم قریب سے قریب تر آ گیا۔ کافی بھیڑ تھی۔ مسٹر ہانڈہ نے گھوم کر باتھ روم کے آدھ کھلے دروازے کی طرف دیکھا وہ چلا کر بولے "شریمتی جی! ہم اسٹیشن پر پہنچ گئے ہیں۔ باہر تشریف لے آئیے۔ ایسا نہ ہو کہ میں تو نیچے اُتر جاؤں اور آپ کو گاڑی کا

انجن اغوا کر لے جائے "
اس وقت ان کے فرسٹ کلاس کے ڈبہ میں اور کوئی نہیں تھا چنانچہ ان دونوں کی نوک جھوک ہونے لگی ــــ اتنے میں گاڑی رک گئی۔ مسز ہانڈہ کا خیال تھا کہ شادی کی گہما گہمی میں سوری صاحب خود تو اسٹیشن پر نہیں آئے ہوں گے۔ انہوں نے اپنے لڑکوں میں سے کسی کو بھیج دیا ہوگا۔ لیکن معاً بھیڑ میں سوری صاحب دکھائی دیئے۔ ان کے ساتھ کچھ اور رشتہ دار اور دوست بھی تھے، پچاس برس پھاند جانے پر بھی ان کی شخصیت میں بانکپن اور کشش موجود تھی۔ اپنے چکن کے کرتے اور اُجلے پائجامہ میں وہ بہت پیارے لگ رہے تھے۔ سر کے بال اداکاروں کے ڈھنگ پر کٹے ہوئے تھے۔ اب بھی بالوں میں مہک پری تیل لگاتے تھے۔ دونوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو ان کے ہاتھ ہوا میں لہرانے لگے۔

گاڑی کے رُکتے ہی سوری صاحب ان کے ڈبہ کے سامنے پہنچ گئے۔ ہانڈہ صاحب پلیٹ فارم پر پاؤں بھی نہ رکھ پائے تھے کہ سوری صاحب نے انہیں بازوؤں میں دبوچ لیا۔ حسب عادت سُوری نے فلک شگاف قہقہہ لگایا تو ہانڈہ صاحب نے محسوس کیا کہ اچھا ہی ہُوا جو وہ وہاں چلے آئے۔ کاروبار تو چلتے ہی رہتے ہیں۔

مِسز ہانڈہ دکھائی نہیں دیں تو سوری جی نے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھا "کہو یار! بھابی کو نہیں لائے؟"
اتنے میں رتنا باتھ روم سے نکل کر دروازے میں آکھڑی ہوئی۔ جوں جوں عمر بڑھی ان کے کپڑوں کی تڑک بھڑک بھی بڑھتی، ساتھ ہی ساتھ چہرہ کی لیپا پوتی پر زیادہ سے زیادہ وقت صرف ہونے لگا۔ ان کی جگمگاہٹ سے ایک بار تو سب کی آنکھیں جھپک گئیں ــــ سُوری صاحب کا حکم پا کر قلی ڈبے میں گھس گئے اور سامان اٹھا لائے۔ کچھ لوگوں نے سوری صاحب کے اشارے پر ہانڈہ صاحب اور رتنا کے گلے میں پھولوں کے ہاتھ پہنا دیے۔ مسز سُوری نے پیار سے رتنا کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیے اور اس طرح یہ چھوٹا سا قافلہ اسٹیشن سے باہر نکلا۔ مسٹر ہانڈہ اور ان کی بیوی نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ ان کا استقبال لیڈروں کا سا کیا جائے گا۔
سُوری صاحب کی پُرانی عادت تھی کہ جس کسی کو دوست بناتے اسے بانس پر چڑھا دیتے اور جس کسی کے دشمن بن جاتے اسے اندھے کنوئیں میں دھکیل کر دم لیتے۔ میانہ روی سے ان کا کوئی سروکار ہی نہیں تھا۔
مانگی ہوئی بڑی سی اسٹوڈی بیکر کار میں اپنے مہمانوں کو بٹھا کر سوری صاحب کوٹھی پر پہنچے۔ وہ کار خریدنے کی توفیق رکھتے تھے۔ لیکن جب تک مانگے تانگے سے کام چل رہا تھا، چلائے جا رہے تھے۔
نہ جانے کتنی بار سوری صاحب نے یہ بات دہرائی "یار! تم نہیں جانتے کہ تمہارے آنے سے مجھے کس قدر مُسرّت کا احساس ہو رہا ہے۔ اگر تم اس موقعہ پر دھوکا دے جاتے تو یاد رکھتے ساری عمر میں تمہارا مُنہ نہ دیکھتا" پھر "ارے ہاں بچّوں کو ساتھ کیوں نہیں لائے؟"

ہانڈہ صاحب کو آخری فقرہ کا جواب نہیں سوجھا تو سوری صاحب بول پڑے "اوہ! سمجھا۔ تم نے سوچا ہوگا کہ کچھ دن بیوی کے ساتھ بچّوں سے الگ تھلگ کیوں نہ گزارے جائیں۔ کوئی ہرج نہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے "
ہانڈہ صاحب احتجاج بھی نہیں کر سکے کہ ان کے دل میں یہ بات نہیں آئی تھی۔ اور اگر وہ احتجاج کرتے بھی تو سوری صاحب

باور نہ کرتے۔ انہیں چپ پاکر سوری جی نے زور کا قہقہہ لگاتے ہوئے بغل میں بیٹھی اپنی بیوی کی چٹکی لے لی۔ پھر بولے "یار ہانڈہ! میں نے تو طے کرلیا ہے کہ جب شادی کے بعد ہمارا بیٹا کہیں ہنی موُن منانے جائے تو میں بھی اپنی بیوی یعنی تمہاری بھابی کو لے کر کہیں ہنی مون نمبر دو منانے کے لیے چلا جاؤں .. .. لیکن تمہاری بھابی مانے گی کہاں؟

اس پر مسز سوُری نے ماتھے پر بل ڈال کر شوہر کی طرف دیکھا۔ سوُری صاحب بولے "شریمتی جی! مجھے گھورتی کیوں ہو؟ میں تمہیں بھگا کر تو نہیں لایا۔ تم سے باقاعدہ شادی کی" تمہاری بے قاعدہ حرکتوں کو باقاعدہ برداشت کیا۔ یعنی شوہر میں جتنی صفات ہونی لازمی ہیں، وہ مجھ میں ہیں .. .. ۔ میں تو اپنے آپ کو پیدائشی شوہر سمجھتا ہوں۔ جس طرح پیدائشی شاعر ہوتے ہیں پیدائشی ادیب .. .. ۔"

ان کی نوک جھونک پر مسٹر اور مسز ہانڈہ مسکرا دیئے۔ سوُری جی کا یہی اندازِ گفتگو تھا۔ چھیڑ چھاڑ۔ کھینچ تان، چہل بازی ان کی سرشت میں داخل تھی۔ کئی برسوں کے بعد وہی ناٹک اپنے سامنے ہوتے دیکھ کر مسٹر ہانڈہ کو مزہ آگیا۔ انہوں نے سوچا کہ اگر آٹھ دس دن اسی طرح گزر گئے تو وہ تازہ دم ہو کر پھر اپنے کام میں جٹ سکیں گے۔

کوٹھی دلہن کی طرح سجی ہوئی تھی۔ رنگ برنگی جھنڈیاں۔ لاوڈ سپیکر اور دیگر گہما گہمیاں۔ سوُری صاحب نے یہ کوٹھی نئی نہیں بنوائی تھی بلکہ پرانی ہی خریدی تھی۔ سستی مل گئی۔ اس کے چاروں طرف اتنی زمین چھوٹی ہوئی تھی کہ اس پر ایسی پانچ کوٹھیاں اور تعمیر ہو سکتی تھیں۔ سوری صاحب کا پرنٹنگ پریس کافی آمدنی پیدا کر رہا تھا۔ اس لیے نہ صرف پرانی کوٹھی پر نیا رنگ و روغن چڑھایا گیا بلکہ اس کے آگے نیا پورٹیکو اور کچھ کمروں کا اضافہ بھی کیا۔ ان کے ذہن میں یہ بات بھی تھی کہ لڑکوں کی شادیاں ہو جانے پر انہیں الگ الگ حصوں کی ضرورت ہوگی۔

دنیادار ہوتے ہوئے بھی سوُری جی دنیاداری کی چکی میں پس نہیں رہے تھے۔ وہ زندہ دل تھے۔ خود بھی خوش رہتے اور دوسروں کو بھی خوش رکھتے۔ ان کی یہ عادت تھی۔ ہر کام بڑے اہتمام سے کرتے۔ انھوں نے شادی کے سلسلے میں بھی کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی۔

مسٹر اور مسز ہانڈہ کے لیے الگ کمرے کا انتظام کر دیا گیا تھا جس میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ اس کمرے میں پہنچ کر سوری صاحب نے ہانڈہ جی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا "میری کوٹھی بہت بڑی ہے۔ اس وقت بھیڑ کا یہ عالم ہے کہ میں کسی کو بھی الگ سے کمرہ نہیں دے سکا۔ لیکن یار! تمہارا مجھے اتنا خیال ہے کہ تمہارے لیے الگ کمرہ مخصوص کر دیا ہے تاکہ تمہیں کوئی تکلیف نہ ہو۔ اوے! دیگر لوگوں کی بات چھوڑو — خود دولہا کے باپ کے رہنے کا ٹھکانا نہیں ہے مگر تمہارا رتبہ باپ سے بلند تر ہے!"

سوُری صاحب کا قہقہہ گونجا۔ ہانڈہ صاحب نے کچھ کہنا چاہا تو انہوں نے اپنے مہمان کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے پھر کہا "دیکھو دیکھو، اب تھینک یو کہہ کر مزا کر کرا مت کر دینا — تم تو جانتے ہی ہو کہ میں نہ کسی کا احسان مانتا ہوں اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ کوئی میرا احسان مانے — بات کو سمجھا کرو .. .. بھئی!"

تب رازکی بات کہنے کے لیے سوری صاحب اپنا منہ ہانڈہ کے کان تک لے جاکر بولے "کپڑے وپڑے بدل کر آؤ گے تو تمہیں وُہ وُہ مال دکھاؤں گا کہ عمرِ رفتہ کو آواز دیتے دیتے تمہارا گلا بیٹھ جائے گا۔"

اس وقت سوُری جی کی بیوی رتنا سے بات چیت کر رہی تھی۔ سوُری صاحب اپنی بیگم سے کہنے لگے "آیئے شریمتی جی!

ہم چلیں - اس جوڑے کو کچھ تنہائی بھی میسر آنی چاہیئے ۔۔ ہاہا ۔۔ ہاہا!"

دونوں کمرے سے باہر نکل گئے تو سوری صاحب کی آواز سنائی دی "گھر میں جو نئے دو مہمان آئے ہیں۔ ان کے ناشتہ کا جلد از جلد انتظام ہونا چاہیئے"

پانڈہ صاحب سمجھ گئے کہ یہ الفاظ انہیں کو سنانے کے لیے کہے گئے ہیں۔ تنہا رہ جانے پر مسز پانڈہ بولی "مجھے تو بھوک لگی ہے۔ صبح سے ایک ایک کپ چاے اور دو نمکین بسکٹ کھائے ہیں"

"تم نے سنا نہیں سوری شوبھا سے کیا کہہ رہا تھا؟"

"سن لیا ——— شوبھا کچھ لائے تو ۔ ۔ ۔ ۔ "

"مجھے معلوم ہوتا تو صبح ہی تمہارا پیٹ بھر ناشتہ کروا دیتا"

"خیر کوئی بات نہیں ——— پہلے آپ نہا لیجئے۔ پھر میں نہالوں گی۔ اتنے میں ناشتہ بھی آجائے گا"

وہ نہا چکے تو سوری صاحب دروازے پر دکھائی دیئے۔ ساتھ شوبھا ہاتھ میں دو بڑی بڑی طشتریاں تھامے کھڑی تھی اور ان کے پیچھے نوکر بڑے سے ٹرے میں کھانے کی چیزیں اور چاے کا سامان لیے کھڑا تھا۔ آتے ہی انہوں نے پوچھا "تو گویا آپ نہا دھو چکے؟"

"ہاں بھئی! اب دل تو چاہتا ہے کہ کچھ کھا پی کر سو جاؤں ۔۔ رتنا کو نیند نہیں آئی وہ کام کاج میں بھابی کا ہاتھ بٹائے گی"

"نہیں، نہیں ——— سونے کا تو نام نہ لو۔ میں اتنا شریف میزبان نہیں ہوں کہ تمہیں چین کی نیند سونے دوں۔ کیسی غیر شاعرانہ باتیں کرتے ہو یار میرے ۔۔ لو، پہلے ناشتہ کرلو، پھر میں تمہیں کان سے پکڑ کر اپنے کمرے میں لے جاؤں گا"

سوری صاحب نے معاً آگے بڑھ کر سرگوشی میں کہا "میرا کمرہ راجہ اندر کا اکھاڑہ بنا ہوا ہے آجکل"

دونوں خواتین آپس میں اتنی مصروف تھیں کہ انہیں مردوں کی سازش کا کچھ بھی علم نہیں ہوا۔ کھانے پینے کا سامان میز پر چن دیا گیا تو سوری صاحب نے پھر شوبھا کا بازو تھام کر کہا "آؤ ابھی تھوڑی دیر کے لیے چلتے ہیں۔ ہمارے سامنے یہ لوگ مارے شرم کے پیٹ بھر کر ناشتہ بھی نہیں کریں گے۔ ہاہا! ہاہا!"

چاے پیتے وقت رتنا بولی "آپ نے یہ کیوں کہہ دیا کہ آپ تو سونا چاہتے ہیں اور مجھے نیند نہیں آئی اس لیے میں کام کاج میں شوبھا کا ہاتھ بٹاؤں گی۔ ابھی تو مجھے بھی نیند آرہی ہے ۔۔"

"میرے کہنے سے کیا ہوتا ہے؟ یہاں تو معاملہ ہی الٹا پڑ گیا تم تو سو سکو گی، لیکن مجھے وہ جمدوت اپنے ساتھ لے جائے گا"

"ٹھیک ہی تو ہے جو دوسروں کے لیے گڑھا کھودتا ہے خود ہی اس میں گرتا ہے ——— یہ تو پرانی کہاوت ہے آپ نے سنی ہی ہوگی ——— اچھا یہ تو بتایئے کہ آپ لوگ آپس میں اسکول کے بچوں کی طرح کھسر پھسر کیوں کرنے لگتے ہیں؟"

"کیا کہتی ہو؟ ۔ میں نے کیا کھسر پھسر کی! سوری کی تو بچپن سے عادت ہی ایسی ہے"

ناشتہ کے بعد نوکر ہانڈہ صاحب کو بلانے آگیا۔ صرف ہانڈہ صاحب اس کے ساتھ سوری صاحب کے کمرے میں پہنچ گئے۔ وہاں شوبھا بھی کھڑی تھی۔ اس نے پوچھا "رتنا جی کیا کر رہی ہیں؟ اکیلی بیٹھی ——؟"

"میرے خیال میں وہ سونے جا رہی ہیں، اور میں ——"

سوری صاحب بیچ میں بول اٹھا "میری پیاری شریمتی جی! ابھی آپ میری پیاری بھابی کو سونے دیجئے۔ بے چاری تھکی ہوئی ہوں گی۔"

شوبھا نے شوہر کی طرف تیکھی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا "تو آپ کے دوست تھکے ہوئے نہیں ہیں؟"

"اوہ! ان کی تھکاوٹ تو میں چٹکیوں میں دور کر دوں گا۔"

شوبھا مسکرا کر رسوئی گھر کی طرف چل دی۔

سوری صاحب نے چاندی کی پلیٹ میں رکھے ہوئے پان اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا "بہت اچھے پان ہیں۔ منہ میں رکھو تو بتاشے کی طرح گھل جاتے ہیں۔ ان کا سرور پاؤں کے ناخنوں تک پہنچتا ہے۔ دو کھاؤ۔"

ہانڈہ صاحب نے دو پان اٹھاتے ہوئے پوچھا "اتنے بڑھیا پان آئے کہاں سے؟"

"دو نہیں، کم سے کم چار پان تو کلے میں دباؤ —— اچھے پان کے پتے تو مل ہی جاتے ہیں۔ لیکن پان لگانے کا ہنر بھی کسی کسی کو ہی آتا ہے۔ یہاں بھی ایک پان لگانے والی پہنچ گئی۔ رشتہ سے میری سالی لگتی ہے۔ ہائے! کیا پان لگاتی ہے انہیں کھاؤ اور اس کے ہنر کی داد دو۔"

ہانڈہ صاحب نے دو پان اور منہ میں رکھ لیے۔ سوری نے کہا، چلو، تمہیں گھما پھرا کر پہلے ساری کوٹھی تو دکھا دوں۔ میں نے اس میں کچھ تبدیلیاں تو کی ہیں اور کچھ کرنی چاہ رہا ہوں۔ تم سے صلاح مشورہ بھی ہو جائے گا۔"

سوری جی کی بات ختم بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ دروازہ کھلا اور لمبے قد کی، قریب بائیس برس کی خاتون کمرے میں تشریف آور ہوئیں۔ ہانڈہ صاحب کو وہاں دیکھ کر نووارد پہلے کچھ جھجکی، پھر منہ پھیر کر لوٹنے لگی تو سوری صاحب نے بلند آواز میں کہا "تم کہاں بھاگی جا رہی ہو؟ ایم اے پاس لڑکی ہو کر دیہاتنوں کی طرح جھینپ رہی ہو —— ان سے ملو۔ یہ میرے جگری دوست مسٹر ہانڈہ ہیں۔ ان کا ذکر میں پہلے بھی تم سے کر چکا ہوں۔ اتفاق سے ابھی ابھی تمہارا ہی ذکر ہو رہا تھا۔"

وہ رک گئی اور اس نے گورے گورے ہاتھ جوڑ کر ہانڈہ جی سے نمستے کی۔ پھر سوری صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے بولی "میرا ذکر کیوں ہو رہا تھا؟"

"اس لیے کہ تم قابلِ ذکر ہو۔ میں نے انہیں بتایا کہ آج کل ہمارے یہاں ایک بڑی ہی پان باز لڑکی آئی ہوئی ہے۔"

"آپ نے مجھے پان والی بنا ڈالا؟"

سوری جی نے اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے ہانڈہ صاحب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "اس کا نام کلپنا ہے —— کلپنا کا مطلب سمجھے؟ ... یعنی تخیل! ... تصور! ..."

سُوری صاحب نے تامّل کیا تاکہ جو مطلب انہوں نے سمجھایا تھا وہ ہانڈہ صاحب کے ذہن نشین ہو جائے۔ پھر بولے "یہ باور کرنا مشکل ہے کہ فی الحقیقت ایسی لڑکی ہو سکتی ہے۔ شکل دیکھو تو کلپنا، باتیں سنو تو کلپنا، پان کھاؤ تو کلپنا ——— سو بھائی، انہیں محض پان والی مت سمجھ لینا۔"

اس پر وہ تینوں ہنس دیئے۔

سوری صاحب نے کلپنا سے کہنا شروع کیا "میں انہیں کوٹھی دکھانے جا رہا ہوں۔ انہوں نے اسے تب دیکھا تھا جب میں نے اُسے شکستہ حالت میں خریدا تھا۔ اب اس کی کایا پلٹ دیکھ کر میرے یار کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ ابھی، آگے آگے دیکھئے ہوتا ہے کیا۔"

کلپنا ڈنلپ پلو والے دیوان پر بیٹھ چکی تھی، لیکن سُوری صاحب کی بات سُنتے ہی اُٹھ کر کھڑی ہوتے ہوئے بولی "اچھا تو میں چلتی ہوں۔" سوری صاحب بولے "ارے! میرا یہ مطلب نہیں تھا۔ ۔ ۔"

"میں بھی کام ادھورا چھوڑ کر آئی تھی۔ سوچا کہ آپ کے پانوں کا اسٹاک ختم نہ ہو گیا ہو۔"

"سچ مچ تمہیں میری کتنی فکر رہتی ہے!"

یہ کہتے کہتے سوری جی نے اپنی ہتھیلی کلپنا کی ٹھوڑی کے نیچے رکھ دی۔ اس پر کلپنا جھینپ گئی اور اس کے گال تمتما اٹھے۔ اس نے ٹھوڑی ان کی ہتھیلی سے سرکائی اور وہاں سے چل دی۔ جھٹکا لگنے پر پیچھے سے اس کی دبیز لمبی چوٹی ناگن کی طرح بل کھا کر لہرا گئی۔ جب تک وہ پردے کے پیچھے غائب نہیں ہو گئی وہ دونوں اسی کی طرف دیکھتے رہے۔

ہانڈہ صاحب عمر اور حالات کے اس دور میں تھے کہ اس قسم کی چھیڑ چھاڑ کا تصور بھی ناممکنات میں سے تھا۔ لیکن سوری جی کی یہ حرکات دیکھ کر انہیں بڑا عجیب سا لگا۔ حالانکہ سُوری جی عمر میں ان سے زیادہ تھے، بال بھی مقابلتہً زیادہ پک گئے تھے۔ لیکن لڑکپن کے کھلنڈرے پن کو وہ بخوبی نبھائے جا رہے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ان میں پہل کرنے کی جرأت تھی، جو کسی بھی مرد کے لیے لازمی ہے۔ جو کچھ سوری صاحب کر گزرتے تھے وہ ہانڈہ صاحب کی قوت سے باہر تھا۔ دوسرے ان کا خیال تھا کہ چونکہ رتنا حسین تھی۔ اس لیے ہانڈہ صاحب کو دائیں بائیں دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی کبھی۔ بھلا کون ایسا مرد ہو گا جو حسین ترین بیوی کے شباب کے ڈھل جانے کے بعد اِدھر اُدھر تاک جھانک نہ کرے لیکن ہانڈہ جی کو اتنی فرصت کہاں! فرصت ہو بھی تو پھر جرأت کہاں! ——— اور پھر ہر کسی کا یہ نصیب کہاں کہ سوری صاحب کی عمر میں بھی عورتوں سے پھاگ کھیلتے پھریں۔

معاً سوری صاحب نے ان کے کندھے پر ہاتھ مار کر پوچھا "کس سوچ میں ڈوب گئے یار؟"

ہانڈہ صاحب نے چونک کر سر کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا "نہیں کچھ بھی تو نہیں۔"

"ہا ہا ہا ہا ۔ ۔ میں تمہیں الزام نہیں دوں گا۔ بھلا ایسا کون مرد ہو گا جو کلپنا کو دیکھے اور کلپنا میں ڈوب نہ جائے!"

ہانڈہ صاحب سٹپٹا گئے۔ ان سے کوئی جواب بن نہیں پڑا۔ پھر سُوری صاحب نے ان کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا "اچھا چلو تمہیں کوٹھی تو دکھا لاؤں۔"

دوسرے کمرے میں پہنچے تو تیس پینتیس سال کی ذرا دہرے بدن کی ایک طرح دار خاتون دکھائی دی۔ سُوری صاحب کو دیکھتے ہی اس نے شاخِ گل کی طرح لچکنے کی زحمت اٹھاتے ہوئے دریافت کیا "آج آپ نے ناشتہ بھی کیا یا نہیں ؟ "

سُوری صاحب کی آنکھیں شرارت سے ناچ اٹھیں بولے ، "آج کل بس حسینوں کو دیکھ دیکھ کر جی رہا ہوں۔ بھوک پیاس کا احساس ہی مٹ گیا ہے ۔"

اس پر اس خاتون نے دونوں ہاتھ اٹھائے تو اس کی لال پیلی چوڑیاں کھنک گئیں، اور اس نے سُوری صاحب کو پیار بھرا دھکا دیتے ہوئے کہا "جائیے جائیے ! جھوٹے کہیں کے !"

یہ کہہ کر وہ ٹھمک سے آگے بڑھ گئی، اور سُوری جی نے دوست کی کمر میں چٹکی لیتے ہوئے کہا: "یہ بھی رشتے میں میری سالی لگتی ہے۔ دیکھنے میں بالکل رس گلّا لیکن اس کے اندر بارود بھرا ہے بارود !"

پانڈے صاحب مسکرا کر چپ ہو رہے ۔ انہیں تعجب ہو رہا تھا کہ سوری صاحب نے کتنا زبردست جمگھٹا اپنے یہاں اکٹھا کر لیا تھا۔ قریبی رشتہ داروں کے علاوہ بھی نہ جانے کون کون لوگ وہاں جمع تھے۔ جلسوں میں جانا ، دوسروں کے یہاں پارٹیاں کھانا، اپنے گھر میں پارٹیاں کھلانا ——— انہیں یہ سب کچھ بہت بھلا لگتا تھا۔ ان گنت عورتیں اور لڑکیاں بھی موجود تھیں۔ ان میں سے ہر ایک کو سُوری صاحب جانتے تھے اور ہر ایک سے کوئی نہ کوئی رشتہ گانٹھ رکھا تھا۔ ہر ایک سے چھیڑ چھاڑ اور چہل بازی کا سلسلہ جاری تھا۔

سُوری صاحب نے پہلے تو نیا باورچی خانہ دکھایا۔ وہاں رُک کر انہوں نے بڑے فخر سے کہا" دیکھو پانڈے ! میں نے کتنا بڑا رسوئی گھر بنوایا ہے ۔ یہاں ولائتی ڈھنگ کی اونچی اونچی بھٹیاں بھی ہیں اور دیسی ڈھنگ کے فرشی چولہے بھی، اسٹوو بھی ہیں اور مٹی کے تیل سے جلنے والے چولہے بھی۔ اسٹور روم ساتھ ہی ہے ۔ چینی کے برتن ، چھری کانٹے ۔ ڈنر سیٹ ، شربت سیٹ وغیرہ رکھنے کی الماریاں ذرا غور سے دیکھو یہ ریفریجریٹر میں نے نیا ہی خریدا ہے۔ دوسرے دروازے ہیں رسوئی گھر کے ۔ ایک کھوکی لکڑی کا، اور دوسرا باریک جالی دار دروازہ ——— تاکہ مکھیاں اندر نہ گھس سکیں...."

وہ رسوئی گھر کی خوبیاں بیان کر ہی رہے تھے کہ اتنے میں قریب کا دروازہ کھلا اور اٹھارہ انیس سال کی ایک لڑکی ۔ جس کا رنگ سانولا، آنکھیں موٹی موٹی تھیں، دودھ کا چھوٹا سا پتیلا دونوں ہاتھوں میں لیے اندر آئی تو سُوری صاحب سے ٹکرا کر لڑکھڑا گئی۔ انہوں نے فوراً لڑکی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر سہارا دیتے ہوئے کہا "ارے بے بی ! سنبھل کر چلو.. .. .. اگر کہیں کمر میں بل آجاتا تو ؟ ——— کیا ہے پتیلے میں ؟"

بے بی مسکرا کر بولی "چھوٹے بھیا کے لیے دودھ گرم کرنے جا رہی ہوں ۔"

سُوری جی نے بے بی کے گوری سے گال پر میٹھی سی چٹکی لیتے ہوئے کہا " اس عمر میں بہت سنبھل کر چلنا چاہیئے ، بے بی !"

وہ رسوئی گھر سے باہر آئے تو پانڈے صاحب نے دوست کے بازو کو دباتے ہوئے کہا" اسے تم بے بی کہتے ہو؟ وہ اٹھارہ انیس برس سے کم تو نہیں ہوگی ۔"

"میں ہی نہیں سبھی اسے اس نام سے پکارتے ہیں ۔۔ ۔ دیکھ لو، ماں باپ بھی اسے ابھی تک فراک پہناتے ہیں ـــــ تم میری طرف اس قدر گھور گھور کر کیا دیکھ رہے ہو؟ ۔۔ ۔ میں تو اس کا انکل ہوں انکل!"

کچھ آگے بڑھ کر سوری صاحب ہاتھ کے اشاروں سے بتاتے گئے کہ کہاں کیا بن چکا ہے اور کیا بننے جا رہا ہے۔

کوٹھی کے پچھواڑے سیمنٹ کے گول چبوترے پر کچھ عورتیں بیٹھی سبزیاں کاٹ رہی تھیں۔ ان میں سے کسی کو سوری صاحب نے بھابی کہا، کسی کو چاچی کسی کو مَوسی ـــــ لیکن چھیڑ چھاڑ کا ڈھنگ ایک سا ہی تھا۔ ان میں کلپنا بھی بیٹھی تھی۔ اس نے اپنا چہرہ دونوں گھٹنوں میں دبا رکھا تھا۔ اس پر نظر پڑتے ہی سوری جی بول اٹھے "ارے! یہ تم کیا کر رہی ہو؟ ۔۔ ۔ نام کلپنا، اور کام سبزی کاٹنا؟"

یہ سُن کر سب عورتیں کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

سوری صاحب قہقہے لگاتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ پھاٹک اور کوٹھی کے درمیان زمین کا بہت وسیع ٹکڑا پھیلا ہوا تھا۔ سوری صاحب نے کہا، "سوچتا ہوں یہاں کچھ کوارٹر بنوا کر کرایہ پر چڑھا دوں ۔۔ ۔۔ لیکن نہیں، پچھواڑے کی زمین دوسری سڑک کو چھو رہی ہے۔ وہاں کوارٹر بنوائے جائیں تو الگ الگ رہیں گے اور کرایہ بھی وصول ہوتا رہے گا ۔۔ ۔ کیوں، تمہارا کیا خیال ہے؟ میرا مطلب ہے کہ تمہاری رائے کیا ہے؟"

پانڈے صاحب چونکے۔ بھلا ان کی کیا رائے ہو سکتی تھی ۔ ان کا دھیان تو اور ہی طرف تھا۔ غالباً وہ کلپنا کی کلپنا میں ڈوبے ہوئے تھے۔ ایسی حسین، ایسی میٹھی لڑکی، پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی۔

انھیں اس طرح کھوئے کھوئے دیکھ کر سوری صاحب نے ان کی پیٹھ پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے کہا "اِیں تھک گئے ہو کیا! ۔۔ ۔۔ اچھا تو چلو میرے کمرے میں ـــــ دیکھو، میں تمھیں تنہا ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔ ہاں، میرے کمرے میں نیند بھی آئے تو بے شک سو سکو گے۔ رہی بھابی جی سے ملنے کی بات! اب ان کی تمہاری ملاقات رات کو ہی ہو سکے گی تم نہیں جانتے کہ عورتوں کو باتیں کرنے کا کتنا شوق ہوتا ہے۔ دیکھو نا، یہاں نہ جانے کتنے لمبے عرصہ کے بعد بھابی جی کو اتنی ساری عورتوں سے گپیں ہانکنے کا موقعہ ملا ہے۔ موج لینے دو۔"

پانڈے صاحب کی نیند تو اُڑ چکی تھی، لیکن وہ چاہتے تھے کہ آرام سے لیٹ کر سگرٹ کا دھواں اڑائیں۔ کمرے میں پہنچتے ہی وہ دیوان پر لیٹ گئے اور ایک مریل سا گاؤ تکیہ سر کے نیچے رکھ کر سگریٹ جلا لیا۔ آرام کرسی پر سوری جی نیم دراز ہو گئے۔ "کیوں پانڈے! بور تو نہیں ہو رہے؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔"

فی الحقیقت اب اپنے کمرے میں جا کر رتنا سے باتیں کرنے کو ان کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اس سے باتیں تو سدا ہی ہو سکتی تھیں، لیکن سوری کے قول کے مطابق اندر کا یہ اکھاڑہ پھر کہاں ملے گا۔ یہ بھی تو ممکن تھا کہ رتنا تھوڑا بہت اونگھنے کے بعد کسی کام میں جُٹ گئی یا گپیں ہانک رہی ہو۔

سوری صاحب نے غالباً دوست کی ہمت افزائی کے لیے کہا "جب ہم لنچ کے لیے بیٹھیں گے تو کلپنا ہمارے ساتھ ہوگی

کئی اور سالیاں بھی آئیں گی جنہیں دیکھ کر تم پھڑک اٹھو گے "

جہاں تک ہانڈہ صاحب کا تعلق تھا وہ پھڑکنے کی منزل سے گزر کر بسمل ہو رہے تھے۔

سُوری صاحب کا یہ کمرہ کوٹھی کے وسط میں تھا۔ چنانچہ اِدھر اُدھر آنے جانے کے لیے اکثر لوگوں کو ادھر ہی سے ہو کر گزرنا پڑتا تھا۔ سُوری صاحب کسی عورت کو بغیر دو چار باتوں کے وہاں سے نہ گزرنے دیتے۔ موقعہ محل دیکھ کر چھیڑ چھاڑ بھی ہو جاتی۔

کچھ دیر بعد کلپنا پھر آئی۔ اب کے وہ پان لگا کر لائی تھی۔ سُوری صاحب بولے "پانوں کے لیے شکریہ، لیکن کلپنا! تمہیں دو پان اپنے ہاتھ سے مجھے کھلانے بھی پڑیں گے"

اسی اثنا میں ایک خوبرو جوان اندر آیا۔ سُوری صاحب نے تعارف کراتے ہوئے بتایا "ہانڈہ صاحب! یہ لکی ڈاگ کلپنا کا پتی ہے —— دیکھو بھئی، تمہارے آنے سے پہلے میں تمہاری بیوی سے کہہ رہا تھا کہ اپنے ہاتھ سے دو پان میرے منہ میں ڈال دو لیکن نہ جانے تمہارے ہی ڈر کے مارے یہ اس بات سے کترا رہی ہے ... "

ہانڈہ صاحب کو اب معلوم ہوا کہ کلپنا شادی شدہ ہے —— نوجوان نے زور کا قہقہہ لگاتے ہوئے بیوی سے کہا عجیب ہو تم بھی! بڑے بھاجی کا اتنا سا کہنا بھی نہیں مانتی؟ بس جلدی سے دو پان ان کے منہ میں یوں ڈال دو جیسے لیٹر بکس میں لفافے ڈالے جاتے ہیں "

یہ سُن کر سُوری صاحب نے زور کا قہقہہ لگایا، اور اس موقعہ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے کلپنا نے ان کے منہ میں دو پان ڈال دیئے۔ پھر وہ شوہر کے ساتھ چلی گئی۔

سوری جی نے مڑ کر ہانڈہ صاحب کی طرف دیکھا "ارے یار! تم منہ پھلائے کیوں بیٹھے ہو؟ اس سنسار کی بھی کچھ موج لے لو۔ یہ دنیا آنی جانی ہے۔ فانی ہے — یہاں سب چلتا ہے"

ہانڈہ صاحب نے آنکھیں موند کر جواب دیا "براہِ راست نہ سہی لیکن تمہارے ذریعہ سے کافی موج لے رہا ہوں"

اتنے میں عورتوں کا ہی گروہ ادھر سے گزرا جو کچھ دیر پہلے سبزیاں کاٹنے میں مصروف تھا۔ سوری صاحب نے ان میں سے ایک بزرگ خاتون سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا "تائی! آج تو بڑی بانکی دکھائی دے رہی ہو تم ... "

تائی بولی "شادی تو تمہارے بیٹے کی ہو رہی ہے۔ لیکن تمہاری چہل بازی دیکھ کر لگتا ہے جیسے تمہارا بیاہ ہونے جا رہا ہو"

"تائی تم نہیں جانتیں کہ جب بیٹے کا بیاہ ہوتا ہے تو باپ کی جوانی بھی عود کر آتی ہے، اور اسے یوں لگتا ہے جیسے دوسری مرتبہ اس کی شادی ہونے جا رہی ہو ... کم از کم مجھے تو ایسا ہی محسوس ہو رہا ہے۔

اس پر سبھی عورتیں ہنس پڑیں۔ سُوری جی نے ہانڈہ جی کے کان میں کہا "ہنسی تو سمجھو پھنسی"

تائی نے ماتھے پر بل ڈال دریافت کیا "یہ کانا پھوسی کیا ہو رہی ہے! —— مرد ہو کر مردوں کی طرح ڈنکے کی چوٹ بات کیوں نہیں کرتے؟"

"تائی! مردوں کی طرح بات مَرد سے کی جاتی ہے۔ بھلا عورتوں سے بھی کوئی مردوں کی طرح بات کرتا ہے؟"

پھر زوردار قہقہے!

جب وہ چلنے کو ہوئیں تو سوری صاحب بولے "کہاں کو چلیں؟"

"گھر کے کام ادھورے پڑے ہیں"

"لیکن دیکھنے میں آپ کا گروہ قوالی گانے والیوں کی ٹولی سے کم نہیں لگتا"

"دھت! جلد ہی دادا کہلانے لگو گے —— اب تو مسخرہ پن چھوڑ دو"

"تائی! میں تو کافی سنجیدگی سے غور و خوض کرنے کے بعد مسخرہ بنا ہوں"

اس بات چیت کے دوران پانڈے صاحب کی آنکھیں نیم وا سی رہیں۔ ان کی ناک تک کئی رقسم کی خوشبوئیں پہنچیں تو عورتوں کے چلے جانے کے بعد بولے "یار! یہ خوشبو کیسی ہے؟"

"تم نے دیکھا نہیں؟ تائی کے ساتھ کئی بانکی ناریاں بھی تو تھیں۔ ۔۔ ۔۔ عطر میں بسی ہوئی"

پانڈے صاحب نے آنکھیں موندلیں تو سوری جی پھر بولے "ابھی سے چکرا گئے؟ کھانے کے موقعہ پر دیکھنا، کیسے کیسے سیلکٹڈ پیس (SELECTED PEICE) آتے ہیں۔

بے شک کھانے کے موقعہ پر سوری صاحب نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔ یہ بھی غنیمت رہا کہ اس وقت نہ شوبھا وہاں موجود تھی نہ رتنا! وہ دونوں بھیتر کے کمرے میں گھُسی گھنوں کپڑوں کے بارے میں صلاح مشورہ کر رہی تھیں —— نتیجہ یہ کہ سوری جی اور بھی کھُل کھیلے۔ آخر چھیڑ چھاڑ ہی تو تھی۔ ذومعنی۔ سہ معنی الفاظ کا استعمال بڑی بیباکی سے کیا جارہا تھا۔ ان کی باتیں سُن سُن کر خواتین کیسے کیسے ہنستیں، بل کھاتیں اور ایک دوسری کی جانب پُرمعنی نظروں سے دیکھتی تھیں۔ کلپنا پر ان کی خاص عنایت رہی تعلیمیافتہ ہونے کے باعث کلپنا ان کی باتوں کا بُرا بھی نہیں مانتی تھی۔

کھانا کھانے کے بعد پانڈے صاحب پر غنودگی کا غلبہ ہوا اور وہ اپنے کمرے میں آکر سو گئے۔ ڈھائی بجے کے سوئے سوئے شام کو ساڑھے چار بجے جاگے۔ سوتے وقت بھی وہ انھیں لڑکیوں کے خواب دیکھتے رہے جن کے ساتھ انھوں نے کھانا کھایا تھا جن کے منہ ہنستے پھولوں کی طرح کھل جاتے تھے۔ کلپنا کی صورت ان سب میں نمایاں رہی —— جب ان کی آنکھ کھلی تو کلپنا کا چہرہ ان سے دو فٹ کے فاصلہ پر ہی تھا۔ وہ ہڑبڑا گئے۔ سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ یہ خواب تھا یا حقیقت!

نہیں۔ کلپنا سچ مچ ہی ان پر جھکی شہد بھرے ہونٹوں سے کہہ رہی تھی "مجھے آپ کو جگانے کے لیے بھیجا گیا ہے۔ آیئے، چائے پر آپ کا انتظار ہو رہا ہے۔ جوں کے توں چلے چلیئے"

اتنا کہہ کر کلپنا نسیم سحری کے جھونکے کی طرح دروازے سے باہر نکل گئی۔ ۔۔ ۔۔ پانڈے صاحب نے گھبرا کر اِدھر اُدھر نظر دوڑائی یہ دیکھ کر انہوں نے اطمینان کی سانس لی کہ رتنا وہاں موجود نہیں تھی۔

رات کے ساڑھے گیارہ بجے تھے۔

ہانڈہ صاحب کپڑے بدل کر بستر پر بیٹھ چکے تھے۔ رتنا ان کے سامنے کھڑی تھی۔ انہوں نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا "آج تو ہم دن بھر نہیں مل پائے۔"

رتنا ذرا جھینپ کر بولی "کیا کرتی؟ شوبھا بہن ہر کام میں مجھ سے مشورہ لیتی رہیں! جو بات کسی اور سے نہیں کہہ سکتیں، وہ مجھ سے کہتی ہیں ... ... "

وہ بولتی جا رہی تھی لیکن ہانڈہ صاحب کا دھیان کسی اور طرف تھا۔ انہیں اپنی پتنی کے ہونٹ ہلتے دکھائی دے رہے تھے۔ لیکن باتیں نہیں سنائی دے رہی تھیں۔ زبان پر شکایت تھی لیکن دل میں مسرت۔ کیونکہ رتنا سے الگ رہ کر آج انہیں کیسی کیسی صورتیں دکھائی دی تھیں! کیسی کیسی شرابی آنکھیں ... ... جن کا نشہ اُترنے کو نہیں آ رہا تھا ــــ اور پھر ان سب کی ملکہ، کلپنا۔ سُوری جی نے جان بوجھ کر شام کے وقت کلپنا کو انہیں جگانے کے لیے بھیجا تھا۔ چائے کلپنا کے ساتھ، رات کا کھانا کلپنا کے ساتھ! ... ... اور اب خوابوں میں بھی کلپنا کا ساتھ!

رتنا ان کی باہوں میں تھی۔ کتنے برسوں کے بعد رتنا کے لیے ان کے دل میں وہی پرانی وحشیانہ طلب پیدا ہوئی تھی۔ باہر پھیلی چاندنی کے ہلکے پرتو میں رتنا اور کلپنا میں حدِ فاصل قائم کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ شاید خاوند کے بازوؤں کی غیر معمولی گرفت کو محسوس کر کے ہی رتنا کی آنکھوں میں نشہ سا آ گیا۔ یگ بیت گئے جب وہ اس تندی سے بغلگیر ہوتے تھے۔

معاً ہانڈہ صاحب کو خیال آیا کہ اس کوٹھی میں صرف حسین عورتیں ہی تو نہیں آئی تھیں بلکہ وجیہہ جوان بھی آئے ہوئے تھے۔ کیا رتنا کو دن بھر میں ایک بھی جوان اتنا نہ بھایا ہو گا جتنی کلپنا انہیں بھائی تھی؟

اس خیال سے ان کے دل میں گدگدی سی ہوئی، انہوں نے راز دارانہ لہجہ میں پوچھا "کون تھا ... وہ؟"

رتنا کے چہرے پر اُلجھن کے آثار پیدا ہوئے، اور وہ کسمسا کر رہ گئی۔

وصیّت

حکیم احمد شجاع

ایک آراستہ کمرہ ـــــ سامنے کی دیوار پر مُغلیہ لباس میں نواب والا جاہ کی تصویر ایک سنہری چوکٹے میں آویزاں ہے - اس کے نیچے مینٹل پیس پر پرانے زمانے کے خوب صورت گلدانوں میں پھول سجے ہیں - مینٹل پیس کے نیچے ایک خوب صورت تپائی پر ایک پرانی وضع کی صراحی اور چاندی کے آرائشی جام ہیں - کمرے میں ایک بیش قیمت قالین بچھا ہے - کمرے کے دائیں طرف ایک صوفہ سیٹ ہے - صوفے کے سامنے ایک چھوٹی سی خوب صورت میز رکھی ہے جس پر دو ایک کتابیں اور لکھنے کا سامان ہے - ساتھ ہی ایک دروازہ ہے جو محل سرا میں کھلتا ہے - کمرے کے بائیں طرف تین چار خوبصورت زینوں کے اوپر ایک پلیٹ فارم ہے جس پر ایک دروازہ ہے جو محل سرا کی دوسری طرف کھلتا ہے - اس کے پٹ کھلے ہیں اور پس منظر میں ایک منقش دیوار نظر آتی ہے - صوفے پر شہباز مرزا نواب والا جاہ مرحوم کا ایک معتبر مصاحب بیٹھا ہے - وہ ایک بھاری بھرکم جسم کا آدمی ہے اور اپنی وضع قطع سے بہت ہوشیار اور صاحبِ فراست معلوم ہوتا ہے - وہ ایک لمبے چوڑے کاغذ کو بڑے غور سے پڑھ رہا ہے اس کے چہرے اور پیشانی پر تشویش کے آثار ہیں اور اس کی حرکتوں سے بے چینی ظاہر ہوتی ہے - کاغذ کی تحریر کو ختم کر کے بڑی احتیاط سے اس پر نواب مرحوم کے جعلی دستخط ثبت کرتا ہے اور انہیں بڑے غور سے دیکھتا ہے - پھر میز پر سے ایک خورد بین اٹھاتا ہے اور ایک دستخط کا مقابلہ ایک دوسرے دستخط سے کرتا ہے جو ایک دوسرے کاغذ پر ہیں - پھر اطمینان کا سانس لیتا ہے اور کاغذ کو دیکھتے ہوئے کہتا ہے -

شہباز - اولاد کے لیے انسان کو کیا کچھ نہیں کرنا پڑتا -

(دائیں طرف کے دروازے سے نواب والا جاہ کی بیگم برجیس محل گھبرائی ہوئی داخل ہوتی ہے اور شہباز مرزا کے قریب جاکر بڑے رازدارانہ انداز سے کہتی ہے)

برجیس - جمیل کی باتوں سے صاف صاف ظاہر ہوتا ہے کہ نواب نے مرنے سے پہلے اسے کسی وصیّت کا پتہ دیا ہے -

شہباز - (بے پروائی سے) پھر؟ -

برجیس - (کسی قدر غصّے سے) پھر کیا! - وہ دیوار جس نے بیٹے کو باپ سے جدا کر رکھا تھا اب آن کی آن میں گر جائے گی -

شہباز - (مسکرا کر اور برجیس کے سر کی طرف اشارہ کر کے) جو دماغ ایک بوڑھے امیر کو بیوقوف بنا چکا ہے - ایک نوجوان امیر زادے کو بھی بے وقوف بنا سکتا ہے -

برجیس - مگر نواب کی وصیّت؟ -

شہباز (بے پروائی اور حقارت سے) کاغذ کا ایک پُرزہ ہے ـــــــــــ

برجیس (طنز سے بات کاٹ کر) جس پر ہماری قسمت موقوف ہے -

شہباز۔ (اطمینان سے) یہ سب تشویش بیکار ہے —— وصیت کی رو سے جمیل اپنے باپ کی جائیداد کا وارث صرف اس وقت قرار دیا جائے گا جب وہ میری بیٹی سے شادی کرے گا۔

برجیس۔ (حیران ہو کر) تمہاری بیٹی!۔

شہباز۔ ہاں۔ میری بیٹی۔

برجیس۔ (حیرت سے) وہ کہاں ہے۔

شہباز۔ (مایوسی سے) نہیں جانتا —— (کچھ سوچ کر اور رک رک کر) مگر شاید کبھی مل جائے —— (جلدی سے) اسی امید پر جی رہا ہوں۔

برجیس۔ (کچھ حیرت سے) تم نے اس کا ذکر آج تک نہیں کیا۔

شہباز۔ یہ ایک راز ہے جو نواب کے جیتے جی میں کسی کو نہ بتا سکتا تھا۔

برجیس۔ (بڑی بے صبری سے) اور اب۔

شہباز۔ بتا سکتا ہوں —— (بڑی گہری اور جذبات سے بھری ہوئی آواز سے) بیس برس گزر گئے میری بیوی میری بیٹی کو لے کر کہیں روپوش ہو گئی۔

برجیس۔ (حیرت سے) کیوں!۔

شہباز۔ ایک بدکار باپ کو اس کے گناہ کی سزا دینے کے لیے: ایک بدعہد شوہر سے اس کے جرم کا بدلہ لینے کے لیے۔

برجیس۔ (اور زیادہ حیرت سے) کیسا جرم —— کونسا گناہ؟ ——

شہباز۔ جس سے میں نے ایک عورت کی معصومیت کو جھوٹی قسموں اور کبھی نہ پورے ہونے والے وعدوں سے ٹھگا۔

برجیس۔ (حیران ہو کر) یہ عورت کون تھی؟۔

شہباز۔ ایک شریف گھرانے کی آبرو —— ایک معزز خاندان کی عزت ——

برجیس۔ (اور زیادہ حیران ہو کر) کون؟۔

شہباز۔ نواب والاجاہ کی بہن!۔

برجیس۔ (حیران ہو کر) نواب والاجاہ کی بہن!

شہباز۔ ہاں!

برجیس۔ (افسوس سے) مگر ایسا کیوں ہوا؟

شہباز۔ اس لیے کہ محبت کی آنکھ اندھی ہوتی ہے امیری اور غریبی میں تمیز نہیں کرتی۔ نواب کی بہن کو مجھ سے محبت ہو گئی۔ میں نے اس سے خفیہ طور پر شادی کر لی۔ مگر نواب کو جیتے جی اس بات کا علم تک نہ ہوا کہ اس کی بہن نے کس سے شادی کی اور کہاں چلی گئی۔

برجیس۔ (حیرت سے) پھر کیا ہوا؟

شہباز۔ (بڑی حسرت سے) آہ ——— وہ محل سراؤں کی لاڈلی جس نے ایک غریب شخص کی محبت کی خاطر اپنی دولت اپنی عزت اپنی آبرو برباد کی تھی۔ میری روز افزوں بدکاریوں سے تنگ آکر ایک بیٹی کا باپ ہوجانے پر بھی مجھے پہلے سے بہتر نہ پاکر میری بیٹی کو ساتھ لے کر کہیں غائب ہوگئی۔ میں نے دنیا کا کونہ کونہ چھان مارا مگر ان کا سراغ کہیں نہ ملا۔

برجیس۔ پھر؟۔

شہباز۔ اس امید پر کہ شاید نواب کا دل پسیج جائے یا میری بیوی پشیمان ہوکر محل سرا میں لوٹ آئے میں نے نواب کی خدمت میں رسائی حاصل کی اور رفتہ رفتہ ان کا سب سے زیادہ معتبر مصاحب بن گیا۔ بیس برس گزر گئے ہیں میں اسی امید پر جی رہا ہوں کہ شاید میری بیوی محل سرا میں آنکلے۔

برجیس۔ (کچھ خوش ہوکر) تو پھر اس موہوم امید پر تم مجھ کو نواب کی دولت سے کیوں محروم کر رہے ہو؟

شہباز۔ (حسرت سے) تم کو دولت کی ضرورت ہے اس لیے کہ تم نواب کی محل سرا میں عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہی ہو اور مجھ کو دولت کی ضرورت نہیں کیونکہ میری بیوی دنیا کے کسی گمنام گوشے میں شاید فاقوں سے مر رہی ہے۔

برجیس۔ اور اگر تمہاری بیٹی نہ ملی — تو وصیت کا کیا ہوگا۔

شہباز۔ (جلدی سے) تمہارے پہلے شوہر سے تمہاری بیٹی جو موجود ہے۔ تم جمیل کو کہہ دینا کہ نیلوفر میری بیٹی ہے (شہباز کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں) اور ایک بے رحم تقدیر کے ہاتھوں مات کھاکر میں بھی سمجھ لوں گا کہ نیلوفر میری ہی بیٹی ہے۔

برجیس۔ (جعلی وصیت نامے کو لینے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے) تو پھر یہ وصیت نامہ جمیل کو دکھا دینا چاہیئے۔

شہباز۔ (اس کے ہاتھ کو ہٹا کر اور کاغذ کو لپیٹتے ہوئے) ٹھہرو۔ قسمت کی بساط پر پہلا پانسہ نیلوفر ہی کو پھینکنے دو۔

برجیس۔ (کچھ سوچتے ہوئے) اور اگر وہ ہار گئی۔

شہباز۔ (بڑے اطمینان سے) تو پھر یہ وصیت نامہ موجود ہے۔ (اس مکالمے کے آخری حصے کو نیلوفر سن لیتی ہے جو بائیں طرف کے دروازے سے نکل کر اب سیڑھیوں کے پلیٹ فارم پر آگئی ہے۔ شہباز جعلی وصیت نامے کو لپیٹ کر دائیں طرف کے دروازے سے نکل جاتا ہے۔ نیلوفر سیڑھیوں سے اتر کر برجیس محل کے قریب آجاتی ہے۔)

برجیس۔ (اپنے آپ کو تسلی دیتے ہوئے) جو امید بیس برس سے بر نہیں آئی۔ اب کیا بر آئے گی۔ (نیلوفر سے) تم نے کچھ سنا؟۔

نیلوفر۔ (بے پروائی سے) میں سن رہی تھی۔

برجیس۔ (بڑی سنجیدگی سے) کچھ سمجھیں!

نیلوفر۔ (کچھ سوچ کر) سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

برجیس۔ (نیلوفر کو دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے مگر کنایہ نیلوفر کی طرف ہے) بہت خوب صورت ———

مگر بہت بدقسمت ۔

نیلوفر۔ کون ؟ ۔

برجیس۔ تم ۔ (! تمہارے سوا اور کون ہو سکتا ہے ۔)

نیلوفر۔ (حیران ہو کر) آپ کیا کہنا چاہتی ہیں ۔

برجیس۔ جو تمہیں سننا چاہیئے ۔

نیلوفر۔ کیا ——— ؟ ۔

برجیس۔ یہی کہ حسن دولت کے بغیر ایک بدقسمتی ہے ۔

نیلوفر۔ خدا آپ کو سلامت رکھے ——— میں بدقسمت کیوں ہونے لگی ۔

برجیس۔ (کچھ سمجھاتے ہوئے خیال ہی خیال میں) جس شخص کے پاس اپنی دولت نہ ہو صرف مفلس ہے مگر جو شخص دوسروں کی دولت کی کمزور بنیاد پر اپنی امیدوں کا محل تعمیر کرتا ہے ۔ مفلس بھی ہے اور بے وقوف بھی ———

نیلوفر۔ (کسی قدر طنز سے) تو میں قسمت سے کیسے لڑ سکتی ہوں ۔

برجیس۔ قسمت ! ——— نادان لڑکی قسمت ایک جھوٹ ہے جسے انسان ایک پرانی عادت سے مجبور ہو کر بولتا ہے ۔ قسمت ایک فریب ہے جس سے غریب اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں ۔

نیلوفر۔ (چونک کر) تو مجھے کیا کرنا چاہیئے ۔

برجیس۔ جو ہر حسین عورت کر سکتی ہے ۔ قدرت نے دولت کے سوا تمہیں سب کچھ دے رکھا ہے ۔ تم اپنی کوشش سے اس کمی کو پورا کر سکتی ہو ۔

نیلوفر۔ (بے بسی سے) یہ میرے بس کا کام نہیں ۔

برجیس۔ اسی لیے اسے کرنا چاہیئے ۔ دولت ، عزت ، ترقی کوئی شخص آسانی سے حاصل نہیں کر سکتا ہے ۔ گلاب کے پھول تک پہنچنے سے پہلے کانٹوں سے الجھنا پڑتا ہے ۔

نیلوفر۔ (کچھ نہ سمجھ کر) تو آپ کیا چاہتی ہیں ۔

برجیس۔ (کنائے سے کچھ سمجھاتے ہوئے) جس طرح بڑی بیگم بن گئی ۔ تم چھوٹی بیگم بن جاؤ ۔

نیلوفر۔ (کچھ حیران ہو کر) وہ کیسے ؟ ۔

برجیس۔ (بے اعتنائی سے) عورت سب کچھ کر سکتی ہے ۔

نیلوفر۔ مجھے سوچنے کے لیے وقت دیجئے ۔

برجیس۔ بیوقوف لڑکی سوچنے کی کچھ ضرورت نہیں ۔ وقت کسی کا انتظار نہیں کرتا ۔

(جمیل اور شہباز مرزا دائیں طرف سے داخل ہوتے ہیں ۔ ان کو دیکھتے ہی نیلوفر بڑے ناز و انداز سے دوڑ کر سیڑھیوں

پر چڑھتی ہے اور محل سرا میں چلی جاتی ہے۔ جمیل کے ہاتھ میں شہباز مرزا کی تیار کی ہوئی وصیت ہے)۔

جمیل۔ (شہباز مرزا کو مخاطب کرتے ہوئے) تو یہی ہے وہ وصیت جس کی بنا پر آپ میری جائداد پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔

شہباز۔ میں صرف آپ کو آپ کی جائداد کا قبضہ دلانا چاہتا ہوں۔

جمیل۔ میں ایسی وصیت کا پابند نہیں ہو سکتا۔

شہباز۔ اب تو جمیل میاں آپ کو پابند ہونا ہی پڑے گا۔ وصیت کی موجودگی میں اس کی تعمیل ضروری ہے۔ ہمارے بس کی بات نہیں قانونی مجبوری ہے۔

جمیل۔ کوئی مجبوری نہیں۔ یہ وصیت اباجان نے میری غیر موجودگی میں لکھی ہے۔ اگر میں ان کی آنکھوں سے دور نہ ہوتا تو وہ کبھی ایسا تحریر نہ کرتے۔

برجیس۔ (بے پروائی سے) خیر! اب تو وہ تحریر کر چکے۔ اب یا تو جمیل میاں تم نیلوفر سے شادی کرنے پر تیار ہو جاؤ اور یا اپنے باپ کی جائداد سے دستبردار ہو جاؤ۔

جمیل۔ جائداد میری جائز وراثت ہے میں اس سے دستبردار نہیں ہو سکتا۔

شہباز۔ مگر قانون کسی شخص کی ذاتی رائے سے تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔

جمیل۔ یہ جائداد اباجان کی جدی وراثت تھی اور اس لحاظ سے ان کے پاس ان کی زندگی تک امانت تھی۔

شہباز۔ اور اسی لیے اس امانت کے امین ہونے کی حیثیت سے انہوں نے جس کو مناسب سمجھا اس کا حقدار بنا دیا۔

جمیل۔ (بگڑ کر) ان کو یہ اختیار نہ تھا۔

شہباز۔ اس کا فیصلہ عدالت کرے گی۔ اگر آپ کو اس اختیار سے انکار ہے اور اپنا حق طلب کرنے پر اصرار ——— تو جائیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیے ——— اور جب آپ کی شنوائی ہو جائے تو اپنے حق کی قانونی سند لے کر آئیے۔

جمیل۔ قانونی سند کی آپ کو ضرورت ہے۔ قدرتی سند کے ہوتے ہوئے مجھ کو قانونی سند کی ضرورت نہیں۔

برجیس۔ قدرتی سند تمہارے ہی حق میں سہی ——— مگر قانونی سند اس کے حق میں ہے جس کے قبضے میں یہ تحریر ہے۔

جمیل۔ (وصیت نامے کو اپنی پشت کی طرف ہٹا کر) تو اس تحریر پر اس وقت میرا قبضہ ہے۔ (برجیس گھبرا جاتی ہے مگر عین اس وقت شہباز ہاتھ بڑھا کر وصیت نامے کو جمیل کے ہاتھ سے چھین لیتا ہے۔ جمیل پریشان ہو جاتا ہے۔

شہباز۔ (برجیس سے) آپ محل سرا میں تشریف لے جائیے۔ چھوٹے میاں کو میں سمجھا لوں گا۔

(برجیس چلی جاتی ہے اور زینے کی سیڑھیوں پر زور زور سے قدم رکھتی ہوئی محل سرا میں داخل ہو جاتی ہے۔

جمیل۔ (شہباز) آپ میرے معاملات میں دخل دینے والے کون ہیں اور اس ناواجب حرکت سے آپ کا کیا مطلب تھا۔

شہباز۔ (نہایت سنجیدگی سے) میں اس تحریر کی رو سے نواب صاحب کی جائداد کا محافظ اور ان کے وارثوں کا سرپرست ہوں (سمجھاتے ہوئے حکمتِ عملی سے) چھوٹے میاں! ابھی آپ نادان ہیں۔ ناتجربہ کار ہیں۔

جمیل۔ (طنز سے) مگر آپ تو بہت ہوشیار ہیں!۔

شہباز۔ (اسی فقرے سے فائدہ اٹھاکر) اسی لیے عرض کرتا ہوں کہ ہاتھ آئی ہوئی دولت کو یوں نہ ٹھکرایئے۔ اپنے باپ کی وصیت کو اس طرح ہنسی مذاق میں نہ اُڑایئے۔

جمیل۔ تو آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ لوگوں سے ڈر کر اپنے حق سے ہاتھ دھو بیٹھوں؟

شہباز۔ یہ کون کہتا ہے۔

جمیل۔ (پریشان اور خوش ہوکر) تو پھر آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟۔

شہباز۔ ذرا زمانہ سازی سے کام لیجیے۔

جمیل۔ مرزا صاحب!۔ آپ کا داؤ مجھ پر نہیں چل سکتا۔

شہباز۔ (بڑی مکاری سے) دولت حاصل کرنے کے لیے انسان کیسے کیسے سودے کرتا ہے اور یہ بڑے فائدے کا سودا ہے چھوٹے میاں! خیر۔ اس وقت آپ کی طبیعت پر غصہ غالب ہے۔ محل سرا میں جاکر ذرا آرام فرمایئے (برجیس محل اور نیلوفر جو دروازے کی آڑ میں کھڑی ہوکر سب باتیں سن رہی ہیں سامنے آجاتی ہیں اور نیلوفر کہتی ہے)۔

نیلوفر۔ آیئے آیئے۔ (نیلوفر ناز و انداز سے آگے بڑھ کر جمیل کو بڑے پیار سے کھینچتی ہوئی محل سرا میں لے جاتی ہے۔ شہباز مرزا اپنی کرسی پر آبیٹھتا ہے۔ دروازے پر دستک ہوتی ہے)

شہباز۔ آجاؤ۔

(ایک ملازم داخل ہوتا ہے)

ملازم۔ وکیل صاحب تشریف لائے ہیں سرکار!

شہباز۔ بلاؤ۔

(ملازم واپس جاتا ہے شہباز وصیت نامے کو غور سے پڑھنا شروع کرتا ہے۔ وکیل صاحب کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ ملازم دروازہ بند کر دیتا ہے)

شہباز۔ (اکڑ کر) آیئے وکیل صاحب۔ (کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) تشریف رکھیے۔

وکیل۔ تسلیمات عرض کرتا ہوں مرزا صاحب۔

شہباز۔ تسلیم۔

(وکیل کرسی پر بیٹھ جاتا ہے)

شہباز۔ میں نے آپ کو اس لیے تکلیف دی ہے کہ ذرا آپ نواب صاحب مرحوم کے اس وصیت نامے کو دیکھ لیجئے۔ قانون کے لحاظ سے اس میں کوئی قابلِ اعتراض بات تو نہیں ؟۔
(شہباز وصیت نامہ وکیل کو دے دیتا ہے۔ وکیل اسے پڑھنا شروع کرتا ہے)

وکیل۔ (وصیت نامہ پڑھنے کے بعد) معاف کیجئے مرزا صاحب۔ معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب مرحوم قانون سے بالکل واقف نہ تھے)

شہباز۔ (حیران ہوکر) کیوں۔ اس میں ایسی کیا بات ہے ؟۔

وکیل۔ (اپنی ڈاڑھی کھجاتے ہوئے) بات یہ ہے کہ مرزا صاحب۔ کہ نواب صاحب نہ تو اپنی بیگم کو اُن کے شرعی حق سے محروم کر سکتے تھے اور نہ اپنے بیٹے ہی پر اس کی جائز وراثت حاصل کرنے کے لیے کوئی شرط لگا سکتے تھے اور معاف کیجئے وہ ایک غیر شخص کو اپنی بیگم اور بیٹے کا سرپرست بھی مُقرر نہیں کر سکتے تھے۔ یہ وصیت نامہ کسی عدالت کے نزدیک بھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔

شہباز۔ (کچھ سوچنے لگ جاتا ہے) تو پھر اس کا کوئی علاج ؟۔

وکیل۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ آپ نواب صاحب کے صاحبزادے کو اپنی بیٹی سے شادی کرنے پر پیار اور محبت سے رضامند کرلیں اور بیگم صاحب کو ان کا شرعی حصہ دے دیں۔ ہاں آپ اس بات پر بھی زور نہ دیں کہ آپ ان کے سرپرست ہیں۔

شہباز۔ (کسی قدر غصّے سے) تو پھر آپ کس مرض کی دوا ہیں ؟۔

وکیل۔ (مسکراکر) کچھ ایسے مرض بھی ہوا کرتے ہیں مرزا صاحب جو لا علاج ہوتے ہیں۔

شہباز۔ (جیب سے ایک بٹوا نکال کر اس میں سے سو سو روپے کے دس نوٹ گن کر وکیل صاحب کو پیش کرتے ہوئے اور مسکراکر) مرض لاعلاج سہی ——— لیکن طبیب کو علاج کی کوشش تو بہر صورت کرنی چاہیئے۔

وکیل۔ (نوٹ سنبھالتے ہوئے خوشی سے) میں ہر ممکن کوشش کروں گا کہ اس وصیت نامے کے جواز کی کوئی قانونی صورت نکل آئے۔

شہباز۔ (اٹھ کر وکیل کو رخصت کرتے ہوئے) مگر اس میں دیر نہ کیجئے گا۔ وکیل صاحب۔

وکیل۔ (جاتے ہوئے) بھلا ایسا بھی کہیں ہو سکتا ہے کہ آپ کا کام ہو اور اس میں دیر کی جائے (چلتے ہوئے ذرا رک کر) مگر ہاں ! اس بات کا خیال رہے کہ اس وصیت نامے کو کوئی اور دیکھنے نہ پائے۔

شہباز۔ (کچھ سوچتے ہوئے) جس کو دیکھنا نہ چاہیئے تھا وہ تو اسے دیکھ چکا ہے۔

وکیل۔ (تسلی دیتے ہوئے) خیر کیا مضائقہ ہے۔ یہ تحریر تو آپ کے قبضے میں ہے ——— آداب۔ (شہباز دروازہ کھول کر وکیل صاحب کو رخصت کرتا ہے اور دروازہ بند کر دیتا ہے)۔ (مہ جبیں محل گھبرائی ہوئی ا

دروازے سے جو زینوں کے پلیٹ فارم پر کھلتا ہے داخل ہوتی ہے)

برجیس۔ شہباز مرزا!

شہباز۔ (گھبرا کر) کیوں خیریت تو ہے؟۔

برجیس۔ (بڑی مایوسی سے ایک کرسی پر گر کر) آہ — میری امیدوں پر پانی پھر گیا — میرا خیالی محل تقدیر کی ایک ہی ٹھوکر سے گر گیا — تم میری عقل ہو مجھے کوئی رستہ دکھاؤ — مجھے تم پر بھروسہ ہے — اس آڑے وقت میں کام آؤ۔

شہباز۔ آخر کچھ تو بتاؤ۔

برجیس۔ آہ — جمیل کی شادی میری بیٹی سے نہیں ہو سکتی۔

شہباز۔ کیوں؟۔

برجیس۔ جمیل شادی کر چکا ہے۔

شہباز۔ (گھبرا کر) کب؟۔

برجیس۔ یہ میں نہیں جانتی۔

شہباز۔ کس سے؟۔

برجیس۔ اس کا بھی مجھے علم نہیں۔

شہباز تم سے کس نے کہا؟

برجیس۔ خود جمیل نے۔

شہباز۔ (تعجب اور گھبراہٹ سے) کیا؟۔

برجیس۔ یہی کہ وہ شادی کر چکا ہے۔ اور اب کسی دولت کے لالچ اور وصیت کے ڈر سے اپنی بیوی کو چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔

شہباز۔ (کچھ سوچ کر) اس شادی کا کوئی ثبوت؟۔

برجیس۔ جمیل کے بیان کے مطابق ایک باضابطہ نکاح نامہ۔

شہباز۔ وہ کس کے پاس ہے؟

برجیس۔ اس کی بیوی کے پاس۔

شہباز۔ اس کے گھر کا کوئی نشان۔

برجیس۔ (یاد کرتے ہوئے) قاضیوں کے کوچے میں تیسرا مکان۔

شہباز۔ جمیل اس وقت کہاں ہے؟

برجیس۔ محل سرا میں۔

شہباز۔ (کچھ سوچ کر) اس کو وہیں روکو۔ اور جب تک میں نہ کہوں اسے کہیں جانے نہ دو۔

برجیس۔ اگر وہ جانا چاہے تو میں اسے کیسے روک سکتی ہوں۔

شہباز۔ ایک عورت کو اس سے زیادہ عقل مند ہونا چاہیئے ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔

برجیس۔ مگر ۔۔ ۔۔ ۔۔

شہباز۔ اگر مگر کچھ نہیں ———— یہ معاملہ بہت اہم ہے ——— کام زیادہ، اور وقت کم ہے۔

برجیس چلی جاتی ہے شہباز اپنی کرسی پہ بیٹھ جاتا ہے اور گھنٹی بجاتا ہے ایک ملازم داخل ہوتا ہے۔

شہباز۔ (ملازم کی طرف دیکھتے ہوئے) ارشاد کو بھیجو ———— اور جب وہ آجائے تو دروازہ بند کر دو۔

ملازم۔ جو حکم سرکار۔

شہباز۔ (اپنے آپ سے سوچتے ہوئے) اگر جمیل کی بیوی کا نکاح نامہ میرے قبضے میں آجائے تو پھر اس کا نکاح کیسے ثابت ہو سکتا ہے (ارشاد داخل ہوتا ہے۔ ملازم دروازہ بند کر دیتا ہے۔ شہباز ارشاد کی طرف دیکھتے ہوئے) کام بہت ضروری ہے اور اسے بڑی رازداری سے کرنا ہوگا ———— کر سکو گے؟۔

ارشاد۔ خادم ہر خدمت انجام دینے کو تیار ہے۔

(بیک گراؤنڈ سے ستار کی ایک دلکش دھن سنائی دیتی ہے جو برابر جاری رہتی ہے)۔

شہباز۔ (اٹھ کر اور ارشاد کے قریب آکر) چھوٹے نواب صاحب اس وقت محل سرا میں ہیں۔ تم کسی نہ کسی طرح ان کے مکان میں داخل ہو جاؤ۔ اگر وہاں کوئی ایسی چیز پاؤ جس میں ایک قیمتی کاغذ حفاظت سے رکھا جا سکتا ہے تو میرے پاس لے آؤ۔ سمجھ گئے۔

ارشاد۔ مکان کا پتہ۔

شہباز۔ قاضیوں کے کوچے میں تیسرا مکان ———— جاؤ۔

(ارشاد چلا جاتا ہے۔ محل سرا کا دروازہ کھلتا ہے اور برجیس محل خوش خوش زینے سے اترتی ہے۔ شہباز قریب آکر)

برجیس۔ تمہاری چال کامیاب ہوئی۔ جمیل اس وقت نیلوفر کے نغمے سے مسحور اور شراب سے مخمور ہے۔

شہباز۔ (مسکرا کر) تو اور کیا چاہتی ہو؟۔

برجیس۔ ایک ضروری کام میں تمہاری امداد۔

شہباز۔ وہ کیا؟۔

برجیس۔ بس یہی کہ جلدی سے قاضی کو بلا کر نیلوفر اور جمیل کا نکاح نامہ لکھوا لو۔

برجیس- (اپنے معمولی طریق گفتگو کو بدل کر) مگر تم تو کہتی تھیں کہ اس کی شادی ہو چکی ہے۔

برجیس- اس سے کیا ہوتا ہے۔

شہباز- سب کچھ۔

برجیس- وہ کیسے؟

شہباز- جس بیوی کی خاطر جمیل اپنے باپ کی وصیت اس کی دولت اور جائیداد کی پروا نہیں کرتا۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ اس سے تمہارے اندازے سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ ہوش میں آتے ہی وہ اس کے پاس چلا جائے گا اور یہ نکاح نامہ دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔

برجیس- تو پھر اس کانٹے کو رستے سے ہٹانے کی کوئی تدبیر؟

شہباز- کر دی گئی ہے۔

برجیس- کیا؟۔

شہباز- تھوڑی دیر میں اس کی بیوی کا نکاح نامہ میرے قبضہ میں ہوگا۔

برجیس- اور اس کی بیوی؟

شہباز اس کی زندگی یا موت میرے حکم پر منحصر ہوگی۔

برجیس (اطمینان اور مسرت سے) میری خوش قسمتی کے فرشتے میں اس احسان کا شکریہ کیسے ادا کروں۔

شہباز- (ایک فیصلہ کن لہجے میں) بس آدھی جائیداد میرے نام لکھ دو۔

برجیس- مگر یہ جائیداد میری نہیں۔

شہباز- کیا نیلوفر تمہاری نہیں؟۔

برجیس- (حیران ہو کر) تمہارا مطلب؟

شہباز- نکاح سے پہلے پہلے اس سے نواب کی آدھی جائیداد میرے نام لکھوا دو۔

برجیس- (کچھ سوچ کر) اس کا فیصلہ تو نیلوفر کے اختیار میں ہے۔

شہباز- نیلوفر کی قسمت کا فیصلہ میرے اختیار میں ہے۔

برجیس- (گھبرا کر) وہ کیسے؟۔

شہباز- اگر وہ مجھ کو آدھی جائیداد دینے سے انکار کرے گی تو ساری جائیداد سے ہاتھ دھو بیٹھے گی۔

برجیس- کیوں؟۔

شہباز- اس لیے کہ نواب نے اپنے وصیت نامے میں تم کو یا نیلوفر کو کچھ بھی نہیں دیا۔

برجیس- (پریشان ہو کر) وہ وصیت نامہ کہاں ہے۔

شہباز۔ میرے پاس۔

برجیس۔ (ہوشیاری سے) اس کا کوئی گواہ۔

شہباز۔ ہے۔

برجیس۔ کون؟

شہباز۔ میں۔

برجیس۔ تو تم نے مجھ سے پہلے کیوں نہ کہا۔

شہباز۔ میں وقت کا انتظار کر رہا تھا۔

برجیس۔ شہباز ——— شہباز بتاؤ۔ اس میں کیا لکھا ہے؟

شہباز۔ بہت کچھ ——— مگر سب تمہارے خلاف۔

برجیس۔ کیا۔

شہباز۔ ابھی نہیں بتا سکتا ———

برجیس۔ شہباز اس وصیت نامے کو جلا دو۔

شہباز۔ میری شرط مان لو میں اسے جلا دوں گا۔

برجیس۔ تو بولو تم کیا چاہتے ہو؟

شہباز۔ نواب کی نصف جائداد کا قبالہ۔

برجیس۔ اگر میں انکار کر دوں۔

شہباز۔ (بے پروائی سے) تو یہ وصیت نامہ نیلام کر دیا جائے گا۔ اس کو خریدنے کے لیے بہت لوگ تیار ہوں گے۔

برجیس۔ (اندیشے سے) کون؟

شہباز۔ جمیل اُس کی بیوی۔۔ ۔۔ ۔۔

برجیس۔ (گھبرا کر اور بات کاٹ کر) نہیں شہباز۔ مجھ پر ترس کھاؤ ——— میری امیدوں کو یوں مٹی میں نہ ملاؤ ——— لاؤ مجھے وہ وصیت نامہ دکھاؤ ——— میں نیلوفر کو تمہاری شرط پر رضامند کروں گی۔

شہباز۔ جاؤ۔ نیلوفر سے قبالہ لکھوا لاؤ۔ میں وصیت نامہ تمہارے حوالے کر دوں گا۔

برجیس۔ (جاتے ہوئے) میرا انتظار کرو۔ مگر کہیں ایسا نہ ہو ———

شہباز۔ (بات کاٹ کر) نہیں نہیں مجھ پر اعتبار کرو۔

(برجیس چلی جاتی ہے۔ شہباز دروازہ بند کر لیتا ہے)۔

(دوسرے دروازے پر دستک ہوتی ہے۔)

دروازے کے باہر سے آواز۔ ارشاد۔

شہباز۔ (بڑی بے چینی سے کرسی سے اٹھتا ہے) آجاؤ۔

(دروازہ کھلتا ہے ارشاد داخل ہوتا ہے اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی صندوقچی ہے۔

شہباز۔ دروازہ بند کردو۔

(ارشاد دروازہ بند کر دیتا ہے۔)

شہباز۔ کہو کیا خبر لائے۔

ارشاد۔ (بڑھ کر اور صندوقچی شہباز مرزا کی طرف بڑھا کر) اس مکان میں یہی ایک صندوقچی تھی جس میں کوئی قیمتی چیز رکھی جاسکتی ہے۔

شہباز۔ (صندوقچی کو ہاتھ میں لے کر) شاباش — آفرین — تم سے یہی امید تھی۔

(شہباز میز کی طرف جاتا ہے صندوقچی کو میز پر رکھ دیتا ہے۔ میز کی دراز سے کنجیوں کا ایک گچھا نکالتا ہے اور اس میں سے مختلف کنجیاں نکال نکال کر صندوقچی کو کھولنے کی کوشش کرتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ ارشاد سے باتیں کرتا جاتا ہے)۔

شہباز۔ مکان میں کوئی تھا؟

ارشاد۔ (بڑے ادب سے) سرکار کے اقبال سے میں نے مکان کو خالی ہی پایا۔

شہباز۔ (کچھ حیران سا ہو کر) کوئی ملازم — کوئی ماما — کوئی انا۔؟

ارشاد۔ مکان کی حیثیت ایسی معلوم نہ ہوتی تھی کہ اس کے رہنے والے ایسی فضول خرچی کر سکیں۔

شہباز۔ (کچھ سوچتے ہوئے) ہوں — گھر کا سامان۔؟

ارشاد۔ بس غریب لوگوں کا سا۔

شہباز۔ تعجب ہے (صندوقچی کھل جاتی ہے اس میں سے ایک سر بمہر لفافہ ملتا ہے۔ شہباز یہ سمجھ کر کہ اس میں نکاح نامہ بند ہے بہت خوش ہوتا ہے۔

شہباز (ارشاد سے) جاؤ۔

(ارشاد چلا جاتا ہے اور دروازے کو بند کر دیتا ہے)

شہباز۔ (زیادہ تر اپنے آپ سے مخاطب ہو کر)۔

شہباز۔ بیوقوف عورت تو نے کس کوشش سے اس تحریر کو دنیا کی نظر سے چھپایا ہے۔ صرف اس لیے کہ یہ ایک دوسری عورت کی تقدیر کی روشن تحریر بن جائے۔

(لفافے کو کھولنے سے پہلے بہ غور دیکھتا ہے اور اس کی مہروں کو محفوظ دیکھ کر اطمینان اور مسرت کا اظہار کرتا ہے۔ مہریں توڑ کر لفافہ کھولتا ہے۔ اس میں سے ایک اور لفافہ ملتا ہے جس پر شہباز کا نام اور پتہ لکھا ہے)

شہباز۔ (پڑھتے ہوئے دیوانہ وار) شہباز مرزا۔
خداوندا یہ کیا راز ہے (جلدی سے لفافہ پھاڑ کر اس میں سے ایک خط نکالتا ہے)۔
خط
"یہ خط تم کو اس وقت ملے گا جب تمہاری مصیبت زدہ بیوی دنیا سے سفر کر چکی ہوگی"
(بڑے رنج کے اظہار سے)
"دنیا سے سفر کر چکی ہوگی — آہ — میری امیدوں کا خون ہو گیا"
(خط پڑھنا شروع کر دیتا ہے)
"اور تمہاری بیٹی نسیم اپنے آپ کو بے یار و مددگار پاکر تمہاری مدد کی طلب گار ہوگی"
شہباز۔ آہ — آہ —! میری بیٹی اور اس حالت میں —— میری نورِ نظر اور اس مصیبت میں ——
میرے خدا مجھے سہارا دے (سر کو میز پر ٹیک دیتا ہے۔ شہباز پھر سنبھل کر خط پڑھنے لگتا ہے)۔
"اگر تمہارے دل میں کچھ بھی اولاد کی محبت ہے تو فوراً اس پتہ پر جاؤ اور اپنی بیٹی نسیم کو مصیبت سے بچاؤ
مگر خبردار اسے نام نہ بتانا۔

بدنصیب زمانی۔

قاضیوں کا کوچہ مکان نمبر ۳۔

(وفورِ اضطراب سے سر کے بال نوچ لیتا ہے)
شہباز۔ خداوندا میں نے یہ کیا پڑھا۔ کیا تو نے میرے گناہوں کا انتقام میرے ہاتھوں ہی سے لیا۔ (پھر ہوش سنبھال کر آواز
دیتا ہے) ارشاد۔
(دروازہ کھلتا ہے اور ارشاد داخل ہوتا ہے)۔
ارشاد۔ سرکار۔
شہباز تم نے کیا کہا تھا اس گھر میں کوئی نہیں تھا۔
ارشاد اس وقت تو کوئی نہ تھا سرکار۔
شہباز (کچھ سوچ کر) تو آؤ میرے ساتھ چلو شاید اب وہاں کوئی مل جائے۔
(تیزی سے دروازے سے نکل جاتا ہے اور ارشاد اس کے پیچھے دوڑتا ہوا جاتا ہے)۔
اور اس دروازے سے جو زینے کے پلیٹ فارم پر کھلتا ہے۔ برجیس غصے میں بھری داخل ہوتی ہے)۔
برجیس۔ (فضا میں دیکھتے ہوئے خیال ہی خیال میں شہباز سے مخاطب ہوتی ہے) نصف جائیداد کا قبالہ —— شہباز! یوں مفت
میں ہاتھ نہیں آسکتا —— تو صرف ایک عورت کی کمزوری سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے —— اور چاہتا ہے کہ مجھ کو

خوش قسمتی کی جوکھٹ پر پہنچا کر دھتکار دے ———— اگر تو ایک جعلی وصیت نامہ لکھ کر مجھے میرے حق سے محروم کر سکتا ہے اور نواب کی جائیداد پر قبضہ کرنے کے بہانے ڈھونڈ سکتا ہے تو میں تیرے ہی ہتھیاروں سے تجھے شکست دوں گی ———— میں بھی نیلوفر اور جمیل کا جعلی نکاح نامہ لکھوا کر نیلوفر کو نواب کی جائیداد کی وارث بنا دوں گی۔

(بڑھ کر میز کے سامنے اسی کرسی پر بیٹھ جاتی ہے جس پر پہلے شہباز بیٹھا تھا۔ پھر گھنٹی بجاتی ہے۔ دروازہ کھلتا ہے اور ایک ملازم داخل ہوتا ہے)۔

ملازم۔ سرکار!۔

برجیس۔ منشی جی دفتر میں ہیں؟۔

ملازم۔ جی سرکار۔

برجیس۔ انہیں ہمارے پاس بھیج دو۔

ملازم۔ بہت بہتر سرکار۔

(ملازم چلا جاتا ہے۔ برجیس غصے سے بے چین ہے اور دروازے کی طرف دیکھ رہی ہے۔ دروازہ کھلتا ہے اور منشی داخل ہوتا ہے)۔

منشی۔ کیا حکم ہے سرکار!۔

برجیس۔ دروازہ بند کر دیجئے اور میرے قریب آئیے۔

(بوڑھا منشی دروازہ بند کر کے آگے بڑھتا ہے)

برجیس۔ اس محلے میں قاضی کو جانتے ہیں آپ؟۔

منشی۔ جی ہاں۔

برجیس۔ اس کا ایمان؟۔

منشی۔ روپے پیسے کا لالچ نہ ہو تو بہت مضبوط ہے سرکار۔

برجیس۔ تو جائیے۔ اس کی امید اور اندازے سے بڑھ کر انعام کا لالچ دے کر اسے لے آئیے ———— مگر جلدی ———— بہت جلدی۔

منشی۔ جو ارشاد۔

(منشی جانا چاہتا ہے ———— برجیس منشی کو روک کر)

برجیس۔ اور سنیئے ———— شہباز مرزا اپنے کمرے میں ہوگا۔ ہماری اجازت کے بغیر وہ محل سرا سے باہر نہ جانے پائے۔

منشی۔ (گھبرا کر) مگر وہ تو محل سرا میں موجود نہیں ہیں —

برجیس۔ (تعجب اور گھبراہٹ سے) کیا ————؟۔

منشی۔ میں نے ان کو بڑی پریشانی کی حالت میں ابھی ابھی محل سرا کے بڑے دروازے سے باہر جاتے دیکھا ہے۔
برجیس۔ (کچھ سوچ کر) کچھ پروا نہیں —— جایئے۔
(منشی ابھی دروازے سے نکلنے نہیں پاتا کہ ایک ملازم داخل ہوتا ہے)۔
برجیس۔ کیا ہے۔؟
ملازم۔ ایک خاتون دروازے پر کھڑی ہیں اور آپ سے ملنا چاہتی ہیں۔
برجیس۔ کون خاتون؟۔
ملازم۔ وہ اپنے آپ کو چھوٹے سرکار کی بیگم بتاتی ہیں۔
برجیس۔ چھوٹے سرکار کی بیگم —— جاؤ انہیں عزت سے لے آؤ۔
(ملازم جاتا ہے)
برجیس۔ (فضا میں دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے) نیلوفر تیری قسمت جاگ اٹھی —— یہ بازی بھی میرے ہی ہاتھ رہی۔
(دروازہ کھلتا ہے۔ ایک خوب صورت اور نوجوان خاتون داخل ہوتی ہے۔)
برجیس۔ (ملازم سے) جاؤ —— اور دروازہ بند کر دو۔
(ملازم جاتا ہے اور دروازہ بند کر دیتا ہے)
برجیس۔ (تکبّر اور استغنا سے) تو تم اپنے آپ کو جمیل کی بیوی بتاتی ہو۔؟
خاتون۔ (عاجزانہ استقامت سے) جی!۔
برجیس۔ (غرور سے) تم نے جمیل سے کب شادی کی؟۔
خاتون۔ میں نے جمیل سے شادی نہیں کی۔ جمیل نے مجھ سے شادی کی ہے۔
برجیس۔ (تمسخر سے) ہاہاہا —— ہاہا —— وہ کب؟۔
خاتون۔ (ایک زخمی پرندے کی طرح چوٹ کھا کر) جب انہیں آپ لوگوں نے محل سرا سے نکال دیا تھا — جب وہ میری طرح غریب تھا —— جب وہ کسی کی محبت کو مال و دولت سے نہ جیت سکتا تھا۔ جب سر چھپانے کے لیے اس کے پاس ایک چھپر کا سہارا بھی نہ تھا۔
برجیس۔ (غصّے میں) بیوقوف عورت تُو کیا بک رہی ہے۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ تُو خود چل کر میرے گھر آئی ہے۔
خاتون۔ (ایک شیرنی کے انداز استقامت سے) میں اسے اپنے شوہر کا گھر سمجھ کر آئی ہوں —— آپ سے کچھ مانگنے نہیں آئی۔
برجیس۔ (بے پروائی سے) تو تجھے جمیل کے پاس جانا چاہیئے تھا۔ میرے پاس کیوں آئی؟؟

خاتون۔ مجھے خیال تھا کہ جمیل محل سرا میں ہے —— اور شاید (رک رک) آ —— آ —— آپ انہیں میرے پاس نہ آنے دیں —— شاید وہ اپنے باپ کی جائیداد کے لالچ میں اپنی بیوی کو بھلا بیٹھیں۔

برجیس۔ (نفرت اور حقارت سے، چھوکری! —— ایک بھولے بھالے لڑکے کو احمق بنا چکی —— اب مجھے بیوقوف بنانے آئی ہو!۔

خاتون۔ (غیرت سے مشتعل ہوکر) معزز خاتون شریف عورتیں دوسروں کی بہو بیٹیوں کو اس طرح ذلیل نہیں کیا کرتیں میں آپ کو بے وقوف بنانے نہیں آئی۔ اپنے شوہر کی تلاش میں آئی ہوں۔

برجیس۔ (تکبر اور حقارت سے) تجھ جیسی عورتوں کے زبانی دعووں سے شریفوں کی عزت برباد نہیں ہوسکتی۔

خاتون۔ اگر میں جانتی کہ آپ اپنی بہو سے ایسا سلوک کریں گی تو میں ہرگز یہاں نہ آتی۔

برجیس۔ (غرور سے) تم اور میری بہو!۔

خاتون۔ جمیل آپ کا بیٹا نہ سہی —— مگر نواب والا جاہ کا بیٹا تو ہے —— اور میں جمیل کی بیوی ہوں۔

برجیس۔ اس کا ثبوت۔

خاتون ہے۔

برجیس کیا۔

خاتون۔ میرا نکاح نامہ۔

برجیس۔ (گھبرا کر) کہاں ہے۔؟

خاتون۔ میرے پاس۔

برجیس۔ (کچھ سوچ کر) دکھاؤ میں اسے دیکھنا چاہتی ہوں۔

(خاتون اپنا بازو بند کھول کر ایک تعویذ نکالتی ہے جس میں نکاح نامہ بند ہے۔ نکاح نامے کو تعویذ سے نکال کر برجیس کو دیتے ہوئے)۔

خاتون۔ یہ دیکھئے۔

(برجیس نکاح نامہ لے کر اسے پڑھنا شروع کر دیتی ہے کہ اتنے میں وہ دروازہ جو زینوں کے پلیٹ فارم پر کھلتا ہے اور جمیل گھبرایا ہوا زینوں پر سے اُترتا ہے اور چلّاتا ہے)۔

جمیل۔ نسیم! —— نسیم!!۔ (خاتون کی پشت دروازے کی طرف ہے)۔

جمیل۔ (کچھ نہ سمجھتے ہوئے) میں نے ابھی ابھی اپنی بیوی کی آواز سنی تھی۔

(خاتون فوراً مڑ کر جمیل کو دیکھتی ہے اور دوڑ کر اس کی طرف جاتی ہے)۔

خاتون۔ جمیل! —— جمیل!!

(عین اس وقت دوسرا دروازہ کھلتا ہے اور شہباز مرزا گھبرایا ہوا داخل ہوتا ہے)

شہباز۔ جمیل — جمیل — میری بیٹی کہاں ہے؟۔

جمیل۔ آپ کی بیٹی؟۔

شہباز۔ (تکرار سے) ہاں — ہاں میری بیٹی — تمہاری بیوی ۔

(نسیم مڑ کر شہباز مرزا کی طرف دیکھتی ہے شہباز مرزا بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیتا ہے)

(برجیس ان سب کو دیکھ کر گھبرا جاتی ہے اور دل ہی دل میں کچھ فیصلہ کر کے نکاح نامہ کو پھاڑنا چاہتی ہے، اور کہتی ہے)۔

برجیس۔ تو یہ ہے وہ کاغذ جس کو تم اپنا نکاح نامہ کہتی ہو۔

نسیم۔ میرا نکاح نامہ۔

شہباز۔ (برجیس سے اور کچھ سمجھ کر۔ غصے سے) رک جاؤ ———

(کاغذ چھیننے کے لیے دیوانہ وار بڑھتا ہے برجیس گھبرا جاتی ہے اور نکاح نامے کو ہاتھ میں لیے ایک طرف ہٹنا چاہتی ہے۔ شہباز مرزا بڑھ کر اسے زور سے دھکا دیتا ہے)۔

شہباز رک جاؤ ——— (برجیس دیوار کے ساتھ جا ٹکراتی ہے ایک خفیہ بٹن دب جاتا ہے نواب والا جاہ کی تصویر گر جاتی ہے اور دیوار میں ایک دراز نظر آتا ہے)۔

برجیس۔ (حیرت سے) یہ کیا؟۔

شہباز۔ (جلدی سے آگے بڑھتا ہے اور دراز سے ایک کاغذ نکال کر اسے پڑھتا ہے اور خوشی سے چلاتا ہے۔)

شہباز۔ (جمیل کی طرف بڑھاتے ہوئے) اصلی وصیت۔

برجیس کرسی پر گر کر میز پر اپنا سر ٹپک دیتی ہے اور نسیم بڑھ کر اس کے ہاتھ سے اپنا نکاح نامہ چھین لیتی ہے)

(پردہ) ———

کھلے خط

سیّد محمد نواز

بھائی طفیل !

"نقوش" کے شمارہ نمبر ۱۰۵ (اپریل مئی جون ۱۹۶۶ء) میں حفیظ ہوشیارپوری کے خطوں کے ساتھ پیر حسام الدین صاحب راشدی کا جو خط شائع ہوا تھا، وہ حفیظ کے بہت سے اعزّہ و احباب کے لیے تشویش کا باعث ہوا تھا۔ آپ کو یاد ہو گا میں نے آپ سے اس بات کا ذکر بھی کیا تھا۔ کراچی پہنچ کر میں نے حفیظ کو بدستور صحت مند اور خوش و خرّم پایا۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ کراچی میں حفیظ سے اکثر ملنے والے احباب کو بھی اُن کی صحت کے متعلق پیر صاحب کا خط پڑھ کر تعجب ہوا تھا۔ میں نے حفیظ سے اس خط کا ذکر کیا تو شکایتاً نہیں بلکہ حکایتاً اُنھوں نے اپنے عزیز دوست پیر حسام الدین راشدی کے متعلق کہا :

کیا جانیے اُس نے مجھے کس حال میں دیکھا!

پیر صاحب نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ "حفیظ ایک بجھے ہوئے چراغ کی مانند ہے جس کی لَو سے فقط دُھواں نکل رہا ہو۔" اس کے جواب میں حفیظ نے صائب کا یہ شعر پڑھا :

ندارد دُو دمانِ عشق چُوں من مجلس افروزے
سیہ مستی کند پروانہ از دُودِ چراغِ من

اس پر آٹھ سال پہلے کا ایک منظر میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ یہ ۵ ستمبر ۱۹۵۸ء کا واقعہ ہے۔ جناح ہسپتال کے سپیشل وارڈ کے ایک کمرے میں حفیظ نیم بیہوشی کے عالم میں تھے اپنے ماحول سے بے خبر۔ خدا جانے کس کیفیت میں انھوں نے ایک قطعہ اور غزل کے کچھ شعر کاغذ کے ایک پُرزے پر لکھے۔ وہ پُرزہ بستر سے فرش پر گرا اور ایک دوست کے ہاتھ لگا اور اس طرح یہ شعر اتفاقاً محفوظ ہو گئے۔ بعد میں جب یہ شعر انھیں سنائے گئے تو شعوری طور پر انھیں خود یہ علم نہیں تھا کہ یہ شعر انھوں نے لکھے ہیں۔ ان میں ایک خاص کیفیت جھلک رہی ہے اور چونکہ یہ ابھی تک کہیں نہیں چھپے، آپ یقیناً سُننا چاہیں گے۔ قطعہ یہ ہے :-

تم کہاں ہو گے، ہم کہاں ہوں گے
فاصلے کتنے درمیاں ہوں گے
جو نہ تھے بارِ خاطرِ احباب
دوشِ احباب پہ گراں ہوں گے!

غزل :-

ہمیں جہاں ہیں رازِ آشنا قیامت کے

کہ فاصلے ہیں قیامت ، رہِ محبّت کے
اِس ایک بات کا غم ہے کہ رائگاں کھوئے
شبِ فراق میں اوقات اپنی فرصت کے
وہ آنے والے ہیں شاید کہ میرے ذہن میں آج
اُبھر رہے ہیں خد و خال اُن کی صورت کے
نہ کوئی رسمِ دنیا کے سوا محبّت کے
نہ کوئی شرط ، سوا شرطِ آدمیّت کے

اِن اشعار سے ظاہر ہے کہ عالمِ بیماری میں بھی حفیظؔ کو نوائے سروش میّسر رہی ، چہ جائے کہ صحت یاب ہونے کے بعد وہ اس قدر رُکھّ جاتے جیسا کہ پیر حسام الدین صاحب کے خط سے ظاہر ہوتا تھا ۔

میرے استفسار پر حفیظؔ نے اُس خط کے بارے میں جو کچھ بتایا وہ آپ کو بتانا ضروری سمجھتا ہوں ، بات یوں ہوئی کہ ۳۰ مارچ ۱۹۶۶ء کو پیر حسام الدین راشدی اور کرنل خواجہ عبدالرّشید دفتر میں اُن سے ملنے آئے ، اس وقت حفیظؔ کی میز پر چاروں طرف فائلوں کے انبار تھے ۔ گفتگو کا سلسلہ دفتری مصروفیات سے آگے نہ بڑھ سکا ۔ اِسی دوران میں دفتر کے ایک اور صاحب اُن کے کمرے میں آ گئے ۔ ظاہر ہے کہ ایسے اجنبی اور خشک ماحول میں وہ بے تکلّفانہ گفتگو کیسے ممکن تھی جو ان کا خاصہ ہے ۔ یہ درست ہے کہ پیر صاحب کئی دفعہ " نقوش " کے لیے حفیظؔ سے غزلوں کی فرمائش کر چکے تھے ، حفیظؔ نے ہر بار دفتری مصروفیات کے باعث معذرت کا اظہار کیا ، حالانکہ اُن کے پاس بہت سی غیر مطبوعہ غزلیں موجود ہیں ، لیکن تلاش کرنے کی فرصت کسے اور نقل کون کرے ۔ پیر صاحب نے اِس معذرت کو مصروفیت سے زیادہ بیماری پر محمول کیا ۔ اور اس کا اظہار کچھ اس انداز میں کیا کہ خود کرنل رشید صاحب کو جو پیر صاحب کے ساتھ حفیظؔ سے ملنے آئے تھے ، اُن کا خط پڑھ کر تعجب ہُوا ۔

بہرحال علمی اور ادبی دنیا پر پیر صاحب کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے حفیظ کے وہ خطوط جو مفید اور دلچسپ معلومات سے پُر ہیں اور جن میں اُن کا کلام بھی ہے ، آپ کو اشاعت کے لئے بھیج دیئے ۔

حفیظؔ کے اِن خطوں کی اشاعت کے کچھ اور دلچسپ پہلو بھی ہیں ، بعض لوگوں کو اِن خطوں کے ذریعے پہلی دفعہ یہ بات معلوم ہوئی کہ حفیظ خط بھی لکھا کرتے ہیں یا دوسروں کے خطوں کا جواب بھی دیا کرتے ہیں ، ورنہ عام طور پر اُن سے اِس کے برعکس شکایت رہی ہے ۔ حفیظ کے پاس طرح طرح کے خطوط آتے رہتے ہیں ، تاریخوں کی فرمائش ، کلام اور مضامین کی فرمائش ، علمی اور ادبی نکات کے متعلق استفسارات ، کمیاب یا غیر مطبوعہ کتابوں اور قدیم علمی نسخوں کے متعلق معلومات ، اور خط اِس کثرت سے آتے ہیں کہ انھیں پڑھنے تک کی فرصت نہیں ملتی ۔ وہ کہتے ہیں ان سب خطوں کا جواب میرے بس کی بات نہیں ، اس کے لیے دفتر چاہیے ۔ حفیظ کے پاس ایک ایسا خط بھی ہے جس میں ایک ہم عصر شاعر نے خود اپنی وفات پر قطعۂ تاریخ کی فرمائش کی ہے !

نقوش میں شائع شدہ خطوں نے حفیظ کا ایک اور راز فاش کر دیا ہے ، وہ اپنی بے شمار قیمتی اور نایاب کتابیں ضائع کر چکے ہیں ۔

جو مانگ کر لے جانے والوں نے پڑھ کر واپس نہیں کیں۔ نتیجہ یہ ہے اب جب کوئی اُن سے کتاب مانگتا ہے تو صاف انکار کر دیتے ہیں۔ پیر حسام الدین صاحب کے نام اُن کے ایک خط میں ایک ایسی کتاب کا ذکر ہے۔

حفیظ کا حلقۂ احباب مختصر ہے، کوئی دس بارہ برس پہلے انہوں نے ایک جدید قسم کا "ساقی نامہ" لکھا تھا جس میں اپنے کئی دوستوں کا ذکر کیا ہے۔ اُس وقت کے سماجی اور سیاسی ماحول کا نقشہ کھینچا ہے اور اس ناگفتہ بہ ماحول سے نکل کر حلقۂ احباب میں پناہ ڈھونڈی ہے۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ وہ اِس ساقی نامے کی اشاعت پر آمادہ ہو جائیں۔

چیدہ چیدہ احباب کو حفیظ بڑے پیار سے خط لکھتے ہیں، یہ خط اکثر منظوم ہوتے ہیں اور زیادہ تر فارسی میں۔ میرے خیال میں کئی غزلیں جو حفیظ نے اپنے دوستوں کو خطوں کے ساتھ بھیجیں، ابھی تک چھپی نہیں۔

مجھے حفیظ سے دیرینہ نیازمندی کا شرف حاصل ہے، قیامِ لندن کے دوران میں حفیظ نے مجھے کئی خط لکھے، ایک منظوم فارسی خط ملاحظہ کیجیے۔

RUSKIN HOUSE
54. HUNTER STREET
BRUNSWICK SQUARE
LONDON, W.C.1

۱۲ جنوری ۱۹۵۷ء

(بوقتِ نیم شب)

سخت غافل بودہ ام اے وائے من اے وائے من
در مہجوری سزائے شوقِ بے پروائے من

از نگاہم دُور اعجازِ تصوّر را نگر!
اے کہ رُوئے تُست پنہان من و پیدائے من

گرمیٔ یادت مداوائے زمستانِ فرنگ
شعلۂ مَے بے تو شد افسردہ در مینائے من

ختم شد بر تو محبت چوں نبوّت بر رسولؐ
اے حبیبِ بے شریک اے گوہرِ یکتائے من

زانکہ من در بزمِ تو ہنگامہ آرا نیستم
بزمِ تو آباد و در بزمِ تو خالی جائے من

محفلِ احباب را ہرگز نباشد آب و تاب
بے دلِ بیدارِ تو بے دیدۂ بینائے من

در گہے نمایانِ آں در کشورِ افرنگ نیست
سجدۂ شوقے کہ بیتاب است در سیمائے من
روز ہائم بگذرد در قربتِ بیگا نگاں
یادِ ہم کیشاں انیسِ خلوتِ شبہائے من
روزگارِ ہجر را آساں تواں کردن بسر
خوشتر از امروزِ من باشد اگر فردائے من
دور تر افتادم و محبوب تر گشتم حفیظ
لطفِ یاران است و اخلاصِ دلِ شیدائے من

حفیظ ہوشیار پوری

حفیظ نومبر ۱۹۵۶ء کے شروع میں لندن گئے تھے۔ لیکن وسط جنوری ۱۹۵۷ء سے پہلے مجھے خط نہ لکھ سکے منظوم خط کے مطلع میں اسی بات کی طرف اشارہ ہے۔

یہ غزل لندن سے رخصت ہونے سے پہلے مجھے بھیجی تھی۔ :

لندن ۱۵ مارچ ۱۹۵۷ء

غزل

دل کی حالت دمِ رخصت مت پوچھ
ہائے وہ شکل وہ صورت! مت پوچھ

اُن تھرکتے ہوئے ہونٹوں کی قسم
مئے ناخوردہ کی لذّت! مت پوچھ

عجزِ گفتار نہ رسوا ہو جائے
اُس کی باتوں کی حلاوت! مت پوچھ

متّصل گوشِ برآواز ہے دل
وہ کہانی وہ شکایت مت پوچھ

گنگ ہے اہلِ محبّت کی زباں
حرف ناگفتہ کی حسرت مت پوچھ

زندگی بھر کی جدائی کے لئے
چند لمحوں کی رفاقت مت پوچھ

مجھے احبابِ وطن یاد آئے
اجنبی لوگوں کی چاہت مت پوچھ

مَیں نے پہلے بھی محبت کی ہے
وجہِ انکارِ محبّت مت پوچھ

پھر کہاں مجمعِ احباب حفیظ
چار دن جینے کی فرصت مت پوچھ

حفیظ ہوشیار پوری

مارچ ۱۹۵۸ء میں حفیظ حیدرآباد میں ریڈیو پاکستان کے ریجنل ڈائرکٹر تھے۔ میں اُن سے ملنے گیا۔ کراچی آتے ہوئے راستے میں ٹھٹھہ

کے قریب میری کار کو ایک حادثہ پیش آیا، میں بال بال بچ گیا۔ سید قمر رضا سپرنٹنڈنٹ پولیس ٹھٹھہ نے ٹیلیفون پر حفیظ کو حادثے کے بعد میری خیریت سے مطلع کیا، لیکن حفیظ حادثے کی اطلاع سے اتنے متاثر ہوئے کہ رات بھر نہیں سوئے، دوسرے دن مجھے اُن کا یہ منظوم خط ملا:۔

حیدرآباد

۲۲ مارچ ۱۹۵۸ء

بر من ہر آنچہ دُور ازاں مہرباں گذشت
از دردِ ہجر بر دلِ یارم ہماں گذشت

یک روز بودہ در بزمِ آں "یارِ دلنواز"
روزِ دگر بسوئے وطن ناگہاں گذشت

رفت آنچناں کہ سیر ندیدیم رُوئے او
چُوں ماہِ نَو کہ زود ز آسماں گذشت

عزمِ سفر نمود، سبا شُودہ از سفر
چُوں بُوئے گل رسیدہ چو ابرِ رواں گذشت

در رہ دو چارِ حادثہ[1] گشت و مرا ز تن
گوئی ز درد و رنج و غم و کربِ جاں گذشت

پرس از دل خودت کہ انیسِ دلِ من است
با از "ندیمِ[2] من" کہ شبِ من چساں گذشت

در سینہ دل تپید ز چشمم برفت خواب
وز صد خلوص حرفِ دعا بر زباں گذشت

بنشست بسکہ تیرِ دُعا راست بر ہدف
شکرِ خدا کہ یارِ من از بیمِ جاں گذشت

چوں من کسے کہ خاکِ رہِ دوستاں شدہ است
دامن کشاں ز بارگہِ این و آں گذشت

باور نشد وفائے من از دل گذشتنم
در دوستی حفیظ باید ز جاں گذشت — حفیظ ہوشیارپوری

---

[1] کار کے حادثے کی طرف اشارہ ہے۔
[2] حفیظ کے ایک دوست جو اُن دنوں حیدرآباد میں ان کے ہاں مقیم تھے۔

اگست ۱۹۶۴ء میں لاہور سے میں نے حفیظ کو ایک خط میں غزل کے کچھ شعر بھیجے، مطلع یہ تھا:

نہ کسی سے پیار مجھ کو، نہ ہوں میں کسی کو پیارا
میں وہ موجِ مضطرب ہوں، نہ مِلا جسے کنارا

حفیظ کا جواب اُسی زمین میں ایک نہایت شگفتہ غزل کی صورت میں آیا، اُن کا خط ملنے پر میں نے انھیں لکھا کہ "حفیظ، اگر میری ہر سعی ناکام کے جواب میں تم ایک نئی غزل کہنے کا وعدہ کرو تو میں ہر روز کچھ اُلٹے سیدھے شعر تخمیس لکھ بھیجا کروں اور تمہاری ایک تازہ بہ تازہ مرصّع غزل آجایا کرے یہ مجھ پر بھی احسان ہوگا، آنے والی نسلوں پر بھی، اُردو ادب پر بھی۔" یہ غزل بھی غیر مطبوعہ ہے اور درج ذیل ہے:۔

کبھی اس طرف اشارہ، کبھی اُس طرف اشارہ
سرِ بزم منتخب کر کسی ایک کو خدارا

کبھی قُرب سے دبایا مرے جوشِ آرزو کو
کبھی مجھ سے دور رہ کر مرے شوق کو اُبھارا

کبھی یاد نام تیرا ترے رُوبرو نہ آیا
کبھی اپنے سائے کو بھی ترے نام سے پکارا

جو ستم ہے بے سبب ہے، جو کرم ہے بے طلب ہے
مجھے یہ بھی ہے گوارا، مجھے وہ بھی ہے گوارا

تمھیں نام سے غرض کیا ہے بھلا سا نام اس کا
مرے جانِ دل کا دشمن مجھے جان و دل سے پیارا

کئی انقلاب آئے، کئی حادثات گذرے
کبھی دیکھا تھا جو تم نے وہی حال ہے ہمارا

غمِ عشق اگر نہ ہوتا تو نہ ہم کہیں کے رہتے
یہی موت کا بہانہ، یہی زیست کا سہارا

نہ یہ شمعِ دَیر ہوگی، نہ چراغِ کعبہ ہوگا
ہوا جس دم آشکارا، ترا حُسنِ عالم آرا

ہمیں دیکھنا تھا آخر یہ زوالِ آدمیت
کہ نہ تاب دشمنی ہے نہ ہے دوستی کا یارا

یہ جہانِ زندگاں ہے کہ دیارِ کشتگاں ہے
کوئی دشمنوں کا مارا، کوئی دوستوں کا مارا

یہ وہ دوست ہیں کہ جن میں نہیں جذبۂ رقابت
یہ نوازؔ ہے تمہارا، یہ حفیظؔ ہے تمہارا

حفیظ ۲ جنوری سے ایک سال کی رخصت پر ہیں، رخصت ختم ہونے پر ملازمت سے ریٹائر ہو جائیں گے۔ وہ اِس بات پر بہت خوش ہیں۔ اپنے کاغذات ٹھیک ٹھاک کر رہے ہیں، اب اُمید بندھتی ہے کہ اپنے کلام کی ترتیب کا کام بھی شروع کر دیں گے۔ آپ کو براہِ راست جلد خط لکھنے کا وعدہ کیا ہے۔

نیاز کیش

سید محمدؐ نواز

بس بال بال بچے...

خوش قسمتی سے بریک بروقت لگے
ورنہ اللہ کو پیارے ہو گئے ہوتے !
تیز رفتار بس اور اسے اوورٹیک کرتی ہوئی ٹرک
کی زد سے ذرا کم ہی بچا کرتے ہیں۔ چند لمحوں کی
دیر اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے کہ دس بیس سال
پہلے دوسری دنیا میں پہنچ جائیں۔ سڑک پر چوکنا نہ
رہنا جان بوجھ کر موت کو دعوت دینا ہے!
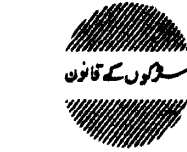
- جہاں کہیں ممکن ہو' فٹ پاتھ اور زیبرا کراسنگ استعمال کیجئے
- جہاں فٹ پاتھ نہ ہوں' وہاں دائیں کنارے پر یوں چلئے کہ آپ آتے ہوئے ٹریفک کو سامنے سے دیکھ سکیں۔
- سڑک پار کرتے وقت پہلے دائیں پھر بائیں پھر ایک بار دائیں اور دیکھ لیجئے تاکہ اطمینان ہو جائے کہ سڑک صاف ہے
- سڑک پار کرتے وقت ہمیشہ سیدھے اور نسبتاً تیز چلئے
- چلتی ہوئی بس یا ٹرام سے ہرگز نہ اتریئے اسی طرح کسی مقررہ اسٹاپ کے علاوہ اترنے کی کوشش نہ کیجئے
- ایسے موڑوں پر جہاں دائیں بائیں سے آنے والی گاڑیاں نظر نہ آئیں انتہائی محتاط رہئے